





رجسٹرڈ نمبر ۱۷۸

دسمبر ۱۹۴۲ء

# معارف

مجلس المصنفین کا علمبردار  
برس دارین ماہوار میسرانہ

میں تبت خلا

یتد سلیمان بنی



قیمت: پانچ روپیہ سالانہ

نفسیہ کی از المصنفین اعظمیہ

# السَّيْرَةُ النَّبَوِيَّةُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں: پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور اب اس میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو ہر روایات صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصباح و علم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق فضائل اور آداب کے عنوانوں اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے، قیمت بڑی تقطیع حجم قیمت ملے قیمتی قیمت چھوٹی تقطیع حجم قیمت اول قسم دوم سیرۃ النبی - حصہ اول x x x سیرۃ النبی حصہ اول ۵۶۱ x للہ

دوم	۲۵۱	للہ	دوم	۳۸	۴۳۸	۴۳۸	۴۳۸	۴۳۸	۴۳۸
سوم	۵۹۶	للہ	سوم	۹۴	۹۴	۹۴	۹۴	۹۴	۹۴
چہارم	۶۸۶	للہ	چہارم	۸۸	۸۸	۸۸	۸۸	۸۸	۸۸
پنجم	۳۶۸	للہ	پنجم	۹۳	۹۳	۹۳	۹۳	۹۳	۹۳
ششم	۶۱۲	للہ	ششم	۸۴۲	۸۴۲	۸۴۲	۸۴۲	۸۴۲	۸۴۲



شیرۃ المعتبر

یعنی

معارف اعظم گڑھ

کی

۵۰ ویں جلد

از جولائی ۱۹۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۲ء

حررت جلال

سید لیان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ



# فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۵

جولائی ۱۹۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسماء گرامی	صفحہ	شمار	اسماء گرامی	صفحہ
۱	جناب سید ابو عامر صاحب	۳۰۱-۲۹۱	۶	جناب زبید احمد صاحب لکچرار عربی	۴۱۷
	ایم اے ال ال بی علیگ	۳۷۲		الہ آبادیونیورسٹی	
۲	جناب سید ابوسل صاحب	۴۱۱-۳۹۱	۷	سید سلیمان ندوی	۱۹۲، ۸۲، ۲۱۲
	بی اے علیگ		۸	سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب	۳۲۲، ۲۳۲، ۲۰۲
۳	جناب مولانا امتیاز علی خان	۴۶۵-۱۱۹		ایم اے علیگ رفیق دارالمصنفین	۶۸
	صاحب عربی ناظم کتب خانہ ریاست رامپور		۹	خواجہ عبدالحمید صاحب لکچرار فلسفہ	۴۵۱، ۴۴۲
۴	جناب نواب صدرباگ جنگ بہاؤ	۳۵۸		گورنمنٹ کالج لاہور	
	مولانا حبیب الرحمن خان شروانی		۱۰	جناب عبدالرزاق صاحب قریشی	۳۳۷، ۲۵۵
۵	مولانا سید یاسین علی ندوی رفیق دارالمصنفین	۶۱	۱۱	مولانا عبدالسلام ندوی	۸۵-۵۶، ۲۴۵-۱۶۵، ۴۷۴

شمار	اسماء گرامی	صفحہ	شمار	اسماء گرامی	صفحہ
۱۲	جناب قاضی عبدالودود صاحب پرنسٹن	۳۹	۲۱	جناب نیاز احمد صاحب صدیقی	۲۱۳-۱۴۶
۱۳	جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب ایم	۱۹۴، ۳۶		دائیں پرنسٹن شیلی انٹر کالج انٹرم گڈہ	۴۵۵
	علیگ پکار کنگ ایڈورڈ کالج	۲۴۵	۲۲	ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے پی ایچ	۳۲۵
	(مراؤ تی برار)			ڈی بی سٹریٹ لاسٹا ذ فلسفہ جانتی	
۱۴	مولوی محمد اویس صاحب ندوی	۱۸۱، ۱۰۳		شعراء	
	نگرامی رفیق دار المصطفیٰ	۱۴۵	۱	جناب اثر رحمانی رامپوری	۶۶
۱۵	جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب	۵	۲	جناب انگھرام دادی	۶۶
	استاذ جامعہ عثمانیہ		۳	جناب اسد ملتانی	۱۵۵
۱۶	جناب محمد عبدالقادر صاحب	۴۳۳	۴	المجد حکیم الشعراء جناب سید احمد حسین صاحب	۳۹۵-۱۵۵
	لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ			المجد حمید آبادی	
۱۷	جناب مسعود حسن صاحب شمس المسمیٰ	۳۱	۵	جناب المجد علی صاحب جعفر فیض آبادی	۳۹۴
	ایم اے کلکتہ یونیورسٹی		۶	جناب حسرت ترمذی بی اے ال ال بی	۳۱۴، ۶۵
۱۸	جناب مولانا مسعود عالم ندوی	۲۲۸	۷	جناب روش صدیقی	۳۱۴، ۲۲۶
	کنڈلاگر بانکی پور لائبریری		۸	پروفیسر سلیم فارانی ام اوال گورنمنٹ	۳۹۴
۱۹	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۵۰، ۷۹-۵۳ ۲۲۲-۱۵۶ ۳۱۵-۲۳۷		کالج پشاور	
		۳۹۶-۳۸۵ ۴۷۷-۴۷۰	۹	مجدوب جناب خواجہ عزیز الحسن	۱۵۴
۲۰	پروفیسر سید نواب علی صاحب	۲۳		صاحب مجدوب زارنٹ انسپکٹر مدارس	
	سابق وزیر تعلیم جوناگڑہ		۱۰	جناب یحییٰ صاحب انظمی	۲۲۶-۶۴ ۳۱۳

# فہرست مضامین

جلد ۵۰

جولائی ۱۹۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

صفحہ	مضمون	شمار	صفحہ	مضمون	شمار
۵	عہد نبوی کے عربی ایرانی تعلقات	۹	۱۹۲۱، ۸۲، ۱۲	شذرات	
۲۵، ۱۹، ۳۱، ۳۶	فارسی کے چند قدیم شعرا	۱۰	۳۲۲، ۲۴۲، ۴۰۲	مقالات	
۲۱۵	قرآن اور علاج خوف	۱۱			
۲۳	قصص احمی	۱۲	۱۸۱، ۱۰۳	ابن جریر طبری	۱
۳۵، ۸	قنوی محبت نامہ سوز و گداز	۱۳	۴۳۳	ابن خلدون کے معاشی خیالات	۲
۴۰، ۵	مشرق تولد کی اور قرآن	۱۴	۳۶۲-۳۹۱	اردو صحافت کا ارتقاء	۳
۳۳، ۸۱، ۲۵، ۵	حضرت مرزا منظر جانجامان	۱۵	۴۴۲	افلاطون	۴
۸۵	وصف شہید یا شاہد	۱۶	۲۴۵، ۱۶۵	امام رازی اور تنقید فلسفہ	۵
۱۱۹	یاد پاستان	۱۷	۳۱	بنو امیہ کے عہد میں نشر کا سرمایہ	۶
	تلخیص تبصرہ		۳۹	بیدل اور تذکرہ خوشگو	۷
۲۱، ۴	ادب و ادبی ذوق	۱	۴۱۷	علوم حدیث پر ہندوستانی عربی تالیفات	۸

صفحہ	مضمون	شمار	صفحہ	مضمون	شمار
۲۲۷	شعلہ نور	۷	۵۶	اندلس کا دماغی ترکہ کتب خانہ	۲
۳۹۴	غزل امجد	۸		اسکوریاں مین	
۳۱۴	غزل حسرت	۹	۳۰۱	راجہ ٹوڈرل کے لڑکے	۳
۱۵۵	فیض عشق	۱۰	۵۳	ردمانیہ کے مسلمان	۴
۶۴	عردان جی کی تماش	۱۱	۲۵۵	فن سیرت نگاری	۵
۳۱۳	مقدم ماہ صیام	۱۲	۱۴۶	کیہ کمر	۶
۶۵	منکد خدا سے	۱۳	۴۵۱	مرنجان مرنج یا بھلا مانس	۷
۲۲۶	مواعظ تجدید	۱۴	۳۸۵	ہالینڈ میں اشتراق	۸
۶۶	یادگار را نگر	۱۵	۲۲۲، ۱۱۵، ۱۶۱، ۳۹۱، ۳۰۹، ۴۶۱	اخبار علمیہ	
	تقریظ و انتقاد			آثار علمیہ	
۴۷۰	آفتاب	۱	۴۶۵	مولین پٹی کے دو غیر مطبوعہ خطوط	۱
۲۲۸	حضرت مجدد کا تصور توحید	۲		ادبیات	
۴۷۴	شیم عشرت	۳	۳۹۵	تحدیر از مجالست جاہلان	۱
۶۸	محمد علی کی خود نوشتہ سوانح عمری کا کچھ حصہ	۴	۱۵۴	جذب مجذوب	۲
			۶۷	جذبات اثر	۳
۱۵۶، ۱۶۶	مطبوعہ عاجلہ		۱۵۵	رباعی	۴
۳۱۵، ۲۳۷			۳۹۴	زمرہ عرفان	۵
۴۷۱، ۳۹۶			۳۱۴	سجدہ گہ افلاک	۶

# جلد ۵ "ماہِ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۱ھ مطابق ماہِ جولائی ۱۹۴۲ء" عدد ۱

## مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۲ - ۴
عہد نبوی کے عربی ایرانی تعلقات	جناب ڈاکٹر محمد تمیذ اللہ صاحب استاد جامعہ نعیمیہ	۵ - ۲۴
قصص الحق،	پروفیسر سید نواب علی حسنین سابق وزیر تعلیم جوہانہ	۲۳ - ۳۰
بنو امیہ کے عہد میں نثر کا سرمایہ،	جناب مسعود حسن مناشی معلم اہم الکلمہ نویز پریسی	۳۱ - ۳۸
بیدل اور تذکرہ خوشگوار،	جناب قاضی عبدالودود صاحب بیر شریٹینہ	۳۹ - ۵۲
روایہ کے مسلمان،	"م"	۵۳ - ۵۶
اندلس کا دماغی ترکہ کتب خانہ اسکوریال میں،	"ع"	۵۷ - ۶۰
اجار علیہ،	"ز"	۶۱ - ۶۳
مردان حق کی تلاش،	جناب یحییٰ اعظمی،	۶۴ - ۶۵
منکر ہذا سے،	جناب حسرت رزوی۔ بی۔ اے ایل ایل بی،	۶۵ - ۶۶
یادگار انگور،	جناب اگلہ مراد آبادی،	۶۶ - ۶۷
جذبات اثر،	جناب اثر رحمانی رامپوری،	۶۷ -
محمد علی کی خود نوشتہ سوانح عمری کا کچھ حصہ،	"ص ع"	۶۸ - ۷۵
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۷۶ - ۸۰



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## مشیت خاصہ

### مولانا محمد حسن صاحب محدث ٹونکی کی وفات

مولانا محمد حسن خاں صاحب محدث ٹونکی جو تقریباً اسی پندرہ برس تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ الحدیث رہ کر دو سال ہوئے کہ ریاست کی خواہش پر اپنی وطن چلے گئے تھے، افسوس ہو کہ چند روز ہوئے کہ اپنی وطن ہی میں وفات پائی، محدث مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب مصنف مجمل المصنفین اس وقت کے علماء میں ایسے دو نامور فرو تھے کہ جن کے وجود پر علم و فضل اور ورع و تقویٰ کو ناز تھا، انھیں اللہ کہ ابھی مولانا محمود حسن خاں صاحب ہم میں موجود ہیں، مگر افسوس ہو کہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد حسن خاں صاحب نے اس عالم فانی کو الوداع کہا، ایسے زمانہ میں جب نام کے مولویوں کی تعداد کو کثرت حاصل کر رہی ہو، مگر کام کے علماء روز بروز کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں، مرحوم کی وفات مشرقی علم و فضل کی کائنات میں حادثہ عظیم سمجھی جائے گی،

— — — — —

مرحوم بڑے جامع العلوم تھے، علوم عقلیہ و نقلیہ و ریاضیہ کے وہ یکساں ماہر تھے، زیادہ تر اپنے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب پڑھا تھا، حدیث کی سند شیخ حسین صاحب عرب یعنی خیر رجبی سے حاصل کی تھی، استفادہ باطنی میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا، انھوں نے مکہ معظمہ جا کر حضرت حاجی شاہ امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا تھا، اور ماشاء اللہ زہد و عبادت بے تکلفی اور تواضع میں بزرگوں کا نمونہ تھے، علوم عقلیہ و ریاضیہ میں بھی ان کا درجہ بلند تھا، اور علوم نقلیہ میں وہ ماہر کامل تھے، علم حدیث کو بطور حنفیہ بہت خوبی سے پڑھاتے تھے، رجال پر ان کی نظر وسیع تھی، ان کے درس کا طریقہ یہ تھا کہ حدیث پڑھاتے وقت احادیث کی ساری کتابیں



اور اسامہ الرجال اور اصول کی کوئی مستند کتاب ارد گرد رکھ لیتے تھے، ہر نزاعی مسئلہ پر وہ دلائل تحقیق دیتے وقت اپنے شاگردوں کو ہر حوالہ کی حدیث کو بخال کر دکھاتے، اور رجال پر بحث کرتے وقت راوی کی حالتِ بانی بیان کر کے مذمتی کیلئے اُلوکتا ب کھوکھڑاں اوی پر حرج و توہین کے قول بھی دکھا دیتے، اور اصول سے اپنے مدعا کو ثابت کرتے تھے، ان سے اکثر مسائل میں گفتگو آتی رہتی تھی، مگر وہ ہمیشہ حاضر العلم نظر آئے، اور جب کبھی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، اصاف اقرار کر لیتے تھے، اور دوسرے وقت وہ اس کو دوبارہ سمجھ کر بحث میں لاتے تھے، اس علم و فضل پر سید منکسر عجید خاکسار، سید متواضع، اتباع سنت اور پابندی شریعت میں ممتاز تھے، ان کی نماز خضوع و خشوع اور سکون و طہانیت کی تصویر ہوتی تھی، دارالعلوم کی مدرسہ کے زمانہ میں لکھنؤ کے اکثر علم ان کے معترف و مداح تھے، اور مسائل میں ان کا فیصلہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ اس مجموعہ خوبی کو اپنے فضل و کرم سے نوازے، اور مراتب اعلیٰ عنایت فرمائے،

ہندوستانی لیکا ڈی الہ آباد جو کئی سال سے حکومت کی تحقیقاتی قید و بند میں گرفتار تھی، اخبارات سے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ وہ اب گورنر صاحب صوبہ کے حکم سے آزاد کر دی گئی ہے، ہذا کلسنسی نے تحقیقاتی کمیٹی کی ایک دو باتوں سے اتفاق اور اس کے اکثر فیصلوں سے بجا اختلاف کیا ہے، ہذا کلسنسی کی یہ نفاذی اس وقت جب دنیا خون میں نہا رہی ہو، اور دوبارہ اس کی امداد کا اجراء جب ہر حکومت جو کچھ اس کے خزانہ میں ہونگ کی قربانگاہ پر چڑھا رہی ہو، سید تعریف کے قابل ہے،

اگر یہ بات جو ہمارے بہت سی جموں و پٹنوں پر گراں گذریگی صفائی اور ایمانداری کے ساتھ کمدی جائے تو بجا نہ ہوگا، کہ ہمارے بہت سی جموں جو ہندی کو موہ کی زبان بنانے کے لئے سالہا سال سے سیرکار ہیں، ہر اس کوشش کو جس سے اردو کی بقا اور قیام کو کوئی مدد ملے، حد درجہ ناپسند کرتے ہیں! اور اس لئے ہندوستانی یکجا دی لا آباد انکی نظروں میں اس کو شکست دے گی کہ یہ ہندی کی تہذیب کے برابر ہی برابر دو کو کیوں جگہ دیتی، اور اسکی بقا و قیام میں کیوں کوشش کرتی ہے، کانگریس گورنمنٹ کے عہد میں وزیر تعلیم اور اسپیکر جس طرح کھلم کھلا اور بالا اعلان ہندی کی اشاعت

اور امداد کا کام انجام دیتے رہے، وہ کچھ چھپی بات نہیں، ان ہی کے اشارہ سے ہندوستانی ایجا ڈیٹی پر اس نام سے تحقیقات کا پہرہ بٹھایا گیا کہ اس کے ذریعہ سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے بجائے، ایک ہندوستانی زبان کا کام کس طرح کیا جاسکتا ہے، حالانکہ اس کے بنانے کی غرض یہ کہی نہ تھی، بلکہ فریقہ نہ جھگڑوں سوا لگ رہ کر دونوں زبانوں کی برابر کی خدمت تھی،

یہ سب کو معلوم ہے کہ خاکسار نے محافضوں کے باوجود ہندوستانی نام اور ہندوستانی زبان کی پرزور حمایت کی تھی، اس سے مقصود یہ تھا کہ دونوں قوموں کے درمیان بول چال کی زبان ایک ہو، اور جسکی صورت یہ تھی کہ ہمارے اردو اور ہندی کے اہل قلم چند اصول پر مل کر ایک ہوتے، اور دونوں کو شش کرتے کہ اپنی زبان کو آسان سے آسان کریں، اور لفظوں کے پرتال کا طریقہ یہ ہوتا کہ وہ لفظ قبول کئے جاتے جو وطن میں ہیں، اس کے لئے نہ قاموس کے ورق کھولے جاتے اور نہ شد ساگر سے دیکھ دیکھ کر بولے اور لکھے جاتے، مگر انفس کہ یہ میری تحریک عام طور سے کامیاب نہ ہو سکی، اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ہمارے سیاسی ہندی کے حامی یہ کرچکے ہیں کہ وہ ہندی کو یعنی سنسکرتی ہندی کو اس صوبہ کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنا کر چھوڑیں گے، اس خیال کے حامی اگر صوبہ کی تعلیمی وزارت، مجلس قانون ساز کی صدارت اور ہماری سب سے پرانی تعلیم گاہ (یونیورسٹی) کی وائس چانسلری کی کرسیوں پر ہوں تو نتیجہ کے متعلق فیصلہ مشکل نہیں،

ہندی کے بعض حامیوں کی طرف سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اردو مسلمان بادشاہوں کے دربار میں پیدا ہوئی اور صرف لوگوں کی زبان رہی جو درباروں سے تعلق رکھتے تھے، باقی سارا ملک کی زبان ہمیشہ ہندی ہی رہی ہے، انفس کہ یہ نظریہ بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلری طرف سے پیش کیا گیا ہے، اس کو نذرہ ہو گا کہ علمی اور تاریخی مسلوں میں بھی ذہنی تنگ نظری کہ کس طرح بد نظریہ پر مبنی ہے، اردو کی ہزار سال کی تاریخ اب بالکل سناٹا لگی ہے اس کو دیکھ کر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ زبان عوام کے جذبہ پڑوں، بیوپاریوں کی دکانوں، لشکریوں کے خیموں اور فقیروں کی خانقاہوں کو نکل کر بادشاہوں کے درباروں تک پہنچی ہے یہ درباری بازار بازار سے دربار تک نہیں پہنچی ہے، اور یہی واقعہ اردو کی ملکی ضرورت کے راز کو فاش کرتا ہے،

# مقالہ

## عہدِ نبوی کے عربی ایرانی تعلقات

از

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاد جامعہ عثمانیہ

قبل اسلام جزیرہ نما سے عرب زیادہ تر صحرا ہے، اس لئے وہاں کی آبادی اپنی غذا تک کے لئے قدیم سے بیرونی درآمد کی محتاج رہی ہو، تعددِ اذواج سے آبادی میں تیز اضافہ اور ذرائعِ معیشت میں خانہ جنگیوں وغیرہ کے باعث روز افزوں انحطاط عربوں کو اکثر ترکِ وطن پر مجبور کر رہا ہے۔ ایک طرف وہ خطرناک بحری راستہ سے مشرقی افریقہ جاتے رہے، تو دوسری طرف شمال مشرق میں عراق کی طرف اور شمال مغرب میں فلسطین کی طرف بھی جنگی کے راستہ سے ہمیشہ ان کا رخ رہا، بعد میں ملاچی عمارت بڑھنے پر وہ ہند اور چین تک تجارت کے لئے آنے جانے لگے،

جہاں تک ایران کا تعلق ہے، اس کو سب سے پہلے معلوم ہوتا ہے، کہ قبیلہ طے ہی سے سابقہ پڑا،

چنانچہ اب یہ مسلمات سے سمجھا جاتا ہے، کہ فارسی لفظ تازی، اور اسی کا بگڑا ہوا چینی لفظ

اسکی قدامت اور وسعت کے لئے دیکھے میرا مقام لڑ عربوں کے تعلقات بیزنطینیوں سے جو مجاہدہ تحقیقاتِ علمیہ جامعہ

عثمانیہ سانئہ سوم، مختصر یہ کہ سنٹ پاول کے زمانہ میں دمشق میں ایک عرب بادشاہ حارث حکمران تھا، تو

عرب جیسے شمالی علاقوں تک میں عرب کی راجدھانیان قائم ہو چکی تھیں،

تاشی<sup>۱</sup> جس سے عرب مراد ہوتے ہیں، اسی لفظ طی کی بگڑی ہوئی صورت ہے،

ان تارکان وطن کی تعداد ایرانی صوبہ عراق میں اتنی زیادہ ہو گئی تھی، کہ انھوں نے عہد نبوی سے صدیوں قبل حیرہ (کوفہ) میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی تھی، اور نخی قبیلہ کے ان عرب حکمرانوں پر ماحول کا کچھ اتنا اثر پڑا کہ شام کی طرف جانے والے غسانیوں کے برخلاف انھوں نے خانہ بدوشی تک ترک کر دی، اور بستیوں میں بس کر عربی تہذیب کی عظیم نشان خدمت انجام دینے لگے،

ایرانی شنشاجون نے مختلف مصلحتوں سے انھیں ہاتھ لیا، چنانچہ ایک طرف تو یہ عرب ایران (عراق) کے مابین حد فاصل اور حجاز مملکت (Arabia - الحجاز) بنے، اور خانہ بدوش بدویوں کی عراق میں لوٹ مار کی ہمیں خودیہ لوگ جھیلنے لگے، اور ایرانی امن میں ہو گئے، تو دوسری طرف ایرانی جو روز افزون آرام طلب ہوتے جا رہے تھے، مفت کے عرب رضا کاروں سے اپنی فوج میں کثیر تعداد میں کام لینے لگے، اس سے عربوں میں جنگجوئی اور فوج آرائی کی روح نہ صرف تازہ ہوئی بلکہ مصقل پاتی اور فطرت میں رہتی گئی، تو ساتھ ہی ایرانی روز بروز جنگ سے ڈرنے لگے، اور ہزول ہوتے گئے، ایرانی نیز نطنی جنگوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان عربی فوجوں نے جو قیصلہ کن اور عظیم نشانہ تھے لیا، اور ایرانی حکومت کے لئے صرف اپنے بل بوتے پر جو وسیع فتوحات حاصل کیں، ان سے ہر کوئی واقف ہے، ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں، یہ امر البتہ نمایاں کئے جانے کے قابل ہے، کہ نیز نطنی قیصلہ نے ضخیموں اور پھر غسانیوں سے جنگی حلیے کر لی، اور ایرانی کسراؤن کے لئے بھی ناگزیر تھا کہ اسی کے حامل طاقتور عربوں کو اپنا حلیف بنا لے رکھیں،

عرب کے جانوروں تک کی وفاداری ضرب المثل ہے، پھر حیرہ کے حکمرانوں پر کسرایان ایران کا اعتماد کیون نہ بے پایاں ہوتا، کسی اور ملک میں یہ نظیر نہ ملے گی، جیسی بیان ملتی ہے، کہ کسراے ایران

۱۔ برٹش شائر کا انگریزی رسالہ عربوں کے متعلق چینون کے معلومات "رست" (۱۸) تبنیہ مسعودی ۱۸

اپنے ولی عہد کو اپنے جو نیز حلیف بلکہ ماتحت حکمران حیرہ کے ہاں بھیج دے، تاکہ وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہو۔ بعد میں بدوی روایات کے حامل اس شہزادے نے حکمران بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ حیرہ کا عربی ماحول مدائن کے ایرانی ماحول سے کہیں زیادہ مفید و کردار ساز تھا،

حیرہ والوں کی خدمات خود عرب کے لئے کچھ کم اہم نہ تھیں، عربی شعراء اور تاجر ہمیشہ ان کے دربار میں بھرے رہتے تھے، اور غیر محسوس طور سے تاثر و تاثیر کرتے چلے جاتے تھے، اور غالباً صحرائی نشیون سوا اس مسلسل تعلق ہی نے باوجود عیش و ترنہ کے نجی حکمرانوں میں بہت سی اچھی بدوی صفیئتیں مثلاً بات کا پاس اور ان کے لئے جان تک کی پروا نہ کرنا، بہت کچھ برقرار رکھیں،

عربی رضا کاروں کی وفاداری اور اطاعت شہزادی نے رفتہ رفتہ دربار مدائن کو یہ بھلا دیا کہ حیرہ کمزور اور جو نیز حلیف سہی، لیکن ماتحت اور غلام نہ تھا، محوسی و مزدو کی روایات نے عصمت و ناموس کا تصور ہی ایرانی دربار سے مٹا دیا تھا، اسی لئے انھوں نے اس میں کوئی برائی ہی نہیں سمجھی کہ انہی اصول کا اطلاق عرب حکمران کی بومیٹیوں پر کیا جائے، اس کے نتیجے سے سب واقف ہیں کہ حکمران حیرہ کو مدائن طلب کیا گیا، اور اس وفاتشار نے جانتے بوجھتے اسکی تعمیل کی، تو تحفظ عصمت کے جرم میں اس کا سر قلم کیا گیا، اور نشہ غرور میں چور شہنشاہ نے جانبر مملکت کو بھی فنا کر دینے کا حکم دیا، چنانچہ حیرہ میں ایرانی افسر آدھلکے اور گوبرائے نام لایس بن قبیصہ نامی ایک عرب کو بھی وہاں کے عربوں کے سردار بنایا گیا، لیکن سلطنت حیرہ کا ایران سے اسحاق کر کے ایک مملولی صوبہ بنادیا گیا، یہ قصہ حسین ختم نہ ہوا، بلکہ حکمران حیرہ نے اپنے پاس کا بعض امانتی مال اصل مالکوں کو پہنچانے کے لئے بعض بڑی قابل کے سرداروں کے سپرد کیا، تو شہنشاہی احکام اسکی فوری واپسی کے لئے پہنچے، اور انکار پر سردار ہی اٹھ

ملے نہ دکنے بلکہ ایران کے متعلق بھرے دربار میں شہنشاہ سے جس بے باکانہ بے جہتی کا اظہار کیا تھا، اس سے

عربی خان بے خبر نہ ہوئے،

عربوں کی بالکلیہ تباہی کے لئے ایک عظیم الشان ایرانی لشکر روانہ کیا گیا، مگر اب کی دفعہ قدرت نے ایران کو ایک تنبیہ کرنی چاہی، اور ذی قار کی جھیل پر ان کی فوج کو جان پر کھیلے ہوئے بدوؤں نے کاٹ کر رکھ دیا، مگر دربار ایران نے بجائے سبق لینے اور اپنی اصلاح کرنے کے، عربوں پر مزید ستم آرائی شروع کر دی، اور انھیں روز افزوں اپنا دشمن بنانا شروع کیا، (اب جناب رسالت مآب صلعم کا مدنی زندگی شروع ہو چکا تھا) اور خلافت صدیقی کے آغاز پر اسی ایرانی سرحد کے ستم رسیدہ دشمنی شیبانی کا ایران پر حملہ کے لئے اپنے رضا کارانہ خدمات کا پیش کرنا زیادہ تر ایران کی اسی عرب کش سیاست کا ردِ عمل تھا اس واقعہ سے چند ہی سال قبل مینیون کی دعوت اور تعاون سے ایرانیوں نے حبشیوں کو نکال کر مین پر قبضہ کر لیا تھا، اور دہر زکی فوجی گورنری کے بعد لائق باذان وہان گورنر بنا، لیکن پائے تخت ایران میں کچھ ایسی تیزی سے شاہ گردی ہو رہی تھی، کہ کبھی بھرا ایرانی فوج کے لئے کسی مزید لگ کی غیروہی مین پر قبضہ رکھنا بڑا دشوار ہو گیا تھا،

حیرہ اور مین کے علاوہ مشرقی اور جنوب مشرقی عرب کے ساحلی علاقوں یعنی عمان اور الحسار میں بھی وجہ اس زمانہ میں بحرین کہا جاتا تھا) ایرانی اثرات شکم ہو گئے تھے، عمان میں جندی بن ابی الحسار کا خاندان کسراے ایران کی طرف سے حکمران نامزد ہوا تھا، جس کے کچھ حالات محمد بن حبیب المتوفی (۲۴۵ھ) نے اپنی مشہور کتاب البحر وخطوطہ دائرۃ المعارف حیدرآباد میں لکھے ہیں، اور بعد میں اسی جندی کے بیٹوں جزیف اور عبد بن جناب رسالت مآب صلعم نے مخاطب فرمایا تھا، عمان وسیع ملک وہان کے ایک اور عرب سردار ہوزہ بن علی کو کسری نے ایک جواہر نگار ٹوپی عطا کی تھی، اسی لئے اس کا لقب ذوالتاج یا صاحب التاج مشہور ہو گیا تھا، دیکھئے اشتقاق ابن دُرید ص ۲۰۹ عقد الفریہ ابن عبد ربہ جلد ۲، ص ۱۱۱) الحسار میں کسی عرب ریاست کا بظاہر پتہ نہیں چلتا، اور وہان کے صد مقام بحرین ایرانی فوجی گورنر (مرزبان) رہا کرتا تھا، بعض غیر موروثی عرب افسر بھی تھے،

عرب مؤنفون کے ہاں اس قسم کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں، فلان عربی شیخ نے فلان بانٹا (کسری، قیصر خاشی وغیرہ) کے ہاں باریابی حاصل کی، ابی عبد ربہ نے اس کا ایک مستقل باب (انوفاد) ہی قائم کیا ہے، ایسے ہی ایک شخص سے خوشنودی کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شیخ کی خواہش پر کسری نے ایک مندر (انجینیر) بھیجا، جس نے وادی دج میں ایک فیصل دار قلعہ تعمیر کیا، جسے طائف کہنے لگے (کتاب الاغانی جلد ۱۲ صفحہ ۴۹) اس کے استحکام کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے، کہ فتح مکہ جنین کے بعد طائف کو اسلامی فوجوں نے آگھیرا تھا، اور بادیو و خنق اور دبا بون کے استعمال کے محاصرہ ختم ہوتا نہ نظر آیا، اور خباب رسالت مآب صلعم نے فرید جانی نقصان نامناسب سمجھ کر محاصرہ اٹھالیا تھا، ابتداء اسلام | ایران آتش پرست تھا اتمانہ فی جنسی اباحت کی بھی تو حقیقی بہنوں اور صبی بیٹیوں تک کو وہاں ازدواجی اغراض کے لئے محرمات میں نہیں شامل کیا جاتا تھا، غالباً اسی قسم کے معاملات ہون گئے جس نے مشرک عیسائیوں کو خباب رسالت مآب صلعم کی نظر میں مجوسوں پر قابل ترجیح بنا دیا تھا، قرآن مجید کی سورہ روم بھی انہی جذبات کی ترجمان ہے

(ابن ہشام صفحہ ۲۷۷) وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ابتداء اسلام میں جب آنحضرت صلعم مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت اور اسلام کی برد کی ترغیب دیتے، تو علاوہ اخروی روحانی ثواب کے دعوے کے پیشینگوئی بھی فرماتے کہ کسری و قیصر کی دولت تمھارے قدموں پر پنچا ور ہوگی، جنگ خندق میں سنگ مرمر کی چٹان کو توڑتے وقت چٹکاریاں اڑنے پر اسی پیشینگوئی کا اعادہ فرمایا گیا تھا، (دیکھو طبری وغیرہ)

میں نے ایک مستقل مضمون میں اس تفصیل پر بحث کی ہے کہ ۶۷ھ کی صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے فتح مبین اور نصر عزیز کیوں کہا ہے، اور کس نے اسے اسلام اور مسلمانوں کی سیاسی کامیابیوں





کاشہ کار سمجھا جاتا ہو، (شہور عام خیال تبلیغ کی سہولت کچھ دل کو نہیں لگتا) یہاں اس کا دوسرا ناغیر ضروری بہ حال اس صلح سے جہاں مسلمانوں کے ہاتھ کھل گئے، اور وہ خیبر کے نو پذیر خطرے کا دو ہی تین مابین صلح کرنے کے قابل ہو گئے، وہیں انھیں ینو امین ایرانیوں کی بنی نطینیون (رومیون) کے ہاتھوں عہد آفرین شہادت کے سلسلہ میں بین الممالک صورت حال سے فائدہ اڑٹھانے کا موقع مل گیا، (ینو امین کی لڑائی شہان سلسلہ میں ہوئی تھی، اس کے بعد ہی صلح حدیبیہ ہوئی)

بلادی (فتوح ص ۷۷) اور ابن الاثیر (کامل ۵/۱۶۱) نے بیان کیا ہے کہ ایرانی مقبوضہ بحرین کے ایک عربی النسل افسر منذر بن ساد کی کج ناسالت با علم نے سب پہلا خط سلسلہ ہی میں وہ نہ کیا تھا، غالباً کسرے ایران کا خط بھی اسی نامہ بر کے ذریعہ پہنچا گیا ہوگا، جس نے بحرین کے حاکم سے خواہش کی، کہ اسے کسری کے پاس مدائن بھیج دے،

یہاں اسکی غالباً ضرورت نہیں کہ ساد وہ بحرین عمان یمن وغیرہ عرب کے جملہ ایرانی مقبوضات سے عہد نبوی میں جو اسلامی تعلقات رہے ان کی پوری تفصیل اور ان کا ارتقا بتایا جائے، ورنہ ان علاقوں کے ایرانی افسروں یا عرب شیوخ کے نام لکھے ہوئے کئی درجن نامہ ہاے نبوی تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں، ایک منذر ہی کے نام کے نو خط ملتے ہیں، جن میں بحرین کی سیاسیات کی پڑتی تاریخ محفوظ ہے، ان کے متن کے لئے میری حیرت انگیز الو سائق الیسٹیا سیتیہ دیکھی جاسکتی ہے، (جس کی طباعت کے بعد اوائل ۱۳۶۱ء میں کتب خانہ خدابخش مرحوم پٹنہ میں قبیلہ عبدالقیس سے کیا ہوا ایک اور معاہدہ کتاب و سبیلہ للتعبد جن میں دستیاب ہوا ہے) یہاں صرف شہنشاہ ایران سے خط و کتابت پر کچھ بحث کی جائیگی، جس میں متعدد گتھیاں سلجھانی ہیں،

تمام اسلامی مؤرخوں محمد ثون اور دیگر مؤلفوں نے متفقہ طور سے بیان کیا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی جناب رسالت مآب ﷺ نے جب ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کے نام اسلام کے تبلیغی

خطوط صحیح، تو ان میں سے ایک کسر اسے ایران کے نام بھی تھا، اس کا تین جس میں کچھ فعلی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں، یہ ہے،

(۱) بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۲) مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللّٰهِ اَلِیْ کَسْرِیْ عَظِیْمٍ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ کِی طَرَفِ سَمَرِ دَارِ اِیْرَانِ

فارس، کسری کے نام،

(۳) سَلَامٌ عَلٰی مَنْ اَتٰیهِ الْهُدٰی وَآمَنَ هِدَايَتِ پَرِیْنِے اور خدا و رسول پر ایمان لانے والے

باللہ ورسولہ، کے لئے سلامتی ہو،

(۴) وَادْعُوْهُ بِدُعَايَةِ اللّٰهِ فَاِنِّ اَنَا دُاعِيَةُ اللّٰهِ اِنِّی الْاِنْسَانُ کَا فِتَّةِ

خدا نے تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے،

(۵) لَا تَذَرْنِيْ كَاَنْ حَيًّا دِيْحَتِي الْقَوْلِ تَاكُمِیْنِ ہر زندہ شخص کو ڈراؤن کا فروں

علی الکافریں، کے متعلق خدا کی بات پوری ہو کر رہے گی،

(۶) فَاَسْبِغْ تَسْلُوْا اِسْلَامَ لَا سَلَامَتِ رَہے گا،

(۷) فَاِنْ اَبَيْتَ فَاَنْ اَشْهَرِ الْمَجْوِسِ اگرو تو انکار کرے تو تمام مجوسیوں کا

علیائے، وبال تجبی پر پڑے گا،

یہ تین تاریخ طبری ص ۱۵۷، ص ۱۵۷، ۱۵۷ (دور و ایتین) صبح الاغشی قلعندی جلد نمبر ۲ ص ۲۹۶

کتاب النصائین لابی ہلال العسکری، نیز جلد نمبر ۲ ص ۳۷۷ اعلام السالین عن کتب سید المرسلین لابی

طولون، مکتوب نمبر ۱۳، المواہب اللدنیہ للقسطلانی جلد نمبر ۱ ص ۲۹۱، تاریخ السیاحی جلد نمبر ۲ ص ۸۳

نصب الراية لاحادیث الهدایة للزیلعی، مکتوب نمبر ۷، مفید العلوم ومبید العموم للقرطوبی مکتوب نمبر ۲

دلائل البتوة لابی نعیم جلد نمبر ۲ ص ۱۲۳، المنتقی لابی نعیم ورق نمبر ۳۵ رب (مخطوط حیدرآباد دکن)

نفیر دون بک جلد ۱ ص ۱۳۱ وسیلۃ المتعبدین لعمروصلی جلد ۸ ورق نمبر ۲۷ ب (مخطوط بانک پور) میں مکمل ملتا ہے، اور طبقات ابن سعد، اموال ابی عبید، صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند ابن جنبل وغیرہ میں جستہ جستہ ملتا ہے، اس پر کائناتی نے اپنی اطالوی تاریخ اسلام میں اور اسپرنگر نے اپنی جرمن کتاب سوانح و تعلیمات محمدی میں بحث کی ہے ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد میں میرا بھی ایک انگریزی مضمون اس خطا کے متعلق ملیگا،

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ متن مختلف تاریخوں نے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے اہم ترین بعض روایتوں میں بسم اللہ الرحمن الرحیم حذف ہو گیا ہے، اسکی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ حذف عبارت کا عام رواج رہا ہے،

قلقشندی نے ابوبلال عسکری سے جو متن نقل کیا ہے، صرف اسی ایک روایت میں کسری آؤینہ عظیم فارسی کے الفاظ ہیں، اور باقی کسی نے بھی پرویز کا نام نہیں لیا ہے، میرا خیال ہے کہ پرویز کا نام بعد کا قیاسی اضافہ ہے، واللہ اعلم،

فتن بن جریر کی ایک روایت میں وشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریک له وان محمد اعبد لا ورسوله کے الفاظ زائد ہیں، جو اصل فقرے کی صرف شرح معلوم ہوتی ہے، فتن بن دعار اللہ اور دعیۃ اللہ کی روایتیں عام ہیں، رسالات نبویہ مؤلفہ عبد المنعم خان ٹونکی نے دعار الاسلام کہیں سونقل کیا ہے، مطلب سب کا ایک ہی ہے،

فتن بن قرآنی آیت کے محاذ سے بعض روایتوں میں "لینذر" بھی مروی ہے، جو عربی کے محاذ ذرا تکلف سوتھیک ہوگا،

فتن بن فان کی جگہ "ان" اور اسی طرح "آیت" کی جگہ "ولیت نیز آثم الجوس علیک کی جگہ علیک آثم الجوس وغیرہ فرق بھی ملتے ہیں، جو روایت بالمعنی کا نتیجہ ہیں، ان سے مطلب پر کوئی

اثر نہیں پڑتا،

غرض یہ خط عبداللہ بن حذافہ السہمی بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے تھے، یہ ٹھیک طور سے  
 نہیں معلوم ہوتا کہ آیا عبداللہ بن حذافہ ہی مدائن گئے تھے، یا حاکم بحرین نے اپنے کسی آدمی کے ہاتھ  
 اسے پاس تخت روانہ کیا تھا، بہر حال تمام اسلامی مولف بیان کرتے ہیں کہ کسری (خسر و پرویز)  
 نے طرزِ تاجِ طب دیکھتے ہی پورا خط پڑھے بغیر چاک کر دیا، اور نامہ بر کو سامنے سے بھکوا دیا، اس کے  
 علاوہ یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے، کہ کسری نے تین کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ دو آدمی مدینہ روانہ  
 کرے اور بنی عربی کو برضا مندی ورنہ گرفتار کر کے مدائن روانہ کرے، جب یہ لوگ مدینہ آئے  
 تو جناب رسالت مآب صلعم نے ان سے کہا کہ آج رات میرے رتبے تمہارے رب کو قتل کر دیا، اس نے  
 وہیں چلے آئے، اور جلدی ہی مدائن سے کسری شیریہ نے سرکاری اطلاع بھیجی کہ اس نے مصیحتِ عالمہ  
 کے تحت اپنے باپ کو قتل کر دیا، اور خود تخت نشین ہو گیا ہے، اور کہتے ہیں کہ شیریہ کی پدرکشی  
 کی تاریخ وہی تھی، جو حضرت رسول کریم صلعم نے فرمائی تھی، اور اس معجزہ کو دیکھ کر باذان افسوس  
 بہت سے یعنی مسلمان ہو گئے،

یہ واقعہ سیرۃ ابن ہشام (ص ۱۲۷) پر مذکور ہے اور بہ ظاہر ابن اسحاق کا بیان نہیں ہوا  
 بلکہ ابن ہشام نے زہری کی روایت خود اضافہ کی ہے، سیرۃ ابن ہشام ص ۱۰۹ میں جہان باذان ہونے کے  
 نام خطوط کا ذکر ہے، وہاں کسری کو سلسلہ میں یہ قصہ بیان نہیں ہوا ہے، تاریخ طبری (۱۵۷ تا ۱۶۰)  
 میں جہان اس سفارت کا ذکر ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل ہوا ہے، وہیں زہری کی روایت صرف  
 اتنی بیان ہوئی ہے کہ کسری کے نام مبارک کو پارہ پارہ کر ڈالنے کی اطلاع ملی، تو آنحضرت صلعم  
 نے فرمایا کہ خدا اسکے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے، اور طبری نے شیریہ کی پدرکشی کا قصہ زہری  
 کے اس قطع کلام کے بعد خود مدین حسب کی روایت کی بنا پر نقل کیا ہے، اور وہاں زہری کا اس

سے تعلق نہیں ہے،

اس اختلاف کو ہم کوئی خاص اہمیت عام حالتوں میں نہیں دیتے، لیکن طبری نے جانا  
یہ قصہ سلسلہ کے حالات میں حدیبیہ کے بعد بیان کیا ہے، وہیں ایرانِ قدیم کے حالات ہیں، (نہ)۔  
یہ جملہ بھی عکرمہ کے حوالہ سے ایک غیر مربوط قصہ کے آخر میں لکھا ہے۔

فَاهْلَتِ اللّٰهَ كَسْرَى وَجَاءَ الْخَبْرُ      چنانچہ خدا نے کسری کو ہلاک کر دیا، ۱۱

اِلٰی سَهْوَلٍ اللّٰهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ      اس کی اطلاع جنابِ رسالتؐ کا کوئی قصہ

یُوْهُ الْخَلْدِ یَدْبِیْتُهُ فَضَحَ وَ      کے دن پہنچی جس سو آپ کو ادراپ کے ساتھیوں

مِنْ مَعْلَمٍ،      کو خوشی ہوئی،

جب خسرو پر ویز کے مرنے کی اطلاع حدیبیہ کے دن آپ کی تھی، تو پھر بعد میں پرویز کے نام  
خط لکھا، اور درگشی کی اطلاع بطور معجزہ دینا سب بے بنیاد قصے بن جاتے ہیں، اکثر نویسی کی وجہ سے  
طبری کے ہاں بلا تفسیق متضاد روایات کا آجانا اور روایات میں بھی بے احتیاطی سے قطع و برید  
ہو جانا ایک معروف واقعہ ہے، جس سے ہر وہ شخص واقف ہے جس نے طبری کا غور سے مطالعہ کیا ہو،  
اسی بنا پر ابو نعیم کی دلائل النبوة (جلد نمبر ۲ ص ۱۲۴) کی یہ روایت خاص توجہ کی مستحق ہے کہ:

”رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی دن شکست ہوئی تھی جہن حدیبیہ کی صلح ہوئی اور

اسکی اطلاع پہنچی تو جنابِ رسالتؐ کو بڑی خوشی ہوئی کہ قرآن مجید کے سورہ روم کی کئی سال

قبل کی پیشین گوئی پوری ہو گئی،

نیز وہ کی لڑائی شعبان ۶۲۷ء (دسمبر ۶۲۷ء) میں ہوئی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، عام  
سے اسلامی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حدیبیہ کے لئے مسلمانِ مدینہ سے ذی قعدہ ۶۲۷ء میں پہلے  
لیکن امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (ص ۱۲) میں یہ روایت بیان کی ہے کہ جنابِ رسالتؐ

حدیبیہ کے لئے رمضان میں نکلے، تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۴) میں حدیبیہ کے ذی قعدہ میں پیش آنے کا ذکر کر کے اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ عودہ کے بیان کے مطابق صلح حدیبیہ یاہ شوال میں منعقد ہوئی،

آنحضرت صلم کے ہمعصر زمانہ کی تاریخین نہ تو بیزنطینیوں کے ہاں محفوظ رہیں، نہ ایرانیوں کے ہاں، اور نہ حبشیوں کے ہاں ان حالات میں ایک واحد استثنائاً خاص توجہ کا محتاج ہے، وہ یہ کہ قیصر ہرقل اور کسری پر دیزین جب آخری فیصلہ کن لڑائی شروع ہوئی، تو قیصر میدان جنگ سے وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خط روانہ کرتا رہا، اتفاق سے یہ اب تک محفوظ ہیں، اور انہی میں سے ایک میں قیصر نے اپنے بیٹے کو لکھا ہے کہ خبر آئی ہے کہ خسرو پر دیز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے، ۲۲ فروری سنہ ۶۲۷ء کو قتل کر ڈالا ہے، جو وسط رمضان سنہ ۶ کے مطابق ہے، قرآنی شہادت قیصر کے اس خط کی صحت کی تائید کرتی ہے، شہان میں مینو امین فیصلہ کن شکست کھانے کے بعد وسط رمضان میں اس کا مارا جانا کوئی تعجب کا حامل نہیں، اور بظاہر قیصر کو اس واقعہ کے بیان کرنے میں عمدہ جھوٹ پر آمادہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، اسی وجہ سے واقعہ کا یہ بیان کرنا کہ

”شیرویہ نے اپنی باپ کسری کو منگل کی رات ۱۰ ارجمادی الاولیٰ سنہ ۶ کو قتل کیا، جبکہ

چھ گھڑی رات گزر چکی تھی، (تاریخ طبری ص ۱۵۴)

اپنے اندر مقابلہ کم کشش رکھتا ہے،

۱۔ قیصر ہرقل کی جگہوں کے متعلق بھی بڑی پیچیدگیوں ہیں، اس موضوع پر سبے مستند کتاب جو من زبان میں گیر لاند (Jérôme) کی ہے جس کا نام ”قیصر ہرقل کی ایرانی مین“ (Die persische feldzüge des Kaisers Heraklius) ہے، یہ واقعہ اس کتاب میں یونانی تواریخ یونان کے حوالہ سے نقل ہوا ہے،

غرض اس وقت جو گھٹیاں نظر آتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے :-

واقعه	طبری فی روایہ	ابونعیم	ابویوسف	واقعی	ابن کثیر فی روایہ	برقل کا خط یثربی تاریخ میں	عام مورخین
نیزہ بین ایرانی شکست	.	.	.	.	یوم الحجۃ	.	شعبان ۶۰ھ
کسری پر وزیر کا قتل	یوم الحجۃ	.	.	۱۰ رجبی	.	وسط رمضان	.
بیٹے کے ہاتھ	.	.	.	الاولیٰ ۱۰ھ	.	۶۰ھ	.
اس قتل کی اطلاع کا	.	یوم الحجۃ	.	.	.	.	حدیبیہ کو کئی ماہ بعد تقریباً
جبار سائب کو پہنچا	.	.	.	.	.	انسانی یا جادوی الاونی	.
حدیبیہ کیلئے روانگی	.	.	رمضان ۱۰ھ	.	.	.	ذی قعدہ ۶۰ھ
صلح حدیبیہ	.	.	.	.	شوال ۶۰ھ	.	تقریباً اواخر ذی قعدہ
.	.	.	.	.	.	.	یا اوائل ذی الحجہ ۶۰ھ

ان میں ممکن ہو تو باہم تطابق دینے ورنہ کسی ایک کے بیان کو ترجیح دینا کی ضرورت ہے، لیکن اس

طرح توجہ کرنے سے قبل دو اہم امور بطور تمہید ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے :-

۱۔ واقعی اور ان کے شاگرد ابن سعد نے سیرۃ نبویہ کے واقعات کو کبھی تو ہجری سنہ سے

بیان کیا ہے، اور کبھی ہجرت کے وقت سے، اور سب جانتے ہیں کہ ہجرت ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی

اور سنہ ہجری اس کو کوئی دو ماہ اٹھارہ دن قبل یکم محرم سے شمار کیا جاتا ہے، اسی لئے مثلاً

جنگ بدر کا ذکر کرنا ہو تو ماہ نهم (رمضان) ۲ھ یا ہجرت سے ایک سال چھ ماہ بعد کہنا پڑے گا،

واقعی نے کسی ایک طریقہ شمار کا چونکہ شروع و آخر تک لزوم نہیں رکھا ہے، اس لئے من الهجرة

(ہجرت کے وقت سے) اور للهجرة (ہجری سنہ سے) کہنے میں آسانی خلط ملط ہو سکتا ہے، مزید برآں

اگر رادی کی صرف روایت پہنچی ہو، اور اس سے بالمشافہ جرح اور تعین کا موقع نہ ہو، اور رادی نے بھری سنہ مراد لیا ہو، اور واقعی نے وقت ہجرت سے مدت مراد ہونی بھی ہو، تو نادانستہ ۱۱ ماہ کا بڑی آسانی سے فرق پیدا ہو جاتا ہے، خاص کر اس لئے کہ واقعی نے مینے کا نام لینے کے لئے اکثر مینون کی گنتی دی ہے، کہ ہجرت کے اٹھارہ یا بیس مینون بعد اوغیرہ،

۲۔ جناب رسالت مآب صلیم ذی حجۃ سنہ ۱۱ میں سال کبسیہ کو عربی مینون کے لئے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا، اور ضبط حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت (انما النسئ ذیۃ فی الکفر الا یہ) کو دہرانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا،

وَاِنَّ الزَّهْمَانَ قَدْ اسْتَدْلَكَ وَهَيْئَةً      زَمَانٌ جَرَّ كَحِجْرٍ بَعْدَ بَيْتٍ شَمْلٍ اَنْتِيَارٍ كَرَّجَا بَرٍّ  
يَوْمَ خَلَقَ اللهُ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضَ      جِيسَا خَلَقْتَ آسْمَانِ دَرِزِينَ كَعَدَّتْ تَحَا،

(سیرۃ ابن ہشام ص ۶۸ تا تاریخ طبری ص ۱۵۵، وغیرہ)

اور متفقہ طور سے اسکی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت سنہ ۱۱ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبسیہ دونوں محاذ سے ذی حجۃ باہم جمع ہو گئے تھے، قمری اور کبسیہ مینون کے متعلق عربی مورخوں نے جو بیانات چھوڑے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ہر تیسرے سال قبیلہ بنی نقیم کا سردار جس کا لقب قلس ہوا کرتا تھا، حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص رسم کی انجام دہی کے ذریعہ سے اعلان کرتا تھا، کہ اب جو ذی حجہ چل رہا ہے، اس کے بعد نیا چاند نظر آئے، تو وہ محرم حرام کا نہ ہوگا، (بلکہ ایک گناہم اور غیر محترم مہینہ ہوگا) اور اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرام کا ہوگا، (جدید علم ہیئت بھی یہی کہتا ہے کہ قمری سال میں شمسی سال سے دس دن کم ہوتے ہیں، اور ہر تیسرے سال ایک مہینہ کا فرق پڑ جاتا ہے) اس بیان کے بموجب اگر سنہ ۱۱ میں دونوں قسم کے مینے یکجا ہو گئے تھے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ



۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
ہجری مدنی	کی کبیہ	ہجری مدنی	کی کبیہ	ہجری مدنی	کی کبیہ	ہجری مدنی	کی کبیہ	ہجری مدنی	کی کبیہ
محرم	ربیع ۱	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر
صفر	ربیع ۲	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱
ربیع ۱	جمادی ۱	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲
ربیع ۲	جمادی ۲	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱
جمادی ۱	رجب	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲
جمادی ۲	شعبان	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب
رجب	رمضان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان
شعبان	شوال	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	شوال
رمضان	ذی قعدہ	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	ذی قعدہ
شوال	ذی الحجہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ
ذی قعدہ	×	ذی قعدہ	ذی الحجہ	ذی قعدہ	ذی الحجہ	ذی قعدہ	ذی الحجہ	ذی قعدہ	×
ذی الحجہ	محرم	ذی الحجہ	محرم	ذی الحجہ	محرم	ذی الحجہ	محرم	ذی الحجہ	×

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ذی قعدہ ۱۰۰۰ کی من جب صلح حدیبیہ ہوئی، تو رمضان

۱۰۰۰ ہجری چل رہا تھا، اور اس طرح عروہ کا یہ کہنا کہ ہم حدیبیہ شوال میں ختم ہوئی یا امام ابو یوسف کا کہنا کہ حدیبیہ کے لئے مسلمان مدینہ سے رمضان میں نکلے تھے، اور عام مورخین کا اس واقعہ کو ذی قعدہ میں قرار دینا، ان میں باہم کوئی تضاد نہیں، چونکہ اس وقت تک سال کی کبیہ منسوخ نہیں ہوا تھا، اور مکہ پر قریش ہی قابض تھے، اس لئے ان کے حج کا موسم ان کے ذی قعدہ و ثور

ہوا تھا، حالانکہ خالص قمری حساب سے ابھی رمضان ہی کا مہینہ چل رہا تھا،

سنہ ہجری اور وقت ہجرت کے فرق کے تین مہینے اور قمری اور کبیسیہ سالوں کے سٹھ مہینے فرق کے تین مہینے چھ مہینوں کا فرق، یہ بڑی آسانی سے واقف ہی کی اس روایت کی توجیہ کر دیتا ہے کہ پرویز کا قتل ذی قعدہ (مکی) کی جگہ جمادی الاولیٰ میں کیوں بیان کیا گیا، دوسرے الفاظ میں دیکھنے کے لئے ہوگا کہ سنہ ہجرت اکثر دین مہینہ میں اور واقف ہی نے وقت ہجرت (ربیع الاول) سے حنا کیا، اور نہ تو دو کبیسیہ سالوں کا خیال رکھا، اور نہ ہجرت اور سنہ ہجری کے فرق کا لحاظ کیا، اور سنہ ہجرت کے اکثر دین مہینہ یعنی ذی قعدہ سٹھ مہینے کی جگہ جمادی الاولیٰ سٹھ مہینے بیان کر دیا، واقف ہی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ خسرو پرویز کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارے جانے کی تاریخ انھیں کس ماخذ سے معلوم ہوئی، اگر اس تاریخ کے متعلق یونانی مورخ کا بیان (خود قیصر ہرقل کے خط کی بنا پر) صحیح مانا جائے تو یہ واقعہ ۲۴ فردری ۳۳۰ء (مطابق وسط رمضان ۳۳۰ء) وسط ذی قعدہ سٹھ مہینے کی گھنوا ہوگا، اور یہ روایت قطعاً رد کر دینی پڑے گی، کہ کسر کے حکم سے جب یمن سے دو ایرانی افسر مدینہ آئے تو جناب سالت آپ صلم ذان سو فرمایا کہ آج رات میرے رب نے تمھارے رب کو قتل کر دیا۔ اور یہ کہ اس پیشنگوئی یا غیب گوئی کے صحیح ثابت ہونے پر گورنر یمن مع حوالی موالی سلمان ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اپنی عظمت کی برقراری کے لئے ایسے کسی معجزہ کی محتاج نہیں، خاص کر جب کہ اس معجزہ کا حال کچھ بہت زیادہ مستند ذرائع سے بھی معلوم نہیں ہوتا ہے، اور اس کے متعلق خود عرب مؤلف متفق باتیں بیان کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر واقف ہی کی روایت کہ یہ قتل ۱۰ جمادی الاولیٰ کو ہوا، صحیح بھی مانی جائے تو متعدد علمی پیچیدگیوں پیدا ہو جاتی ہیں، اور پرویز کے قتل کی جو تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہو، اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے،

اسی طرح ہی کی روایت کہ کسری کے قتل کی اطلاع حدیبیہ کے دن آئی، اصل میں اس روایت کی بجگہ ہی ہوئی شکل ہی جو ابو نعیم نے بیان کی ہے، کہ نینوا کی شکست کی خبر حدیبیہ کے دن آئی، اور اس میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ یہ حدیبیہ سے مینہ بھر پہلے کا واقعہ تھا، اور اس عرصہ میں ایران کی خبر اس زمانہ میں تک آسکتی تھی،

مجھے اپنے ان افکار کو نہ نتائج پر اصرار نہیں ہے، اور اگر کوئی اہل علم ان کی اصلاح کر سکیں اور گھٹتوں کو کھلیا سکیں تو سیرۃ نبویہ کی ایک اچھی رقم ہو سکے گی، واللہ الہادی الی الصواب و ھو الموفق والذیہ المآب،

تتمہ | جیسا کہ عرض کیا گیا جناب سات مآب صلعم و کسری عظیم الفرس کے نام خط روانہ فرمایا تھا ابوہلہ عسکری کی روایت کہ خط میں کسری ابرو نیز لکھا ہوا تھا، ممکن ہو کہ صحیح ہو، اور باوجود پر ویز کے قتل ہو چکنے کے اس کی اطلاع اس وقت تک مدینہ منورہ نہ آئی ہو، لیکن پر ویز کے قتل کے بعد مدائن میں جو شاہ گروہی شروع ہوئی، اس کے باعث یہ نہیں معلوم کہ وہ نام نہ مبارک دراصل کس نے وصول کیا، بہر حال ایران کی پریشان صورت حال کے باعث جناب سات مآب صلعم نے براہ راست ایرانی مقبوضات عرب کے افسردن سے مخاطبت شروع فرمائی، چونکہ ان ٹھٹی بھرا ایرانیوں کو اب مدائن سے کسی کمک اور مدد کی توقع نہ رہی تھی، جیسا کہ طبری نے تاریخ خفہ میں بیان کیا ہے کہ کم از کم یمن میں ایک وطنیت پسند تحریک زور و شور سے اٹھ چکی تھی، کہ مداخلت کنندہ ایرانی غیر ملیکوں کو نکال باہر کیا جائے اس لئے علاوہ اور اسباب کے کوئی توجہ نہیں کہ اپنی جان و مال کے اس خطرہ کو دیکھ کر ان ایرانیوں نے اسلام قبول کرنے اور حکمران عرب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت حاصل کرنے کی جانب ترغیب پائی ہو، اور ہم دیکھتے ہیں، کہ یمن، عمان، بحرین وغیرہ کے ایرانی مقبوضات دیکھتے دیکھتے

سلا گواہ بنیم کے ظاہری الفاظ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نینوا کی شکست ہی حدیبیہ کے دن ہوئی،

مدائن سے ٹوٹ کر مدینہ سے جڑ گئے تھے، اور آنحضرت صلم کی سیاستِ خارجہ کچھ اتنی کامیاب ہوئی تھی، کہ باقی علاقوں کے لئے مدائن کو فکر ہونے لگی، چنانچہ جذبہ ہی و نون بعد جب قسمت نے بورانِ دخت کو تختِ کیانی پر پہنچایا، تو اس نے جناب رسالت مآب صلم کے پاس تحفے تحائف بھیج کر دوستی کی طرح ڈالنی چاہی (جیسا کہ تاریخ طبری ص ۳۱۶ میں صراحت سے اور ترمذی شریف جلد نمبر ۲ ص ۲۹۶ باقیوں) المدیامین بلا صراحت نام اس کا ذکر ملتا ہے۔

ضمیمہ | نسی کے متعلق عرب مولفون میں سے البیرونی وغیرہ بعض یہ بیان کرتے ہیں، کہ یہ سال قمری کو سالِ کبیسہ بنانے کا نام ہے، تو بعض مولف یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اشہر حرم کی طوالت سے گہرا کہ غیر حرام مہینہ بیچ میں شامل کیا جانے کا نام تھا، تاکہ اس زمانہ میں لوٹ مایہ کچا سکے، غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ نسی کی حرمت کے کئی سو سال بعد جب خالص قمری سنہ میں پے ہوئے بعض عرب مؤلف اس کو سمجھ نہ سکے، اور جس طرح قمری و شمسی سال میں سالانہ دس دن کا فرق قدیم زمانہ میں عام بدویوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا، اور وہ قس کی کبیسہ گری کو محض یہ سمجھتے تھے، کہ مسلسل تین حرام مہینوں کی دل برداشتہ کرنے والی طوالت کو توڑنے کے لئے ایک غیر حرام مہینہ لایا گیا ہے، بالکل اسی طرح نسی بدویوں کی اولاد اور ان کی کما و تون اور روایتوں کے حامل مسلمان علما بعد کو زیادہ غور کے بغیر بدویوں کی روایتوں کو اسلامی ادبیات میں شامل کرنے لگے، نسی کے متعلق سویڈن کے پروفیسر موبنگ (Mobeng) نے جرمن زبان میں ۱۹۳۱ء میں جو مقالہ لکھا ہے، وہ چاہے نتائج کے لحاظ سے غیر خوشی بخش ہو لیکن مواد اور حوالوں کے اعتبار سے بہت مفید ہے، اسی کا خلاصہ انسائیکلو پیڈ آف اسلام میں بھی دیا گیا ہے۔

# قصص الحق

## داستانِ کلیم

از

پروفیسر سید نواب علی صاحب سابق وزیر تعلیم جو ناگدہ

ہنود کی طرح مہر یون کے بھی بے شمار دیوتا اور دیویاں تھیں جن کے بت مندرون میں پوجے جاتے تھے، ان کا بڑا دیوتا امن تھا، جس کا چہرہ کبھی شکل ایک ریشاٹل انسان کے اور کبھی منڈ کی طرح جس کے دو سینگ کا نوں کی طرف جھکے ہوئے نقش کیا جاتا تھا، اور پیچھے ایک دم لٹکتی ہوتی تھی، سر پر لمبی کلاہ دو گوشہ سرخ بنر اور نیلے رنگ کی پیشانی کے دو نوں جانب بدر کاٹل اور آفتاب اس دیوتا کا عظیم الشان مندر دار السلطنت تھیں میں تھا، اور ملک بھر میں بڑا متبرک مانا جاتا تھا، اور ہر فرعون وہاں نذر و نیاز چڑھایا کرتا تھا، اس مندر کا سردار کاہن نہایت مقتدا اور متمول ہوتا تھا، اور عموماً وزیر سلطنت سیاہ و سفید کا مالک اور محکمہ تعمیرات کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، اراضی ملک کا ایک حصہ اس کے قبضہ میں بطور جاگیر رہتا تھا، اور ذاتی مسلح فوج رکھنے کا اختیار تھا، تخت نشینی کے جھگڑوں میں جس فوجی کا طرفدار سردار کاہن ہوتا تھا، وہی فرعون بن بیٹھا تھا،

فراعنہ میں پہلا موصد | پندرہویں صدی قبل مسیح میں امینوتپ سوم بڑے شان و شکوہ کا فرعون گذرا

اس کے عہد میں دولتِ مصر دنیا کی سب سے بڑی سلطنت شمار ہوتی تھی، اس کے عہد کے تعمیرات اور صفحہ اعلیٰ صناعتی اور نقاشی کے نمونہ تھے، اس کا میر عمارت اپنے زمانے کا مشہور ساحر سمجھا جاتا تھا

اس نے تھیس کے مغربی میدان میں فرعون کے دو بڑے مجے ایسی صنعت سو بنائے تھے، کہ طلوع آفتاب کے وقت ان کے جوف سے آوازیں نکلتی تھیں، دس مہینے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں سونے کا پتھر اسی صنعت سے بنایا تھا، اس فرعون نے ۲۶ برس حکومت کی تخت نشینی کے بیسویں سال اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا، جو باپ کی وفات کے بعد امینوتپ چہارم کے لقب سے جانشین ہوا، اس نے حکمانہ دماغ پایا تھا، اور مزاج میں بڑی نفاست تھی، ابتدا ہی سے اسکو بت پرستی سے نفرت تھی، اور وزیر اعظم سردار کاہن کے مذہبی تشدد اور امور مملکت میں دخل اندازی کو پسند نہیں کرتا تھا، سردار کاہن نے بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر عوام کے مذہبی جوش کو بھڑکا کر اپنی قوت بڑھانا چاہی، مگر فرعون کی سبب دلوں میں ٹھٹی ہوئی تھی، کچھ نہ ہو سکا تب فرعون نے حکم کھلا اپنے عقائد کا اظہار شروع کیا، اور امن مند کی معافیان ضبط کر لیں، اور بتوں کی پوجا کی مانعت ہونے لگی، پھر اس نے اپنا پایہ تخت تھیس بدل کر تین سو میل جانب جنوب البتآن میں قائم کیا، اور ایک نیا عالیشان معبد بنایا، جس میں نہ اعصاب تھے، نہ تماثل، صاف ستھرا مکان جانب مشرق خوشبودار پھولوں سے آراستہ، عبادت کے وقت اتوں یعنی نور الانوار کا ذکر ہوتا تھا، جس کا منظر آفتاب اور جس کی ششامیں مبداء حیات تھیں، اسکی تعلیم تھی، کہ اتوں جو خداے واحد ہے حسن کامل ہی، اس تک رسائی حسن کلام اور حسن عمل سے ہوتی ہی روح انسانی اسکے نور کی ایک شعاع ہے، اسلئے کشت و خون اور جنگ و جدال سے گریز چاہئے، اصلح اور آشتی سے زندگی بسر کرنا چاہئے، اس حکمانہ تعلیم کے ساتھ فرعون نے اپنا لقب امینوتپ بدل کر اخیتون رکھا، اور حکم دیا کہ ممالک محروسہ میں اس نئے دین کی تبلیغ کی جائے، چنانچہ مصر اور شام میں نئے عبادت خانے تعمیر ہوئے، اخیتون نہ صرف حکم موجد تھا، بلکہ شاعر بھی تھا، اس کی ایک مناجات گذشتہ صدی میں دستیاب ہوئی ہے، کہتا ہی:

تیری صنعتیں جو ہماری نظروں سے غائب ہیں، شمار نہیں ہو سکتیں، اے خداے واحد تیر

قدرتیں کسی اور میں کب ہیں، تو نے عالم کو اپنی مرضی کے مطابق بنایا، ایسی حالت میں جب کہ تو یگانہ تھا، کائنات تیرے یہ قدرت میں ہے، تیرے ظہور سے زندگی ہے، اور تیرے غیبت سے موت، تجھی سے انسان کی زندگی ہے، اور اس کی آنکھیں تیرے ہی حق کی نگراں ہیں، تو نے ہی صورت حسین کھینچی ہے، اور ہاں تو ہی میرے قلب میں جلوہ گر ہے۔

آخر کے مضمون کو اردو کے ایک شاعر نے خوب ادا کیا ہے،  
 دیو و حرم کا جب کہ جہان میں نشان تھا عاشق کے دل سوا کوئی اسکا مکان تھا  
 اخیوتوں کا انتقال جوانی میں ہو گیا، اسکی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، جانشین نا اہل تھے، ۱۱  
 ایک ہی قرن کے اندر اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا، امن دیوتا کے کاہنوں کی پھر بن آئی، انھوں نے اپنے ڈھب کے فراعنہ جو انیسویں خاندانِ عیسٰی کے نام سے مشہور ہیں، تخت پر بٹھائے اور ظلم و استبداد کا زور و شور سے عمل شروع ہوا، اخیوتوں کے متبعین اور ہم نوا پر آفت آگئی بہت سے مارے گئے، اور اکثر دین نے اپنا ایمان چھپایا، بنی اسرائیل بھی جو قوم ہمسایہ کے اخراج کے بعد سے موردِ ظلم و ستم تھے، اب بے طرح ستائے جانے لگے، آخر ان مظلوموں کی نالہ نیم شبی اُڑی اور آو سحر نے عرشِ الہی کو ہلا دیا، اور خدا کے حکیم کا شکل موسیٰ ظہور ہوا،

تو ریت کتابِ خروج میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل جنھیں حضرت یوسفؑ نے مصر میں آباد کیا تھا، ۴۳۰ برس کے بعد وہاں سے حضرت موسیٰؑ کے ہمراہ غرقِ فرعون کے بعد نکل گئے، اس وقت حضرت موسیٰؑ کی عمر انوشی سے متجاوز ہو چکی تھی، اس حساب سے آپ کی پیدائش کا زمانہ چودہ سو برس قبل مسیح تھا، اور وہ دورِ فرعونِ سی اول کا تھا جس نے بیس سال تک حکومت کی، اسکی وفات کے بعد اس کا نائب بیٹا رعیمیس دوم تھیس کے دارالسلطنت میں تخت نشین ہوا، ۱۱ اور ۶ برس تک حکومت

کی اور یہی حضرت موسیٰ کا فرعون تھا،

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کا قصہ سب سے زیادہ متعدد سورتوں میں بار بار مذکور ہے، اوقات تقریباً وہی ہیں، جو تورات کی کتاب خروج اعداد اور نمثنیٰ میں درج ہیں، لیکن چند ایسے واقعات بھی سورہ المؤمن، سورہ الکہف اور سورہ یوسف میں مذکور ہیں جس کا ذکر کتب یہود و نصاریٰ میں نہیں ہے، لیکن ان کی تصدیق گذشتہ صدی میں مصر کے آثار قدیمہ کے انکشاف سے اب ہوتی ہے، ان واقعات کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں،

اول، آل فرعون کا ایک مرد مومن،

حق تعالیٰ سورہ المؤمن میں ارشاد فرماتا ہے،

وَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ

إِسْمَانَهُ اتَّقُوا اللَّهَ رَجُلًا

يَقُولُ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ

بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ

میرا رب اللہ ہی اور وہ آیا تمہارے پاس

تمہارے رب کی دلیلوں کے ساتھ،

(المومن)

فرعون نے جب حضرت موسیٰؑ سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ الٰہیؑ تو بہم ہو کر حضرت کو قتل کرنا چاہا، لیکن آل فرعون کے ایک مرد مومن نے جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، مانع اور فرعون کو سمجھانے لگا، کہ وہ اپنے قصد سے باز آئے، اس مرد مومن کا ذکر تورات میں نہیں ہے، ہمارے مفسرین نے قیاس آمدائی کی، مگر کوئی ثبوت نہ تھا، اب جب کہ فرعون احنن آتون کے حالات کا جن کو ہم اوپر لکھ چکے ہیں، آثار قدیمہ سے انکشاف ہوا تو دیکھو کہ قرآن کی معجز بیانی کی کیسی تصدیق ہوتی ہے، خاندانِ عیسیٰؑ امن دیوتا کے کاہنوں کی حمایت سے تخت نشین ہوا تھا، فرعون ختمین



اتوں کے متبعین جو موصد تھے، نئی حکومت کے خوف سے اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے، انہی میں سے آلِ فرعون کا یہ مرد مومن بھی تھا، جسے حضرت موسیٰؑ کے بے خوف و خطر اعلانِ حقِ سوائی جرات ہوئی کہ تنکبر فرعون کو سمجھانا شروع کیا، اور یوں کہنے لگا،

وَلْيَقْوَ اِنِىْ اِخَافُ عَلٰىكَ يَوْمَہٗ  
اور اے میری قوم میں ڈرتا ہوں تمھارے  
الْتَّنَادِ يَوْمَہٗ تَوَلَّوْنَ مَدْبَرِیْنَ  
پکارنے کے دن سو جب کہ تم پھر جاؤ گے پھٹے  
مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِدٍ  
پھیر کر اور نہیں ہوگا تمھارے لئے اللہ کو کوئی بچا  
مَنْ یُّضِلُّ اللّٰہُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ  
اور جس کو اللہ گمراہ کرے نہیں ہے اس کوئی  
کوئی راہ دکھانے والا،

ان آیات میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے، آلِ عمیس کی تخت نشینی کے بعد مغربی ایشیا کے مفتوح ممالک نے بناوٹ کی اور متحدہ قوت سے مقابلہ پر آمادہ ہوئے، موسیٰ فرعونِ عمیس دوم ایک تہا فوج لیکر ان پر حملہ آور ہوا، مگر میدانِ جنگ میں اسکی فوج کا ایک بڑا حصہ شکست کھا کر بھاگا، اتحادیوں نے مصری کیمپ کو لوٹنا شروع کیا، یہ دیکھ کر فرعون اپنی بقیہ فوج کو یکجا کر کے بادل کی طرح گر جتا ہوا بڑی دیر سے ان پر ٹوٹ پڑا، اور دشمنوں کو ماتا کاٹتا ہوا دریائے اردن کی طرف ڈھکیل دیا، جہاں ان کی کثیر تعداد دریا میں غرق ہو گئی، اس فتح کی یادگار میں فرعون نے ایک بڑا مندرِ رعیم شہر تھیس میں بنوایا، اور دیواروں پر اس جنگ کا نقشہ کھنچوایا، فرعون ایک قوی پہل دیوتا کی طرح کھڑا ہے، ہاتھ میں بھاری کمان جس سے وہ اپنے دشمنوں کے جم غفیر پر جگو بہت ہی پستہ قد دکھایا، تیروں کی بوچھاڑ کر رہا ہوا بھاگ رہے ہیں، اور دریا میں ڈوبتے ہوئے ایک دوسرے کو مدد کے لئے بلا رہے ہیں،

اس ہتیباک منظر کو یاد دلاتے ہوئے آلِ فرعون کا وہ مرد مومن قوم سے کہتا ہے کہ فرعون

کی زیادتیوں کا کہیں وہی نتیجہ نہ نکلتے جس کی تصویر اس نے نقش کرائی ہے، یقیناً فی اخافِ  
حلیکُم یوم التناد کے یہ معنی ہیں جواب حل ہوئے ہیں، یہاں یہ بیخ انداز بیان بھی ملحوظ رہے کہ  
وہ دم و دم من مکتبر فرعون کو براہِ راست مخاطب نہیں کرتا ہی کہ کہیں اس کے غصہ اور ضد کی آگ  
بھڑک اٹھے، بلکہ ایک مختصر اور موثر تقریر میں قوم سے خطاب کرتا ہی، مردانِ خدا کی نگاہ کتنی تیز ہو  
ہی، وہ مستقبل کی تصویر حال کے آئینہ میں دیکھتے ہیں !

دوم، قصہ مجمع البحرین،

واذ قال موسیٰ لفته لا ابرح اور جب کہا موسیٰ نے اپنے جوانوں سے کہ

حق ابلغ مجمع البحرین اور مجمع نہیں ہوں گا میں یہاں تک کہ پہنچوں میں  
امضیٰ حصّاً دو دور یاؤں کے ملنے کی جگہ یا اسی طرح بڑھ

ان آیات میں جس واقعہ کا ذکر ہے، وہ تفاسیر و احادیث میں قصہ خضر و موسیٰ کے نام سے

مشہور ہے، جو غرقِ فرعون کے بعد جب بنی اسرائیل بیابانِ تہ میں سرگرداں تھے، حضرت  
موسیٰ کو پیش آیا ہی کہا جاتا ہی کہ آپ ایک دن دعا فرماتے ہیں جس سے مجمع نہایت متاثر ہوتا ہی  
اور حیرت سے پوچھتا ہے کہ کیا آپ سے بھی بڑھکر کوئی اور عالم ہے، آپ نفی میں جواب دیتے ہیں  
وحی آتی ہے کہ میرا ایک بندہ مجمع البحرین پر ہے، جو تجھ سے زیادہ عالم ہے، آپ شوقِ علم میں نکل  
پڑتے ہیں، اور اس بزرگ سے جو خضر ہیں، استفادہ فرماتے ہیں، یہاں یہ یاد رہے کہ جس نے  
کا یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے، اس وقت آپ کی عمر سو سے زائد متجاوز ہو چکی تھی، آپ رسولِ اَوَّلُ  
ہو چکے تھے، اور کوہِ طور پر احکام مل چکے تھے !

احادیث کے سلسلہ رواۃ پر اگر غور کیا جائے، تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ قصہ از قبیلِ استرا  
ہے، روایات سے تھوڑی دیر خالی الذہن ہو کر اگر آیاتِ قرآنی کا مطالعہ آثارِ قدیمہ کے انکشافات

اور جغرافیہ و تاریخ کی روشنی میں کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ واقعہ کی صورت ہی کچھ اور تھی،  
 حضرت موسیٰ کو فرعون کی ملکہ نے جو مومنہ تھی، اولاد کی طرح پرورش کیا تھا، آپ کی تعلیم و  
 تربیت مدینہ الشمس (ہیلوپولس) میں ہوئی، جو اسی زمانہ میں جب کہ حکماء یونان تھے، نہ زرتشت  
 نہ گوتم ایک مشہور یونیورسٹی تھی، جہاں علوم و فنون کے باہر جو عموماً کاہن ہوتے تھے، تعلیم دیتے تھے، بخیل  
 اعمال حواریں باب، مین لکھا ہے، کہ حضرت موسیٰ نے مصریوں کے تمام علوم کی تعلیم پائی تھی، اور کلام  
 اور کام میں قوت والے تھے۔ جوانی میں آپ کو فرعون نے حبشیوں کے ملک اتیوپیہ کی طرف بھیجا تھا جہاں  
 آپ نے باغیوں کو زیر کیا، اور وہیں قرابت بھی کر لی، اس ملک کی سرحد سوڈان سے لی ہوئی ہے جہاں  
 دریائے نیل کی دو شاخیں جو بحر ابيض اور بحر اسود کے نام سے مشہور ہیں، بمقام خرطوم ملتی ہیں (جیسے گنگا  
 اور جنا الہ آباد میں) یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن میں مجمع البحرین کہا گیا ہے، اسکی تصدیق ادا مضیٰ حبیباً  
 بھی ہوتی ہے، اگر مجمع البحرین سے جانب جنوب دریائے نیل کے منبع کی طرف بڑھیں تو یکسر واد  
 کوں تک برسوں انسان چلتا رہے، اور راستہ ختم نہ ہو،

ہم اوپر لکھ چکے ہیں، کہ فرعون انین اتون نے اپنا دار السلطنت تھیس سے جانب جنوب  
 تین سو میل قائم کیا تھا، اور جایا بنائے معبد بنوائے تھے، جو عموماً دیا کے کنارے پر نصاب مقامات میں  
 ہوتے تھے، ان معبدوں میں اس کے عہد کے موحیدین مشغول عبادت رہتے تھے، (جیسے آنحضرت صلعم  
 کی بشت سے پہلے عرب میں وقر بن نوفل، زید بن عمرو بن نفیل، قس بن ساعدہ وغیرہ وغیرہ تھے)  
 ان موحیدین میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں، جو حضرت موسیٰ کو ملے، اور جن کے متعلق قرآن میں و  
 علمنا من لدنا علماً وار و ہوا ہے، اور حضرت موسیٰ بشت سے پیشتر عالم جوانی میں جو تحصیل  
 علم کا زمانہ ہی ان بزرگ سے ملاقی اور مستفید ہوئے، حضرت موسیٰ اس وقت جلد مشغول ہو جانے لگے  
 تو یٰ نبیہ جوان تھے، مشیتِ الہی یہ تھی، کہ قبل اس کے کہ آپ فرعون اور اس کے جنود کے سامنے

جنگِ آزادی کے ٹو بفر ایک قطرہ خون بہائے ہوئے کھڑے ہوں، دینی مصلحت بینی سکھیں، اور جلد با  
 نہ ہوں، ساتھ ہی غور و تامل، صبر و تحمل اور کتمانِ راز کا سبق سکھیں، کشتی کا ٹوڑنا، لڑکے کا قتل، اور  
 دیوار کا بغیر اجرت لئے بنادینا وہ نظارہ تھا جو مذکورہ بالا صفات حاصل کرنے کے لئے علی تعلیم  
 خضر کا اگرچہ احادیث میں نام آیا ہے، اور حضرات صوفیہ کا اُن سے فیض حاصل کرنا بھی مذکور ہے  
 نظامی سکندر نامہ میں ”مرا خضر تعلیم کر بود و دوش“ فرما گئے ہیں، لیکن قرآن میں خضر کا نام نہیں ہے حضرت  
 موسیٰؑ دے بزرگ کا نام جو بھی ہو وہ عارفِ موحّد تھے، اور علمِ لدّنی سے فیضیاب تھے، اکثر علماء اور  
 حضرات صوفیہ قائل ہیں کہ خضر اب تک زندہ ہیں، لیکن اکثر محدثین خصوصاً بخاریؒ اس کے منکر ہیں  
 جن کی تائید میں حافظ ابن کثیر نے دو عمدہ دلیلین پیش کی ہیں، اول نصِ قرآنی وَمَا جَعَلْنَاهُ صَبًا  
 لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ، دوم حدیثِ نبوی کہ اگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ (زمین پر) زندہ ہو  
 تو ان کو میری متابعت کے سوا چارہ نہ تھا، اب اگر خضرؑ رسالت میں زندہ تھے، تو حاضر ہو کر زُمر  
 اصحاب میں شامل ہوتے، حضرات صوفیہ کا کسبِ فیض ہمارے نزدیک یوں ہے، کہ عالمِ روحانیت  
 میں غیب و شہادت کے مجمع البحرین پر مستفید ہوئے ہوں، اور یہ کچھ بعید نہیں ہے،  
 اے کہ انکار کنی عالمِ درویشان! توچہ دانی کہ چہ سودا و سراسر ایشان!

## ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قوموں کا ذکر ہے، ان میں سے دینِ آہصاب الایک، قومِ ایوب، نبیہمیل  
 اصحابِ الرس، اصحابِ البحر، بنو قیدار، انصار اور قریش کی تاریخ، اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب  
 پر تفصیلی مباحث، صفحات ۲۴۰ صفحہ، قیمت پانچ روپے، دوم،



تحریری نہیں، بلکہ زبانی،

اسلام سے پہلے قصہ گو اور افسانہ خوان عربوں کا تذکرہ سننے میں آتا ہے، جنہیں وہ اپنی زبان میں سنا کر کہا کرتے تھے، اس سلسلہ میں نضر بن عارث کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، وہ عین کے قیام بادشاہوں کی کمائیاں اور ان کے حالات سنایا کرتا تھا، ان حکایتوں اور افسانوں کو وہی حیثیت حاصل تھی، جو ہمارے یہاں جنوں، بھوتوں اور پریوں کی کہانیوں کو حاصل ہے، نثر کا کچھ سرمایہ راویوں کے ذریعہ بھی جمع ہوا، جو قصیدہ سناتے وقت اس کی شان نزول، اسکی تلیحات اور اس سے متعلق بے شمار کتابیں سننا بھی ضروری تصور کرتے تھے، یہ چیزیں آج تاریخی، ادبی اور جزائیا کی حیثیت سے ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں، اس زمانہ میں خطابت کا بھی عام رواج تھا، اور خطیب کو شاعر کے بعد بڑا اقتدار حاصل تھا، زمانہ کجائیت کے یہ خطبات اور خصوصاً قس بن ساعدہ اور اوسحمان بن وائل کے خطبے اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے، اب تک محفوظ ہیں، اس سلسلہ میں ان بشپار کہاوتوں اور ضرب الامثال کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری ہے، جو عہد جاہلیت میں رائج تھے، اور جنہیں بہت زمانہ کے بعد ابوالہلال عسکری المتوفی ۳۳۵ھ نے جمرۃ الامثال میں، میدانی المتوفی ۳۸۵ھ نے مجمع الامثال میں، اور منفل ضبی المتوفی ۳۸۵ھ نے کتاب الامثال میں جمع کیا،

جب اسلام نے عربوں کی زندگی کے ہر پہلو میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کیا، تو یہ توقع ہوئی کہ نثر کی قسمت بھی جاگے گی، خصوصاً قرآن مجید کے نزول نے جو عربی نثر نگاری، اور ادب و انشاء

لے یہ ایک جاہلی شاعر بعض حضرات کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہ کا شعر ہے،

کان لیسوین بین الحجون الی الصفا انیس و لیسوین بجمکتہ ساجرا

علہ ابن ندیم نے ایک بہت قدیم مجموعے کا تذکرہ کیا ہے، جسے الکلابی نے مرتب کیا تھا، مگر آج اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے، الکلابی نے یہ ابن معاویہ کے زمانہ میں گزرا ہے،

بنو امیہ کے عہد میں نثر کا سر

کا بلند ترین اور فصیح ترین نمونہ ہے، یہ امید کہ بلند پایہ نثر نگاروں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو جائیگی اور بھی قوی ہو گئی، اگر بقیہ قسمتی سے خلافت راشدہ کے اختتام سے پہلے کوئی باقاعدہ خدمت انجام نہ پاسکی، اس وقت تک نثر کا سرمایہ چند ہزار حدیثوں، کچھ ترجمہ بری احکامات اور معادلات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی تقریریں، اور آپ کے مختلف خطوط کے سوا کچھ نہ تھا، اسکی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں مسلمانوں کی مذہبی سرگرمی نے جو دوسری صدی ہجری میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ ظاہر ہوئی عربی نثر کو قومی چامہ پر نشوونما پانے کا موقع نہیں دیا، دوسرے ان دنوں علماء عام طور پر علم کو سفینوں میں جمع کرنے کے بجائے سینوں میں محفوظ رکھنا پسند کرتے تھے، مذہبی اور جنگی مصروفیتوں کے علاوہ عام سیاسی بے چینی بھی بڑی حد تک اس راہ میں حائل رہی، اگر ایک طرف حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا عہد حکومت فتنہ ارتداد اور غیر ملکی فتوحات سے پُرسور رہا، تو دوسری طرف حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا زمانہ خانہ جنگی سے پُر آشوب رہا، اسلئے عربی نثر کی تاریخ صحیح معنوں میں بنی امتیہ کے دور حکومت سے شروع ہوتی ہے،

بنو امیہ کی سلطنت جیسا کہ دنیا جانتی ہے، اگر غیر اسلامی نہ تھی، تو خالص اسلامی بھی نہ تھی، اس لئے مذہبی علوم و فنون کو جن میں سے بعض کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں پڑ چکی تھی حکومت کی سرپرستی نصیب نہ ہو سکی، اس میں شک نہیں کہ اس دور میں چند جلیل القدر علماء مثلاً تفسیر میں مجاہد اور ابن عباس، حدیث میں امام زہری، ماحم بن سلیمان اور شعبہ بن حجاج، فقہ میں عبدالرحمنؓ ماری لے تاریخ ادبیات عرب انٹیکسن صفحہ ۲۴۷ قاضی ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام زہری

کا یہ قول نقل کیا ہے، :-

کنا نکر کتاب العلم حتیٰ انکرونا علیہ ہم لوگ علم کا قلبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے  
ہو کاء اہم اء، بیان تک کہ امر نے ہم کو اس پر مجبور کر دیا

وغیرہ پیدا ہوئے، مگر ان بزرگوں نے جو کچھ کیا، انفرادی طور پر ہی دج ہے کہ یہ بزرگ کوئی بڑا تحریر یا سرمایہ چھوڑ سکے، انوی دربار میں تاریخ کو بڑا عروج نصیب ہوا، اور یہ اخیر زمانہ تک مقبول بنی رہی، مگر تاریخ سے یہ دلچسپی علم و ادب کی خدمت کے جذبہ سے نہ تھی، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا، کہ صاحب اقتدار جماعت تخت و تاج کی حفاظت کے لئے ہر طرح کی سیاسی اور ملکی تدبیروں سے واقف رہے، اور یہ صلاحیت صرف تاریخ کی کتابوں، اور اگلے فرمانرواؤں کی سیرت کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی تھی، مسعودی کی روایت کے مطابق خاندان بنی امیہ کے بانی حضرت امیر معاویہ کا یہ معمول تھا، کہ وہ روزانہ رات کا ایک شلٹ مورخین کی صحبت میں گزارتے، یہ مورخین انھیں عرب و عجم کو بتاتے ہوئے کے حالات، ان کی سلطنت، ان کی لڑائیوں، ان کے طریق حکومت، اور ان کی سیاسی چالوں کی تفصیل سنایا کرتے، پھر وہ کچھ دیر آرام فرماتے، اور جب ایک شلٹ رات باقی رہ جاتی، تو علما کی ایک دوسری جماعت آتی، لاطینی اور یونانی کتابیں ان کے ساتھ ہوتیں، اور وہ دنیا کے بڑے لوگوں مثلاً جولیس سیزر، ہینیال اور سکندر کی سوانح نمایان عربی زبان میں ترجمہ کر کے سناتے، امیر معاویہ کو عرب کے قدیم بادشاہوں کے حالات سے اس قدر دلچسپی تھی، کہ انھوں نے یمن کے ایک عرب عبید بن شریہ کو اپنے دربار میں بلایا، اس سے جنوبی عرب کی روایتوں اور افسانوں کے متعلق سؤالا کئے، اور ان کے جوابات کو ایک جگہ جمع کر کے ایک کتاب تیار کرائی، یہ کتاب جس کا نام کتاب الملوک و اخبار الماضین تھا، اور آج دنیا سے ناپید ہے، مسعودی کے زمانہ میں بڑی مقبول تھی، عرب کی قدیم تاریخ سے متعلق بہت سی روایتیں جنھیں مسلمان مورخین عام طور پر اپنی کتابوں کی ابتداء میں درج کرتے ہیں، ایک فارسی النسل یمن کے باشندے وہب بن منبہ المتوفی ۱۱۴ھ سے ۱۱۵ھ مردج الذہب، مسعودی ۱۱۵ھ الفہرست، ابن ندیم، فلوکل ایڈیشن ۱۱۵ھ سے مسعودی جلد ۴ صفحہ ۱۱۱ سال ۱۱۵ھ وہب بن منبہ کی ایک کتاب التیجان فی ملوک حیرا در عبید کی اخبار عبید کجا حیدر آباد کو شائع ہو گئیں،



منقول ہیں، ابن ندیم نے ابو مخنف کو طعن بھی اڑا دی کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے مختلف موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں، وہ حضرت علیؓ کے طرفدار تھے، ان کی تصنیف ذکر مقل سیدنا و مولانا حسین بن علیؓ جسے کئی سال ہوئے و لما سن نے اپنے اہتمام سے شائع کیا، شہادتِ کربلا پر معتبر کتاب بھی جاتی ہے، عوانہ بن اکھم لکھی بھی اسی زمانہ کے مشہور اہل قلم ہیں، انھوں نے ابن ندیم کے بیان کے مطابق دو کتابیں تصنیف کیں، ایک کا موضوع عام تاریخ، اور دوسرے کا حضرت امیر معاویہؓ کے حالاتِ زندگی، اور بنی امیہ کی تاریخ تھی، علم الانساب اگرچہ درحقیقت اسی کی شاخ ہے لیکن عربوں نے ہمیشہ اسے ایک علیحدہ اور مستقل فن تصور کیا، سب سے پہلا شخص جس نے اس فن پر کتاب لکھی وہ زیاد بن ابیہ ہے، جسے امیر معاویہؓ نے اپنا سوتیلا بھائی بنا کر اپنے طرفداروں میں شامل کر لیا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے نسب نامہ پر ایک رسالہ لکھا تھا، کیا عجب ہے کہ اس میں اوسخ اپنی پیدائش کے متعلق جو خبریں مشہور تھیں، ان کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہو، اس دور کے اولے دوسرے ماہر انساب و غفل، حجر بن حارث اور سان الحجر ہیں لیکن ان لوگوں کے حالاتِ زندگی اور ان کی تصانیف کا کسی جگہ پتہ نہیں چلتا،

ان کے علوم کے علاوہ دوسرے دینی و دنیوی علوم کی طرف تک قلم عدم تو جی نہیں برتی گئی، امیر معاویہؓ کے بعد عبدالملک بن مروان نے جو شہنشاہ بن تخت نشین ہوا، مختلف اسلامی موضوع پر علماء سے کتابیں لکھوائیں، سعید بن جبیر نے اسی کی تحریک پر قرآن مجید کی تفسیر لکھی، چنانچہ عطار بن دینار کے نام سے جو تفسیر عام طور پر مشہور ہے، وہ دراصل ان ہی کی تصنیف ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، کہ ان کا زمانہ علم و ادب کے لئے ناخوشگوار رہا ہے صحیح ہے، کہ ان کے دربار میں مبتذل شاعری کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن اس حقیقت سے کون انکار

لہ ایضا ملاحظہ فرمائو: الفوائد الزکیة جلد دوم، ص ۱۵۱ الفہرست، ابن ندیم، غلوگ ایڈیشن صفحہ ۱۰۷ میزان الاعتدال للذہبی

کر سکتا ہو، کہ انھوں نے تمام ممالک میں حدیث و سنن کے جمع کرنے اور ترتیب دینے کا کم بھی، چنانچہ سعد ابن ابراہیم نے جوہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے، دفتر کے دفتر لکھ کر تمام ممالک میں بھیجے ابو بکر بن محمد انصاری کو جو بڑے پایہ کے محدث اور امام زہری کے استاد تھے، حدیثوں کے جمع کرنے کا خاص شوق تھا، حضرت عائشہؓ کی اکثر روایتیں فقہ اور عقائد کے اہم مسائل سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو خاص طور پر جمع کرنے کا اہتمام کیا، عمرہ بنت عبدالرحمن ایک بہت بڑی محدث اور عالمہ تھیں، اور چونکہ حضرت عائشہؓ کی آغوش تربیت میں بی بی تھیں، اس لئے ان کی روایات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، انھوں نے ابو بکر بن محمد کو عمرہ کے پاس بھیجا کہ حضرت عائشہؓ کی تمام روایتوں کو ان سے لیکر قلمبند کریں،

امام زہری سے پہلے فنِ نمازی کی طرف جس نے بعد میں ترقی پا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات کی شکل اختیار کی، اس قدر توجہ نہیں کی گئی جس کا وہ محتاج تھا، اب تک اس سلسلہ میں جو کچھ کیا گیا، وہ یہ تھا کہ غزواتِ نبوی کے خاص طے قائم کئے گئے، جن میں اس فن کے علماء طلبہ اور عوام کے سامنے تقریریں کیا کرتے تھے، چنانچہ عمرو بن قتادہ انصاری المتوفی ۱۲۱ھ کے متعلق یہ تصریح موجود ہے کہ وہ دمشق کی جامع مسجدین لوگوں کو نمازی اور مناقب کا درس دیا کرتے تھے،

سب سے پہلے جس نے نمازی کے فن کو ترقی دی، اور اسے عام مقبولیت بخشا وہ عہدِ بنی امیہ کے

مشہور محدث محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہیں، وہ امام بخاری کے شیخ الشیوخ تھے، فقہ و حدیث میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، ان کی تصنیف کتاب المنازی جیسا کہ امام بیہقی نے روض الانف میں لکھا ہے، فنِ نمازی

طہ طبقات ابن سعد ج ۲ تہذیب التہذیب لابن حجر، حدیث اور نمازی کے سلسلہ میں بعض واقعات

اور بعض حوالے میں نے علامہ شبلیؒ کی سیرۃ النبی کے مقدمہ سولے میں، مجھے افسوس ہو کہ ہر جگہ الگ الگ

اس کا حوالہ دینا میرے لئے ممکن نہ تھا تہذیب التہذیب لابن حجر،

کی پہلی کتاب تھی، اور غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ایما سے لکھی گئی تھی، امام زہری اس حیثیت سے بھی ممتاز ہیں، کہ اموی دربار میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، اور انھوں نے عبدالملک کے زمانہ میں قضا کا منصب قبول کیا، سئمہ میں آپ کا انتقال ہو گیا، ان کے شاگردوں میں کئی ایسے لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے مغازی کو درجہ کمال تک پہنچایا، امام زہری کے معاصر عبدالرحمن عامری نے فقہ میں ایک بڑی اچھی کتاب "موطا" تصنیف کی جس کی شرح امام زرقانی نے شرح الموطا کے نام سے کی، اس سلسلہ میں اسد ابن موسی المتوفی ۱۹۸ھ کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، جنھوں نے زہد و تصوف پر ایک بڑی مفید کتاب "کتاب الزہد" لکھی، عہد بنی امیہ کے ممتاز شریکداروں کی فرست نامکمل رہ جائیگی اگر دو اور اہل قلم کا تذکرہ نہ کیا جائے یہ ابن سیرین اور ان کے شاگرد حضرت حسن بصری ہیں، ابن سیرین نے خوابوں کی تعبیر کے متعلق ایک بڑی دلچسپ کتاب لکھی جس کا نام کتاب الجوامع ہے، حسن بصری تصوف کے علمبردار ہیں، ان کے چھوٹے چھوٹے خطبے اور ان کے مذہبی اقوال اس زمانہ کی شریکداری کے بہترین نمونے ہیں، استاد اور شاگرد دونوں نے اسی سال یعنی ۱۲۸ھ میں وفات پائی، جو جبریا اور فردوق کی موت کی وجہ سے عربی ادب کے لئے "عام احزن" کہے جانے کا مستحق ہی

بنو امیہ کے زمانہ میں علوم عقلیہ کی تحصیل کے لئے جو کوششیں کی گئیں ان پر نظر ڈالئے، تو خالد بن یزید المتوفی ۱۴۵ھ کا نام بہت نمایاں نظر آتا ہے، خالد کو جب مروان کے مقابلہ میں حکومت کی طرف سے ہلکے یابوسی ہو گئی، تو اس نے اپنی توجہ علم و ادب کی طرف مبذول کی، اسے ہیئت اور کیا سے خاص طور پر دلچسپی تھی، اسکندریہ ان دنوں علم کیا کے لئے بڑا مشہور تھا، چنانچہ اس ایک علمی پادری کو جس کا نام مروان بن

۱۵۰ ابن خلکان وابن ندیم ۱۵۱ ابن الجوزی، سیرۃ صفحہ ۱۶۱-۱۶۲، ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳ پر زہیر جولیس رسکا نے اپنے ایک رسالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ خالد نے کیا پر کوئی کتاب یا کوئی رسالہ نہیں لکھا جو کہ میں اس کے نام سے مشہور ہیں، وہ قرون وسطیٰ میں لکھی گئی تھیں، اور شاہزادے کی طرف بعد میں منسوب کر دی گئیں

تھا اور جو وہاں مقیم تھا، بلایا، اور اس سے کیمیا کی تعلیم حاصل کی، چند دنوں کے بعد اس نے ایک اور عالم کو جس کا نام اسٹیفن (اسطفان) بتایا جاتا ہے، کیمیا پر متعدد کتابیں عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اس نے نہ صرف قطبی اور یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا، بلکہ خود بھی اس موضوع پر چار رسالے لکھے اسی طرح جیسا کہ مصنف الفہرست نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے، علم طب پر بہت سی کتابیں خصوصاً شامی ہیونیوں کے قلم سے عربی میں منتقل ہوئیں، اگر افسوس ہے، کہ ان میں سے ایک بھی ہم تک نہیں پہنچ سکی، ایک شامی طبیب ماسرجویہ یا ماسرجس نے جو بصیرہ میں مقیم تھا، اور مردان بن حکم کا ہم عصر تھا، اہرول بن امیون کی کتاب قانون (دکن شس) کا جو طب پر لکھی گئی تھی، شامی سے عربی میں ترجمہ کیا،

میں نے اگلے صفحات میں جو مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے، وہ بڑی تفصیل اور اضافہ کا محتاج ہے لیکن اس سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے، کہ شہر کی بنیاد کو مختصر پیمانہ پر لیکن مضبوط اموی فرمانرواؤں کے اوائل حکومت ہی میں پڑ چکی تھی، جب آل عباس برسرِ اقتدار ہوئے، تو ان کے لویہ چیز بڑی مفید ثابت ہوئی، اور اسی پر انھوں نے ایک شاندار عمارت تیار کی، ابو الفرج اصفہانی کی کتاب الانانی بدیع الزمان اور حریری کے مقامات بطری کی تاریخ الرسل والملوک اور مسعودی کی مروج الذهب بلاشبہ عربی ادب میں شہر کے بے نظیر شاہکار ہیں، لیکن یہ ماننا پڑے گا، کہ بنو امیہ کی کوششوں کے بغیر اس قدر مختصر مدت میں ایسے شہر پارے اور اتنی کثیر تعداد میں شاید وجود میں نہ آ سکتے،

۱۔ چارون رسالوں کے نام یہ ہیں، ۱۔ کتاب الحرات، ۲۔ کتاب الصحیفۃ الکبیر (۳) کتاب الصحیفۃ الصغیر

(۴) کتاب وصیۃ الی ابنہ فی الصنعة، ملاحظہ فرمائیے، الفہرست فلوگل ایڈیشن صفحہ ۲۵،

۲۵ الفہرست ابن ندیم، فلوگل ایڈیشن صفحہ ۲۵،

# بیدل اور تذکرہ خوشگو

از

جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر

(سلسلہ مئی ۱۹۲۲ء)

سفینہ خوشگو کی تیسری جلد میں خوشگو کا ترجمہ نہیں لیکن دوسرے شعرا کے تراجم میں ضمناً خوشگو نے اپنے حالات لکھے ہیں، اُس کا وطن متھرا تھا، سال وفات معلوم نہ ہو سکا، لیکن قرائن کہتے ہیں کہ گیارہویں صدی کے اواخر یا بارہویں کے اوائل میں پیدا ہوا ہوگا، سرخوشؒ اور گلشنؒ کی شاگردی کا اُس نے اقرار کیا ہے، لیکن باوجود اس غیر متوکی عقیدت کے جو اُسے بیدل سے ہے، اُس نے صریح الفاظ میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ میں بیدل کا شاگرد ہوں، اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ باقاعدہ شاگرد نہ تھا۔ سفینہ خوشگو کی تیسری جلد جس میں معاصرین کے حالات ہیں، بہت کیا ہے اور ہندوستان کے

۱۵ سفینہ ترجمہ بے کس، قدرت اللہ شوق نے بنداجن (ضلع متھرا) وطن لکھا ہے ۱۶ ”راجم خوشگو اول در عمر چارہ سالگی مشق خود را بہ نظر اصلاحی گذرانید از روی کمال عنایت تخلص خوشگو عنایت فرمود“ ”بر فیتہ حقوق پدرانہ دارو“ ترجمہ سرخوشؒ ۱۷ گلشنؒ کی ”بندگی خاص و شاگردی“ کا اعتراف کیا ہے، ان کا ترجمہ اس بیت سے شروع ہوتا ہے، ۱۸

گلشنؒ معنی جناب شیخ سعد اللہ ما قیلہ، امیر ما، استاد ما و شاہ ما

۱۹ آرزو نے جن سے اصلاح لینے کا خوشگو کو قرار ہے، مجمع النفائس میں لکھا ہے، ۲۰

”استفادہ بسیار از بے دل و سرخوش و گلشن نمود، از مدت بہت و پنج سال بہ این بیچ مراں ربطی کلیم ہم نہ“  
و این عاجز ہم در تربیت ادبہ تعمیر از خود را نمی نہ شود و نیست ۲۱

کسی مشہور کتب خانے میں کتبخانہ مشرقیہ بانگی پور کو چھوڑ کر اس کا کوئی نسخہ نہیں نسخہ بانگی پور کی کتابت  
۱۲۰۰ء میں ہوئی ہے، اور غالباً اس کا منقول عنہ کوئی ایسا نسخہ تھا جو میر عبد الولی عرلات کی نظر  
سے گذر چکا تھا، کاتب نے ان حواشی کو بھی نقل کر لیا ہے جو عرلات نے لکھے تھے، یہ صحیح نہیں کہ سفینہ  
خوشگو عشرہ ششم میں تمام ہوا ہی اس میں بعض واقعات اس کے بعد کے بھی درج ہیں،

جلد ثالث میں بیدل کے حالات اور ان کی طرف اشارات دوسرے شاعروں کے ترجم

میں بھی ملتے ہیں

میریان بیدل، اعظم شاہ، نقاد سخن و قدردانِ این فن بے غول، راسخ، سالم، شہرت شعرا  
در گاہ او نیند و بار بار بہ صدد ہائے گراں مندا بیتا ز یافتہ اند، میاں سرخوش در جنگ نامہ حوالہ او گفتہ  
و مرزا بے دل صاحب بریں دو بیت صادر کردہ اند:

ز شمشیر دہے نہ می دانستے کہ ابروے معشوق پنداشتے

نہ بود از سیاہی فوجش ہر اس کہ کرتے خط و خالِ خواباں قیاس

خوشگو نے تاریخ ذیل اعظم شاہ کے نام لکھی ہے ہر مٹا ہٹا بھا گیا، لیکن اس سے ۱۰۹۱ء نکلتا ہے

”مرٹا کو ہائے مخفی سے لکھیں تو ۱۰۹۰ء برآمد ہوگا، خوشگو کے قول کے مطابق ۱۰۹۰ء نکلتا چاہئے یہ دو شعر بھی

اعظم شاہ کے ہیں،

غمے بس است بروئے اجل فضو نیست سرایِ سینہ ما خانہ نزو نیست

راہ نگاہ راز من از ہمہ باب بستہ روزہ نظارہ راشب و خواب بستہ

عاقلاً خاں رازی تخلص ہمسکری نام تھا، صاحب ثنویات و دیوان، آخر عمر میں صوبہ دار شاہجہاں پور

۱۰۰۰ء وفات تحقیق عظیم آبادی ۱۰۰۰ء کہیں خلاصہ اور کہیں اس الفاظ نقل ہوئے ہیں تعظیمی الفاظ اکثر نکال دئے گئے ہیں

۱۰۰۰ء اعظم شاہ کی ایک فارسی تاریخ عظیم جہاد کن بھی سفینہ میں ہے، اس سے ۱۰۹۰ء نکلتا ہے ۱۰۰۰ء مارا میں ہے، قیاساً ۱۰۰۰ء

”خود را یکے از اغواث و اقطاب زمانہ می دانست، حضرت میرزا بے دل از صحبت مے ایں ہمہ سامان استادی و تصوف بہم رسانید، و ہر گاہ شعر میرزا را احسنت و تحسین می فرمود میرزا بری خاست و تسلیم، بجای آورد، این معنی از روئے حرمت و بزرگی بود نہ از راہ شان امارتش، و دوسے مژ شیخ برہان شطاری برہان پوری بود، چنان چہ ملفوظات شیخ بزرگوار خود نوشتہ،

سال وفات شمسہ، بے دل نے ایک غزل لکھی ہے جس کے ہر مصرع سے تائید وفات نکلتی ہے  
 شکر اللہ خاں، خاکسار تخلص، ساداتِ خواف سے تھے اور عاقل خاں رازی کے داماد، صاحب دیوان  
 ہیں اور شرح ثنوی مولوی کے مصنف، عالمگیر کے زمانہ میں ”گردشاہ جہاں آباد“ کے فوجدار تھے، وفات  
 ۱۱۱۲ھ ”شکر اللہ خاں، شاہ کر خاں، اکرم اللہ عرف عاقل خاں پسرانش مدت مدید بعد پر خود بودند  
 و خدمت گاری میرزا بے دل صاحب می نمودند“

عاقل خاں عاشق تخلص، اکرم اللہ، خلف شکر اللہ خاں و دختر زادہ عاقل خاں رازی بے دل  
 کے صاحب دیوان شاگرد تھے، اور ان کے طرز خاص، اور انہی کی زبان میں شعر کہتے تھے، ”در جمیع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰) کہ والا شاہ بیان عالمگیری سے تھا، دوسرے عہدوں پر مامور رہنے کے بعد ۱۱۲۲ھ جلوس میں  
 بخشی گری تن تھا، اور سال ۱۱۲۴ میں صوبہ دار شاہ جہاں آباد ملی، شاہ برہان الدین راز الہی سے بڑی عقیدت  
 رکھتا تھا، رازی تخلص کی یہی وجہ ہے۔ ۱۱۲۵ھ تا ۱۱۲۸ھ میں شمسہ بھی لیکن بے دل کے کلیات سے بھی شمسہ  
 ثابت ہوتا ہے ۱۱۲۵ھ ایک نہیں دو غزلیں ایسی لکھی ہیں، ایک غزل کے بعض مصرعے خوش گو نے بھی نقل  
 کئے ہیں، یہ ہے،

وایے پیونہ سخن سخن نماند	تکیہ گاہ صاحب عرفان نماند
رفت از آفاق لطف عدل و داد	برکت دیں مشدود انسان نماند
قلب اقطاب حقائق بار بست	ساکے در کشور امکان نماند
جمع اسناد بے شیرازہ شد	مابطہ قلم ہندستان نماند
ہادی انوار لطف از دیدہ رفت	ہمدی جم جاہ عاقل خاں نماند

۱۱۲۵ھ آزاد نے سر داؤد میں سال وفات ۱۱۰۸ھ لکھا ہے، اسکی تحقیق آئندہ کی جائے گی،

شاگردانِ آن حضرت ربّہ خلافت داشت "عہد بہادر شاہ میں دیوان صوبہ لاہور تھے،

"غزلتے در شکوہ دیر نویسی خطوط بہ خدمت مرزا فرستادہ بود، اُن جناب بعد مطالعہ فرمود

کہ فکر عاشق ہمہ مشوقانہ افتادہ، و او خود پایہ فکر از ماہم گذرانیدہ، لیکن چون خاطرش عزیز است موافق استدعائش اصلاح لفظی در مطلع او ہم باشد و مطلع این ست،

زمانہ می کند اُن آشناے ما از مادش پُرسِت کہ خالی ست جلے ما

مرزا صاحب بجائے لفظ آشناے ما، بے وفاے ما رسانیدہ "

عین جوانی میں ۱۲۳ھ میں انتقال کیا، مرزا وفات کی خبر سے دیر تک اٹکیا رہے،

"نواب ذوالفقار خاں کہ مبلغ دو صد اشرفی بہ خدمت میرزا نیاز گذرانیدہ بود، ہمہ اُن را بہ

عاقل خاں بختیدہ بودند کہ در اُن وقت از طرف خرج معسر بود "

منعم خاں خان خاناں، منعم تخلص، بہادر شاہ کے وزیر کل، الہامات منعمی، مکاشفات منعمی وغیرہ

مصنف، وفات ۱۲۳ھ،

"وقتے این سہ بیت کہ تازہ گفتہ بود پیش میاں صادق، القاقواندہ، وایشان نقل کرد "

بعد ازاں مرزا بے دل و دیگر شعرا بہ جواب اُن پر داختمند،

چہ شد کہ منقسم فرمان دے ہفت اقلیم حروف سکّام اما در بند ز روسیم

من از صحرا فردان جنون قدر دگر دُم بیابان می کند از گرد پاؤ انداز تعظیم

سپندم، شعلہ ام سوز دل پروانہ عشقم کد میں شمع محض سوختن ہا کر و تعلیم

لے اس کے متعلق میرزا کا کوئی خط در قعات بیدل کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں نہیں ملے، ان کا داغ خراب تھا، جو مکتوب لکھا ہے "فیتر جمع شعرا دادہ بود بہ طلب ایشان رفت، فرمودند شعرا نامرعی بود، خود گذشت بے دل قدسے و قوی داشت اہم مرد، حالاً شاعر منعم، اِس زمرہ کا حقیقی درمیان صرف می کنی، یہ سنو کہ در شراب شاہ صرف کم،



نظام الملک، شاگرد بے دل، ”ہر گاہ بہ خانہ مرزا قیصرین می آوے، میرزا شرائط استقبال بجا آوے، ہم دست شدہ، اندرون دولت خانہ می برو، وصحبہ رنگیں می داشت، واز اقسام طعام حلوائے بیضہ مرغ بہ مذاقش گوارا افتادہ، بہ میرزا اکثر فرمایش آں می نمود، در وقت رخصت چون مرزائے مرحوم کتابے از قدامت کیلیمائے سعادت و نجات و دیگر ازیں عالم گی گذراندی گفت ازیں کتب ذخیرہ ہادر خانہ دارم، از تبرکات تصنیفات خود عنایت کیند و کتب و سفائن دست خط میرزا با خود می برد“

معاصرین و احباب میرزا، سرخوش، فقیر خوشگو شاہ گلشن را وسیلہ برانگیخت کہ ایشان را بریں پتہ باید آوے کہ بہ خانہ میرزا بے دل رفتہ صحبت دارند کہ ملاقات دو صاحب کمال فائدہ ہاوار، چہ از مدت تمدنابر بعضے اسباب در میان ایں ہر دو بزرگ جدائی بود، نیندہ فرمود ”ہوس تماشک جنگ قیلاں وارید، ایں مطلع گفت و پیش ایشان خواند،

از فضل حق زہر و جہانم گرفتہ ایم      یک در گرفتہ ایم و چہ حکم گرفتہ ایم  
فرمود فضل حق ہمہ جامی باید آلا دیں بیت“

(خوشگو نے لکھا ہے کہ آرزو اس اعتراض کو غلط سمجھے ہیں) سال وفات ۱۱۲۶ھ فضل حق ہوئے خوشگو  
ایزد بخش رسا، عزت کے شاگرد تھے، شیعہ سے سنی ہو گئے، سنی تخلص رکھا،

لے سرخوش کلمات الشعرا میں لکھا ہے، فقیرہ اشارہ میاں ناصر علی چندی بیت ایشان (یعنی بیدل) را از راہ شوخی پیش سرخ رسا نیندہ مطلع برجستہ ساختہ، اگرچہ ایشان شنیدہ مخطوطہ نشندہ از زوسے غیرتے کہ تلامذہ رحمن را باشد بہرودند، اما از منصف و عزیزان نازک فہم بسیار پندند، حکایتیہ و محیط اعظم میرزا بیدل بہ بازو بیت تمام کردہ ہوندر، فقیر در دو بیت رباعی بہ فصاحت تمام درست نمود، سرخوش نے مرزا کی تالیف بھی کی ہے ”سر آمد سخنور این کامل“ استاد فن امر و در شاہجہاں باد کوں رستمی می نوازود و او سخنور می دہد، در فقر و توکل باشاؤ وقت خود“ لے ان کے نام کے کئی خطرقات بیدل میں ہیں، جہاں تک مجھ یاد ہے، ایک صاحب نے ہمارا سا بن سخن کے حوالہ سے لکھا تھا کہ ناصر علی نے ایک شعر لکھا تھا جس پر انھیں بڑا ناگوار تھا، میرزا کے اشارے سے انکے شاگرد عبرت نے اس کا جواب لکھا تھا،

”بے دل کہ ہائیشان بیار بودی فرمودند کہ روزے در اثناے محبت باوے گفتم کہ مارا اور آخر تخلص شما لفظ ”ی“ نہ می آید، نظر بہ قامت دراز خود رسا مقرر سازید، قبول نمود و بر خاست تسلیم بجا آورد“

وفات ۱۱۱۹ھ

میر محمد زماں راسخ، ”با بے دل خیلے مربوط ہو دہ میر و مرزا حاجی اسلم، سالم و حکیم شیخ حسین شہرت در گجرات بہ لشکر شاہی با ہم ہم طرح بودہ اند“ وفات ۱۱۱۹ھ

ناصر علی سال وفات بے دل نے ”رنگ ناز شکست“ سے نکالا، ۱۱۱۹ھ

ناظم خاں فاضل قمی، ایران سے سندھ آئے، سندھ سے دہلی، ناظم خاں خطاب فرخ سیرنے دیا، شاہنامہ کے مصنف ہیں، اوّل عہد محمد شاہ میں وفات پائی،

حاجی محمد اسلم سالم، اعظم شاہ کے گجرات میں ذکر رہے تھے، اعظم شاہ کے مقتول ہونے کے بعد وار د دہلی ہوئے، بے دل سے اخلاص قدیم تھا، ملنے کے لئے آئے، شعر و سخن کی محبت رہی، بیدل نے چند شعر سنائے، سالم نے کہا،

”ایں ہمہ شنیدم، آں چہ دریں روز با بر حاشیہ نوشتہ شد از آں ہم باید خواند و غرض ازیں داشت کہ ترقی فکر معلوم کند، مذاقش ازیں جاتصور باید کرد کہ با ہم چو مرزا بے دل ایں قسم حرف زدہ و مرزا مرحوم در تمام عمر دیوان کسے بہ تلاش طلب نہ فرمودہ، مگر دیوان حاجی کہ چند شبانہ روز در مطالعہ داشت“

وفات ۱۱۱۹ھ

نصرت خاں عالی، ”مرزا بیدل ہر گاہ نامش بر زبان می آورد، بہ خطاب حاجی بخوی یاد می فرمود“

وفات ۱۱۲۳ھ

آقا براہیم، فیضان، پسر آقا محمد حسین خاں، ناجی، اکثر اوقات در خانہ اوجیح شغری بود، میرزا بیدل

صاحب را طلب می داشت، و ضیافت می نمود، صحبت می فرمایند، و قیام می نمود، و خوشگو ریزه چین فیوضات آل مجلس است، وفات ۱۲۳۰ھ۔

مرزا حسن، ذوالقدر تخلص، اوائل در سرکار شجاع در فرقہ سپاہیاں انتظام داشت، و بابے دل از مغزین محشود ہم طرح بود... فقیر اور ادراک کمال پیری کہ از نو دم تجاوز بود در مجلس مرزا معفوریہ ام وفات عہد فرخ سیر میں ہوئی،

حسین شہرت، بابے دل در سرکار اعظم شاہ یک جا گذرانیدہ، تا پنج وفات ۱۲۳۰ھ شہرت سے نکلتی ہے،

خواجہ عبداللہ ساقی، اعظم شاہی، از یاران بے دل، غفلت اللہ بے خبر، از صحبت وے بیار محفوظ شدند، آزاد بلگرامی کے حوالہ سے بے جزا اور بے دل کی ملاقات کا حال لکھا ہے جو بد بیضا اور سرور آزاد میں موجود ہے،

تلامذہ و مستفیدان بے دل، معنی یاب خان شاعر، از شاگردان رشید، ہمیشہ خدمت متعلقان بے دل می گرد، و بسبب ادہنگامہ عرس گرم بود، مرزا ابیارش می خواستند، از وے عنایت عصا شمشیر بے پروا بخشدہ بودند، چنانچہ تا حال بہ دست داشت، وفات ۱۲۳۵ھ،

محمد احسن سابع، بیدل سے فیض یاب ہوئے، علی التواتر بہ خدمت ایشان می رسید و مستفید می شد، لیکن بعد وفات بے دل شاگردی شہرت کی وجہ سے بے دل کے حقوق شاگردی کو بالکل فراموش کر گئے،

گور بخش حضوری، بابے دل سالما صحبت داشتہ مشق سخن بہ کمال رسانیدہ،

میر محمد احسن، ایجاد، اعظم شاہ کے لشکر میں تھے، و آں جا بابے دل و سالم و گلشن صحبت ہے

لے خوشگو کہتا ہے کہ یہ مادہ تا پنج میرا ہی، لیکن یہی سرور آزاد میں بھی ملے، ایجاد کے نام کا خطر رفات میں ہوا ان کی سفارش بھی ایک امیر سے کی تھی،

مستوفی داشتہ، شاگرد بے دل، تخلص بے دل کا عطیہ، وفات ۱۱۳۲ھ،

میر عبد الصمد سخن، سخن تخلص از بے دل یافتہ، اوائل میں شاگرد تھے، وفات ۱۱۴۱ھ

شیخ عصمت اللہ کامل، از بے دل تخلص یافتہ، روزے جہدِ مردِ خودے خوش اسلوب از ساخت  
برہان پور نذر ایشان آورد، مرزا فرمود ترکیب این جہد صبر بہ نشان برہان پور برہان قاطع ست کامل  
نظر بر رعایت دو ایہام درین رعایت کردہ، تصدیق گردید، دے چوں ہم راہ منصب دارانِ قلیل البضاعت  
بسمی بردرونمے... در شکوہ لم قراری خویش برخواند

فلاطون گریا میدی شود عا جز بہ تدبیرم کہ منصب آتشیں اغے شد و جا گیر جاں گیرم  
ہماں دم آں حضرت بجائے آتشیں، لفظ آتشک رسانیدہ اصلاح فرمودند، وفات عہد فرخ سیر  
حافظ محمد جمال، تلاش، از تخلص یافتگان بے دل، در عہد عالم شاہ دیدنش می شد، میزباید  
ازیں آتشیں خطوطی بودند،

بروز عید ہر شاہ و گداکم می کند خود را توفیق بر سمند ناز و من از خوشنیت رنتم  
احمد عبرت، مرزا بے دل را توجہ خاص با او بود، چنانچہ برکت انعام مبتکرہ ایشان بہ پایہ سخن  
رسیدہ، تخلص از آں جناب یافت، وفات ۱۱۳۵ھ، از سانچہ او تا دیرے انکبار بودند  
سید معنی قانع، گویند شاگرد بے دل، میر معصوم وجدان، چندے شاگرد بے دل۔

محمد اشرف، حسرت، ہر صلی بے کس، سری گو پال تبر، محمد پناہ قابل، تلامذہ بے دل،  
محمد عطاء اللہ عطا تخلص، از ساکنانِ مردہ ہر مراد آباد بود، طبع رسا داشتہ، در عہد مبارک محمد شاہی  
بہ توجہ... رلے صاحب اندرام، تخلص بہ خطاب خانی سرفروزی یافتہ، از شاگردان مرزا بے دل پڑ  
طبعش بہ لطافت و ظرافت بیشتر میل داشت، ہر گاہ در بزم شریفش باری یافت، مرزاے مرحوم

لے سخن کے نام کے خط بھی رقعات میں ہیں، لے نکات الشعرا میں بھی عطا کا ترجمہ ہے،

برائے خاطر و اشعار موصدقہ موقوف نموده، ہزلیات درمیان می آورد، و اکثر می فرمود، استحقاق تیغ و تلخ دیوان ہزلیات عطا دارد، و قتی مرزائے مغفور قلم دانے و بیاضے کہ از اشعار منتخب خود نوشته بود بہ او عنایت فرمود، این رباعی در شکر آن گذرانید:

بے دل شہ اقلیم کمال ہر فن از گوشہ چشم تا نظر داشت بہ من

از روض عنایت قلم دان و بیاض فرمود مرا وزارت ملک سخن

بہ ہمہ حال مرد عزیز بے بود، حرکات تکلیس از و سری زد و زینت مجلس با بود، روزے تایید و وفات میرزا بے دل در مجمع شعرائی خواند و می گفت صفت، آل ست کہ در وزن خالق باری گفتہ ام:

عبد القادر بے دل رفت، در سال ہزار و صد و سی و ششم در دار الخلافہ بہ رحمت حق پیوست، و وفاتش رونق مجمع عرس میرزا بر ہم خورد و اشعارش کم بدست آمدہ این قدر بیا و ماندہ:

بر خور واریگ فروی، شاگرد بے دل وفات <sup>۱۱۹</sup> "در احمد آباد بہ سبب نوکری.... بادشاہی

بسیار ماندہ"

شاہ گلشن، "اکثر بہ زبان می راند کہ در زمانے کہ... بے دل صاحب سی ہزار بیت شدہ،

در فکر سخن ترقی کرد، میاں ناصر علی از ترقی باز آمدہ بہ ہر قدر کہ نصیب گردور، در ساخت ہن تاژ

بہ فکر آمدہ بودم، این ہر سہ دور یکے بود، میرزا بے دل تخلص من گلشن بہ ایشان، و تخلص سخن بہ

میر عبد الصمد بہ یک روز عنایت کردہ، "وفات جمادی الاولیٰ <sup>۱۲۰</sup> "جائے گلشن بہشت بد"ی

سے تایید مکتبی ہے،

سکھراج سبقت، وطن اصلی نواح کھنڈ، آبا و اجداد اسد خان وزیر کے نوکر تھے، سبقت بہت

ملہ میاں پر کوئی نفاذ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو گیا ہے، از رونے مجمع القاس میں گلشن کی زبانی لکھا ہے کہ میرزا تخلص بہ من دوا چوں نسبت گل و گلشن (شاہ گل ان کے پیر تھے) ملاحظہ کردم اختیار نمود ہوشیاد و سر جانتیہ تبدیل در اشعار میں کردہ باشد

علوم میں دستگاہ رکھتا تھا، اور فنونِ سیاق میں یگانہ آفاق تھا، از شاگردانِ بے دل بود و میرزا اکثری فرمودند کہ سبقت بر جمیع ہندو بیچگان فائق ست۔“

کچھ دنوں سید اسد اللہ خاں معروف بہ نواب اولیا، عمہ زادہ سید قطب الملک کا میر سامان اور دیوان رام، دکن کی لڑائیوں میں امیر الامرا حسین علی خاں کے ساتھ شریک تھا، امیر الامرا کو داؤد خاں پر جرح ہوئی تھی، اس کے حال میں سات سو شعروں کا جنگ نامہ لکھ کر پیش کیا تھا، اور پانصدی منصب پر سرفراز ہوا تھا، ہنگامہ سادات کے رفع ہونے کے بعد مالوہ میں تین سو سواروں کا چارہدا تھا، راجا گر دھربہادر سے جن کا ملازم تھا جھگڑا ہو گیا، اسی میں قتل ہوا، کہ دیکھراج زما سبقت سے تاریخ وفات (۱۱۳۸ھ) نکلتی ہے، دیوان میں دہزار کے قریب شعر تھے، ضائع ہو گیا،

”فیتر خوشگوار عنفوانِ شعور بہ خد متش بندگی داشتہ، در سائلِ عروض و قافیہ و معما و اکثر دواوین تازہ گویان پیش او گذر آید، چوں نسبت ہم عمری دانستیم، بے تکلفانہ توجہ نمود۔“

منزلِ خاں صفت و قابل، شاگرد، وفات بے دل کی تاریخ ختم کلام سے نکالی ہی لیکن اس میں ۱۰ کا اضافہ کرنا ہو گا، از سرینائی دل گفتہ شد ختم کلام، وفات ۱۱۴۲ھ،

میر محمد علی، راج، شنیدہ شد کہ او شاگردِ غائبانہ میرزا بے دل ست، و برضے گویند شاگردی میر محمد زماں راسخ کردہ۔“

اندرام، مخلص، اوائل میں بے دل کے شاگرد، شیورام داس جیا، شاگرد، وفات ۱۱۴۲ھ، حکیم چند ندرت، ”بارہا صحبت بے دل، و دیگر شعراے نام دار یافتہ۔“

لے اردو کے بھی شاعر تھے، ملاحظہ ہوتا کہ فتح علی خاں گرویزی ۱۱۴۲ھ تو فتح علی کہ مخلص کی مرآۃ الاصطلاح دیامرۃ المصطفیٰ اس وقت نام ٹھیک یاد نہیں، جس میں بہت سے شاعروں کا ذکر آگیا ہے، بے دل کے ذکر خالی نہ ہوگی، لیکن اس میں بے دل کے متعلق کوئی بات نہیں ملی،

نصرت اکثمیری الاصل، متوطن لاہور، بے دل کی یہ بیت خود دیوان میں ہو، لاہور میں نصرت کے نام سے مشہور ہے،

چشم پوشیدہ نواں کر سفر

پہ قدر راہ قنا ہموار ست

جلد ثالث کا قلمی نسخہ اغلاط سے خالی نہیں، لیکن اغلاط اتنے زیادہ نہیں جتنا ترجمہ بے دل کی نقل کو دیکھ کر میں سمجھا تھا، یہ نقل ایک عربی کے فارغ التحصیل طالب العلم نے کی تھی، اور کتابت کے بڑے بار میری ہدایت کے مطابق اصل سے اس کا مقابلہ بھی کر لیا تھا، یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ نقل میں جو اغلاط ہیں وہ اصل سے مطابقت ہونے کی وجہ سے ہیں، میں نے اسے معارف کو بھیج دیا تھا، اسکی اشاعت کے بعد جب میں نے خود اصل سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ اگرچہ چند اغلاط کی ذمہ داری کاتب سفینہ اور کاتب معارف کے سر ہو لیکن بیشتر اغلاط نقل کرنے والے صاحب کی بے پروائی کا نتیجہ ہیں، تصحیح میں گل رعنا مصنفہ شفیقہ اور سفینہ عشرت مصنفہ درگاہ اس سے بھی مدد لی ہے، ان دونوں تذکروں میں بے دل کا حال بڑی حد تک سفینہ خوشگو سے لیا گیا ہے، اور جا بجا سفینہ خوشگو کی عبارتیں آگئی ہیں، بعض امور کے متعلق میں نے جناب ریاض حسن خاں صاحب خیال کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا ہے، اور ان کا بہ غایت ممنون ہوں،

ان اغلاط کی تصحیح حسب ذیل ہو:

صفحہ ۳۵ ترجمہ بیدل کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے (جو حذف ہو گئی ہے)

۱۔ عزالت نے عائشہ سفینہ میں لکھا ہے، کہ میں نے کمر یہ شعر خود نصرت کی زبان سے سنا اور وہ اپنے کو بے دل کا شاگرد کہتے تھے ۲۔ دیوان مطبوعہ میں ایک غزل اس زمین میں ہو لیکن یہ شعر نہیں، بحقیقت میں اس زمین کوئی غزل غالب نہیں، سوائے ان میں بھی یہ شعر نصرت کے نام مندرج ہو

بدن کہ خامہ سنبھلستان بنگا و جین سائے آستان پاکست و دل غنچ مثال پردہ کشائے حقیقت ایجا  
 بوے گل نفسے کہ شگفتگی اندجین بہار آئینش گلشن گلشن بہ خود بالیدن داشت، و بزرگی از ذوات عرض  
 کما لائن عالم عالم سامان و کان چیدن می پناشت،

بایدم شستن لب از مشک و گلاب تا گویم نام آن قدسی جناب  
 سامعہ را وقت گل چینی رسید تا مقدر اربع حقینی دید

درویش پائشا و داغ پوست تحت سرفرازی، پادشاہ (غایا یہاں پر کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے)،  
 فراخ تحت ردائے بی نیازی، ابر و بار، شکوہ آسمان کمال، (۹) خورشید آسمان و قار جہان قال و  
 حال، آئینہ منظر قدرت الہی جاے لبالب و قدرت لامتناہی، قبلہ لفظ و کعبہ معانی، کد خدائے سخن  
 و خداوند بخندانی،

مرزا بے دل کہ رہ نامے سخن ست پیغمبر و غوث و پیشوای سخن ست  
 یکتا ست در آفریدن طرز کلام باندہ کہ بے سخن خدائے سخن ست

نگہت گلستان و بوستان نذر شائے سامعہ باد بہ استشمام از احواش سعادت کما لائن  
 دکن (۱۰) سطرہ اربعی سبقت کی بیت اول سفینہ اور سفینہ عشرت میں یوں ہو مصرع ثانی کے بعض  
 الفاظ کی صحت میں اب بھی شک ہے،

آن ذات ابد قدرت منزلیہ مقام عبدالقادر غوث نقشبش نام  
 سطر ۱۶ سکھان راسے، سکھ راج،

صفحہ ۳۵۹ سطر ۲ بہ قوت ریاضی بر ماضی و مستقبل روزگار اطلاع داشت، سطر ۱۲  
 انتخاب جز و زمان، سطر ۴ جنش مزگاں پے نم خامہ تحریر بود، سفینہ چہار عشر مطبوعہ اور چہار  
 کے تین قلمی نسخوں میں ہے نم، لیکن جناب خیال کی رے میں، باغم یا پر نم ہونا چاہئے، بے نم سے

لکھنے وقت  
 قلمیں زمین کی  
 تینوں پر کلم  
 نہ ہرگز نہ تاج  
 چچ بنی کجک  
 جس کا ہمارے  
 سر کرنے میں آئے  
 خامہ خوب ہے  
 ہنرمند بنیم  
 ہے راجا  
 بنیاں



ان کے نزدیک ”پیہم“ بھی مرجع ہے، سطر ۱۱، میرزا قلیندر برادر اعیانی مرزا عبدالحق سطر ۴، اباد شاہ داشت سطر ۱۹ عارضۂ تب،

صفحہ ۳۶۰ سطر ۱۰ سر نہ ولا، جناب خیال نے اس کی جگہ سرمہ سا بخوڑ کیا ہی، سطر ۱ بہ صحت نہ گریہ سطر ۱ گردن رعونت تارک از تافت، سفینہ میں اسی طرح ہے، لیکن یہ مصرع غلط ہی، سفینہ عشرت میں اس مقام پر گردن رعونت برفلک تافت، خوشگو نے غالباً اسی طرح کھا ہوگا، سطر ۱ گذشتے سطر ۱ انفاں خوش سطر ۴ بوسے عجیش،

صفحہ ۳۶۱، بہتر از وقتش سطر ۱۰ ضروریات راہ مدکار

صفحہ ۳۶۲ سطر ۱۰ یعنی بسر سطر ۱۰ میر کا مگار سطر ۱۰ بہ سبب فرمایش، سفینہ میں ”بہت فرد جناب خیال کی رلے میں“ بہ سبب فروزش، سطر ۱۰ بہ مزاج،

صفحہ ۳۶۳ سطر ۱۰ نگاہ سطر ۱۰ شادم الخ، یہ شعرا یک منزل کا ہے جو کلیات میں موجود ہے، قافیہ گاہ گاہی ہونا چاہئے، سطر ۴ وہ زلزلہ آشفنگی بنیاد سطر ۵ از بدو شعور سطر ۶ واپ خود سطر ۷ پشتہ سطر ۸ واپ بادہ زب زور نہ گنجد در ظرف، سطر ۸ اگر خامہ،

صفحہ ۳۶۴ سطر ۱۰ در تگ دو دو، سطر ۲ دو ہزار، سطر ۵ عکس خوں از آہن، سطر ۶ داشتہ سطر ۷ بولاس،

سفینہ میں ابولاسی، یہ لفظ تذکروں میں کئی طرح آیا ہی، گل رعنائیں ابولاسی ہی اور منوہر سہا صاحب انور ایم ہے دہلوی معلوم ہوا کہ یہ صحیح ہی ابولاسی بہ داؤد بھول ہی، سطر ۱۱، بسیار داشت، سطر ۱۲ حشیم ہاے خجستہ سطر ۱۳ سطر ۱۳ شش گره، سطر ۱۴ آہستہ و جدا جدا،

صفحہ ۳۶۵، سطر ۲ باز شدے سطر ۶ زیادہ گذشتے، سطر ۸ داشتے، سطر ۹ و میرزائی از سر پایش

می بارید، سطر ۱۱ کہ بہ اصلاح غزبیش نیاز افتادست، یہ مصرع سفینہ، سفینہ عشرت اور گل رعنائیں میں ہے کہ بہ اصلاح عزیزانش نیاز الخ، اس طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، جناب خیال نے اس مصرع کی

تین ٹیکس پیش کی ہیں (۱) کہ باصلاح غلط ریش بہ ناز الخ (۲) کہ بہ اصلاح خط وریش بہ ناز الخ (۳) کہ بہ اصلاح خط وریش دراز الخ سطر ۱۳، بدسرشتہ

صفحہ ۳۶۶، سطر ۱۰، قافیے میں یائے معروف چاہئے، مزید تصحیح آئندہ ہوگی، سطر ۴ نیز نگ سطر ۶ چہر فی چہر فی، سطر ۱۰ استادان می باشد سطر ۱۱، در اکیلات میں وگرا

صفحہ ۳۶۶، سطر ۲ ہر گہ سطر ۴ چہر علم بہ حشت، سفینہ و سفینہ عشرت میں سیطر ج لیکن اکیلات میں علم چہر حشت " سطر ۳ چہر گہ سطر ۴ چناں، سفینہ در اکیلات و فوں میں اس طرح ہی چناں، سطر ۴ اکیلات، سفینہ میں اسی طرح لیکن جناب خیال کی رائے میں کنایت ہو تو عجب نہیں لیکن گل رعنا کے مصنف جو کچھ لکھا ہی، دو کتابت " کا موبہ ہی صفحہ ۳۶۶ سطر ۲، محل کس، سطر ۶ درنگے بے اندازہ سطر ۱۱ یا ہزار، صفحہ ۳۶۶، سطر ۱۰ لفظ مسلم کے بعد کاتب نے عبارت ذیل حذف کر دی ہی، میدارید، ناظم خاں گفت از قدماہر کہ باشند بن آں حضرت ہفہ شعرا، صفحہ ۳۶۶، سطر ۲ ہمیں قسم سطر ۲ گہ صفحہ ۳۶۶، سطر ۴ نہایت رونے پانصد بیت سطر ۲ لنگ لنگان بہ سر منزل سطر ۲ الب بدہ، چہر بد عقیق سطر ۲ اخفت

سطر ۱۱، از چہ سطر ۳ اجاز سطر ۱۳، بر کہ بدل سطر ۱۳، مصرع اکیلات میں یوں ہی " اور یہی صحیح ہی کا فادہ چہ بار از کہ ستر کہ بدل سطر ۱۱ چناں، سفینہ میں صاف پڑھا نہیں جاتا، گل رعنا میں چہ سراں اس میں چوں کی جگہ خوں بھی ہی " اس مصرع کی صحت میں شک ہی، سطر ۶ مصرع ۲ گل رعنا میں یوں ہی، گل بد نہ چہر بود نامہ از کہ زیار بیت ثانی کی صحت میں بھی شک ہی، سطر ۱۱، از اند کہ کردہ، سطر ۱۱، ہزار بیت، صفحہ ۳۶۶، سطر ۲ ماہمہ، صفحہ ۳۶۶، سطر ۱۱ افشا نہ اکیلات میں نشاندہ سطر ۱۱، خلقت سفینہ میں خلوت، اکیلات میں خلقت، " سطر ۱۰، نہ پیش اکیلات بہ پیش صفحہ ۳۶۶، سطر ۲ بگس سطر ۱۱، مصرعی، صفحہ ۳۶۶، سطر ۲ جان و جید سطر ۱۱، ہرات، سفینہ میں ہرات کو کاٹ کر ہرات بنا دیا ہی، در جل ہرات ہے، سطر ۱۱، بزبان ہاست سطر ۱۱، بیت از قصائد، صفحہ ۳۶۶، سطر ۲ ہجر بہ تم سطر ۲، گرش سطر ۱۱، نفاق و حد سطر ۱۱، حد نفاق، سطر ۱۱، آخر میں یہ الفاظ کاتب نے حذف کر دئے ہیں، " اس اشعار از آں جاست، اس کے بعد اشعار ہیں، جن کی تعداد کم و بیش ۳۰۰ ہے،

# تلخیص تبصرہ

## رومانیہ کے مسلمان

براہم یورپ کے قریب قریب کل حصوں میں مسلمان آباد ہیں، خصوصاً اس حصہ میں جو فلینڈس خطہ  
مستقیم وسطی یورپ ہوتا ہوا ٹریٹیا تک چلا گیا ہے، ان کی تعداد اور اقتصاد و سیاسی حالت اتنی ترقی پذیر  
کیہاں کی اکثریت رکھنے والی قومیں ان کو خوف و خطرہ کی نظر سے دیکھتی ہیں، یہ سارے مسلمان اپنے  
ملک و قوم کے فکس اور اس کے ٹوہر قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں،

یورپ کے متوطن تمام مسلمان اپنی مذہب اور اپنی روایات و رسوم کی حفاظت کے ساتھ یورپی تہذیب  
میں یورپین اقوام کے دوش بدوش ہیں، ان میں رومانیہ کے مسلمان سب سے زیادہ اپنے دین و روایات  
کے محافظ ہیں، ان میں بھی ڈوبروڈجا کے مسلمانوں کو خاص امتیاز حاصل ہے،  
آبادی کا بڑا حصہ ترکی انس ہے،

ڈوبروڈجا کا علاقہ رومانیہ کے اہم ترین حصوں میں ہے، اسی لئے وہ زمانہ قدیم سے حکومتوں میں  
تنازعہ فیہ چلا آتا ہے، مشرقی یورپ میں کوئی حصہ اتنا حسین نہیں ہے، تین سمتوں سے پانی سے گھرا ہوا چھٹی  
سمت میں کوہستان کو اڈری لاٹر کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے، اس کے دامن میں نہایت شاداب اور خوبصورت  
جھاڑیاں ہیں اور ہر طرف چھوٹی چھوٹی نہریں روان ہیں، ان میں بعض معدنی جھیلین بھی ہیں، جن میں  
غسل کے لیے ہزاروں ہزاروں مریض آتے ہیں، یہ حصہ جنگی نقطہ نظر سے رومانیہ کے لئے اتنا ہی اہم ہے

جتنا روس کے لئے جزیرہ قرم،

ڈوبروڈجا کا لفظ ڈوبریچ سے مشتق ہے جو چودھویں صدی کے نصف میں ڈارنہ کا بڑا باغی تھا

حکمران تھا، اس حصہ میں دیسیر کے قبائل آباد تھے، ان کے بعد یونانی آباد ہوئے، پھر کچھ پھر بلغاریہ، ان کے بعد قزمان پھر بیزنٹینی آخر میں مسلمان ترک آباد ہوئے، ان کی آبادی کی تاریخ یہ ہے کہ ترکی حکومت نے ایک زمانہ میں اس علاقہ کو ترکوں کی آبادی کے لئے مخصوص کر دیا تھا چنانچہ ایک ترکی افسر بابا صالحا لائق وہ وہیں ہزار ترکوں کے ساتھ اگر یہاں آباد ہوا، اور ۱۲۶۳ء میں اوس نے یہاں ایک شہر بسایا، جو داغ بابا کے نام سے موسوم ہوا اور سرزمین یورپ میں ترکوں کی فتوحات کے ساتھ ڈوبروڈجا اور دوسرے یورپین علاقوں میں برابر اسلام پھیل گیا، اور ترکی مسلمان ڈوبروڈجا سے لیکر انتہائی شمالی حصہ سانجہ تک پہنچ گئے، اور ان علاقوں کی حفاظت کے لئے انھوں نے بڑے بڑے جنگی استحکامات اور قلعے تعمیر کرائے، ان میں بابا داغ کا قلعہ سب سے زیادہ مستحکم تھا، اسے سلطان محمد اول نے تعمیر کرایا تھا،

اٹھارہویں صدی کے وسط میں کریمیا کے فوجی مسلمانوں کی بڑی تعداد ڈوبروڈجا میں آ گئی، ان کے علاوہ عرب اور چرکسی فوجیں بھی آکر آباد ہوئیں، لیکن یہ دونوں سین اسٹافانو کے معاہدہ ۱۸۷۸ء کے مطابق لوٹ گئے، اور ڈوبروڈجا پورے ۶۰ برس تک عثمانیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد چڑو کے لئے روسیوں کے قبضہ میں چلا گیا، لیکن پھر ۱۹۱۸ء میں معاہدہ برلن کی رو سے رومانیہ کو مل گیا، اس وقت سے پھر یہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھنی شروع ہو گئی، اور ان کی تعداد ڈھائی لاکھ تک پہنچ گئی، اور انھوں نے اپنی زندگی کا مادی نظام یورپین تہذیب اور روحانی نظام اسلامی شریعت کی بنیادوں پر قائم کیا، لیکن پھر ان کے رومانیہ کو ترکی میں نقل مکان کی وجہ سے رومانیہ میں ان کی تعداد گھٹ کر ڈیڑھ لاکھ رہ گئی، ان کی آبادیاں نہایت مرتب و منظم ہیں، مکانات اور عمارتیں عمدہ کاری اور

سرگزین اور گھلیان بہت کثرت اور مرتب ہیں، آبادیان نہایت وسیع کثرت اور بڑے بڑے میدانوں اور باغوں سے بھری ہوئی ہیں، سرگزین کے دورویہ شاداب اور سایہ دار درختوں کی نہایت مرتب و خوشنما قطاریں ہیں، ان کی آئینہ بگی اور سیلیفون کے تار کمزری کے جالے کی طرح تے ہوئے ہیں، ہر سو قدم پر بکلی کے بڑے بڑے لب شہرون اور دیہاتوں کو بقیہ نور بنائے رہتے ہیں،

رومانیہ کے مسلمانوں نے ترکوں اور دنیا کے دوسرے مسلمانوں سے بھی تعلق قائم رکھا ہے، ان کی بہت سی مجالس اور انجمنیں ہیں، جو عالم اسلام سے اس کا تعلق قائم رکھتی ہیں، ڈوبروڈجا کا کوئی قریبی علاقہ مجالس سے خالی نہیں، جو مسلمانوں کی معاملات کی نگرانی اور سوسائٹی میں ان کی سطح بند کرنے کے فرض انجام دیتی ہیں، ان مجالس کا وہاں کے مسلمانوں پر بڑا اثر ہے، اور ہر مسلمان ان سے تعلق رکھنا اور ان کی امداد و اعانت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے،

ان اسلامی انجمنوں کے علاوہ ڈوبروڈجا کنگری حریت تشکیلاتی کے نام سے بہت سی غیر مذہبی انجمنیں بھی ہیں، گو یہ انجمنیں اسلامی انجمنوں کے رسمی قیود سے آزاد ہیں، لیکن ان اسلامی امور میں جن کا مسلمانوں کی فلاح اور ان کی ترقی سے تعلق ہے، اسلامی انجمنوں کی پوری معاونت و مددگار ہیں،

ڈوبروڈجا کا علاقہ چار حقوق یا چار ضلعوں میں تقسیم ہے، ہر حق میں ممتاز علما دین سے مسلمانوں کا قاضی اور مفتی ہوتا ہے، پھر اکابر علما دین سے ان حقوق اور قضا کا ایک افسر اعلیٰ ہوتا ہے، تمام اضلاع کے قضاہ مسلمانوں کے جملہ امور خصوصاً ان کے شخصی معاملات اور مذہبی اجتماعی اور ثقافتی مسائل میں اس کے احکام کی پابندی کرتے ہیں،

ڈوبروڈجا میں ساڑھے چار سو نہایت خوبصورت مسجدیں ہیں، ان میں بعض بہت بڑی ہیں اکثر مسجدیں استنبول کی مسجدوں کی طرز کی ہیں، ان کی نگرانی اور آبادی کا خاص انتظام ہی بعض مسجدیں دو مسلمانوں نے بنوائی ہیں، اور بعض اسلامی انجمنوں نے مسجدوں کی ضرورت کے لئے رومانیہ کی حکومت اور

میں پستی زمین مفت دیتی ہے، کچھ امداد بھی ملتی ہے، سب بڑی اور خوبصورت مسجد کو مسجد کی جامع کا بنو اور نجارست کی جامع "بارک کارون" ہے، یہ دونوں مسجدیں شاہ کیرول نے مسلمانوں سے اخلاص و محبت کے ثبوت میں اپنی جیب خاص سے بنوائی تھیں، مرحوم شاہ فواد مصر نے جامع بارک کارون کے لئے سالانہ امداد بھی مقرر کی تھی، رومانیہ کی حکومت نے ائمہ و ذنون کی تحریکوں اور مسجد کے دوسرے مصارف و کھارج کے لئے انگوڑے بڑے بڑے باغات وقف کئے ہیں جن کی آمدنی اسلامی انجمنوں کی نگہبانی میں مساجد پر صرف ہوتی ہے، ڈوبرو جاکٹر جی حرت تشکیلاتی کی مجالس زیادہ تر مسلمانوں کے ثقافتی اور سیاسی امور کی نگرانی اور امداد میں متعلق کام کرتی ہیں،

ہر شہر میں چھوٹے بچوں کے مدارس ہیں جن کی مدت تعلیم دو سال ہو، مدرسہ ابتدائی کی پانچ سال بعض شہروں میں ثانوی مدارس بھی قائم ہو گئے ہیں، ان مدرسوں میں جمہوریہ ترکیہ کے اصولوں پر ترکی زبان میں تعلیم ہوتی ہے، مسلمان بچوں کے لئے بھی ابتدائی تعلیم جبری ہے، سب بڑا مدرسہ مجیدیہ جو رومانیہ کے ٹرنینگ کالج کے برابر ہے، اس میں ترکی اور عربی دونوں زبانوں کی تعلیم ہوتی ہے، حکومت اور اسلامی انجمنوں کے درمیان پورا تعاون و اتفاق ہو

## اندلس کا دماغی ترکہ کتب خانہ اسکولیاں میں

قرنِ وسطیٰ میں جب کہ یورپ پر وحشت و جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، عربوں کا تمدن اسپین میں دنیا کو مطلع انوار بنا رہا تھا، اور اندلس میں دماغی سلطنت قائم تھی، اور قرطبہ کے علمی مرکز شمار کیا جاتا تھا، مغرب کے دور دراز مقامات پر اپنی روشنی ڈال رہے تھے، اور وہاں اسلامی حیالات انہیں ذرا کمال تک پہنچ گئے تھے لیکن سیاسی آندھیرن جگہ مصر و فیتون اور زمانہ کی گرد و غبار نے خود اسلامی سلطنت کے قیام ہی کے زمانہ میں اس بلند منارہ کو بار بار گرا دیا، اور اس کے خزانوں کو

منتشر کیا، اس کے بعد اسپین میں اسلام کے اقبال کا ورق ادا لگ گیا، اندلس میں جدید اسپین کی حکومت قائم ہوئی لیکن اس جدید حکومت کو اسپین کا یہ قدیم دماغی ترکہ نہیں ملا، اور تقصیب اور جہالت نے عربی کتابوں کے ایک بہت ہی چھوٹے حصہ کو باقی رکھا، جو اسکوریا ل کے تاریک کمردن اور بعض پہلک کتبچوں میں دفن کر دیا گیا، لیکن اس کے باوجود بھی سترہویں صدی عیسوی تک کے وسط میں عربی کی قلمی کتابوں کی تعداد کئی ہزار تھی، جو اپنی نوعیت میں بہترین حیثیت رکھتی تھیں، لیکن سترہویں صدی میں اسکوریا ل میں ایک ایسی آتشزدگی ہوئی، جس نے اس خزانہ کے تین حصہ کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، اس وقت تک اسپین کی حکومت عربی کتابوں کو ہر مطالعہ کرنے والے کی نگاہ سے چھپانا چاہتی تھی، اور اپنی مصنف بھی دینی اور قومی اثر سے متاثر تھے، اس لئے ان ماخذوں پر جن سے اسلامی سلطنت کے زمانہ کی تاریخ اور تہذیب و تمدن پر روشنی پڑتی تھی، بحث کرنے سے اجتناب کرتے تھے، اور اپنے ملک کے اس تاریخی حصہ کے متعلق صرف قومی ماخذوں سے کام لیتے تھے، اس لئے ان کی تحریریں تقصیب اور فرقہ پرستی کے جذبات سے لبریز ہوتی تھیں لیکن سترہویں صدی کے حادثہ آتشزدگی کے بعد اسپینی حکومت کی آنکھیں کھل گئیں اور مشرق کا زیریں نے عربی کی قلمی کتابوں کے بچے کچے حصہ کی جن کی تعداد ایک ہزار آٹھ سو پچاس تھی، ایک فرست مرتب کرنی چاہی اور کئی سال کی محنت کے بعد اس نے ایک فرست مرتب کی جس کا نام 'اسپینی عربی کتب خانہ اسکوریا ل میں' ہے، اس نے اس فرست میں عربی مجموعہ کے مضامین کو تفصیل کیساتھ پیش کیا ہے، اور ہر کتاب کے مباحث کا خلاصہ لکھا ہے، اس پر حواشی چڑھاے ہیں، اور شکل مقام کی شرح کی ہے، یہ فرست سترہویں صدی کے درمیانی زمانہ میں شائع ہوئی، اور متاخرین مشرق میں بعض نے اس پر یہ تنقید کی، کہ اس میں وقت نظری اور محقق نہیں پایا جاتا، لیکن عام رائے یہ ہے کہ اسکوریا ل میں عربی مجموعہ کتب کا وہ بہترین ذخیرہ اور عربی خیالات کے نتائج کی بہترین نمائندگی ہے، کا زیریں کی فرست کے شائع ہونے کے بعد سب سے اہم مسئلہ جس کی طرف لوگ متوجہ ہوئے تھا کہ

اسکوریال کے اس ذخیرہ سے ادون عربی روایتوں پر بحث کی جائے، جو اسپین میں عربوں کی تاریخ، اسلامی حکومت کی سیاست اور اسلامی سوسائٹی کی خصوصیات و تعلق رگمتی بین چنانچہ ایک جماعت نے حسین ایڈریس اور اسد شاہی نے عربی علوم و ادب کی تاریخ پر بحث کی اور ماسدی نے ایک بڑی کتاب شائع کی جس کا نام "اسپین اور اسپین کو تمدن کی تنقید" ہے، یہ کتاب ۱۳۷۷ھ اور ۱۳۷۸ھ کے درمیان فی زمانہ میں شائع ہوئی، اور وہ اندلس کے تمدن کی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہے، اور اس میں اسپین میں مسلمانوں کی سوسائٹی کی خصوصیات اور اسلامی خیالات کے مختلف گوشوں کے متعلق عمدہ روایتیں جمع کی گئی ہیں، لیکن عربی ماخذوں کے مطابق عربوں کی سیاسی تاریخ اب بھی ایک خواب فراموش رہی، لیکن اس کے بعد مستشرق یوسف کوئندی امین کتب خانہ اکادمی میڈرڈ نے سیاسی حیثیت سے عربی ماخذوں کا وسیع مطالعہ کیا، اور کئی سال اسکوریال کی قلمی کتابوں کی تحقیقات میں صرف کئے، اور اس کے بعد اپنی مشہور کتاب "اسپین میں عربوں کی سلطنت کی تاریخ" شائع کی اس تاریخ کا پہلا حصہ ۱۳۷۸ھ میں شائع ہوا، لیکن اسی سال کوئندی نے دُعا پائی، اس لئے اس کے مسودوں کے دو بقیہ حصے دوسرے سال شائع ہوئے، لیکن ان میں وہ خصوصیات نہ تھیں جو اس کی تاریخ کے پہلے حصہ میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، بہر حال پہلے حصہ میں فتح کے زمانہ لیکر حکم مستقر کے زمانہ یعنی ۳۶۶ھ (۹۷۶ م) تک کی تاریخ درج کی گئی ہے، دوسرا حصہ حکومت مائتہ ملک طوائف کی تاریخ پر سلطنت غرناطہ کے پیدا ہونے تک شامل ہے، تیسرے حصہ میں سلطنت غرناطہ کی تاریخ ۴۹۲ھ میں اس کے زوال تک مذکور ہے، لیکن ان دونوں حصوں میں بعض ایسی غلطیاں موجود ہیں جو مولف کو نظر ثانی کی نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہیں، تاہم ان میں بھی کوئندی کی تفتید و نظریات کا کافی حصہ موجود ہے، کوئندی نے خاص طور پر اپنے خیالات کو نہایت مراحت کیساتھ ظاہر کیا ہے، یہاں تک کہ آرم اور اپنی قوم و وطن پر بالخصوص ان واقعات کے متعلق جو زوال غرناطہ عربوں پر اسپینیوں کے مظالم ان کے عیسائی بنانے، پھر ان کے آبائی وطن سوخون کے سیلاب میں تھکانے و تعلق رکھتے ہیں نہایت سخت الزامات



لگاؤ ہیں ، اسکی وجہ یہ ہو کہ وہ عربی ماخذوں اور ان کی ریح و متاثر ہوئے یہاں تک کہ ڈخود اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ اوس نے عربی ماخذوں اور عربی روایتوں کی استعدت تقلید کی ہو کہ ایک یورپین جیسا دسکی کتاب کو پڑھے گا ، تو یہ سمجھے گا کہ وہ ایک عربی مؤرخ کی کتاب پڑھ رہا ہے ، یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے لیکن ہالینڈ کا مستشرق رہنما رٹ ڈوزی جس نے اندلس کی تاریخ کے مطالعہ میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا ہے اس کتاب پر سخت حکم کی ہے اور لکھا ہے کہ کونسی عربی زبان سب سے کم واقف ہے ، اوس نے ہزاروں واقعات غلط نقل کئے ہیں لیکن اسکی یہ رائے صحیح نہیں ہے ، کونسی عربی روایتوں کو نہایت خوبی سے نقل کرتا ہے ، اسکی کتاب میں جو غلطیاں ہیں ان کا سبب یہ ہے کہ وہ نظر ثانی کرنے سے پہلے مرچکا تھا ، اور اس نے عربی کے ان ماخذوں سے جو باہم مخالف تھے ، بغیر بحث و ترمیم کے بہت سی روایتیں نقل کی ہیں ، لیکن ان غلطیوں کے باوجود اسکی کتاب اندلس کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہے ،

کارڈون نے بھی اپنی کتاب "تاریخ افریقہ اور اسپین" میں کونسی کی طرح اون عربی کتابوں سے روایتیں نقل کی ہیں ، جو پیرس کے کتب خانہ میں موجود تھیں ، لیکن اوس نے اپنی مضمون سے بھی روایتیں نقل کی ہیں ، صرف اخیر فصلوں میں جو زوال و غرماط سے متعلق رکھتی ہیں ، عربی روایتیں نقل کی ہیں ، لیکن ان سب باتوں کو باوجود کاذبیری کی فرست اپنی نوعیت میں بڑا مشکل ہے ، صرف یہی نہیں کہ ڈاندلس کو دماغی سرمایہ کا مکمل خلاصہ ہو بلکہ اس کو اندلس کو تمدن کی برتری و تفوق پر بھی بہت سو دلائل قائم ہوئے ہیں مثلاً اس نے عربی کی بہت سی قلمی کتابوں کا پتہ چلا یا ہے جو سنہ ۱۸۰۰ء میں روئی کے کاغذ پر اور چند کتابیں سنہ ۱۸۰۰ء میں کتاب کے کاغذ پر لکھی گئی ہیں ، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اندلس کے عربوں نے کاغذ سازی میں بڑا کمال حاصل کیا تھا ، اس کے علاوہ بہت سی تاریخی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اہل عرب ہی نے جنگ میں ڈائنامیٹ کو استعمال کیا ، اس فرست سے اور بھی بہت سے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے ، جو اسکوریا ل کے طلعت کہ وہ میں کم ہو گئے تھے ،

# احسان علیہ

## سوئیٹ روس میں مسلمانوں کی تنظیم

موجودہ عالمگیر جنگ سے پہلے سوئیٹ روس کے صحیح حالات پر وہ خفایں تھے، برطانوی روسی اتحادیوں نے اس پردہ کو اٹھایا، اور برطانوی ذرائع ہی سے روس کے حالات کی دلکش تصویریں منظر عام پر آئے لیکن خصوصاً عربی زبان کے ذریعہ جو حالات چھپتے رہتے ہیں، ان کو روس میں مسلمانوں کی عام زندگی کا ایک اندازہ ہوتا ہے،

سوئیٹ روس کے زیرِ علم تقریباً کم کر ۵۰ لاکھ مسلمان آباد ہیں، جو پوری روسی آبادی کی تقریباً ایک چوتھائی ہیں، ان میں سے ایک کروڑ ۹۰ لاکھ ترکستان میں ہیں، ایک کروڑ تھوڑے زمین ۲۰ لاکھ سائبیریا میں، ۳ لاکھ لینن گراؤ کے اطراف میں، اور بقیہ اسی طرح روس کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں، ان میں سے دس لاکھ سے اوپر روس کی سرخ فوج میں بھی داخل ہو چکے ہیں، تھوڑے کے محاذ پر وہ اس وقت دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں،

روسی مسلمان سوئیٹ اتحاد میں مساوی حیثیت سے شریک ہیں، اس کے ساتھ ان کی جداگانہ داخلی تنظیم بھی قائم ہے، روسی علماء دین کی ایک مجلس مشورت قائم ہوئے مسلمان روس کے عام انتخاب سے ان علماء دین میں سے ایک "مفتی" کا انتخاب کیا جاتا ہے، جس کو "شیخ الاسلام" کا مرتبہ حاصل ہے، آج کل اس حلیل اللہ منصب پر رسولیف عبدالرحمن فائز ہیں، ۱۹۳۶ء میں

انہیں مسلمان روس کی مانیدہ انجمنوں نے اس عہدہ کے لئے منتخب کیا تھا، اس عہدہ پر ان کا انتہائی سابق مفتی روس فرخندہ یوسف رضا الدین کی وفات کے بعد علم میں آیا تھا، مفتی رسولیف عبدالرحمن جمعیتہ علمائے اسلام روس کی صدارت عظمیٰ کے منصب پر بھی فائز ہیں، جمعیتہ علمائے مسلمانان روس نے ۱۸ جولائی ۱۹۴۱ء کے ایک منشور میں مسلمانان روس کو موجودہ جنگ میں شریک ہو کر دشمنوں سے ملک کو بچانے کی دعوت دی تھی،

مفتی رسولیف عبدالرحمن روس کے ممتاز اہل علم میں شمار کئے جاتے ہیں، دینی علمی موضوعات پر ان کی قابل قدر تصنیفات ہیں اس وقت ۶۰ سال کی عمر ہے، قد درمیانی، آنکھوں سے ذکات و فراست ٹپکتی ہے، چہرہ پر خوبصورت حنائی ڈاڑھی ہے، جسم پر ڈھیٹلے ڈھالے مشرتی کپڑے، اور شرتر ترکی ٹوپی، ان کے کمرے میں عربی، فارسی، ترکی اور تاتاری زبان کی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ موجود ہے، جن میں تقریباً ۷۰۰ ناو قلمی کتابیں ہیں، روس میں اسلامیات پر کتابوں کا یہ نادر ذخیرہ تصور کیا جاتا ہے، سوویت روس کے مختلف خطوں میں اس وقت ہزاروں اسلامی مدرسے مسجدیں اور کتب خانے قائم ہیں جن سے مسلمانان روس کی ہیئت اسلامی کی تنظیم قائم ہے، اس طرح مسلمانان روس ایک طرف سیاسی حیثیت سے سوویت روس میں مساوی طود پر شریک ہیں، اور دوسری طرف اپنی دینی جمعیوں کے ذریعہ آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی تنظیم بھی قائم کئے ہوئے ہیں،

## ہرات کے چند آثار

افغانستان کے تاریخی شہروں میں ہرات کو نمایاں امتیاز حاصل رہا ہے، خصوصاً سلطان حسین مرزا کے زمانہ میں اس شہر نے مرکزی حیثیت سے بڑی ترقی کی، علما، ادبا، شعراء و دیگر ارباب علم اس دور میں یہاں جمع تھے،

تیمور کی وفات کے بعد شاہ رخ نے چشتیہ میں ہرات کو اپنا دار السلطنت بنایا کہا جاتا ہے کہ اس  
دود میں پورے وسط ایشیا میں سیاسی، اقتصادی و عمرانی حیثیتوں سے تنہا اسی شہر کو مرکزیت حاصل  
تھی، <sup>۸۸۵ھ</sup> ۱۴۸۲ء میں امیر حسین بای قرقہ یہاں کا فرما دیا ہوا، اس نے اپنے ۴۰ سالہ دود حکومت میں ہرات  
کو علمی، تمدنی، اقتصادی اور عمرانی حیثیتوں سے غیر معمولی ترقی دی، ہر خود کی تاریخی تصنیف، جامی کی  
طیغ غزلیات اور ہزاروں کے موسے قلم کے شاہکار اسی تاریخی شہر کی یادگار ہیں،

لیکن افسوس ہے کہ ہرات کے آثار قدیمہ میں سے بہت کم قواعد زمانہ کے دستبر سے محفوظ رہ گئے  
ہیں، بڑا حصہ تو زلزلوں کے ہاتھوں تباہ ہوا، اور کچھ چیزیں وحشی حملہ آوروں نے تباہ کیں، ان میں  
جو ہر شاہ بیگم ملکہ شاہ رخ کی ایک تاریخی مسجد بھی تھی، اب اس مسجد کا تھوڑا سا حصہ محفوظ رہ گیا ہے،  
ان یا تماندہ آثار میں ملکہ جو ہر شاہ بیگم کا مقبرہ بھی قابل ذکر ہے، یہ مقبرہ ایشیا کی خوبصورت  
بڑی ضریحوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، ایک دوسری قابل ذکر عمارت قلعه شاہ رخ، بھی بڑی  
اسکی تعمیر <sup>۸۸۵ھ</sup> ۱۴۸۲ء میں عمل میں آئی تھی، یہ قلعه ان دنوں سپہ سالار عام کی قیامگاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا  
ہے، افغانستان میں تشریف لانے والے صحابہ کرام میں سے حضرت عبداللہ الغباری رضی اللہ عنہ کا  
مزار مبارک بھی اسی شہر میں ہے، اور زمانہ قدیم سے مرجع خلافت ہے، سلطان غیاث الدین غوری نے  
جب اس شہر کو پایہ تخت بنایا تو <sup>۹۶۷ھ</sup> ۱۵۶۰ء میں یہاں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی تھی، وہ بھی اب تک محفوظ  
کھڑی ہے، پھر ہرات کی شہری آبادی میں بہت سی ایسی قدیم عالیشان عمارتیں اب تک محفوظ ہیں،  
بن کی دیواروں پر سنہری کچی کاری کے نادر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، جابجا کوئی خط میں آیات  
اک منقوش ہیں، سنگ موسیٰ، سنگ مرمر، سنگ سرخ اور مرصع لاجوردی نقش و نگار سے آراستہ  
یواریں کھڑی ہیں اگرچہ ان محلات کے لئے تاریخی یادداشتیں محفوظ ہیں، مگر ان کی عالیشان عمارتوں  
سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہرات کی عمرانی ترقیوں کے دوپہر شادی خانوادوں اور لرزے دولت کی قیامگاہیں

## ترکی کی صنعتی ترقی

ترکی کو نئے انقلاب کے بعد جب سر اٹھانے کا موقع ملا، تو اس کی سب سے زیادہ توجہ ملک کی صنعتی ترقی کی طرف مبذول ہوئی، اس دور کا آغاز ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا، حکومتِ ترکی نے مختلف غیر ملکی حکومتوں سے ایسے معاہدے کئے جس سے اس المال فراہم کرنے کا موقع ملا، پھر صنعتی ترقی کے لئے ملک میں مختلف قسم کے ادارے قائم کئے گئے جن میں سے ۱۹۳۲ء میں "سودا ربینک" کا افتتاح خاص طور پر قابل ذکر ہے، یہ بینک مختلف صنعتوں کی ترقی میں امداد پہنچانے کے لئے قائم کیا گیا ہے، ترکی کے اس صنعتی دور میں کان کنی کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، اور روز بروز اس میں غیر معمولی ترقی ہوتی گئی، مثلاً ۱۹۳۱ء میں پتھر کے کوئلہ کی نکاسی صرف ۲۲۰۰۰ ٹن ہوئی تھی، ۱۹۳۵ء میں ترقی کر کے ۳۴۰۰۰ ٹن تک پہنچی، اس سے پہلے عددِ ترکی میں پتھر کے کوئلہ کی نکاسی ہوتی تھی، لیکن اس مقدار میں بھرنے کے بعد نہ صرف درآمد رک گئی، بلکہ وافر حصہ برآمد ہونے لگا، اسی طرح ۱۹۳۶ء میں ترکی میں تانبہ اس قدر مقدار میں نکالا گیا کہ اس سال ساری دنیا کی نصف مقدار صرف ترکی سے حاصل ہوئی، اور اسی طرح اور دوسرے معادن سے تقریباً اسی مقدار میں مختلف چیزیں نکالی گئیں، ترکی میں ایک ادارہ مستقل طور پر قائم ہے، جو باہر بجا تحقیقات کر کے معادن کا اکتشاف کرتا ہے، اور ان جذبہ رسوں میں اتنے معادن دریافت ہو چکے ہیں، جس کی مثال ترکی کی تاریخ میں کبھی نہیں گذری، ترکی کی ان صنعتی ترقیوں سے ایسی بہت سی آبادیاں آج عالیشان شہر بن چکیں ہیں، پچھلی بڑی لڑائی سے پہلے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، مگر آج وہ اپنی صنعتی ترقیوں کے باعث ترکی کے اہم شہر قرار پائے ہیں،

”ر“

# انجمن کتب مردان حق کی تلاش

از

جناب یحییٰ اعظمی

دے مجھ کو کسی مسلم خالص کا پتہ بھی  
 سونے نین اب بھی ہیں یہاں منبر و فزا  
 ہے نعمۂ توحید بھی مسلم کی زبان پر  
 اللہ کا گھرا ب بھی ناز و نسی ہو معمول  
 ہے مسند ارشاد بھی تذکیر سے آباد  
 دستارِ فضیلت بھی سروں پر ہی قرین  
 دیکھو جسے ہے ولی مرتعین بھی بدوس  
 ہیں مدرسہ میں حکمت و دانش کے بھی جلو  
 مکتب میں ادا دانِ تعلقہ بھی ہیں موجود  
 اربابِ معارف کا بھی کچھ قحط نہیں ہو  
 جاری ہیں شریعت کے بھی احکام و ادا  
 یارب ہیں جہان میں علماء بھی حکما بھی  
 گلابنگ مناجات بھی ہے شور و دعا بھی  
 تسبیح بھی ہے زمزمہ حمد و ثنا بھی  
 پُر شور اذانوں سے ہی عالم کی فضا بھی  
 اصحابِ مواظب بھی ہیں اربابِ بُنی بھی  
 سر تا بہ قدم زہد و تقدس کی قبا بھی  
 اوڑھے ہوئے ہے فکر کی پارینہ روا بھی  
 بیہمی ہوئی ہے علم و معارف کی ضیا بھی  
 قرآن و احادیث کے ہیں نکتہ سرا بھی  
 اسرار و خواص کے ہیں یانِ عقد کشا بھی  
 ہر سو ہے بچی مسندِ افت و قضا بھی

ملت کی مجالس بھی اسی طرح ہیں سرگرم      اخبارِ پیمبر بھی ہیں اذکارِ خدا بھی  
ہے محفلِ عرفان بھی بیافانقون میں      آداستہ ہے دائرہ صدقِ صفا بھی  
ہر گوشہ خلوت کدہ زاہرِ مرقاض      گویا کہ وہ ہے جلوہ گرِ شمعِ حرا بھی  
کیا کیا نہیں اس عہد میں موجود ہیں      مطلوبِ آداب دین کو کچھ اسکے سوا بھی  
ہنگامے یہ سب کچھ ہیں مگر یہ تو بتاؤ  
ہیں آج کیسے دہرینِ مروانِ خدا بھی

## منکرِ خدا سے

از

از جنابِ حسرت ترمذی بی اے ایل ایل بی

ذرتے کو کس نے مرمور بنا دیا      قطرے کو کس کے فیض نے گوہر بنا دیا  
آئین کہاں سے شمس و قمر میں تجلیاں      کس نے زمین کو حسن کا پیکر بنا دیا  
کس نے زمین کو اک نگہِ حسن ساز سے      عرشِ برین و خلد کا پسیر بنا دیا  
کس کی لطافتیں ہیں چین کی بہار میں      جلوے نے کس کے لالہِ احمر بنا دیا  
سبزہ کو جو بہار کو، ابر بہار کو      کس نے نشاطِ روح کا منظر بنا دیا  
نگہت سے کس کی دامنِ گلِ عطریں      صحنِ چین کو کس نے معطر بنا دیا  
اس زندگی کی رگھڑ خوار زار میں      کس نے شعور و عقل کو رہبر بنا دیا  
اے منکرِ وجودِ خدا یہ تو غور کر      کس نے تجھے بنا دیا، کیونکر بنا دیا  
جو ہر پہ انحصارِ حیاتِ جہان سہی      کوئی تو ہے کہ جس نے یہ جوہر بنا دیا

تو اور اخراجات خدا سے قدیر سے یہ کس غرور نے تجھے خود سر بنادیا  
کیا ایک سانس کا بھی تجھے اعتبار ہے!  
بے اختیار! کوئی تجھے اختیار ہے؟

## یادگارِ انگڑ

از جناب انگڑ مراد آبادی مرغا

یہ مادہ احسین صاحب انگڑ مراد آبادی ایک دیرینہ سال بزرگوں کے صحبت یافتہ بزرگ تھے، اکثر  
شہدہ میں قیام رہا، شعر و سخن کا بھی ذوق تھا، ربا عیادت انگڑ کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے، افسوس کہ انھوں نے  
اپنے وطن مالون مراد آباد سے دسمبر ۱۹۷۸ء میں اپنے وطن اصلی کی طرف مراجعت فرمائی،  
حتیٰ مغفرت کرے عجب آزاد و مرد تھا۔ ذیل کی نظم ان کی زندگی کا آخری تبرک ہے،

تری نخل سے اٹھ کر خانہ دیرانی نہیں جاتی	نخل کرگل سے نکت کی پریشانی نہیں جاتی
نہیں مٹاؤ تو بے بھی احساس یہ کاری	خطا کا تھی خطایہ تھی پشیمانی نہیں جاتی
سموئے انکی مرضی میں ڈوبے راہ میں انکی	کہ تیری بات یوں بھی تو وہاں فی نہیں جاتی
لگا کر کہ دیا جو خاک میں انداک والوں کو	مگر اس پر بھی شاعری غزل خوانی نہیں جاتی
میں جھکا آئینہ سے جب تو تنہا کر بھراں بولیں	خود اپنی شکل بھی بے توجہ سے پہچانی نہیں جاتی
منہ بے بھی زور اپنا لگا یا فلسفہ نے بھی	تری دشت گرے نوع انسانی نہیں جاتی
جہات دہشت اک چلتی ہوئی گاڑی کے پیچھے ہیں	روانی تیری لے جتے ہوئے پانی چھلک جاتی
ہنسی آتی و فطرت مجھ کو تیرے رخسے پر	کہ پیری میں جوانی کی ہوس انی نہیں جاتی
تیر میں چکر میں ہیں حیراں ہیں پریشان ہیں	وہ دنیا میں کہ جن کی انتہا انی نہیں جاتی



مرا ہونا تو سورج کی طرح روشن ہوئے انگڑے  
مگر ہوں کیا یہ لاعلمی یہ نادانی نہیں جاتی

## جذبات اثر

از جناب اثر رحمانی ماہپوری

وہ رکھیں گے محرومِ حسرت کمانک	نہ پھیریں گے سازِ محبت کمان تک
سمیٹوں ترے غم کی دولت کمانک	بجلاؤں شکرِ محبت کمان تک
اُن آنکھوں سے جو دعوتِ دیدِ پاک	نہ کھائے فریبِ محبت کمان تک
وہ دل جو کبھی شاد و آباد دل تھا	کمان تک خرابِ محبت کمان تک
جو ہو کارگر، جذبہ شوقِ دل میں	دبے خواہشِ عرضِ حسرت کمان تک
کبھی فتحِ میدانِ الفت بھی ہوگا	ہزیمت پہ ہوگی ہزیمت کمان تک
طوبیٰ محبت میں یہ دیکھا ہے،	مرا ساتھ دیتی ہے قیمت کمان تک
سرِ بزمِ اوہ اُن کی دزدیدہ نظریں	کوئی دل کی کر تا حفاظت کمان تک
محبت کا آغازِ آفاذِ حسرت	محبت کا انجامِ حسرت کمان تک
تم ان تلخ فنون کو شیریں بنادو	شکستہ رہے سازِ الفت کمان تک
کبھی تو کرو احتسرامِ محبت	لگتا رہے تو ہیں الفت کمان تک
کبھی تو بنو قدردانِ محبت	کمان تک یہ کفرانِ نعمت کمان تک

کمان تک اثر ایک ہوتے نہ دو دو

نہ اٹھا حجابِ محبت کمان تک،

# بِالتَّيَقُّنِ وَالنَّقَاةِ

محمد علی کی خود نوشتہ سوانح عمری کا کچھ حصہ

*My life: A Fragment by Maulana Mohammad Ali*

ناشر: شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور صفحات: ۲۶۷، صفحہ: قیمت: -/-

جناب شیخ محمد اشرف ادھر کئی سال سے نہایت مفید اور اہم انگریزی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں خاص شہرت حاصل کر رہے ہیں، ان کی مطبوعات کی عمدہ لکھائی چھپائی کا اعتراف امریکہ اور یورپ کے مختلف رسالوں میں بھی کیا گیا ہے، حال ہی میں ان کی مطبوعات میں مولانا محمد علی مرحوم کی ایک تصنیف کا قابل قدر اضافہ ہوا ہے جس کی لکھائی چھپائی، جلد بندی اور ٹائٹل تیج محمد علی مرحوم کی اعلیٰ تحریر اور شخصیت کی شان کے مطابق ہے،

محمد علی مرحوم ہندوستان کی اُن عظیم المرتبت ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زبان، تحریک اور عمل سے ہندوستان میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے کی کوشش کی، وہ نہ صرف ایک سیاسی رہنما تھے بلکہ ایک بلند پایہ صحافت نگار، انشا پرداز، فصیح البیان مقرر، شیرین کلام شاعر اور مذہب کے شدید شیعہ تھے، ان کے جذبات و احساسات کی شدت، فہم و ادراک کی تیزی، عمل کی بے پناہ قوت و سرگرمی اور کردار کی بلندی نے ایسے شرارے پیدا کئے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیسرو ہو کر رہ گئیں، محمد علی مرحوم نے اپنی قوم کے تن بے جان میں پہلے اپنی تحریر و دن کے ذریعہ سے روح چھونکنے

محمد علی کی خود نوشتہ سوانح عمری کا کچھ

کی کوشش کی، اور انگریزی اور اردو میں ہزاروں صفحات لکھ کر اپنے قلب و جگر کے ٹکڑے بکھرے، لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ باوجود ہزاروں صفحے لکھنے کے وہ اپنے زندگی میں نہ مصنف ہوئے اور نہ مؤلف مختلف اوقات میں انھوں نے مختلف کتابوں کے لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن ان کی متلاطم زندگی کے مہز نے کبھی ان کے ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیا، ان کو فرصت ملی تو جیل کی کالی کوٹھڑیوں میں یہاں وہ کتابیں لکھ کر اپنے حوصلوں کی تکمیل کرنا چاہتے تھے، مگر ان کا قلم ان کے خیالات کو طوفان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا، اس لئے قبل اس کے کہ اپنے دل کی حسرتیں نکالیں اسیری کی مدت ختم ہو جاتی تھی، اور پھر ان کے پاؤں میں چکر پڑ جاتا تھا،

مذکورہ بالا کتاب محمد علی مرحوم کے خیالات کے طوفان کا ایک ہلکا سا عکس ہی، جو انھوں نے کراچی جیل میں قلمبند کرنے کی کوشش کی تھی، اس قید فرنگ میں وہ مولانا شبلی مرحوم کی سیرۃ النبی کے طرز پر انگریزی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سیرت لکھنی چاہتے تھے، مگر ایک سال کی مدت صرف اس کے ابتدائی مراحل طے کرنے میں گزر گئی، اور انھوں نے یہ خیال ترک کر دیا، اور ”اسلام خدا کی سلطنت“ کے نام سے ایک کتاب شروع کی، جس میں انھوں نے اسلام کی سچائی اور حقانیت کو اپنے نقطہ نظر سے واضح اور روشن کرنے کی کوشش کی، لیکن ابھی وہ کتاب کی تہید ہی ختم کرنے پائے تھے، کہ جیل سے رہا کر دیئے گئے، اس کے بعد تقریباً سات سال تک اور زندہ رہے، لیکن اس اثنا میں ان کو اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ اس تہید ہی پر نظر ثانی کر لیتے، ان کی وفات کے بعد اس کا مسودہ ارباب جامعہ ملیہ کو دیدیا گیا، اصلی مسودہ اس قدر نامصافت اور کٹا پٹا تھا، کہ بعض جگہ اس کا پڑھنا بھی سخت مشکل تھا، اسی لئے اب تک طبع نہ ہو سکا، پنجاب کے ایک نوجوان اہل علم جناب افضل اقبال صاحب ایم اے نے جن کو مولانا محمد علی مرحوم کی ذات اور ان کی تحریروں کیساتھ عشق وادسکو بڑی محنت سے اڈا کر کے کتاب کی تالیف کے ۱۵ سال کے بعد شائع کیا ہے، جس کے لئے وہ بید شکریہ کے مستحق ہیں،

زیر نظر کتاب مولانا محمد علی کی مجوزہ تصنیف، اسلام خدا کی سلطنت کی تمہید ہے، اس تمہید میں وہ صرف یہ دکھانا چاہتے تھے، کہ ان کو کلام پاک کے مطالعہ اور اسکے سمجھنے کا کب کب موقع ملا، اور اس کو سمجھ لینے کے بعد ان پر اسلام کی تھانیت کس طرح آشکارا ہوئی، اس کو بیان کرنے کے لئے انھوں نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہیں، مگر ان کی زندگی کی حکایتیں خود ان کو بھی کچھ ایسی لذیذ معلوم ہوئیں کہ خود سبزو دراز تر ہو تی چلی گئیں، محمد علی مرحوم کی زندگی میں ان کی تحریروں پر طول نگاہی کا اعتراض کیا جاتا تھا جس کا وہ یہ جواب دیا کرتے تھے کہ وہ طویل اس لئے لکھتے ہیں کہ ان کو فرصت کم رہتی ہے، اور غور فکر سے لکھنے کا موقع نہیں ملتا، لیکن ان کی وفات کے بعد جب ان کی کوئی تحریر کین بھائی ہے تو پڑھتے وقت جی چاہتا ہوں کہ لاش تحریر کا سلسلہ ختم نہ ہونے پائے بعض اوقات وہ اپنی تحریروں میں موضوع سے خارج باتوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلاتے ہیں، جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ قابل قدر قیمتی معلومات کا خزانہ بنتا جاتا ہے،

کتاب کا اصل موضوع جہان سے شروع ہوتا ہے، وہیں پہنچ کر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے، لیکن یہ تمہید بجائے خود ایک دلچسپ کتاب ہو گئی ہے، اس میں محمد علی مرحوم کی آپ بیتی ہے، مرحوم کی کہانی خود ان کی زبانی سننے میں اور بھی موثر اور پُر کیف ہو جاتی ہے، بظاہر انھوں نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے زمانہ کی معاشرت، تعلیم، سیاست اور مذہب کے بہت سے اہم مسائل اور نکات پر روشنی ڈالی ہے جس سے ان کی یہ سوانح عمری اس عہد کے معاشرتی، تعلیمی، سیاسی اور مذہبی حالات کی آئینہ دار بن گئی ہے، اور اس کے مطالعہ میں ایسی لذت ملتی ہے، کہ اس کے سامنے ساری ذہنی لذتیں بیچ معلوم ہوتی ہیں،

پہلے باب کی سرخی گھرا در اسکول کی تعلیم ہے، اس باب کے ۳۱ صفحے ہیں، اس میں مولانا مرحوم نے اپنی ابتدائی تعلیم سے آگے غور ڈکے زمانہ قیام تک کے حالات درج کئے ہیں، ان کو آصف بن محمد علی

کے گھر کی فضا خاندان میں انگریزی تعلیم سے مصیبت کے باوجود ان کی بیوہ مان کے بلند تعلیمی حوصلوں اور برادر  
شفقت کے ساتھ مولانا شوکت علی کی تکمیل نگرانی کا ذکر ہے، مگر محمد علی کی طبیعت کی بے چینی اور بے قرار  
ان کے قلم میں بھی مستقل ہو جاتی ہے، وہ اپنی ابتدائی تعلیم کے حالات قلمبند کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس سلسلہ  
میں ان کا قلم چھل کی ابتدائی خصوصاً مذہبی تعلیم کے تقاض اور مناسب پر چل پڑتا ہے، وہ اپنی والدہ  
کی شفقت و محبت کی لذت کو یاد کرنا چاہتے ہیں، اس میں ان کا قلم ہندوستان کی عورتوں کی تعلیمی  
محرومی اور معاشرتی بیماری پر دوان ہو جاتا ہے، وہ علی گڑھ میں اپنی تعلیم کا ذکر کرنا چاہتے ہیں لیکن  
ان کا دل اس عظیم الشان اسلامی درس گاہ میں مذہبی تعلیم کی کمی اور اس کی جانب سے بے توجہی پر خونچکان  
چنانچہ ان ۲۲ صفحوں میں محمد علی مرحوم کے نہ صرف گھر، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے تعلیمی حالات ہیں، بلکہ اس  
عہد کی تعلیم اور معاشرت پر ایک بہت ہی ناقہ اندہ تبصرہ ہے،

دوسرے باب کا عنوان "بیداری" ہے، اس میں مرحوم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ریاستوں  
کی ملازمت کے بعد ان میں کس طرح ملکی اور قومی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا، کامریٹ کے اجراء کے ساتھ انکے  
جذبات کا نشوونما دیکھنا داستان ہے، بنگال کی جنگ اور ترکوں کے خلاف برطانیہ کی پالیسی نے  
انکے پر جوش قلب و دماغ کو کوہ آتش فشان بنا دیا تھا جس کے شراروں سے وہ تمام مخالفت و فضا کو  
خاکستر کر دینا چاہتے تھے، ان ہی جذبات کے تحت انھوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ شروع کیا، ان  
اسکے فور سے ان کا قلب جتنا زیادہ منفرد ہوتا گیا، اتنا ہی وہ اسلام کے فدائی اور شیدائی ہوتے گئے،  
اور ان تمام چیزوں کے لئے جن کا تعلق اسلام سے تھا، مرثیہ اپنی زندگی کا نصب العین بنایا،

تیسرے باب کا عنوان "میری شکلات اور ان کا علاج" ہے، محمد علی مرحوم کی قومی زندگی کا اتنا  
صحافت نگاری سے ہوتا ہے، لیکن ان کی بلائیں صحافت نگاری نے ان کو بلاؤں میں گرفتار کر دیا،  
جنگ بنگال میں ترکوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، محمد علی مرحوم اپنی تحریروں کے ذریعہ

محمدؐ کی خود نوشتہ سوانح عمری کا کچھ حصہ

مسلمانوں کی سیاست میں ایک طوفان بپا کرنے چاہتے تھے، لیکن پریس ایکٹ کی پابندی ان کے حصول کو کچلنا چاہتی تھیں، حکومت کی بندشوں اور ان کے جذبات کی آزادی میں تصادم ہوا، اور وہ پہلے نراڈ پھر لنڈسوں اور پھر چنڈ واڈہ میں نظر بند کر دیئے گئے، یہ تمام واقعات کل اٹھائیس صفحوں میں ختم ہو گئے، بین محمد علی مرحوم جیل کی کوٹھری میں بیٹھ کر جیلر کی نگرانی میں یہ حالات قلمبند کر رہے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ دل کول کر اپنے جذبات کو کاغذ پر منتقل نہیں کر سکتے تھے، لیکن جملوں اور سطروں کے درمیان وہ تمام چگاریاں موجود ہیں جن سے ان کی آئینہ طبیعت کی تشکیل ہوئی تھی،

چوتھے باب کی سرخی ”اکمنش“ ہے، مولانا محمد علی چھند واڈہ میں ساڑھے تین سال نظر بند رہا، یہاں کی ”فرست“ اور ”اطینان کھی“ میں وہ حقانیت کے ایسے ”سرچھپے“ میں غرق ہو گئے جو تیرہ سو سال کے گمراہوں وغیرہ سے نہ اٹ سکا ہے، اور نہ خشک ہو سکا ہے (ص ۸) یہ پورا باب کلام پاک کے محاسن پر کہیں ذاتی تاثرات بیان کئے گئے ہیں، کہیں یورپین اہل قلم کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات دیئے گئے ہیں، کہیں کلام پاک کے رموز و نکات آشکار کئے گئے ہیں، کہیں عیسائی مذہب کے مقابلہ میں اسلام کی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، تحریر کا انداز بہت ہی دلانہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جام الست کا سرشار رہے خود می بین لکھ رہا ہے، کلام اللہ کے مطالعہ سے جو اثرات محمد علی کے قلب پر مرتب ہوئے، اس کے لطف و اثر کا اندازہ تو اصل انگریزی ہی سے ہو سکتا ہے، ہم صرف اس کا مطلب پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

”میں نے خدا کو پایا، اوس نے بنی نوع انسان کو جو پیام دیا تھا، اس کو پالنے کے بعد میں نے اپنے کو پایا، میری زندگی میں نئے معنی پیدا ہو گئے، زندگی کا اصلی جذبہ مجھ کو معلوم ہو گیا، احساس اب تک نہ ہوا تھا، اس کے بعد میری گزشتہ زندگی جو میرے نزدیک مشرق کے ایک ننید سے متواسے چھوٹے بر اعظم (یعنی ہندوستان میں) بہت ہی مشغول گذری تھی، بالکل

غالی اور بے کیف معلوم ہوئی۔

پانچواں باب یورپ کا دنیا دارانہ رنگ کے عنوان سے شروع ہوتا ہے، اس میں رنن اور ایچ جی، ویلز کی بعض تصانیف پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ عیسائیت مذہبیت اور رویت سے دور ہو کر کس طرح دنیاوی آکانشون سے آلودہ ہو گئی ہو حالانکہ شروع میں عیسائی مذہب کی تعریف ہی تھی جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے از سر نو پیش کی، لیکن عیسائی مذہب یونانی خیالات سے متوث ہو کر اپنے اصلی سرچشمہ سے دور ہو گیا، اسلام پر بھی یہ دور آیا، لیکن سوائے فلسفیوں کی ایک خاص جماعت پیدا ہو جانے کے خدا کے آخری نبی کا پیغام اس کے اثرات و تمام خطرات سے محفوظ رہا،

چوتھا اور پانچواں باب خالص علمی ہے، لیکن چھٹے باب میں جس کی سرخی نئی سرگرمی ہے، پھر کچھ ذاتی حالات آگے ہیں، مگر اس میں زیادہ تر اسلام کے محاسن کی جلوہ آرائیاں ہیں، اس باب کے شروع میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا بھی ذکر ہے، محمد علی مرحوم نے اقبال کی شاعری کی دل کھول کر داد دی ہے، اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اور یہاں تک اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اسلام کے سمجھنے میں ان کو اقبال کی شاعری بھی مدد ملی تھی، محمد علی پر اسلام کے حقائق کا انکشاف جتنا زیادہ ہوتا جاتا تھا، اتنا ہی وہ یورپ کی ذہنی کج روی اور مذہبی گمراہی سے بیسزا ہوتے جاتے تھے، اسچ جی ویلز کی بعض تصانیف کو پڑھ کر ان کا بے اختیار جی چاہا، کہ وہ یورپ جا کر اہل یورپ کو اسلام کا صحیح پیام پہنچائیں، کیونکہ ان کو یقین تھا کہ یورپ کی نجات اسلام ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے، اس سلسلہ میں یورپ کی قومیت کے تخیل پر ایک عالمائے تنقید بھی ہے، محمد علی مرحوم ڈاکٹر اقبال کی طرح قومیت کے گورکھ و ہندوؤں کے قائل نہ تھے، وہ اس کو بنی نوع انسان کی یگانگت اور یکپارگی کے لئے سنگ راہ سمجھتے تھے،

اس باب میں چند واژہ کی نظر بندی کے زمانہ کی زندگی وہاں سے رہائی، یورپ کو دہشت خلافت کی روانگی، وہاں اس کی کارگزاری، وہاں سے واپسی، اور پھر ہندوستان کی سیاست میں مجاہدانہ

محمد علی کی خود نوشتہ سوانحی کا کچھ حصہ

سرفروشی، وائیز کی گرفتاری، مقدمہ کرچی اور آخر میں زمانہ اسیری کے بہت ہی دلچسپ کوائف ہیں کہیں قویہ داستان اتنی پر لطف ہو جاتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس کا لطف ختم نہ ہونے پائے، اور کہیں یہ اتنی درد ہو جاتی ہے کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو روان ہو جاتے ہیں، اس پر سے باب میں محمد علی مرحوم خدا کے ایک عاجز بندہ، ایک عاشق رسول، ایک مجاہد اسلام، ایک جانباز ملت، اور ایک شیدائی قوم کے مختلف جلوہ بین نظر آتے ہیں، اور پڑھنے والا نہ صرف ان کی تحریر بلکہ ان کی شخصیت سے خواہ مخواہ مسحور ہو جاتا۔ سا توان بابت اسلام کہاں سے شروع ہوتا ہے، اور کس طرف جاتا ہے، کے عنوان سے شروع ہوتا ہے، یہ باب جو نسبتاً زیادہ طویل اور پچھن صفوں پر مشتمل ہے، اس میں اسلام کے مختلف عقائد کے تاریخی ارتقار پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور جا بجا مختلف قسم کی فیڈ بکس کی گئی ہیں، ان مباحث کی گتھون میں مرحوم نے اسلام کی اصلی اسپرٹ، انکی لازوال قوت حیات اور قوت تجدید کو دکھانے کی کوشش کی ہے جس کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ذہن میں ایک جلا ہو گئی ہے،

اس باب کے بعد ایک ضمیمہ ہے، حالانکہ اصل کتاب کا آغاز یہیں سے ہونے کو تھا لیکن آغاز غلطہ بنکر رہ گیا ہے، اس نے لائق مرتب نے ناظرین کی سہولت کے خیال سے اس کو بطور غیر منسلک کر دیا ہے اس ضمیمہ کا عنوان غلط فہمی اور اس کے اسباب ہے، اس میں محمد علی مرحوم کے مخالف یورپ کے باشندے اور عیسائی مذہب کے پیروہین، ادھون نے ان کو انہی کے انداز میں اسلام کے حاسن کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، انھوں نے یہ کہ یہ کتاب نامیاد رہ گئی، اگر کتاب مکمل ہو جاتی تو اسلام کا پیام اہل مغرب تک ایک بہترین طرز بہترین انشاء اور بہترین اسلوب بیان کے ذریعہ سے پہنچ جاتا، لیکن آہ! کہ اس "جام کوثر" کا سرشار اپنی تمام سرشاریوں کے ساتھ قبل از وقت حوض کوثر پر پہنچ گیا،

کتاب کی قیمت چھ ہے، لیکن کاغذ اور طباعت کی موجودہ گرانی کے لحاظ سے یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں، ترقی یافتہ قوموں میں ان کے رہنماؤں کو جو محرمیت ہوتی ہے، اس کا ثبوت یہ بھی دیتا



جاتا ہے کہ ان کی تصانیف مطبع سے نکلتے ہی گھر گھر اور گوشتے گوشے میں پہنچ جاتی ہیں، مسلمانوں کا محمد علی مرحوم سے زیادہ محبوب اور ہر دلعزیز رہنما کون تھا، ایسی حالت میں کیا یہ ہندوستان کے مسلمانوں سے توقع نہیں کی جاسکتی ہے، کہ وہ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لے کر صحیح معنوں میں محمد علی مرحوم کی ذات سے اپنی شینگلی کا ثبوت دین گے،

”ص ۷“

## مقدمہ قعات عالمگیر

ہیں قعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن، انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے سینہ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشا اور اس کی تاریخ کے آغاز اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و قعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے

قیمت: - للعر، ۳۹، صفحے،

## قعات عالمگیر

اور جنگ زیب عالمگیر کے خطوط و قعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک عرصہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے میسوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے،

قیمت: - ۳۸، ۴۱، صفحے،

”نیچر“

# مطبوعات جدید

سیرت سید احمد شہید مولف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع چھوٹی جہانت ۵۵ صفحہ کا  
کتابت و طباعت بہتر قیمت ۷۰ روپے معین الدہر صاحب نمبر ۳ گون روڈ لکھنؤ

ہندوستان میں جن قوموں کے ذریعہ اسلام پہنچا وہ خود اسکی صحیح نمائندہ نہ تھیں، اسلئے وہ اپنی  
اصلی شکل میں نہیں پہنچا، اور اس میں لانے والوں کے بہت سے عقائد و رسوم شامل ہو گئے تھے، پھر  
ہندوستان کے عقائد و خیالات نے ان میں مل کر اسکی شکل اور بدل دی، لیکن جب تک یہاں اسلامی  
حکومت قائم رہی، کم از کم سیاسی حیثیت سے اسلام سر بلند رہا، پھر حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ  
مسلمانوں کی سیاسی قوت بھی زوال پذیر ہوتی گئی، اور آخر میں یہ نوبت پہنچ گئی تھی، کہ حکومت برائے  
نام رہ گئی تھی، اس پر دوسری قوموں کا غلبہ واقعہ ارتھا، ملک بھر میں طوائف الملوکی بپا تھی، مذہب  
ادب و خرافات اور مشرکانہ رسوم کا مجموعہ بن گیا تھا، اس نازک دور میں حضرت شاہ ولی اللہ  
دہلویؒ اور ان کے خاندان نے دین و سیاست دونوں میں تجدید و اصلاح کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش  
علیٰ تھی، اسلئے اس کا اثر عقائد و خیالات کی اصلاح تک محدود رہا، سیاسی تجدید و اصلاح کیلئے  
مسلمانوں میں خونِ زندگی دوڑانے کی ضرورت تھی، اس کام کے لئے خدا نے حضرت مولانا سید احمد بریلویؒ  
اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کو پیدا کیا جنھوں نے ایک طرف دین کی اصلاح و تجدید کا صورہ چھوٹا، دوسری  
طرف مسلمانوں میں جہاد کی روح بیدار کر کے ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کے قیام کی  
جہاد کی کوشش کی، یہ مسلمانوں کے جہاد آزادی کی سب سے بڑی انقلابی کوشش تھی، جو اگر کامیاب ہوئی

ہوتی، تو آج ہندوستان کی تاریخ دوسری ہوتی لیکن مسلمانوں کی بد قسمتی ان کے نفاق اور دوسری قوموں کی در اندازی سے اس کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، اس جہادِ حریت میں سارے ہندوستان کے مسلمان شریک تھے، اور آسام سے لیکر پشاور تک اس کا نہایت مرتب اور مکمل نظام قائم تھا، اگرچہ یہ کوشش ناکام رہی، لیکن بے نتیجہ نہیں رہی، اس کے اثر سے مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی، جو اسلام کی صحیح حال، اور جوشِ جہاد سے معمور تھی، اس نے اپنا کام برابر جاری رکھا، اور اس کے ذریعہ دین و سیاست کی بڑی گراں قدر خدمات انجام پذیر ہوئیں، حضرت شیخ المندرجمتہ اللہ علیہ اسی جماعت کی یادگار تھے، آج بھی خدا کے فضل سے اسکے باقیاتِ صالحات موجود ہیں، سید صاحب کے حالات میں یوں تو پڑانے طرز کی بعض کتابیں موجود ہیں لیکن ضرورت ایسی کتاب کی تھی، جس میں موجودہ ذوق کے مطابق سید صاحب کے کارناموں کو پیش کیا جائے اس ضرورت کو اسی دو دہانِ سیادت کے ایک صالح نوجوان مولانا سید ابوالحسن ندوی استادِ دعوۃ العلماء نے پورا کیا، اور سید صاحب کے حالات میں یہ جامع کتاب لکھی اس میں سید صاحب کے خاندانی حالات، سیرت و سوانح اور ان کے دینی اصلاحی اور سیاسی مجاہدات اور کارناموں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، کتاب کے شروع میں پس منظر کے طور پر اس عہد کی دنیا سے اسلام خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی و سیاسی حالت کا مختصر خاکہ دیدیا گیا ہے، اور مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے مسافرِ اسلام ہندوستان کے غریب و بیکار، کے عنوان سے ہندوستان میں اسلام کے انحطاط و تجدید کی بڑی موثر سرگزشت ہے، آخر میں سید صاحب کے خلفاء و متوسلین کے حالات اور ان کے کارناموں کا ذکر ہے، اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۳۳۷ھ میں شائع ہوا تھا اب نئی ترمیم و اضافوں کے بعد یہ دوسرا ایڈیشن نکلا ہے جو پہلے سے نیلے مکمل ہے، یہ کتاب درحقیقت ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی تجدید و اصلاح اور اس دور کے جہادِ آزادی کی تاریخ ہے۔

جب ہندوستان میں انگریزوں کا قدم بھی پورے طور سے نہ جما تھا، اور آزادی کا تصور کسی دوسری قوم کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا،

## حکومت الہی از مولانا ابوالحسن محمد سجاد مرحوم سے تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۳۶ صفحے کاغذ کتابت

د طباعت بہتر قیمت معلوم نہیں، پتہ: مکتبہ سیفیہ مزگیر و کتب خانہ فزیہ مراد آباد،

مولانا ابوالحسن محمد سجاد مرحوم نائب امیر شریعت بہاران صاحب فکر و نظر علمائے دین تھے جنہوں نے حکومت الہیہ یعنی اسلامی نظام حکومت کے تمام گوشوں پر برسوں غور و فکر کیا تھا، اور ان کے دماغ میں اس کا پورا خاکہ موجود تھا، اسکو وہ قلمبند بھی کرنا چاہتے تھے لیکن سیاسی مصروفیتوں نے اس کا موقع نہ دیا، اور ابھی اسکی تمہید لکھنے پائے تھے، کہ پیام اجل آگیا، مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نے اسی کو تبرکاً شائع کر دیا ہے، مولانا مرحوم کا نقطہ نظریہ تھا، کہ ایک ایسے عالمگیر عادلانہ قانون و نظام سازی کے لئے جو ساری دنیا میں نظم و سکون قائم کر سکے، اور انسان کے فلاح و سعادت کا ضامن ہو، جن کمالات اور جن بصیرت کی ضرورت ہو، اس سے انسان محروم ہے اس لئے اس کے بنائے ہوئے سارے قوانین اور نظام بھی ناقص ہیں، چنانچہ آج تک دنیا کی کوئی قوم اور کوئی سلطنت ایسا عالمگیر عادلانہ قانون نہ بنا سکی، اور وہ صرف خدا کی ہدایت اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں بن سکتا ہے، چنانچہ اس کتاب میں اسی نقطہ نظر سے قوانین اور دستورون کے مقاصد و مصالح، انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اور دستورون کے نقائص اور خرابیوں کو دکھا کر خدا کی کتاب اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں قانون اور دستور سازی پر اصولی بحث کی ہو، افسوس ہے کہ یہ رسالہ اصل کتاب کی صرف تمہید ہے، تاہم اس سے اسلامی نظام حکومت کے بارہ میں مولانا کے نقطہ نظر و رائے کی قانونی فکر و نظر کا کسی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے،

شانِ خدا مولفہ جناب مولانا عبید الرحمن صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۵۵ صفحے کاغذ

کتابت و طباعت بہتر قیمت، عربیہ کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۶، نمبر ۳ بی،

لائق مولف نے یہ کتاب وجود باری اور توحید باری کے اثبات میں لکھی ہے، اس میں یہ

دکھایا ہو کہ وجود باری کا اعتقاد انسان میں فطری ہے اور اس بارہ میں یونان کے قدیم حکماء اور یورپ کے جدید فلاسفہ کے اقوال اور ان کے دلائل نقل کئے ہیں اور ملحدوں اور مادہ پرستوں کے شبہات نقل کر کے ان کی تردید کی ہے اور وجود باری پر کلام اللہ کے دلائل بیان کر کے دکھایا ہو کہ وہ تمام دلائل جو فلاسفہ نے وجود باری اور توحید باری پر دیئے ہیں وہ سب کلام اللہ میں موجود ہیں، صرف فرق یہ ہو کہ ادس نے منطقی طریقہ اختیار نہیں کیا ہے پھر توحید باری پر کلام اللہ کے دلائل نقل کر کے دلائل کی مختلف قسموں پر تبصرہ کیا ہے، اور اسلام اور دوسرے مذاہب کے تصور توحید کا موازنہ کر کے دکھایا ہو کہ کوئی مذہب شرک سے خالی نہیں ہے، اور غاص توحید صرف اسلام نے پیش کی ہے، میں صفات الہی کا ذکر اور ان پر تبصرہ ہو کتاب مفید ہے بعض بحثیں مختصراً لکھی گئی ہیں کہیں مکمل لکھا گیا ہے اور جہاں تک ممکن ہو

علم الاقوام حصہ اول دوم قطع بڑی ضخامت ۲۶۵ و ۱۶۴ صفحہ، کاغذ کتب و طباعت بہتر

قیمت عاویہ، پتہ انجن ترقی اور دہندہ نئی دہلی،

نئے علوم میں علم الاقوام نہایت مفید اور دلچسپ علم ہے اس میں تاریخ تمدن کے نقطہ نظر سے ان قدیم اور موجودہ انسانوں اور اقوام و قبائل کی جو تہذیب کے دور طفولیت میں ہیں اور جن کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے، ذہنی تاریخ یعنی ان کی تنظیم خاندان و قبائل کی تقسیم، رسم و رواج، معاشرتی خصوصیات، مذہب، صنعت و حرفت وغیرہ جملہ تہذیبی پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے، اردو میں اس موضوع پر کوئی قابل ذکر کتاب نہ تھی، ڈاکٹر بیرن عمر الف ایمرن فلس نے جو علم الاقوام کے بڑے عالم ہیں اس موضوع پر انگریزی میں دو جلدوں میں یہ کتاب لکھی تھی، ڈاکٹر عابد حسین خاں صاحب نے اردو میں اس مفید کتاب کا ترجمہ کیا ہے اس کے پہلے حصہ میں علم الاقوام کے موضوع و مقصد، اس کی تاریخ، اسکے طریق تحقیق پر بحث، اور دنیا کے اولین تہذیبی خطوں اور تنظیمی حیثیت سے مختلف تہذیبوں کا ذکر ہے، دوسری حصہ میں مختلف ملکوں افریقہ، شمالی و جنوبی امریکہ، جزائر بحر الکاہل، آسٹریلیا، ہندوستان اور دوسرے مشرقی ملکوں کی اقوام کی ذہنی تاریخ اور ان کے تمدنی و معاشرتی حالات ہیں، کتاب مفید اور پرازمعلومات ہے ترجمہ کی خوبی کیلئے جناب مترجم کا نام گائی ہے

## فردوسِ تحفیلِ زرخ، شِ مرجمہ، تقطیعِ بڑی فصاحت ۳۸۲ صفحے کا مذکرتبت و طباعت بہتر

قیمت مجلد ۶۰ پیسہ دارالاشاعت پنجاب لاہور

آج سے پندرہ بیس سال پہلے کی ادبی دنیا میں زرخ شِ یعنی زاہدہ خاتون شہزادیہ مرجمہ بنتِ نواب مزل اللہ خان مرجمہ کو بڑی شہرت حاصل تھی، آج بھی یہ نام ناما نوس نہیں ہے مرجمہ تعلیم یافتہ مسلمان خاتون کا قابلِ فخر نمونہ تھیں، ان کی ذات اعلیٰ تعلیم کے ساتھ تمام لوازمِ شرافت سے آراستہ تھی، ان کا شعری و ادبی ذوق اچھے سے اچھے مرد ادیبوں اور شاعروں سے کم نہ تھا، ایک زمانہ میں دنیا سے شاعری ان کے ترانوں سے گونج رہی تھی، مرجمہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے کلام کا ایک حصہ جو منظومات پر مشتمل ہے، مرتب کر لیا تھا، جسکی اشاعت کی نوبت ان کی وفات کے بیس سال بعد آئی ہے، اس مجموعہ میں تاریخی، مذہبی، قومی سیاسی، اصلاحی مختلف موضوعوں پر ۱۱۲ نظمیں ہیں، نظمیں جذبات و خیالات اور زبانِ دواوب دونوں حیثیتوں سے اردو کے کسی بلند پایہ کلام سے کم نہیں، ان سے مرجمہ کے ادبی ذوق کے ساتھ ان کی علمی استعداد، وسعتِ معلومات، حالاتِ زمانہ سے واقفیت، اور مذہبی و قومی جذبات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، افسوس یہ ہے کہ مرجمہ کا انتقال عینِ عالم شباب یعنی کل ۲۸ سال کی عمر میں ہو گیا، ورنہ عمر اور مشق و مہارت کی پگھلی کے ساتھ ساتھ ان کا کلام بہت اونچا جاتا، آج کل تعلیم یافتہ مسلمان خواتین کی کمی نہیں، بلکہ ان کی ترقی چشم بد و در روز افزون ہے، ان میں شاعرہ بھی ہیں، اور ادیبہ بھی، اور ایسی رنگین نوا کہ ان کی رنگینی پر داغ کی شوخی بھی نہ رہا جائے، لیکن کاش ان میں سے ایک مثال بھی ایسی نکل سکتی جو علمی کمالات اور نسوانی اوصاف میں نہ سہی، کم از کم ادبی ذوق ہی میں زرخ، شِ کا نام تمام نمونہ پیش کر سکتی،

”م“

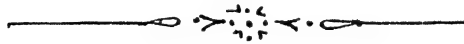
# ”جلد ۵“ مارجب جب مطابق ماگست ۱۹۴۲ء ”عدد ۲“

## مضامین

۸۴ - ۸۲	سید سلیمان، ندوی	نذرات
۱۰۲ - ۸۵	مولانا عبدالسلام ندوی،	وصف شید یا شاہد،
۱۱۸ - ۱۰۳	مولوی محمد اویس صاحب نگرانی	ابن جریر طبری،
	رفیق دارالمصنفین،	
۱۳۶ - ۱۱۹	جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب	یادِ پاستاں،
	عرشی، ناظم کتب خانہ ریاست رامپور،	
۱۴۵ - ۳۷	جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم پی اے	فارسی کے چند قدیم شعراء
	علیگ لکچرکنگ ایڈورڈ کالج امرتسری	
۱۴۹ - ۱۴۶	”ن ص“	کیرکٹر
۱۵۳ - ۱۵۰	”م“	اجار علیہ
۱۵۵ - ۱۵۴	جناب غلام عزیز الرحمن صاحب پٹنہ پرنسپل	جذب مجذوب،
۱۵۵ -	جناب اسد ملانی،	فیض عشق،
	حکیم اشرف احمد صاحب احمد حسین صاحب اتحاد جدید آبادی	رباعی،
۱۶۰ - ۱۵۶	”م“	مطبوعات جدیدہ،

# شہادت

ابھرنے والے اب دارالمصنفین کی آبادی شروع ہو گئی ہے، رفقا اور مولانا مسعود علی صاحب واپس آچکے ہیں اوسط اگست تک خاکسار کی بھی وطن سے واپسی ہو جائے گی، حیاتِ شبلی کی ملتوی شدہ چھپائی کا کام اجرا پائے گا، اور تالیف و تصنیف کے دوسرے سلسلے بھی جاری ہوں گے،



اس دوران میں احباب کے بہت سے خطوط کے جواب میں خاکسار سے تعویق و تاخیر ہوئی، چرکا افسوس ہے لیکن اس سچچان کی تنہائی اور بعض ذاتی انکار و مشغول کو خیال میں رکھ کر امید ہے کہ احباب میری فروگزاشت کو معاف فرمائیں گے،



جولائی کے اواخر میں پٹنہ میں بہار اردو کانفرنس کا اجلاس ہوا خطبے ہوئے، تقریریں ہوئیں، پیغام پڑھے گئے، تجویزین منظور ہوئیں، اور ہندوستانی زبان کی تحریک کے حسن و قبح پر بحث کر آئیاں بھی رہیں، خوشی اس کی ہے کہ اس صوبہ کے حامیان اردو اور شائقینِ ادب نے نشست و گفتگو کے فریضہ کا احساں تو کیا، عمل کا قدم تو اس کے بعد اٹھایا،



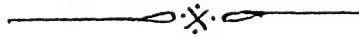
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں پچیس برس کے اندر اس صوبہ کے تعلیم یافتہوں میں اپنی زبان کی شہادت



اصلاح اور صحت کے خیال نے بڑی ترقی پائی ہے، اور ذوق ادب کا وہ ہنرجس کا دعویٰ پہلے صرف خواص کو تھا اب وہ عام ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ کسی صوبہ میں اس کی زبان کی ترقی کا اندازہ اس صوبہ کے منشورات اور مطبوعات ہی سے کیا جاسکتا ہے، اب غور کرنا چاہئے کہ اس صوبہ میں اخبار اور رسالے اور کتابیں سال میں کتنی چھپتی ہیں اور کتنی کبیتی ہیں، اس دو میں اگر اردو کے حامی یہاں پیچھے ہیں، تو صرف زبانی دعویٰ زبان کی ترقی کو کسی صوبہ میں آگے نہیں بڑھا سکتا ہے،



اس جنگ نے ریڈیو کی شکل میں دنیا کی زبانوں میں برق کی سی رفتار پیدا کر دی ہے، برکن، لندن، ٹلی، جاپان، ٹرکی، مصر اور خدا جانے کن کن ملکوں سے اردو یا ہندوستانی زبان میں خبروں اور تقریروں کی اشاعت ہر روز ہوتی رہتی ہے، اور اس کی موج آواز فضاے عالم میں پھیل کر خدا جانے کہاں کہاں پہنچتی ہے، جاپان کو چھوڑ کر باقی ملکوں سے سلیس زبان میں خبریں اور تقریریں پھیلائی جاتی ہیں، اور اپنی اپنی زبان کے باوجود اسی زبان میں ہوتی ہیں، جس کے اندر اشاعت کی قدرتی صلاحیت موجود ہے، اور یہ طبعی دلیل اس زبان کے مستقبل کے دعویٰ کے لئے ناقابل تردید ہے،



اس عالمگیر انتشار و پریشانی خاطر کے دور میں بعض ایسے خادمانِ علم ہیں جو اطمینان کے ساتھ زمانہ کے حالات سے بے پردا ہو کر علیٰ خدمات میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک دوست کی اطلاع ہے کہ مصر سے مشرقی علوم کے بعض شائق حکیم ابوریحان بیرونی کی کتاب الصیدلہ کی اشاعت کی کوشش میں مصروف ہیں، اس کا عربی متن جو بروصہ واقع ٹرکی سے ملا ہے، اس میں جا بجا بیاض پائے جاتے ہیں، مقابلہ اور تصحیح کے لئے اس کے دوسرے نسخوں کی تلاش ہے، اصل عربی نہ ہو تو اس کے فارسی ہی نسخہ ملیں، اسی سلسلہ میں ہندوستان کے اہل علم سے بھی اس کے متعلق استفسار ہے، اگر ہمارے

ناظرین میں سے کسی کو اس کا پتہ معلوم ہو تو دریغ نہ فرمائیں،



صوبہ متحدہ کے تعلیمی محکمہ نے اپنی ہندوستانی ایجاڈمی کی رکنیت کے لئے دارالمصنفین سے ایک رکن کی نامزدگی کی خواہش کی ہے، یہ سرکاری مراسلہ صدر نشین کے نام ہے، امید ہے کہ دارالمصنفین کے صدر نشین نواب صدربار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی دارالمصنفین کی طرف سے کسی رکن کو نامزد فرمائیں،



جنگی ضرورتوں نے ریلوے پارسلوں پر جو پابندیاں عائد کی ہیں اس سے تجارتی اشیاء کی آمد و رفت کی راہ میں جو دقتیں پیدا ہو گئی ہیں اس سے کتابوں کے خرید و فروخت پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے، اس حالت سے دارالمصنفین کے شعبہ اشاعت کا متاثر ہونا بھی ناگزیر ہے، اور نہیں کہا جاسکتا ہے کہ دارالمصنفین کی مالی حالت پر اس کے جو اثرات پڑیں گے وہ کہاں تک اس کے لئے قابلِ برداشت ہو سکیں گے، ضرورت ہے کہ ہمارے احباب ڈاک کے ذریعہ سے کتابوں کے طلب کرنے کے سلسلہ کو وسعت دیں، تاکہ ان کا یہ ادارہ اپنی زندگی کے ان مشغلہ دنوں کو کسی طرح کاٹ سکے،



# مقالہ

## اوصافِ نبوت

اور

### قرآن مجید

(وصف شہید یا شاہد)

از مولانا عبد السلام تدوی

قرآن مجید میں پیغمبروں کے جو پیغمبرانہ اوصاف مذکور ہیں، ان میں ایک وصف شہید یا شاہد ہے۔

جن کے معنی قرآن مجید کے ترجموں اور عام تفسیروں میں گواہ کے لئے گئے ہیں، اور پیغمبروں کی اس گواہی کی مختلف توجہیں کی گئی ہیں، اس معنوں میں پیغمبروں کے تمام پیغمبرانہ اعمال و فرائض کو پیش نظر رکھ کر اس پر غور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس لفظ کے کوئی دوسرے معنی بھی ہو سکے ہیں یا نہیں؟

یہ ایک ایسا وصف ہے، جو پیغمبروں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام روحانی ہستیوں

کو شامل ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ کا یہ خاص وصف ہے، اور قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں آیا ہے، مثلاً  
 اَمَّا عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ، وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ، قرآن مجید کے ایک پرانے مستند ترجمہ

میں پہلی آیت کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے، "اور تو اوپر ہر چیز کے گواہ ہے۔" اور دوسری آیت کا اس سے

مختلف یہ ترجمہ ہے، "وہ اوپر ہر چیز کے حاضر ہے۔"

خداوند تعالیٰ کے بعد یہ وصف ان فرشتوں کا ہے جن کو خداوند تعالیٰ نے اعمالِ انسانی کی نگرانی کے لئے مقرر فرمایا ہے،

وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ اور ہر شخص (اعمال کی جواب دہی کے لئے) حاضر ہوگا، (ایک فرشتہ تو) اس کے ساتھ ہانکنے والا ہوگا، اور ایک (ق-۲)

فرشتہ اس کا اعمال نامہ لئے ہوئے اس کے علموں کا گواہ،

اس آیت میں شہید کا ترجمہ گواہ کے لفظ سے قرآن مجید کے ایک جدید اور مقبول ترجمہ میں کیا گیا ہے، خدا اور فرشتوں کے بدستوری روحانی ہستی پیروں کی ہے، اور یہ وصف ان کے لئے قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں آیا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود فرماتے ہیں، وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مِمَّا دَفَعْتُمْ (مائتہ ۱۶) اور قرآن مجید کے ایک پرانے مستند ترجمہ میں اس کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے، ”اور تمہاری فیہر کے شاہد جب تک رہا میں یح ان کے“ مشاہد عربی لفظ ہے اور محوڑے سے اخلاط کے ساتھ شہید ہی کا ہم معنی ہے، اس لئے ٹیٹھہ ترجمہ نہیں،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سب زیادہ قرآن مجید میں یہ وصف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آیا ہے، وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا، اور (مسلمانو! جیسے ہم نے تم کو اب ٹھیک قبلہ بنا دیا ہے، اسی طرح ہم نے تم کو بیچ کی راس کی امت (مجا) بنایا ہے، تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ رہو اور تمہارا

(بقرہ-۱۴۰) مقابلہ میں (تمہارے) رسول (محمد) گواہ رہیں،

لفظ شہید کے علاوہ آپ کا یہ وصف متعدد آیتوں میں لفظ شاہد کے ساتھ آیا ہے، جو لفظ شہید کے ہم معنی ہے، صرف فرق یہ ہے کہ لفظ شہید مبالغہ کا صیغہ ہے، اور مشاہد مبالغہ کا صیغہ نہیں، جس طرح عالم سے مبالغہ کا صیغہ عظیم ہے، اسی طرح شاہد سے مبالغہ کا صیغہ شہید ہے، اس لئے جو شخص شہید یا شاہد

وہ لازمی طور پر شاہد یا عالم ہے، بہر حال قرآن مجید میں آپ کا یہ وصف شاہد کے لفظ کے ساتھ متعدد آیتوں میں آیا ہے،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا أَوْ مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا، (الاحزاب - ۶)

اے پیغمبر! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے،

یہی آیت سورہ فتح میں بھی ہے، اور امام رازی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

قال المفسرون شاهد اعلیٰ امتك بما يفعلون كما قال تعالى وَيَكُونَنَّ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا،

مفسرین کا بیان ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری امت جو کچھ کرتی ہے تم اس کے گواہ ہو، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت دیکھو الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

میں اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہد اور شہید دونوں ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں،

سورہ مزمل میں آپ کے تمام اوصاف میں صرف شاہد کا وصف جیسا کہ آگے آئیں گے بیان کیا گیا ہے،

یعنی آپ کی صرف ایک پیغمبرانہ حیثیت کو نمایاں کیا گیا ہے،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ یہ تمام پیغمبروں کا مشترک وصف

ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے،

فَلْيَكُنْ أَذًا جِنًّا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدٌ وَجُنَّا يَدْعُو عَلَى هُوَ لَا رَحْمَةَ لَشَهِيدٍ،

بھلا تو (اس دن ان لوگوں کا) کیا حال ہوتا ہو جب لوگ جمع ہوں اور ہم ہر امت کے گواہ (یعنی رسول)

کو طلب کریں (جو ان کی نسبت گواہی دے) اور رکا

(نساء - ۶)

پیغمبر ہم تم کو بھی طلب کریں کہ (اپنی امت کے) لوگوں کی

نسبت گواہی دیں،

لسان العرب میں جہاں مادہ شہید پر بحث کی ہو، لکھا ہے کہ کل بنی شہیدۃ (یعنی پیغمبر

اپنی امت کا شہید ہوتا ہے،

پیغمبروں کے بعد خدا کے نیک بندوں کا بھی یہ وصف قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں مذکور ہے جو ایک

تو سورہ بقرہ کی اس آیت میں جو اوپر گندھکی ہے، اور وہ امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے

اہل کتاب کا ذکر بھی اسی وصف کے ساتھ سورہ آل عمران کی اس آیت میں آیا ہے،

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن

سَبِيلِ اللَّهِ مِمَّنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا

وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ،

اور قرآن مجید کے اس جدید و مقبول ترجمہ میں ”اَنْتُمْ شُهَدَاءُ“ کا ترجمہ بجائے گواہ کے دیدہ و دانستہ

کے لفظ سے کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ خود مترجمین قرآن کے نزدیک اس لفظ کے اور معنی بھی

اب جو وصف خدا خدا کے فرشتوں، خدا کے برگزیدہ پیغمبروں اور خدا کے نیک بندوں میں مشترک

طور پر پایا جاتا ہے، وہ جس قدر اہم اور جس قدر ذمہ دارانہ ہے اس کا اندازہ صحیح بخاری کی اس روایت

سے ہو سکتا ہے کہ جب ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے یہ آیت

”فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ امْتَةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ شَهِيدًا“ پڑھو کر

سنی تو آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، اس لئے ایسے اہم اور ذمہ دارانہ وصف کی

تفسیر بھی اسی اہمیت اور ذمہ داری کے ساتھ ہونی چاہئے، جس کا بہت کم مترجمین نے خیال رکھا ہو

تفسیروں سے اس کے معنی پر کچھ روشنی پڑتی ہے، لیکن اس سے بھی اس کی پوری وضاحت نہیں ہوتی

امام رازی ”وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ“ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :-

فالشَّهِيدُ الشَّاهِدُ وَيُجوزُ حمله على شَهِيدٍ كَمَنْ شَهِدَ شَهِدًا

فالشَّهِيدُ الشَّاهِدُ وَيُجوزُ حمله على شَهِيدٍ كَمَنْ شَهِدَ شَهِدًا

الروية ويجوز حملہ علی العلم ويجوز  
حملہ علی الکلام بمعنی الشہادۃ،  
گوہی دینے کے معنی میں کلام کے بھی ہو سکتے ہیں  
لیکن ان احتمالات میں اصل حقیقت کم ہو کر رہ گئی،

دوسری جگہ ”اذا جئنا من کل امۃ بشہید الخ“ کی تفسیر میں پہلے تو یہ روایت نقل کی  
ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے فرمایا کہ مجھ کو قرآن پڑھ کر سناؤ، انھوں  
نے سورہ نساء کی تلاوت شروع کی، اور اس آیت پر پہنچے تو آپ رو پڑے، اس کے بعد سدی کا یہ  
قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور پیغمبروں کے تبلیغ کی شہادت دے گی اور  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی تصدیق کی شہادت دیں گے، اسی لئے خداوند تعالیٰ نے  
فرمایا ہے، ”وجعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویكون الرسول علیکم  
شہیداً، لیکن یہ صرف سدی ہی کا قول نہیں ہے، بلکہ خود صحیح بخاری میں یہ روایت مذکور ہے  
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام طلب کیے جائیں  
اور وہ حاضر ہوں گے تو خداوند تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا تم نے تبلیغ رسالت کی، وہ کہیں گے  
”ہاں“ اب ان کی امت سے سوال کیا جائے گا، کہ کیا انھوں نے تبلیغ کی؟ وہ کہیں گے کہ ہمارے  
یہاں کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، اب خداوند تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام سے کہے گا کہ تمہارے  
حق میں شہادت کون دیگا؟ وہ کہیں گے کہ محمد اور ان کی امت ”اب امت محمدیہ شہادت دیگی  
کہ انھوں نے تبلیغ رسالت کی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی، ”وَلَقَدْ  
جَعَلْنَاکُمْ امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویكون الرسول علیکم شہیداً“  
اور وسط کے معنی عدل کے بتائے،

اسی روایت کی بنیاد پر مفسرین نے شہید کے معنی ہر جگہ گواہ کے لئے ہیں، لیکن اگر ہر جگہ

شہید یا شاہد کے معنی گواہ کے لئے جائیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کے ”وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ“ کیا معنی ہوں گے؟ ان کی نسبت تو کسی روایت میں نہیں آیا ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنی امت کے متعلق کوئی شہادت دیں گے، بلکہ اس آیت سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہادت ان کی دنیوی زندگی ہی تک محدود تھی، قرآن مجید کی اس آیت ”وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ“ میں شہید کے معنی ان فرشتوں کے ہیں جو لوگوں کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں، حالانکہ یہ کسی روایت سے ثابت نہیں ہے، کہ یہ فرشتے قیامت کے دن خدا کے سامنے لوگوں کے اعمال کی گواہی دیں گے،

اصل یہ ہے کہ نعت میں شہادت کے معنی حاضر ہونے کے ہیں، چنانچہ راغب اصفہانی کی مفردات القرآن میں ہے کہ شہود اور شہادت کے معنی حاضر ہونے کے ہیں، خواہ یہ حاضری ظاہری آنکھ کے مشاہدہ سے ہو یا دل کی آنکھ یعنی بصیرت کے مشاہدہ سے ہو۔ کبھی کبھی یہ لفظ صرف حاضر ہونے کے معنی میں آتا ہے، یعنی مشاہدہ عینی اور مشاہدہ قلبی اس میں داخل نہیں ہوتا مثلاً ”عالم الغیب والشہادۃ“ میں شہادت کے معنی صرف حضور کے ہیں، البتہ اگر اس معنی میں شہود کا لفظ اور مشاہدہ عینی اور مشاہدہ قلبی کے معنی میں شہادت کا لفظ لایا جائے تو بہتر ہو قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے، مثلاً

وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ اور وہ اوپر اس چیز کے کہ کرتے تھے، ساتھ مسلمانوں

کے حاضر تھے،

(بروج - ۱)

یہ ایک قدیم مستند ترجمہ ہے، ایک جدید ترجمہ قرآن میں اس کا ترجمہ یہ کیا ہے، ”اور جو (ظلم و ستم) مسلمانوں پر کر رہے تھے وہ (اس کا تماشہ) دیکھ رہے تھے“ اور تفسیر کبیر میں اس ظالمانہ موقع پر ان کے حاضر بننے یا تماشہ دیکھنے کی متعدد وجہیں بتائی ہیں، جن میں ایک وجہ یہ ہے کہ وہ



اس قدر سنگدل تھے کہ ان کو اس بے رحمانہ تماشے کے دیکھنے میں لطف آتا تھا، لیکن اس کے ایک معنی گواہی دینے کے بھی ہو سکتے ہیں، یعنی جس بادشاہ نے ان کو مسلمانوں کے جلانے پر متعین کیا تھا، یہ لوگ اس کے سامنے گواہی دینے کے لئے اس موقع پر حاضر ہوئے تھے کہ تعمیلِ حکم میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں معنی میں کوئی تضاد نہیں، ایک شخص کسی مجلس میں تماشائی کی حیثیت سے شریک بھی ہو سکتا ہے اور ایک عدالت میں اس کے متعلق شہادت بھی دے سکتا ہے۔

ایک دوسری آیت جس میں یہ لفظ حاضری کے معنی میں آیا ہے، یہ ہے،

ذُرِّیَّتِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا اَوْ جَعَلْتُ (اے پیغمبر! ہم کو اور اس نابکار) کو (اپنے انچو مال پر)

لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا وَآزَبَیْنِ شَہُوْدًا، رہنمود (کہ ہم اس سے نپٹ لیں گے) جسے ہم نے اکیلا

(یعنی بے سامان محض) پیدا کیا اور (پھر) اس کو بہت

سامان غایت کیا اور (مال کے علاوہ) بیٹے دیئے (مدثر-۱)

جو اس کے ساتھ حاضر رہتے ہیں،

تفسیر کبیر میں بیوں کے موجود اور حاضر رہنے کی دو وجہیں بتائی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے بیٹے دولت مند

تھے، اس لیے طلبِ معاش کے لئے اس سے جدا نہیں ہوتے تھے، اور وہ ان کو اپنے ساتھ دیکھ کر خوش ہوتا

تھا، یا یہ کہ وہ اس کے ساتھ مجلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے تھے،

یہ تو اس لفظ کے حقیقی معنی ہیں، اس کے علاوہ یہ لفظ اور بھی بہت سے مجازی معنوں میں استعمال

ہوتا ہے، جن میں ہر جگہ حضورؐ کے معنی پائے جاتے ہیں، شاہد یا شہید یا شہود گواہ کو اس لیے کہتے ہیں کہ

وہ واقعہ کے جائے وقوع پر حاضر اور موجود رہتا ہے، جو لوگ خدا کی راہ میں جان دیتے ہیں، ان کو شہید

اس لیے کہتے ہیں کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں، اس لئے ہم سے غائب نہیں بلکہ ہمیں حاضر اور موجود ہیں

یا یہ کہ ملائکہ رحمت ان کے پاس حاضر ہوتے ہیں، حامی اور مددگار کو بھی اس لئے شہید کہتے ہیں، کہ وہ مدد

کے وقت اور موقع پر جان و مال سے حاضر رہتے ہیں۔

وَانْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا  
فَاْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ  
مِّنْ دُونِ اللَّهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ .

اور وہ جو ہم نے انچونیدے (محمد) پر (قرآن) اتارا ہو اگر تم کو اس میں شک ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے، اور (اپنا اس دعویٰ میں) سچے ہو تو اسی جیسی ایک سورت (تم بھی بنا) لاؤ

(البقرہ - ۳)

اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو (بھی) بلاؤ،

اسی اصول کے مطابق نگران کار کو بھی شہید یا شاہد کہتے ہیں، کیونکہ وہ جن لوگوں کی نگرانی کرتا ہے ان کے درمیان حاضر اور موجود رہتا ہے، اسی بنا پر خداوند تعالیٰ کو شہید یا شہود کہتے ہیں، کیونکہ اس سے بڑھ کر انسانی اعمال کا واقف کار اور نگران کار کون ہو سکتا ہے ؟

وَمَا تَكُونُ مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْلَمُونَ  
مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا . اِذْ تُفِيضُوْنَ فِيْهِ . وَمَا يُغْنِيْ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا اَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا اَكْبَرَ اِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِيْنٍ .

اور (اے پیغمبر) تم کسی حال میں ہو اور قرآن کی کوئی سی آیت بھی (لوگوں کو) بڑھ کر سنا تے اور (لوگوں کو) تم کوئی سائل بھی کرتے ہو، ہم (ہمہ وقت) جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو تم کو دیکھتے رہتے ہیں اور (اے پیغمبر) تمہارے پروردگار (کے علم) سے ذرہ بھر چیز بھی غائب نہیں رہ سکتی، (نہ) زمین میں اور نہ آسمان میں اور کوسے سے چھوٹی چیز ہو یا بڑی (سب) کتاب روشن (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی (موجود) ہے،

(یونس - ۷)

انسانی اعمال کی نگرانی کے لئے خداوند تعالیٰ نے جن فرشتوں کو مقرر فرمایا ہے، ان کو بھی اسی معنی میں شہید کہتے ہیں، قرآن مجید کی ایک آیت یہ ہے،

واشترقت الارض بنور دجھا و وضع  
الکتب و جاسی بالنہین والشہداء  
وقضی بینہم بالحق و ہم لا یظلمون  
اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے چمک اٹھی اور  
(لوگوں کے نامہ اعمال) کی کتاب (لا کر سامنے) رکھ  
جائے گی، اور پیغمبر و گواہ لا حاضر کئے جائیں گے اور  
(لوگوں) میں انصاف کے ساتھ (ان کے اختلافات

(زمرہ - ۷)

(کا) فیصلہ کر دیا جائیگا، اور ان پر (کسی طرح کا) ظلم نہ ہوگا،

لیکن اس آیت میں شہداء کا ترجمہ گواہ کے لفظ سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہاں شہداء  
سے مراد وہ فرشتے ہیں جن کو خداوند تعالیٰ نے اعمال انسانی کی نگرانی کے لئے متعین فرمایا ہے، چنانچہ امام راز  
تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ مقاتل کے نزدیک اس سے حفظ یعنی اعمال انسانی کی نگرانی کرنے والے فرشتے  
مراد ہیں، اور اس آیت سے جیسا کہ اوپر گذر چکا،

وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ  
اور ہر شخص (اعمال کی جواب دہی کے لئے) حاضر ہوگا

(ق - ۲)

(ایک فرشتہ تو) اس کے ساتھ ہانکنے والا ہوگا، اور

(ایک فرشتہ اس کا اعمال نامہ لئے ہوئے اس کے علمبردار ہوگا)

اس کی تائید ہوتی ہے، اس لحاظ سے ان آیتوں میں شہداء اور شہید کا ترجمہ بچاے گواہ کے نگران کار کے  
لفظ سے ہونا چاہئے،

فرشتوں کے بعد اعمال انسانی کی نگرانی پیغمبر کرتے ہیں، اس لئے ہر پیغمبر کو بھی شہید کہتے ہیں اور

یہ کوئی قیاسی بات نہیں، بلکہ جس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شہید کا لفظ آیا ہے، اس کی تفسیر  
تفسیر فتح البیان میں اس طرح کی گئی ہے،

یعنی میں اُنکا نگران کار تھا، اور انکے حالات کی دیکھ بھال

ای حیظنا و رقیبا ارعی احوالہم

کیا کرتا تھا اور تیرے علم کی مخالفت سے انکو روکتا تھا،

وامنعصہ عن مخالفتہ امرک،

یہ تفسیر حقیقت و تفسیری کی تفسیر کشف سے ماخوذ ہے، جو مشہور ادیب تھے، اور ان کی تفسیر نے اپنی حیثیت سے خاص طور پر شہرت حاصل کی ہے، وہ اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں،

رَقِيبًا مِّنْهُمْ مِّنْ اَنْ يَقُولُوا ذٰلِكَ و  
یعنی میں ان کا نگہبان تھا اور ان کو یہ کہنے سے روکتا تھا،

اور اسی معنی میں قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق شاہد کا لفظ آیا ہو  
پیغمبر کے ساتھ ساتھ مومنین صادقین کا ایک گروہ بھی لوگوں کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے،  
اس لیے اس کو بھی اسی معنی میں شہید کا لقب ملا ہے، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُوْنُوْا  
شُهَدَآءَ عَلٰی النَّاسِ میں بھی معنی مراد ہے،

اب نظام نبوت یا ایک پیغمبر کے پیغمبرانہ اعمال کی تکمیل چار قسم کے لوگوں کے اجتماع اور اشراک  
عمل سے ہوتی ہے، جن کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ایک خاص ترتیب سے کیا گیا ہے،

وَمَنْ يُطِيعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ  
اور جو اللہ اور رسول کا کہا مانے تو ایسے لوگ جنت  
الَّذِيْنَ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّ  
میں) ان مقبول بندوں کے ساتھ رہیں گے جن پر  
وَالصّٰدِقِيْنَ وَالشّٰهِدَآءَ وَالصّٰلِحِيْنَ  
اللہ نے (بڑے بڑے) احسانات کئے ہیں، یعنی نبی  
وَحَسَنٌ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا،  
اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے

(نساء - ۹)

اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں،

اور امام رازمی نے تفسیر کبیر میں ان کے معنی اور فرائض نہایت صحیح طور پر بتائے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں  
”خداوند تعالیٰ نے پیغمبروں کا ذکر کیا، پھر تین اوصاف بیان کئے، یعنی صدیقین، شہداء اور  
صالحین، اس پر تو اتفاق عام ہے کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین سے مختلف ہیں  
لیکن ان تینوں اوصاف کے متعلق باہم اختلاف ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تینوں

اوصاف ایک ہی موصوف کے ہیں، کیونکہ ایک ہی شخص صدیق، شہید اور صالح ہو سکتا ہو، لیکن دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ہر وصف سے انسانوں کی ایک مستقل قسم مراد ہے، اور یہی صحت سے قریب تر ہے، کیونکہ مطون کا معطوف علیہ سے مختلف ہونا ضروری ہے، جس طرح انبیاء لوگوں سے مختلف ہیں جن کا ذکر ان کے بعد کیا گیا ہے، اسی طرح صدیق کو ان لوگوں سے مختلف ہونا چاہئے، جن کا اثر ان کے بعد کیا گیا ہے یہی بات اور اوصاف پر بھی صادق آتی ہے، اب ہم تینوں اوصاف کے متعلق بحث کرتے ہیں، ان میں (۱) پہلا وصف تو صدیق کا ہے، اور صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جو سچ بولنے کا عادی ہوتا ہے، کیونکہ جس شخص پر عادت کسی فعل کا غلبہ ہو جاتا ہے جب وہ اس فعل سے متصف کیا جاتا ہے تو اس کے لئے فعل کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ شراب کے سخت عادی کو سکر، شرب اور خمر گوئیں، ایسا نذروں کے اوصاف میں سچائی ایک شریفانہ وصف ہو اور اس کی فضیلت کے لئے صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ایمان صرف صدیق کا نام ہے اور جھوٹ کی برائی کے لئے صرف اس قدر کہنا کافی ہے، کہ کفر صرف تکذیب کا نام ہے، جب تم کو یہ بات معلوم ہو چکی تو ہم کہتے ہیں کہ مفسرین نے صدیق کے متعدد معنی بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ جو شخص بغیر کسی قسم کے شک و شبہ کے پورے دین کی تصدیق کرے وہی صدیق ہے، اور اس کی دلیل خداوند تعالیٰ کا یہ قول ہے،

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَمِلُوا  
هَذَا صَدَقُوا ۖ وَقَالُوا ۚ  
اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان  
لائے وہی صدیق ہیں،

دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ صدیقین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگ ترین صحابہ مراد ہیں، تیسرا قول یہ ہے کہ صدیق اس شخص کا نام ہے جس نے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق



جو شخص خدا کی راہ میں قتل کیا جاتا ہو، اسکو بھی شہید اسی لئے کہتے ہیں کہ خدا کے دین کی حمایت میں اس نے اپنی جان کو ایک متاعِ حقیر سمجھا اور یہ شہادت دی کہ خدا ہی حق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے، اور جو شخص اس معنی میں خدا کے شہداء میں سے ہوگا، وہ آخرت میں بھی خدا کے شہداء کے زمرے میں شامل ہوگا، جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے، "كُنَّا لَكَ جَلَنًا كَرَمًا" امّتہ وسطا لتكونوا شہداء علی الناس!

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ الباقی میں لکھتے ہیں:-

صدیقیت اور محدثیت کی حقیقت یہ ہے کہ امت کے بعض افراد اصل فطرت کے رو سے پیغمبروں کے مشابہ ہوتے ہیں، جیسا کہ ایک ذہین شاگرد اپنے استاد کے مشابہ ہوتا ہے، اب اگر یہ مشابہت تو اسے عقلیہ میں ہوتی ہے، تو اس کو صدیق یا محدث کہتے ہیں، لیکن جب یہ مشابہت قوتِ علیہ میں ہوتی ہے، تو اس کو شہید یا حواری کہتے ہیں، اور خداوند تعالیٰ کے اس قول "وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ" اور لَکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ وَالشَّهَادَةُ الخ میں ان ہی دونوں مقامات کی طرف اشارہ ہے، دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

مقاماتِ قلب میں دو مقام ایسے ہیں جو ان نفوس کے ساتھ مخصوص ہیں، جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، اور وہ دونوں بمنزلہ صدیقیت اور محدثیت کے ہیں، البتہ صدیقیت اور محدثیت کا مرکز قوتِ عقلیہ ہے، اور ان دونوں کا مستقر اس علی قوت میں ہے، جس کی لہریں قلب سے اٹھتی ہیں، اور یہ دونوں شہید اور حواری کے مقامات ہیں،

اب ان محققانہ تفسیروں کے رو سے شہادت کے معنی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے ہیں اور شہید اس شخص کو کہتے ہیں، جو نیکی کا حکم دے، اور برائی سے روکے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک

موت پر فرمایا کہ یہ کیا بات ہے کہ تم لوگ ایک شخص کو دیکھتے ہو کہ وہ لوگوں کی آبروریزی کرتا ہے، اور اسکو روکتے نہیں، سب نے کہا کہ اس کی بہ زبانی سے ڈرتے ہیں، فرمایا تو ایسی حالت میں تم شہداء کے زمرے میں شامل نہیں ہو سکتے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ جس شخص نے برائی سے روکا اور خدا کے معاملہ میں لعنت و ملامت سے نڈر رہا، وہ شہداء کے زمرے میں شامل ہے، (لسان العرب جلد ۵ ص ۲۲۹) جبریل امرا بالمعروف والنہی عن المنکر پیغمبروں کا اصلی فرض ہے، بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا امتیازی وصف یہی ہے، اور اسی امتیازی شان کے ساتھ قرآن مجید میں اس کا ذکر کیا گیا ہے،

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ  
الَّذِي يَخِذُّ مِنْهُمْ مَثَلًا وَهُمْ فِي  
التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ  
وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ،

(ان سے ہماری مراد اس زمانہ کے وہ اہل کتاب تھے) جلد ہمارے (ان رسولِ نبی امی (محمد) کی پیروی کرتے ہیں جن (کی بشارت) کو اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ ان کو اچھے کام

(کرنے) کو کہتے اور برے کام سے ان کو روکتے ہیں (الاحزاب - ۱۹)

اسی معنی میں قرآن مجید میں آپ کا ذکر کہیں شہید اور کہیں شاہد کے لقب سے کیا گیا ہے، اور جہاد جو آپ کی زندگی کا سب سے زیادہ مقدس فرض تھا، اسی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی ایک اعلیٰ ترین قسم تھا، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم میں سے اگر کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے، لیکن اگر اس کی قدرت نہیں رکھتا، تو اپنی زبان سے مٹا دے، اگر اتنی بھی طاقت نہیں رکھتا تو دل سے اس کو برا سمجھے اور صرف دل سے برا سمجھنا ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے، لیکن آپ نے اپنی قوت ایمانی کے بل پر جہاد کے ذریعہ سے نہ صرف ایک یا دو شخص کی بلکہ دنیا کی عالمگیر برائیوں کو مٹایا، اسی بنا پر آپ کی نسبت ارشادِ خداوندی ہے،

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكَ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكَ (لوگو، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف (دوستی کو)



كَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ رُسُوْلًا،

پیغمبر (نباکر) بھیجا تھا، تمہاری طرف بھی (محمد کو) رسول  
(نباکر) بھیجی ہو جو (قیامت کے دن) تمہارے مقابلہ

(منزل - ۱) میں گواہی دیں گے،

اس آیت کے ترجمہ میں بریکٹ میں قیامت کے دن کا جو اضافہ کیا گیا ہے، وہ ایک غیر ضروری اضافہ ہے، کیونکہ آیت میں قیامت کے دن کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس لئے لازمی طور پر شاہد کا ترجمہ گواہ سے کرنا بھی صحیح نہ ہوگا، کیونکہ یہ گواہی قیامت میں نہ ہوگی، بلکہ شاہد کا صحیح ترجمہ نگران کا ریا دوسرے الفاظ میں امر بالمعروف والنہی عن المنکر کرنے والا ہوگا، اور ہم ابھی لکھ آئے ہیں کہ جہاد بھی امر بالمعروف والنہی عن المنکر ہی کی ایک قسم ہے، اس لئے شاہد جہاد کو بھی کہہ سکتے ہیں، اور پیغمبروں میں صرف دو ہی پیغمبروں کی جہاد نہ فوز و فلاح مذہبی تاریخ کا یادگار واقعہ ہے، ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کی وجہ سے فرعون جیسا مغرور اور متمرّد بادشاہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا، دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کے ذریعہ سے خداوند تعالیٰ نے روسائے قریش کو جو کبر و غرور اور ترد و عصیان میں فرعون ہی کے مشابہ تھے، برباد کیا، اور اس حیثیت سے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کامل مشابہت پیدا ہوگئی، اس لئے خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صراحتاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اور کنایۃً آپ کی قوم باخصوص روسائے قریش کو فرعون کے ساتھ تشبیہ دی اور فرعون کے ترد و عصیان کا جو نتیجہ ہوا اس کو نہایت تہدید آمیز الفاظ میں اس طرح بیان فصیح فرعون الرسول فاخذناک اخذ او بیلہ، (منزل - ۱) اس کو بڑے وبال میں دھر کر لیا، اور اس طریقہ سے کفار کہ اور روسائے قریش کو درپردہ اسی سخت گرفت کی دھکی دی، خود ہمارے معصومین تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک تہدید آمیز آیت ہے، چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے،

واعلم ان الخطاب لا اهل مكة و جاننا چاہئے کہ اس آیت کے مخاطب اہل مکہ ہیں،  
المقصود تصدیق ہم بالآخذ الویل اور خطاب کا مقصد ان کو سخت گرفت کی دھمکی دینا ہے  
بہر حال شہادت اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر دونوں ہم معنی ہیں، اور سب سے پہلے شہاد

کا یہ درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا، اور آپ کی تعلیم و تربیت اور آپ کے فیضِ محبت سے آپ کے  
کی امت بالخصوص صحابہ کرام کو یہ شرف حاصل ہوا جیسا کہ خداوند تعالیٰ خود اس شرف کو بیان فرماتا  
كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ لوگوں (کی رہنمائی) کے لئے جس قدر امتیں پیدا  
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ہوئیں، ان میں تم (مسلمان) سب سے بہتر ہو کہ  
اچھے (کام کرنے) کو کہتے اور برے (کاموں) کو منع کرتے ہو  
(ال عمران ۱۱۰)

خداوند تعالیٰ نے اسی مفہوم کو دوسری آیت میں خود لفظ شہادت سے بھی بیان فرمایا ہو  
وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لَكُمُ امَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونُوا  
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝

لیکن ہمارے مفسرین نے عموماً اس آیت میں امَّةً وَسَطًا کے معنی امت عادلہ کے لئے ہیں اور  
صحیح بخاری کی روایت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ”وسطاً“ کی تفسیر عادل کے  
لفظ سے فرمائی ہے، لیکن یہ اس کے مجازی معنی ہیں، ورنہ لغت میں وسط کے معنی کسی چیز کے  
درمیان فی حصہ کے ہیں، اور چونکہ ہر چیز کا درمیان فی حصہ اس کے دونوں کناروں سے بہتر ہوتا ہے،  
اس لئے مجازاً وہ افضل اور بہتر کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور اس حالت میں یہ لفظ اسم  
نہیں ہوتا، بلکہ صفت ہوتا ہے، چنانچہ سان العرب میں ہے، (جلد ۹ ص ۳۰۶)

واعلم ان الوسط قد يأتي صفة و جاننا چاہئے کہ لفظ وسط اصولاً اگرچہ اسم ہے  
وان كان اصله ان يكون اسما و لیکن وہ اس حیثیت سے صفت کے معنی میں

جَعَلَهُ ان اوسط الشی افضلہ وخیارہ  
 کو وسط المعری خیر من طرفیہ وکوسط  
 الدابة للركوب خیر من طرفیہا التمكن  
 الراكب ومنه الحدیث خیار الاعمور  
 اوساطها فلما کان وسط الشی افضلہ  
 واعدله جازان يقع صفته وذلك  
 فی مثل قوله تعالی وتقدس وکذلک  
 جَعَلْنَا کُمْ اُمَّةً وَسطًا ای عدلاً،

بھی آتا ہے کہ ہر چیز کا وسط یعنی درمیانی حصہ اس کا  
 بہترین حصہ ہوتا ہی جیسے چراگاہ کا درمیانی حصہ  
 اس کے دونوں کناروں سے اچھا ہوتا ہے، اور  
 سواری کا درمیانی حصہ سوار کے لئے اس کے دونوں  
 کناروں سے بہتر ہوتا ہے، کیونکہ درمیانی حصہ میں  
 سوار جم کر بیٹھ سکتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں  
 آیا ہے کہ تمام چیزوں کے بہترین حصے اس کے بیچ کے  
 حصے ہوتے ہیں، پس جبکہ کسی چیز کا درمیانی حصہ اس  
 کا بہترین اور موزوں حصہ ہوتا ہے، تو وصفت  
 بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ خداوند تعالیٰ کے اس قول  
 "كَذَلِكَ جَعَلْنَا لَكُمُ اُمَّةً وَسطًا" میں یہ صفت  
 بمعنی عدل آئی ہے،

اب جبکہ وسط کے معنی افضل اور بہتر کے، اور شہادت کے معنی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے قرار  
 پائے، تو یہ آیت پہلی آیت یعنی کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ کے ہم معنی و مراد ہو گئی،  
 اور اب اس کا ترجمہ یہ ہوگا،

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لَكُمُ اُمَّةً وَسطًا تَكُونُوا  
 شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ  
 عَلَيْكُمْ شَهِيدًا،  
 اور اسی طرح ہم نے تم کو بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگ  
 اور تمام آدمیوں کو امر بالمعروف والنہی عن المنکر  
 کرو اور تمہارا پیغمبر (محمد) تم کو امر بالمعروف والنہی  
 عن المنکر کرے،

چنانچہ امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں پہلے تو وسط کے معنی وہی مادل کے لئے ہیں، پھر اس کے دوسرے معنی افضل اور بہتر کے بتائے ہیں، اور لکھا ہے کہ

القول الثاني ان الوسط من كل شيى  
خياله قالوا وهذا التفسير اولى من  
الاول لوجوه،  
دوسرا قول یہ ہے کہ ہر چیز کا وسط اس کا بہترین  
حصہ ہوتا ہے، اور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ تفسیر پہلی  
تفسیر (یعنی وسط بمعنی مادل) سے متعدد وجوہ کی  
بنیاد پر بہتر ہے،

جن میں ایک وجہ یہ ہے کہ  
انه مطابق لقوله تعالى "كُنْتُمْ خَيْرَ  
أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"،  
اور یہ اس بات کی صاف دلیل ہے، کہ وہ دونوں آیتوں کو ہم معنی سمجھتے ہیں،  
اس تفسیر کی روشنی میں شہید اور شاہد کے معنی کی جو تعین و تشریح کی گئی ہے، وہ پیغمبرانہ <sup>نفس</sup>  
سے بہت زیادہ مناسب و کمکتی ہے، اور جو شخص یا جو لوگ دنیا میں ان فرائض کو ادا کریں گے وہی  
قیامت کے دن اور لوگوں کے اعمال کے گواہ بھی ہوں گے، اس لئے حدیث و قرآن میں کوئی تعارض  
نہیں بلکہ تطابق ہے،

## تفسیر ابوسلم اصفہانی

عربی مترزلہ کی منقولہ و انجمن دارالوجود عقلی تفسیر قرآن کے اجزاء جو نہایت دیدہ و دیرزی سے امام رازی  
کی تفسیر کبیر سے جمع کئے گئے ہیں، عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت ۱۰ روپے، ۱۰۳ صفحے،  
"مینجر"

## ابن جریر طبری

از

مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرانی رفیق دارین

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں بلرستان کے مشہور شہرائی کے ایک دولت مند گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا، رنگ گندی، بدن نحیف و نزار، لیکن کسے خبر تھی کہ یہی جسم ناتوان ایک دن ایسے علوم و کمالات کا حامل ہوگا جس کی نظیر ملنا مشکل ہو جائے گی، تفسیر حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، نحو، ادب جس فن پر لب کشائی کریگا معلوم ہوگا کہ یہ اسی کا فن ہے!

اس سے ہماری مراد ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کی ذات ہے!

ابن جریر طبری کو لوگ عموماً صرف ایک مورخ اور اس کے بعد ناقل روایت مفسر کی حیثیت سے جانتے ہیں، ان کے کمالات اور ان کی خصوصیات ابھی عموماً پردہ خفا میں ہیں، اس مضمون میں اجمالی طور سے انہی امور پر نظر مقصود ہے و بآئذہ التوفیق و علیہ السلام،

نام و نسب و ابتدائی زندگی | محمد نام اور ابو جعفر کنیت ہے، خطیب (رج ۲ ص ۱۳۷) اور بسکی (طبقات

شافعیہ ج ۲ ص ۱۳۷) کی روایت کے مطابق پورا نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الطبری،

ابن خلکان (رج ۲ ص ۱۳۷) کی روایت میں نسب نامہ یوں ہے:

ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن خالد الطبری،

کسی نے خود ابن جریر سے ان کا نسب دریافت کیا، انہوں نے جواب میں کہا، محمد بن جریر بائبل  
نے مزید تفصیل چاہی تو یہ شعر پڑھ دیا،

قد رفع العجاج ذكرى فادحى باسمى اذا الانساب طالت يكفنى

سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا، ابھی بچپن کا زمانہ تھا کہ باپ نے خواب میں اپنے نور نظر کو  
بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر پایا، معتبر نے پدرِ خواب سنکر تعیر دی کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا، تو دین کا  
خادم اور شریعت کا زبردست حامی ہوگا،

ابتدائی تعلیم اپنے وطن اہل ہی میں پائی، جب کچھ سن تیز کو پہنچے تو والد بزرگوار نے حصولِ علم  
کے لئے سفر کی اجازت دی، چنانچہ اہل سے رے آئے، یہاں سے اور جوار سے کے مشائخ سے استفادہ  
کیا، اس کے بعد بصرہ، کوثر، مصر، فسطاط اور شام کے سفر کئے اور ہر جگہ علماء و مشائخ سے نفع اٹھایا،  
ابن جریر کے زیادہ قابل ذکر اساتذہ کے نام یہ ہیں:

محمد بن حمید الرازی، ثنی بن ابراہیم اللابی، احمد بن حماد الدولابی، محمد بن بشار ہناد بن  
السری ۲۳۳ھ ابو کریب محمد بن العلاء الہمدانی ۲۳۵ھ،

حصولِ علم میں محنت و جفا کشی کا یہ عالم تھا کہ رے کے زمانہ قیام میں رے اور جوار سے  
دونوں جگہ کے مشائخ سے ہر یک وقت استفادہ کرتے، احمد بن حماد دولابی جوار سے میں رہتے  
تھے، ابن جریر ان کی مجلس میں شرکت کے لئے جاتے اور ختمِ درس کے بعد وہاں سے دوڑتے ہوئے  
رے آتے تاکہ یہاں کے مشائخ کے حلقہٴ درس میں شریک ہو سکیں،

ذہانت، توجہ اور محنت نے اساتذہ کی نظر میں محبوب بنا دیا تھا، چنانچہ کوثر میں ایک بار  
اپنے استاد ابو کریب کے مکان پر دوسرے طالبانِ حدیث کے ساتھ گئے، استاد نے شاگردوں

کا امتحان لیا، اور چند سوالات کئے، ان سوالات کا پورا درمچو جواب دینے والا صرف ایک شاگرد تھا، ابن جریر! اس خوش ہو گیا، اور اپنے حلقہ درس میں اعزاز و اکرام کی جگہ دئی،

ایک عرصہ تک تحصیل علم اور کسب کمالات کے بعد ابن جریر اپنے وطن طبرستان واپس آئے لیکن قدرت کو یہاں ان کا قیام منظور نہ تھا، ان کو ایسے مرکز میں رہنا چاہئے تھا، جہاں سے علوم و معارف کی پوری تبلیغ ہو سکے،

ہوایہ کہ طبرستان میں جب یہ داخل ہوئے تو دیکھا کہ یہاں رفض و تشیع کے دروغ کو خوب فروغ ہے، اور حضرات صحابہ کرام پر عموماً سب و شتم جاری ہے،

اس موقع پر ابن جریر نے اپنے عالمانہ منصب کو محسوس کیا، اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کیا، انجام کار حکومت وقت مخالفت ہو گئی، اور ان کو ترک وطن کر کے بغداد میں قیام کرنا پڑا،

ساری عمر بغداد ہی میں علم و دین کی خدمت اور اعلیٰ کلمہ حق میں بسر ہوئی، حکومت وقت نے بار بار چاہا کہ ان کی کچھ خدمت کرے لیکن ان کی غیور اور متیاط طبیعت نے کبھی اسکو قبول نہ کیا، خاقانی نے اپنے زمانہ وزارت میں کافی دولت نذر کرنا چاہی لیکن وہ ان کی بارگاہ میں قبول نہ ہوئی، قصداً کا عہدہ پیش کیا، اس سے بھی انکار کر دیا، خیر اندیشوں نے عرض کیا کہ یہ تو ثواب کا کام تھا، اسے آپ نے کیوں چھوڑ دیا؟ اس پر ابن جریر ان لوگوں سے ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ مجھکو تو یہ توقع تھی کہ اگر میں اس عہدہ کو قبول کرتا تو تم مجھ کو اس سے باز رکھتے نہ کہ تم خود مجھ کو ترغیب دیتے ہو؟ بغداد کے زمانہ قیام میں بعض اوقات ابن جریر کے لئے بہت سخت گزرے، رفض اور احماء کا الزام لگایا گیا، یہ الزام لگانے والے وہ لوگ تھے جن سے اگر رفض اور احماء کے معنی دریافت

لے ہم الادبار ج ۶ ص ۴۳۳ حوالہ مذکور ص ۴۳۵ حوالہ مذکور ص ۴۳۵ طبعات شافعیہ،

کئے جاتے تو وہ اس کو سمجھ بھی نہ سکتے، حالانکہ ابن جریر نے رفض ہی کے فتنہ کی وجہ سے اپنے وطن طبرستان کو چھوڑا تھا، اور بنداد میں اگر پناہ لی تھی، بغداد میں خابله نے بھی فی الفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، ان کے اختلاف کا سبب یہ تھا کہ ابن جریر نے جب اپنی کتاب اختلاف الفقہاء تصنیف کی جب کا ذکر آگے آتا ہے تو اس کتاب میں امام احمد بن حنبل کا ذکر نہیں کیا، وہ لکھتے تھے کہ امام احمد محدث ہیں فقیہ نہیں ہیں، بہر حال اسی چیز نے خابله کو آتش زیر پا کر دیا، ایک بار تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابن جریر کے مکان پر غالیفین کے ہزاروں آدمیوں نے ہجوم کیا، اور اس قدر خشت باری کی کہ دروازے پتھروں سے بٹ گیا، چھوڑا پولیس آئی، اور اُس نے فتنہ فرو کیا،

یہ سب کچھ ہوا، لیکن اس سے ابن جریر کی عظمت، احترام اور ان کے تقدس میں کوئی فرق نہ آیا، اہل دولت کو یہی تمنا رہتی کہ کاش ابن جریر ان کا تحفہ قبول کر لیں اور اہل علم ابن جریر سے رشتہ کو باعث فخر سمجھتے،

ان کی عظمت و شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو مہینوں تک قبر پر نماز جنازہ پڑھی جاتی رہی، اور صد ہا اہل دین و ادب نے مرثیہ کہے،

ان مرثیوں میں ابن سعید بن الاعرابی اور ابن درید کے مرثیہ بہت دردناک ہیں،

ابن سعید بن الاعرابی کے مرثیہ کا ایک شعر ہے،

قاہرنا علی العلوم اجمع لما      قاہرنا علی محمد ابن جریر

ابن درید نے اپنے مرثیہ میں کہا

ان المنیۃ لم تتلف بدحلا      بل اتلفت علما للمدین منصوبا

ان دونوں مرثیوں کو خطیب نے اپنی تاریخ میں نقل کر دیا ہے،

لہ تاریخ کامل ج ۱۰ صفحہ ۱۵۸ ایضاً مجمع الادب ج ۱ ص ۱۵۸



شعبہ کو دن کے آخری حصہ میں ان کا انتقال ہوا، اور کثیفہ ۶۷ شوال ۳۳۵ھ کو بغداد میں دفن ہوئے۔ ابن خلکان کہتے ہیں کہ مصر میں ایک قبر ہے جو لوگوں کی زیارت گاہ ہے، اور اس پر لکھا ہوا ہے کہ یہ ابن جریر طبری کی قبر ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ابن جریر صاحب تاریخ ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے ابن جریر بغداد ہی میں دفن ہوئے۔

ابن جریر کے علوم [اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن جریر کا جسم بغداد میں زیر زمین دفن ہو گیا لیکن ابن جریر کے نام کو بغداد کی سرزمین نہ دبا سکی] ابن جریر کی اصل چیز نئے علمی کارنامے ہیں خدا کا شکر ہے کہ ان کے کارناموں سے دنیا کسی حد تک آفت ہے اور ان کی معترف ہے،

ابن جریر علوم اسلامیہ کے بہت بڑے خادم اور مسلمانوں کے مخدوم ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، تاریخ، نحو، صرف، ادب، معانی، منطق، حساب، جبر و مقابلہ اور طب میں ان کو خاص کمال حاصل تھا،

ان کی انتیس تصنیفات میں سے ہمارے پاس صرف چھ مطبوعہ کتابیں موجود ہیں (۱) تفسیر ابن جریر (۲) تاریخ ابن جریر (۳) آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ (۴) ذیل المذیل (۵) اختلاف الفقہاء (۶) الاعتقاد،

ایک کتاب تہذیب الآثار کے متعلق معلوم ہے کہ اس کے بعض حصے استنبول کے کتب خانہ میں موجود ہیں، بقیہ نوا درپردہ خفا میں ہیں،

آئندہ صفحات میں ابن جریر کے انہی علوم اور انہی تصانیف کے اجمالی تعارف کی کوشش کی گئی ہے،

ابن جریر اور فن تجوید و قرأت | ابن جریر کے علوم اور تصانیف کو ہم قرآن پاک سے شروع کرتے ہیں

اس سلسلہ میں پہلا فن تجوید و قرأت کا آنا ہی، سات سال کی عمر میں ابن جریر نے قرآن حفظ کیا،  
سیلمان بن عبد الرحمن بن حماد طلی قرآن کے اُستاد تھے، جب تک خود اپنی قرآنہ اختیار کی حمزہ  
جن کا شمار شمس قراد میں ہی، اُن کے طریق پر قرأت کرتے رہے، حمزہ سے انکے روایت کے دوسلے ہیں  
(۱) طلی عن خلا عن سلیم بن عیسیٰ عن حمزہ،

(۲) عن یونس بن عبد الاعلیٰ عن علی بن کیس عن سلیم عن حمزہ،

یونس بن عبد الاعلیٰ (دست ۲۷۳) ہی کے ذریعہ سے بہ واسطہ درشن نافذ کی روایت بھی انکو  
حاصل تھی،

قرآن اتنا اچھا پڑھتے تھے کہ دور دور کے قراء اس کے سننے کے لئے اور عام لوگ ان کے  
پیچھے نماز پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے

خطیب اپنی تاریخ (رج ۲ ص ۱۲۴) میں ابو علی طوماری کے ایک واقعہ کو نقل کرتے ہیں کہ یکبار  
رمضان کی کسی آخری شب میں ابو علی طوماری اپنے استاد ابوبکر بن مجاہد کے ساتھ تراویح کیلئے  
روشنی لئے ہوئے جا رہے تھے، بن مجاہد چلتے چلتے محمد بن جریر طبری کی مسجد کے سامنے کھڑے ہو گئے،  
طبری مسجد میں سورہ جن پڑھ رہے تھے، دیر تک ان کی قرأت سنتے رہے، جب آپ لوٹے تو  
ابو علی طوماری نے عرض کیا کہ آپ نے لوگوں کو اپنا منتظر رکھا، اور یہاں قرآن سنتے رہے،  
ابوبکر بن مجاہد نے کہا کہ تمہیں کیا خبر کہ اللہ نے کیسا آدمی پیدا کیا ہے جو اس قدر اچھا قرآن پڑھتا  
ابن جریر کہ علم قرأت میں کامل دستگاہ حاصل تھی، اس میں انھوں نے امامت کا درجہ حاصل کیا تھا  
اور ان کا شمار ان لوگوں میں تھا جو مختلف قراءتوں میں کسی ایک کو ترجیح دے سکتے تھے

انھوں نے اپنی کتابوں میں قراءت سے مقدمہ و قراءت بیان کی ہیں جو صحابہ کرام کے عہد میں

پڑھی جاتی تھیں اور جن سے وہ نماز پڑھتے تھے

علم قرأت میں تصنیف | ابوعلی الحسن بن علی الاہوازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے فن قرأت میں ابن جریر کی ایک کتاب آٹھ جلدوں میں دیکھی، اس میں انھوں نے تمام مشہور اور شاذ قرات کو جمع کر دیا ہے۔ نیز ان سب میں اپنی پسندیدہ قراتوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اپنے اس اختیار و انتخاب میں وہ قرأت مشہور سے الگ نہیں ہوئے،

یا قوت نے معجم الادباء میں ان کی ایک اور کتاب الفصل میں القرات کا ذکر کیا ہے، جس میں ابن جریر نے حروفِ قرآن کے بارے میں قاریوں کے اختلافات کو واضح کیا ہے، نیز مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام وغیرہ کے قاریوں کی تفصیل اور ان کی قراتوں کی توضیح کی ہے، اور ان میں سے جس کو انھوں نے قابلِ ترجیح سمجھا ہے مع دلائل کے اس کا ذکر کیا ہے، ابو بکر بن مجاہد اس کتاب کیلئے کہا کرتے تھے، کہ اس سلسلہ میں اس سے عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی،

ابن جریر اور تفسیر | قبل اس کے کہ ہم ابن جریر کی تفسیر پر گفتگو کریں ضروری ہو کہ ان سے پیشتر کی تاریخِ تفسیر پر اجمالی نظر ڈال لیں تاکہ صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔ ابن جریر سے پیشتر تفسیر کے تین دور قائم ہو سکے ہیں،

(۱) پہلا دور حضراتِ صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا ہے، جن کو بارگاہِ نبوت سے براہِ راست فہمِ قرآن کا موقع ملا، ہر چند کہ حضراتِ صحابہ عموماً اہلِ عرب تھے اور انہی کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، تاہم یہ فہمِ قرآن میں اپنے کو رسول کا پابند اور محتاج سمجھتے تھے، کوئی لفظ یا آیت ان بزرگوں کی سمجھ میں نہ آتی تو حضورؐ سے دریافت فرماتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ فریضہ تھا، کہ امت کے سامنے وحی الہی کی تشریح و تبیین فرمائیں، اسلئے بسا اوقات ایسا ہوتا

لے شرح سبعہ قرات از مولوی محمد الاسلام صاحب پانی پتی مکتبۃ معجم الادباء ج ۶ ص ۴۷۷،

کہ خود سرور کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کے متعلق صحابہؓ سے دریافت فرماتے اور بعد کو اسکی توضیح و تشریح فرمادیتے،

اس کے ماسوا اکابر صحابہؓ اپنی علمی مجلسوں میں بھی قرآن مجید کے متعلق بہت سے نکتے حل فرماتے، قرآن کے غریب لفاظی کی شرح میں دیوان عرب سے کام لیتے، احکام قرآن پر غور فرماتے، مسائل کا استنباط کرتے نشان نزول بیان فرماتے، اگر کسی کو غلط معانی اخذ کرتے یا بیان کرتے ہوئے دیکھتے تو اسکی اصلاح فرمادیتے تھے،

اس طرح سے قرآن پاک کا سب مستند اور صحیح تفسیری ذخیرہ ان بزرگوں کے سینہ میں محفوظ تھا، اس مبارک عہد میں اسرائیلیات تفسیری روایات میں زیادہ نقل پاکیں، تاہم وہب بن منبہؓ اور کعبہ الاحمار کی روایات کا سلسلہ ضرور تھا، صحابہ کرام میں دس حضرات کو اس فن میں خاص امتیاز حاصل تھا، خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، ان حضرات کے سوا حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے بھی تفسیری روایات مروی ہیں مگر بہت کم! حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی مرویات زیادہ تر قصص اور اخبار و فتن وغیرہ سے متعلق ہیں،

خلفائے راشدین میں سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہیں، حضرت علیؓ کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات زیادہ ہیں، سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں،

صحابہ میں ایک تفسیری مجموعہ کا انتساب حضرت ابی بن کعبؓ کی طرف ہے، اس ابن جریر طبری نے بہ کثرت افذ کیا ہو، حاکم نے مستدرک میں نیز امام احمد بن حنبلؓ نے بھی اس سے افذ کیا ہو، صحابہ کرام کے بعد حضرات تابعین کا دور آتا ہو اس دور میں مکہ اور کوفہ تعلیم قرآن کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں، مکہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ حضرت مجاہدؓ، جعفر بن سعید بن جریجؓ، حضرت عکرمہؓ، حضرت طاؤسؓ، حضرت عطار بن رباحؓ کا فیض جاری تھا،

کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ، حضرت علقمہ بن قیسؓ، حضرت اسود بن یزیدؓ، حضرت ابراہیم نخعیؓ، اور امام شعبیؓ خدمت دین میں مصروف تھے، ان حضرات کے سوا اس عہد کے مشاہیر میں حضرت حن بصریؓ، عطار بن ابی سلمہ خراسانی، محمد بن کعب القرظیؓ، ابو العالیہ رفیع بن ہرمانؓ، الرباعیؓ، ضحاک بن مزاحمؓ، عیسیٰ بن سعید العونیؓ، قتادہ بن دعامہؓ، ابومالکؓ، زید بن اسلمؓ، یسیع بن مرہ ہمدانیؓ کے نام قابل ذکر ہیں، اس دور کی تفسیر کا بڑا سرمایہ حضرت ابیہام کی روایات اور ان کے اقوال ہیں، خود تابعین عظام بھی تلاش و تفحص اور اجتہاد نیز استنباط مسائل سے کام لیتے تھے، قرآن کے متعلق ان کی لغوی تشریحات کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں جمع کر دیا، اس دور میں اسرائیلیات کو تفسیر میں زیادہ دخل ہوا، اہل کتاب مسلمان قورات، انجیل اور ان کے شروح و حواشی کو آیات قرآنی کے ضمن میں بیان کرتے اور لوگ ان کو ذوق و شوق سے سنتے، اس عہد میں ابن جریجؓ جو کہ نصرانی الاصل تھے، ان کی روایات زیادہ شہرت پذیر ہوئیں،

صاحب کشف الظنون نے جن کتب تفسیر کا ذکر کیا ہے، ان میں سے حضرات تابعین کی طرف

جن کا انتساب ہے وہ یہ ہیں،

(۱) تفسیر عکرمہ (۲) تفسیر عوفی (۳) تفسیر مجاہد (۴) تفسیر والبی (۵) تفسیر زید بن اسلم،  
ابن الوزیر یمنی نے ایثار بن علی بن الحنفیہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد علی بن طلحہؓ کی  
کی تفسیر، نیز تفسیر امام حسن بصریؒ تفسیر عطاء بن رباحؒ تفسیر محمد بن کعبؒ قرطبی کا ذکر کیا ہے،  
علی بن طلحہؓ کی تفسیر کے متعلق حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ اس کا ایک نسخہ امام لیثؒ کے کتاب  
شیخ ابوصالح کے پاس تھا، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یہ نسخہ مقرر میں ہے، اگر کوئی شخص اس کے  
لئے مقرر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس صحیفہ سے ابو جعفر خراسانیؒ نے اپنی کتاب  
الناسخ والنسوخ میں کافی اخذ کیا ہے، ابن جریرؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اس سے تخریج کی ہے،  
حضرت سعید بن جبیرؒ کی طرف بھی ایک تفسیر منسوب ہے، حضرت سعید بن جبیرؒ کی خدمت میں  
عبد الملک بن مروان نے لکھا کہ قرآن مجید کی تفسیر تحریر فرمائیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھی جو  
کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی، یہی تفسیر تفسیر عطاء بن دینار کے نام سے مشہور ہے،  
حضرات تابعین کے بعد تبع تابعین کا دور آتا ہے، ان کا اصل کارنامہ احوال صحابہ و تابعین  
کا جمع کرنا اور ان کی اشاعت ہے، دوسری روایات کو بھی انھوں نے جمع کیا، لیکن عموماً جرح و  
سے الگ رہے، الا ما اشار اللہ،

اس سلسلہ میں قابل ذکر حضرات یہ ہیں،

سفيان بن عيينه ۱۹۰ھ، وکیع بن الجراح ۱۹۶ھ، شعبہ بن الحجاج ۱۹۷ھ، اسحاق بن اہو  
۲۳۳ھ، یزید بن ہرون السلی ۲۲۶ھ، عبد الرزاق بن ہمام ۲۲۱ھ، آدم بن ابی ایاس ۲۳۳ھ  
روح بن عبادہ ۲۰۵ھ، سید ابن داؤد ۲۲۰ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ ۲۳۵ھ، عبد بن حمزہ ۲۴۹ھ،

۱۱۰ھ مرآۃ التفسیر ۱۱۰ھ میرزا الاعمال ترجمہ عطاء ابن دینار،

اس دور میں تفسیری دائرہ کو بہت وسعت ہوئی، بہ کثرت روایات کا سلسلہ پھیلا، جب کشف الظنون نے جن تفسیروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ذیل کی تفسیریں اس دور کی ہیں،

- (۱) تفسیر ابن جریج ۲۵۰ھ (۲) تفسیر مقاتل ۲۵۰ھ (۳) تفسیر آدم بن ابی ایاس ۲۵۰ھ
- (۴) تفسیر شعبہ بن جراح ۲۵۰ھ (۵) تفسیر عبد الرزاق بن ہمام ۲۵۱ھ (۶) تفسیر عبد بن حمید ۲۴۹ھ
- (۷) تفسیر دیک بن ابراح ۲۵۹ھ (۸) تفسیر یزید بن ہارون ۲۵۰ھ (۹) روح بن عبادہ کے متعلق
- تہذیب میں جمع تفسیر کا ذکر (۱۰) ابوبکر بن ثیبہ کی تفسیر کا ذکر خطیب کرتے ہیں (۱۱) سنیدین ودا
- کو بھی صاحب تفسیر مانا جاتا ہے،

صاحب کشف الظنون کی ذکر کردہ تفاسیر میں ذیل کی تفسیریں بھی ابن جریر سے پیشتر کی یا ان کے عہد کی ہیں (۱) تفسیر واقدی ۲۵۰ھ (۲) تفسیر ابن ماجہ ۲۵۳ھ (۳) تفسیر اشجع (ابو سعید عبداللہ ابن سعید الکندی) ۲۵۰ھ (۴) تفسیر اناطی (ابو اسحاق نیشاپوری) ۳۰۰ھ (۵) تفسیر یحییٰ (عاطف ابو عبد الرحمن یحییٰ بن مخلد قرطبی) ۲۵۶ھ (۶) تفسیر دینوری ۲۵۹ھ،

تفسیر یحییٰ کے متعلق ابن حزم کہتے ہیں کہ اس سے اچھی تفسیر نہیں لکھی گئی،

اس ضمن میں کسا کی کی معانی القرآن اور فرائض ۲۰۰ھ کی تفسیری کتاب کا ذکر بھی مناسب ہو گا معانی القرآن کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو، البتہ قرآن کی کتاب کے متعلق ابن ندیم کا بیان ہو کہ وہ عمر بن البکر کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، عمر بن البکر فراء کے شاگرد تھے، اور امیر حسن بن سہیل کے ساتھ رہتے تھے، امیر ان سے اکثر قرآن پاک کے مسائل دریافت کرتا، ان کو کبھی کبھی مشکل پیش آتی، اسلئے اُستاد سے درخواست کی کہ قرآن کے متعلق چند اصول یا مستقل کتاب تحریر فرمادیں، قرآن نے شاگرد کی درخواست قبول کی، اور سورہ فاتحہ سے اطار کرنا شروع کیا، ابو العباس کا بیان ہو کہ اس سے پیشتر اس قدر اچھی

کتاب نہیں لکھی گئی

تبع تابعین کی تفسیروں میں دو تفسیریں اور قابل ذکر ہیں، ایک تفسیر سیفان ثوریؒ جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، اس میں وہی آیات تفسیر کے لئے منتخب کی گئی ہیں جن میں کوئی مشکل لفظ یا محاورہ یا کوئی تلمیح ہے، ہر تفسیر بشیر ترمذی یا صحابی اور کثر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی جاتی ہے، مفسر نے الفاظ تفسیر میں بے حد اختصار سے کام لیا ہے، کتاب آیت کا انوکھا فی الدین کی تفسیر سے شروع ہو کر سورہ والطور کی آیت اولیٰ کے آغاز پر ختم ہوتی ہے،

دوسری تفسیر امام مالکؒ کی ہے حسین قرآن مجید کی تفسیر، روایت احادیث سندہ صحیحہ و سیوطی نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعریف کی ہے لیکن یہ شکوک ہے کہ یہ خود امام کی تالیف ہے یا کسی نے امام سے اس کی تعلق کی ہے،

مفسر ابن جریرؒ تفسیر کے ان اہم سلسلوں کے بعد وہ سلسلہ آتا ہے جس میں ابن جریر جیسا فاضل مفسر مشہور پر جلوہ گر ہوتا ہے، جو اپنے پیشروں کا حزن اور پس روؤں کا ماحظ بن جاتا ہے، جس کی تفسیر کے متعلق ایک بزرگ خواب دیکھتے ہیں کہ وہ ابو جعفر طبری کی محفل میں ہیں، ان کے سامنے ان کی تفسیر پڑھی جا رہی ہے کہ یکایک ہاتھ غیبی آواز دیتا ہے کہ جس کو قرآن اس طرح سننا ہو جس طرح کہ وہ نازل ہوا ہے تو اس کتاب کو سنئے، ابو حامد احمد بن ابی طاہر اسفرائینی کہتے ہیں کہ اگر کوئی محض ابن جریر کی تفسیر کے لئے چین کا سفر کرے تو یہ کچھ زیادہ نہیں ہے،

ابن خزیمہ نے اس تفسیر کو کئی سال تک مکمل دیکھا پھر کہا کہ روسے زمین پر ابن جریر سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں،



حافظ جلال الدین سیوطی کہتے ہیں کہ اگر تم مجھ سے پوچھو کہ کس تفسیر پر اعتماد کیا جائے اور اس کو دیکھا جائے تو میں کہوں گا کہ تفسیر ابن جریر طبری جس پر علماء کا اتفاق ہے کہ اسے مثل کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی، داؤدی مالکی کہتے ہیں کہ حسب اتفاق علماء ابن جریر کی تفسیر القرآن کے مثل کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی، خود ابن جریر کہتے ہیں کہ میں نے تفسیر لکھنے سے پیشتر تین برس تک خدا سے دعا کی اور تفسیر کیلئے اعانت کا خواستگار رہا، خدا نے یہ دعا قبول کی،

ابن جریر کی تفسیر پر علماء کا یہ اتفاق بلاوجہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنی خصوصیات اور اپنے امتیاز کی بنا پر اسی کی مستحق تھی، مناسب ہو گا کہ اس موقع پر اجمالاً ابن جریر کی تفسیر کی خصوصیات کا ذکر کیا جائے (۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن جریر سے پیشتر کئی تفسیری مجموعے موجود تھے جیسا کہ ہم تاریخ تفسیر کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں، مگر ان مجموعوں میں کوئی مجموعہ بہ ترتیب مصحف تمام قرآن کی تفسیر نہ تھا، بلکہ ان کی صورت یہ تھی کہ جس کے پاس جو تفسیری روایات تھیں، وہی تفسیری مجموعہ کی شکل میں آگئیں، ابن جریر کی تفسیر سے پیشتر کے تفسیری مجموعوں میں سے ہمارے پاس سلیمان ثوری کی تفسیر موجود ہے، اسکے سوا بخاری، مسلم اور ترمذی کے ابواب التفسیر موجود ہیں، جو اس زمانہ کے اس طریق پر شاہد عدل ہیں،

احمد ابن مصنف منہی الاسلام کا قیاس ہے کہ فرار نے جس تفسیر قرآن کا تصدیق کیا تھا، ممکن ہے کہ وہ مکمل تفسیر ہو لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض قیاس ہی ہے،

بہر حال ہمارے سامنے بہ ترتیب مصحف قرآن کی پہلی اور جامع تفسیر صرف ابن جریر کی ہے، جو خاص اصول و قواعد کے ماتحت لکھی گئی، یہ ابن جریر کی معمولی فیصلت نہیں ہے، (۲) ابن جریر نے بہ ترتیب مصحف تمام قرآن کی تفسیر جمع کرنے کے بعد سب بڑا کام یہ کیا کہ

لے اتفاق ج ۲ ص ۱۱۵ لے طبقات المفسرین نسخہ مخطوطہ بائبلک بید۔

ان تمام معیری ذخیروں کو جو ان کے عہد میں تحریری یا زبانی طور پر موجود تھے اپنی تفسیر میں جمع کر کے ان کو دست برد زمانہ سے محفوظ کر دیا، چنانچہ ذیل کے ماخذ ان کی تفسیر کا اصل قرار پائے:

(۱) کتب تفسیر مصنف عن عبد اللہ بن عباسؓ خمسہ طرق (۲) کتب تفسیر عن سعید بن جبیرؓ طریق (۳) عن مجاہد ثلثہ طرق (۴) عن قتادہ بن دعامہ ثلثہ طرق (۵) عن بصری ثلثہ طرق (۶) عن کرمہ ثلثہ طرق (۷) عن فضی بن مرزوم طریقین (۸) عبد اللہ بن مسعود طریقاً (۹) تفسیر عبد الرحمن بن زید بن اسلم (۱۰) تفسیر ابن جریر (۱۱) تفسیر مقاتل بن حیان،

ان کتابوں کے سوا دوسری احادیث مشہورہ مندرجہ بھی حسب ضرورت ذکر کی گئی ہیں، اس پیشتر ہم تفسیر ابی بن کعبؓ اور تفسیر علی بن طلحہؓ کے متعلق ذکر کر چکے ہیں کہ ابن جریر نے انکو بھی اپنی تفسیر کا ماخذ بتایا ہے،

اس تشریح کے بعد یہ شبہ بھی دور ہو جاتا ہے، کہ ابن جریر سے پیشتر کے تفسیری مجموعے کیا تلف ہو گئے؟ اور ہمارے سلف نے ان سے غفلت کی؟ لیکن صورت حال یہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر نے ان تمام مجموعوں کو اپنی تفسیر میں شامل کر کے دنیا کو ان سے بے نیاز کر دیا، آج اگر کوئی چاہے تو ابن جریر کی تفسیر سے وہ تمام سابقہ مجموعے بھل سکتے ہیں، یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں تمام حدیثی ذخائر کو جمع کر لیا ہو اور آج بھی ان کی صحیح سے وہ کتابیں نکالی جاسکتی ہیں جنکے نام ان پیشتر ذکر کئے جاتے ہیں،

(۳) عموماً سمجھا جاتا ہے کہ ابن جریر نے اپنی تفسیر کی بنیاد محض نقل روایات پر رکھی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن جریر نے محض جمع و نقل روایات پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تمام اقوال کو نقل کر کے مجتہد نامہ کے ساتھ ان کی توجیہ اور بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی کوشش کی، گویا انھوں نے روایت کے

ساتھ درایت سے بھی کام لیا، یہ ان کی وہ خصوصیت ہے، کہ جس میں ان کے عہد تک کی 'انکامات' نہیں،  
داؤدی طبقات المفسرین دسٹہ مخطوطہ بانکی پور) میں لکھے ہیں :-

انہ جمع بین الروایۃ والدلتا انہوں نے روایت اور درایت کو جمع

ولمیشادکہ فی ذالک احد کر دیا، اور اس میں ان سے پیشتر اور ان کے

لاحقہ ولا بعدہ بعد کوئی ان کا شریک نہیں ہی

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ان کے مختارات کو نقل کیا ہی اور کہیں کہیں اختلاف بھی کیا ہی

(۲) ابن جریر نے دستور زمانہ کے خلاف ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کار نمایاں بھی انجام دیا کہ

قرآن سے متعلق اس عہد تک کے تمام پیدا شدہ مباحث کو اپنی تفسیر میں شامل کر کے اس کو اس

عہد تک کی قرآنی انسائیکلو پیڈیا بنا دیا، چنانچہ تجوید، نحو، صرف، لغت، فقہ، عقائد و کلام ملا

اور فرق باطلہ کی تردید، علوم طبعیہ کے متعلق مسائل، ان کی تفسیر میں صاف طور سے ملتے ہیں جن کے

پڑھنے سے اس عہد تک کے انداز فکر کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہی،

تفسیر ابن جریر کے روایتی حصہ کے متعلق یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ انہوں نے ان

طرق سے جو قطعی غیر موثق ہیں، تخریج نہیں کی ہے، مثلاً محمد بن سائب کلبی، مقاتل بن سلیمان،

محمد بن عمر الوادی کہ تاریخ و سیر اور اخبار عرب کے سوا جس کے لئے یہی ذریعہ ہیں، اور کہیں ان

افذ نہیں کیا ہے،

تاہم چونکہ انہوں نے تمام تفسیری ذخائر کے جمع کرنے کا عزم کیا ہی، اسلئے سند کی حیثیت سے

ان کی روایات کے تمام طرق کی تصحیح نہیں کی جاسکتی، لیکن بقول مصنف ضعیفی الاسلام (ص ۱۳۳)

ان تفسیری روایات کو جو سند کی حیثیت سے ضعیف ہیں، بالکل کم قیمت بھی نہ سمجھنا چاہئے،

یہ تسلیم کہ ان کی سند درست نہیں ہے، مگر یہ تو مسلم ہے کہ اس ضعیف اندر روایت میں جو کچھ

کہا گیا ہو وہ اس آیت سے متعلق اس زمانہ کے کسی شخص کا خاص نتیجہ فکری ہو، جو بہر حال لائقِ توجہ ہے،  
ابن جریر کی مرویات پر حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کہیں کہیں حرج کی ہے، خود ابن جریر نے بھی کہیں کہیں  
ضعفِ سند پر تنبیہ کی ہے، مثلاً ج ۲، ص ۲۵، ج ۵، ص ۲،

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ ابن جریر کی تفسیر محض روایات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ قرآن متعلق اس عہد تک کے پیدا شدہ  
کا ایک محفوظ ذخیرہ ہے، زیادہ وضاحت کے لئے اختصار کیساتھ تفسیر ابن جریر کے ان مباحث کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے  
تفسیر ابن جریر اور قرآن کلمات قرآن کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جنکو تمام صحابہ متفقاً یکساں پڑھا ہے اور ان میں کوئی اختلاف  
مکمل نہیں ہے، دوسرے وہ کلمات ہیں جن کے طریق ادا اور قراءہ میں اختلاف ہوا ہے، ہر جہد کہ یہ اختلاف اختلاف  
تناقض و تضاد نہیں، تاہم استنباط احکام و مسائل میں اس کا اثر ضرور پڑتا ہے، اسلئے مفسر کو اختلاف  
قرأت سے واقفیت بہت ضروری ہے، ابن جریر اس فن میں خاص مجتہدانہ شان رکھتے تھے، انھوں نے  
اپنی تفسیر میں تمام اختلافاتِ قرأت کو نقل کیا ہے، نیز اس اختلافِ قرأت سے مفہوم و مسائل کے تنوعات و اختلافات  
پر بھی بحث کی ہے، سیاق و سباق اور دوسرے لائل و شواہد سے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دی،  
کبھی ایک ہی صحابی سے ایک ہی لفظ کے متعلق دو تفسیریں نقل ہوتی ہیں، شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ اختلاف  
کیوں ہے؟ ابن جریر اسکی گروہ کشائی یوں کرتے ہیں، کہ یہ اختلاف تفسیر بنائے اختلافِ قراءہ ہے، مثلاً آیت

انما سکوت البصارنا (ج) مست کردی گئین آنکھیں ہماری،

میں حضرت عبداللہ بن عباس سے دو قول منقول ہیں سکرت بمعنی سددت اور سکرت بمعنی خذت،  
اس اختلافِ معانی کو نقل کرنے کے بعد ابن جریر قراءہ سے نقل کرتے ہیں، کہ یہ اختلاف معانی اصل میں اختلاف  
قراءہ کی بنا پر ہے، جس نے سکرت کو تشدید کے ساتھ پڑھا، اس نے (سددت) کے اور جس نے  
اسکو تشدید کے بغیر پڑھا اس نے (سحرت) کے معنی لئے ہیں، (باقی)

## یادِ پستان

از جناب مولانا امیناز علی خان صاحب عری تاظم کتب خانہ ریاست رام پور

مذکورہ بالا عنوان پر مولوی مقبول احمد صاحب صدنی کا ایک پرمغز، مگر بید و چپ مقالہ معارف میں باقسط شائع ہو چکا ہے، اس کی پہلی قسط میں جو جنوری کے پرچہ میں چھپی تھی، تاریخ محمدی کا بھی تذکرہ کیا۔ کتابخانہ عالیہ رامپور میں اس تراجم علما و اعیان کے خزانے کی دوسری جلد کا پیش قیمت نسخہ محفوظ ہے جو میری تحقیق کے مطابق خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ہے،

مخطوطات عربیہ کی فہرست مرتب کرنے کے دوران میں مجھے اس کتاب کی افادی حیثیت کا علی تجربہ ہوا، اس کی وسعت معلومات سے میں اس درجہ متاثر ہوا کہ اسی وقت سے یہ عزم کر لیا تھا کہ اس کی پہلی جلد کا نسخہ تلاش کر کے دونوں کو کتابخانہ کی طرف سے شائع کرنے کی کوشش کروں گا، برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات فارسی میں ڈاکٹر ریو نے اس کے ایک قلمی نسخہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ پورے دیباچے اور جلد اول و دوم کے انتخاب پر مشتمل ہے،

اس اطلاع جانفزا کہ دیکھ کر میں نے فوراً اس کا فوٹو طلب کیا مگر یہ نسخہ خود ہمارے ہی نسخے کی نقل اور اس بنا پر ترتیب و تصحیح میں اس سے زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید جاتی رہی، تاہم اشاعت کے ارادے میں وہی جنگی موجود رہی، مولانا صدنی مدظلہ کے مضمون سے یہ معلوم کر کے بید خوشی ہوئی کہ اس کتاب کا مکمل نسخہ سید محمد علی صاحب ضوی رئیس چھپرہ منو کے کتابخانہ میں موجود ہے اور موصوفہ اس معاملہ میں اس درجہ دریا دل ہیں کہ مولانا کی فرمائش پر ایک انگریز کو اس کی نقل بھی عطا فرما چکے

ہیں، چونکہ ہم ہندوستانیوں کا حق ترجیح طلب ہے، اس لئے یقین ہو گیا کہ اگر موصوفے استدعا سے نقل کی گئی، تو وہ ضرور نوازش و کرم سے کام لیں گے، اور یہیں پوری کتاب شائع کرنے کا موقع مل جائے گا۔ مولانا صدیقی نے اپنے فاضلانہ مقالے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس سے اس کتاب کے تصنیف اور عہد مصنف کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان ہے، بنا بریں ان امور کے متعلق کچھ کمنا ضروری ہے، مگر یہ جسارت خالص علمی و تحقیقی کی بنا پر کی گئی ہے، اس لئے عرض کر سکتا ہوں کہ

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

مصنف کا نام دنب | مصنف کا نام محمد بن رستم بن قباد بن عبد الجلیل بن عبد الکریم بن طوغان حاشی بدخشی ہے، اس کا خاندان اصلًا بدخشاں کا رہنے والا ہے، اسی لئے یہ لوگ اپنے آپ کو بدخشی کہتے رہے ہیں، سب سے پہلے اس کے پردادا عبد الجلیل حاشی قندھار ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور کنیر میں فوت ہوئے، اس کے دادا قباد بیگ قندھاری المولید ہیں، اور دہلی میں رحلت کی ہے، باپ کی پیدائش راندیر کی ہے، اور وٹکنگیر میں عالمگیر کی چھاؤنی کے اندر انتقال کیا ہے،

حاشی نسبت سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ عربی خاندان کا آدمی ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو پھر ناموں میں عجیت ترکستان کی بود و باش کا نتیجہ ہوگی جس کی مثالیں اور نظریں کم نہیں ہیں،

اس خاندان کے متعدد افراد کا تذکرہ کتاب میں ملتا ہے، ان تمام افراد کے مشاغل زندگی پر

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تیغ و قلم دونوں سے کام لیتے رہے ہیں، چنانچہ حاشی کا پردادا فقیر حنفی ہے، دادا ابراہیم حنفی خصوصاً ریاضی داں ہے، باپ مختلف علوم، قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام، شعر اور ادب کا ماہر ہے، حکیمات دریا ضیات پر بھی اچھی نظر ہے، یونانی زبان پر اتنی قدرت ہے کہ علمی کتابوں کا عربی اور فارسی میں بلا تکلف ترجمہ کرتا ہے،

مصنف کی پرورش اسی بیت السیف و القلم میں ہوئی ہے، اس لئے اس نے بھی تمام مروج

علوم کی تحصیل کی ہی کتاب میں اپنے ایک استادِ حدیث کا ذکر بھی کیا ہے، مگر بر خلاف آباء، مصنف کو ابتدا سے تاریخ سے دیکھی تھی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اُس نے اپنی عمر کے ۲۶ ویں سال میں اس انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب پر قلم اٹھایا ہے۔

مصنف کی پیدائش | حارثی کی پیدائش ۲۱ رجمادی الاولیٰ سنہ عالمگیری مطابق سنہ ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) کو جلال آباد میں واقع ہوئی، تعلیم سے فارغ ہو کر ۲۵ رجمادی الآخرہ سنہ ۱۱۱۵ھ (نمبر سنہ ۱۱۷۳ء) کو سترہویں سال کی عمر میں شاہی ملازمت میں داخل ہوا، دورانِ ملازمت کے واقعات اور اس کی زندگی دوسرے کو اُلف کا پتہ نہیں چلتا، پھر اس کے کہ ۹ برس کی عمر میں باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھا تھا، ”عبرت نامہ“ کے نام سے اُس نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کے دسٹے انڈیا آفس کے کتابخانے میں موجود ہیں، اس کتاب کے آغاز میں خود اپنے حالات درج کئے تھے، افسوس کہ یہ کتاب ہمارے کتابخانے میں نہیں ہے، ورنہ اُس کی زندگی پر مزید روشنی ڈالی جاسکتی تھی، ہاں، فہرستوں وغیرہ سے اُسکی تصنیفات کے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہوتی ہیں، جنہیں تصنیفات کے عنوان کے تحت لکھا جائیگا، افراد خاندان | حارثی نے تاریخ نجدی میں اپنے متعدد عزیزوں کا ذکر کیا ہے، مگر اس کتاب کی ترتیب سنہ وار ہے، اس بنا پر ان لوگوں کے حالات ایک جگہ نہیں ملتے، میں آئندہ سطروں میں وہ تمام ٹکڑے خود حارثی کے لفظوں میں نقل کئے دیتا ہوں،

(۱) سنہ کے ماتحت اپنے والد کے متعلق لکھتا ہے:-

”رستم الخاطب بمبعمہا بن قباد المللق بدیانت خاں بن عبد الجلیل البخاری البدخشی المص  
الہندی المولد، کان جماعاً للعلوم، لایسیما الحکیات، خصوصاً الریاضیات، فانہ کان فیہ  
فرید عصرہ، وکان لہ باع طویل فی اللغۃ والعربیۃ، وکان ذامناً بمتہ تامۃ بالقراءۃ والتفسیر  
والحدیث والفقہ والاصول والکلام والشعر والاداب، وکان عارفاً باللسان الیونانیۃ

وکان یترحم بکتهم بالعربیة والفارسیة،

وہو والد محرر ہذہ الاوراق ہفخر اللہ لہما و احسن الیہما، وکان ولادۃ فی شوال سنۃ  
ثمان وربعین و الف بیلدۃ راندر من بلاد الدکن، و مات یوم الاثنين الثامن عشر من جمادی الاولی  
وقت یضی القرب قلعة و انکلیکیر امن بلاد الدکن فی معسکر سلطان العصر بالارث والاستحقاق ابی المنظر  
محمد الدین محمد اورنگزیب بہادر عالمگیر بادشاہ الغازی، اسکندہ البجان، ثم نقل الی بیلدۃ دہلی، و کان  
لہ رقم السطور یومئذ تسع عشر سنۃ کاملۃ، ہزاری سوار

اس بیان سے عارفی کے باپ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا معقول تھا، منقولات پر بھی صحیح  
نظر تھی، یونانی کا ایسا عالم تھا کہ یونانی کتابوں کے عربی فارسی میں ترجمے کرتا تھا ۱۰۸۳ھ میں راندر  
میں پیدا ہوا تھا، عالمگیر کے دربار میں ہزار سوار کا منصب دار تھا، دکن کی جنگ میں لشکر سلطانی کے  
بمراہ تھا، وہیں ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) میں فوت ہوا، اور دہلی میں نعش لاکر دفن کی گئی،  
(۲) ۱۰۸۳ھ کے وفیات میں اپنے دادا کے متعلق لکھا ہے:-

”قبادیک لمخاطب بدایت خاں بن عبد الحلیل بن عبد الکبیر امحارثی ابید خشی، ولد  
بقندھار و نشر بالہند و صار ذامنزلۃ عند السلطان الکبیر عالمگیر بادشاہ الغازی، و کان  
من علماء المعقول، لایسا الریاضیات، فافان کان فیہ وجد دہرہ و فرید عصرہ، مات فی رمضان  
بدہلی، اولہ ۱۱۱۸ سنۃ

وہو جد محرر ہذہ الارقام، و قد مراہوہ فی سنۃ، ہزار و پانصدی الاسلام و مات غام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عارفی کا دادا بھی بڑا معقول و ریاضی داں تھا، عالمگیر کے دربار میں  
اسکی منزلت تھی، اور ہزار و پانصدی کا منصب رکھتا تھا، قندھار میں پیدائش اور دہلی میں وفات  
وقت انتقال ۱۱۱۸ برس کی عمر تھی، گویا ۱۰۸۳ھ میں پیدا ہوا تھا، اسکی عمر اپنے باپ کے انتقال کے



وقت صرف آٹھ سال کی تھی،

(۳) <sup>۱۰۲۱ھ</sup> کے وفیات میں اپنے پر دادا کے بارہ میں کہتا ہے:-

”عبد الجلیل بن عبد الکریم بن المولیٰ طوفان الحارثی البدخشی، نزیر المند العالم نفیقہ  
اخفی مات بشیر فی ہذہ السنۃ تقریباً ویسائی ابناہ؛ بقادریک الحاطب بدیانہ خاں فی  
سنۃ ۱۰۸۲ حسن بیگ فی سنۃ ۱۰۸۲ (کذا موت من بعض رجال قومی)“

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حارثی خاندان کا پہلا شخص جو وارد ہندوستان ہوا، عبد الجلیل تھا،  
یہ حقیقی نفیقہ تھا، غالباً دینیوی جاہ و منزلت نصیب نہیں ہوئی، اس کا سنہ وفات بھی حارثی کو صرف  
تخمینی طور پر خاندان کے کسی بڑے بوڑھے سے معلوم ہوا ہے، کتاب میں عبد الجلیل کے باپ  
دادا کا ذکر نہیں ملتا، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے غیر ہندی خاندانوں  
کی طرح اس خاندان کے تعلقات بھی بدخشاں سے بالکل ٹوٹ گئے تھے، اور پس ماندوں کو صرف عبد الجلیل  
اور اس کے اخلاف کا علم تھا،

(۴) عبد الجلیل کے ایک بیٹے کا ذکر کیا جا چکا ہے، دوسرے بیٹے حسن بیگ کے متعلق <sup>۱۰۸۴ھ</sup>  
۶۱۶۶۳ کے ماتحت لکھا ہے،

”حسن بیگ المتخلص بہ آگمی، بن عبد الجلیل بن عبد الکریم الحارثی البدخشی، در اوائل سال

فوت شد، عمر شہ ۵ سال، دوسے بچہ دت نظم و نشر مشہور بود، و عم پدر مسودہ و اوراق است

پدرش در سنۃ گذشت، (دسماع)“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بیگ <sup>۱۰۸۴ھ</sup> میں پیدا ہوا، اور ۳ برس کی عمر میں یتیم ہو گیا، یہ

بڑا ادیب تھا، نظم و نشر دونوں پر قدرت رکھتا تھا، اور آگمی المتخلص کرتا تھا،

میں نے خان آرزو کے تذکرہ مجمع النفائس، اور عاشقی کے تذکرہ، نشر عشق میں آگمی کو

کیا، مگر ان دونوں میں اس کا ذکر نہیں ہے،

(۵) ۱۱۹۹ھ کے ماتحت اپنے دادا کے چچا زاد بھائی کا ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:-

”ابو تراب بن عبد العزیز بن عبد الکریم الحارثی البخشی من عرفاء العصر مات بدکن ۶۵۰“

۶۵۰ سنہ وہو ابن عم جد مسود الادواق“

(۶) ۱۱۹۹ھ کے ذیل میں اپنے چچا کے بارہ میں لکھا ہے:-

”دیوانکن مخاطب بمعتمد خاں بن قباد مخاطب بدیانت خاں از امرای عالمگیری“

در ماہ جمادی الاولی در وکن فوت شد، و دے عم مسودا بن ادواق است، عمرش ۶۳ سال بود“

پدرش ۱۱۸۳ھ گذشت، ہزار و پانصدی“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کا چچا ۱۱۸۳ھ میں پیدا ہوا تھا، وہ اس کے باپ کا بڑا بھائی

تھا، اسی لئے اپنے باپ کے منصب ہزار و پانصدی پر فائز بھی ہوا، ۶۳ سال کی عمر میں دکن کے اندر غالباً لشکر عالمگیری میں ۱۱۸۳ھ کو اس کا انتقال ہوا،

(۷) باپ کے ایک چچا زاد بھائی کا ذکر ۱۱۲۲ھ کے ماتحت کرتے ہوئے کتا ہے:-

”محمد بیگ مخاطب بہ نخلص خاں بہادر بن احمد بیگ حارثی بخشی، از کبار امرائے شاہ عالمی“

نیمروز سنہ ۸۲۰ صفر بحکم جہاندار شاہ بقتل رسید سنش ۵۲ سال، و دے ابن عم والد محرم

ارقام بود و اخلاق کریمہ بسیار داشت، پچہ ہزاری“

حارثی کا یہ رشتے کا چچا ۱۱۲۲ھ میں پیدا ہوا تھا، یہ شاہ عالم بہادر شاہ اول کے دربار کا

بہت بڑا سردار اور چہار ہزاری منصب اور خطاب نخلص خاں بہادر سے سرفراز تھا،

(۸) اپنے حقیقی چچا کے بیٹے کا ذکر ۱۱۳۱ھ میں اس طرح کیا ہے:-

”محمد نغضہ خاں بن دیوانکن مخاطب بمعتمد خاں بن دیانت خاں حارثی بخشی، از امرائے

عصر، روضان، درشاہجان آباد فوت شد، عمر ۶۵ سال، دو گاہے شعر ہم میگفت، دوسے  
ابن عم مسودہ اوراق ست، و پدرش در ۱۱۰۰ گزشت //

یہ ۱۰۷۶ھ میں پیدا ہوا، دہلی کے امرا میں سے تھا، شعر بھی کہہ لیتا تھا، ۶۵ برس کی عمر میں مر گیا،  
(۹) حارثی نے اپنے ایک حقیقی بھائی کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ ۱۱۳۵ھ کے تحت لکھا ہے:-

”میرزا عبدالرحمن متخلص بغیرت بن رستم فخری، بن قباد فخری، بن قباد فخری، بن قباد  
حارثی بدخشی، جوان مستعد، طالب علم شاعر بود، و بحسن اخلاق، اتقان داشت، روزنہ  
۵ ذی القعدہ در شاہجان آباد فوت شد، ایک ہر روز ماندہ عمر ۳۰۰۰ سال و ۳ ماہ  
دوی برادر اسیانی و جامع ایں اوراق بود //

حارثی کا بھائی اس خاندان کا تیسرا شاعر ہے، کتاب کے راہپوری نسخے میں اسکی عمر کے ہند  
پڑھنے میں نہیں آئے، اس لئے یہ بتا نامکن نہیں کہ یہ حارثی سے بڑا تھا یا چھوٹا، البتہ عبارت سے  
یہ مفروضہ مترشح ہے کہ اُس نے جوانی میں انتقال کیا، محولہ بالا دونوں تذکروں میں اسکا بھی ذکر نہیں  
(۱۰) ۱۱۵۴ھ میں اپنی والدہ کا ذکر کیا ہے، کہتا ہے:-

”زادہ خانم بنت میرک بیگ بن خواجہ بیگ، محارثیہ، زوجہ محمد رستم الفخری، بن قباد  
ابن قباد بیگ، محارثی، والدہ جامعہ ذہالہ اوراق، میرزا محمد بن محمد فخری، قونیت غرقہ

جمادی الاولیٰ بشاہجان آباد و لما ۳۵ سنہ الا شہر، و کانت جامعہ بخصال الفخری من الورع  
والعفاف و النجاء و حسن الاخلاق، کثیر البر و الاحسان الی الاقارب، الابا و قد مر ذہبانی //

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کی والدہ تقریباً ۱۱۵۴ھ میں پیدا ہوئی تھی، اور اپنے شوہر  
۲۳ سال چھوٹی تھی، خود حارثی کی والدہ کا خاندان بھی حارثی بدخشی ہے، اور اس لئے بعید نہیں  
کہ اوپر جا کر یہ سب عبد الجلیل کے کسی بزرگ سے مل جاتے ہوں،

(۱۱) اپنے ماموں کے متعلق ۱۱۲۰ھ میں لکھتا ہے:-

”محمد خواجہ مخاطب بن خنق خاں بن میرک بیگ بن خواجہ بیگ حارثی بدخشی، از امر“

عصر در ماہ صفر بشاہجہان آباد فوت شد، عمرش ۴۳ سال و ۵۰ خال حقیقی جامعیں اس در آن“

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد خواجہ ۱۱۶۶ھ میں پیدا ہوا تھا اور اپنی بہن سے عمر میں چھوٹا تھا،

حارثی نے (اسے بھی) امرے عصر میں ظاہر کیا ہے، اور خنق خاں خطاب بتایا ہے،

(۱۲) حارثی کے دوسرے ماموں کا نام نعمان بیگ بن میرک بیگ تھا، ان کے پوتے کا

تذکرہ ۱۱۵۲ھ کے ماتحت ان لفظوں میں کیا ہے:

”مظفر حسین متخلص بہ حسین بن محمد غیاث بن نعمان بیگ بن میرک بیگ حارثی بدخشی، شاعر

خوش کلام، ۲۱-۲۲ شوال در ہمایہ نجیب علی خاں.... فوجدار اُمادہ در جنگ....“

باقی عبارت حاشیہ کے ساتھ کٹ گئی ہے، یہ اس خاندان کا چوتھا ادیب ہے،

(۱۳) اسی خاندان کے ایک فرد کا تذکرہ ۱۱۳۹ھ کے ماتحت کیا ہے، جلد نے حاشیہ کے ساتھ

کچھ عبارت کاٹ دی ہے، اس نے مصنف سے اسکے رشتہ کا پتہ نہیں چلتا، اس کے متعلق کہتا ہے:

”میرزا محمد افلاطون بن جعفر بیگ حارثی ابدخشی ثم الدہلوی، الزہاد العالم الفقیہ العثمی

وکان کامل العقل وافرالدہار، مات بشاہجہان آباد، یوم الاثنين ۲۰ ربیع الاول، ۱۱۵۲ھ“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ۱۱۶۵ھ میں پیدا ہوا تھا اور دہلی میں فوت ہوا، یہ زاہد

اور فقیہ تھا،

(۱۴) ایک اور فرد اسی خاندان کا ۱۱۶۶ھ میں مذکور ہے، اسکے متعلق کہتا ہے:-

”جلیل بیگ بن ابوتراب حارثی، از امرے کبرشاہی و جہانگیر شاہی، و کثیر نفوذ شد“

دوے بصلاح و تقویٰ و علم و فضل اختصاص داشت، و بعد ابیحمل کہ جد والدہ اقم....

میری الیہ بود (کھذا رایت فی بعض مسودات قدما رومی عرفات العاقلین)۔

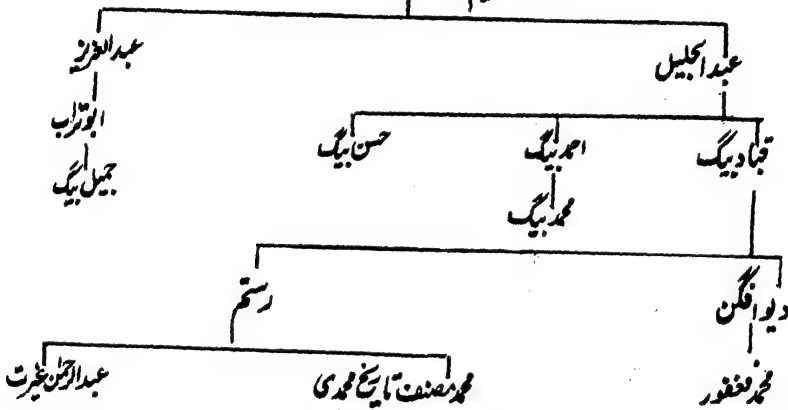
اصل کتاب میں چند لفظ کسی نے مٹا دیے ہیں، اسلئے رشتہ معلوم نہ ہو سکا، بظاہر یہ ابو ترابی حارثی مصنف کے پر داد ابو عبد اکیلیں کے بھائی عبد العزیز کا بیٹا ہی، اگر یہ صحیح ہے، تو پھر جمیل بیگ اس کے دادا چچا زاد بھائی ہوا،

مطالعہ کرنے والوں کی سہولت کے خیال سے میں حارثی کے والدین کے خاندان کا شجرہ علیحدہ

لکھے دیتا ہوں جو حسب ذیل ہے

## دادھیال کا شجرہ

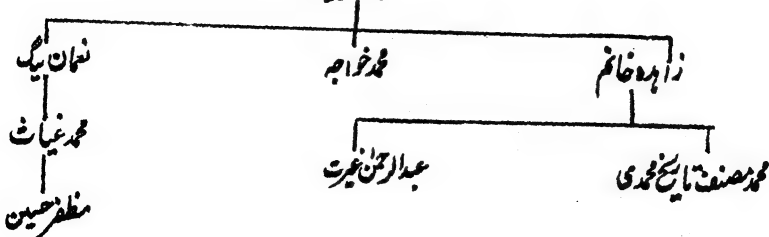
عبد الکریم بن طوغان حارثی بدخشی



## نانہیال کا شجرہ

خواجہ بیگ حارثی

میرک بیگ



تعلیم و تصنیف | مصنف کے خاندان میں علم و دولت دونوں کی برکتیں پائی جاتی تھیں، اس بنا پر یقین ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت میں خاصی کوشش کی گئی ہوگی علومِ آئید کے متعلق خود اس کا کوئی بیان ہمارے سامنے نہیں ہے، البتہ <sup>۱۱۳</sup> شیخ کے ماتحت اپنے حدیث کے ایک استاد کا ان لفظوں میں تذکرہ کیا ہے:

”الشیخ مقرب اللہ بن جارا اللہ بن نور اللہ بن نور اللہ بن الشیخ الحدیث عبدالحی بن سیف اللہ بن

الترک الدہلوی العلامة المتقن الخفیات فی رمضان بہی، ولہ نحو ستین سنہ، و ہوا ول من

قرأت علیہ حدیث“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عارفی نے سب سے پہلے دہلی کے مشہور محدث خاندان کے بزرگ شیخ مقرب اللہ سے حدیث پڑھی،

ہمارے کتب خانہ میں پچاس ساٹھ مختلف فنون کی قلمی کتابوں پر مصنف کے دستخط اور حروفِ ہیا چنانچہ ابن اثیم کی شرح مصائدات کے پہلے صفحہ پر جو الفاظ اس نے لکھے ہیں، وہ حسبِ فیل ہیں۔

”اللہ اکبر“

من عوامی الزمان عند العبد الضعیف الراجی رحمۃ ربہ المنان میرزا محمد بن معتمد خاں ختم شد

لہ بالامن والايمان“

اس عبارت کے اوپر بیضی شکل کی چھوٹی سی مہر ہے، جس میں ”یا محمد“ لکھا ہوا ہے، حیدرآباد کے کتاب خانے میں یہی مستند کتابوں پر بھی عبارت اور مہر میں نے دیکھی ہے، تذکرہ صوفیہ پر ایک کتاب موسوم ”بہ مختصر مجمع الاجاب“ کتاب خانہ عالیہ ایسور میں محفوظ ہے، اس کے پہلے صفحہ پر عارفی نے اپنے قلم سے ۲۰ سطروں کا ایک نوٹ لکھا ہے، جس میں بتایا ہے کہ یہ کتاب حلیۃ الاولیاء ابو نعیم اسمعانی اور صفوہ الصفوہ ابن الجوزی کا اختصار ہے، اور اس کا مصنف محمد بن الحسن، علامہ نووی متوفی ۶۷۶ھ کے شاگرد کا شاگرد ہے، کتاب کے حاشیوں پر جا بجا تصحیحات اور ذیلی عنوانات اپنے قلم سے لکھے

ہیں، اور کتابوں پر بھی اس کی تصحیص پائی جاتی ہیں،

ان امور سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اُس نے تمام غروبِ علوم پڑھے تھے، اور ان علوم کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا، اگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اُسے زیادہ دیکھی تاریخ و تذکرہ سے رہی ہے چنانچہ اس نے سب سے بڑی کتاب تاریخ ہی پر تصنیف کی، اور اس کا نام تاریخِ محمدی رکھا، میں پہلے اس کی دوسری کتابوں کا تذکرہ کرتا ہوں۔

ردالبدر | ان میں کی پہلی ”ردالبدر“ ہے، شاہ محمد حمزہ صاحب مارہروی نے بیہوشیہ میں اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا، تاریخِ محمدی کے ورق ۵۵۱ الف کے حاشیہ پر شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

”رسالہ ردالبدر، بل تحقیق الما... از تالیفات مولف اس تاریخ، مرزا محمد عارفی بدخشی“

در ۱۱۸۰ھ نزادیں غیر رسید، فوت والد خود محمد رستم ہفتدہم جمادی الاولیٰ سنہ مسطورہ نوشتہ

وایں رسالہ مذکورہ در عنوان شباب بموت سالہ ارقام ساختہ تحقیقات خوب بکار بردہ“

اس تحریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسالہ ردالبدر بیہوشیہ کے قریب لکھا گیا تھا، اور یہ مصنف کی

ابتدائی تصنیفات میں سے ہے،

مفتاح المنجا | دوسری تصنیف مفتاح المنجا فی مناقب آلِ عباس ہے، یہ عربی زبان میں اہل بیت رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب پر لکھی گئی ہے، اُنے والی دونوں کتابوں نزل الابرار، اور تحفۃ الجبین میں

اس کا حوالہ ملتا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان دونوں سے پہلے مصنف نے اسے تصنیف کیا

تحفۃ الجبین | تیسری تالیف تحفۃ الجبین بمناقب ائمتہ الراشدین ہے، جو عربی زبان میں خلفائے

راشدین کے فضائل پر لکھی گئی ہے، اس کتاب کے خاتمہ سے پہلے چلتا ہے کہ جمعہ کے دن، رمضان

۱۱۲۵ھ کو فرخ سیر کے عہدِ حکومت میں مصنف نے اسے ختم کیا ہے،

کتاب خانہ عالیہ، امپور میں اس کا ایک مخطوطہ ہے، جسے سید رحم علی کا تب نے ۱۳۷۶ھ میں

تسلیق خط میں لکھا ہے، اس کا انداز تحریر نمبر ۱ سے ملتا جلتا ہے، اور وہ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) کی توثیق ہے، بعد نہیں ہے کہ یہ بھی اسی سال کے قریب لکھی گئی ہو،

نزل الابرار | چوتھی کتاب نزل الابرار فی فضائل الائمۃ الاطہار ہے، یہ بھی عربی زبان میں لکھی گئی ہے، اس کا آغاز ۱۱۹۴ھ رمضان ۱۱۹۴ھ کو ہوا تھا، اور دہلی کے کسی امیر کے نام معنون تھی کہ خانہ عالیہ رامپور میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے، جو بخط تسلیق معمولی ۱۱۰ وسط سائز کے ۲۷ صفحوں پر ۱۱۹۴ھ ذیقعدہ میں لکھا گیا ہے، اس کا خط نمبر ۳ کے مشابہ ہے جس سے میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ سید رحم علی ہی نے اسے بھی لکھا ہے ویسا ہے میں مصنف نے کہا ہے کہ چونکہ مفتاح النجاشی کتاب کی ہر طرح کی مدہشیں جمع کی گئی تھیں اس لئے بعض اجاب نے صرف صحیح مدنیوں پر مشتمل کتاب کی تالیف کی فرمائش کی، یہ کتاب اس فرمائش کی تعمیل میں مرتب ہوئی ہے،

عبرت نامہ | پانچویں تالیف عبرت نامہ ہے، یہ فارسی زبان میں لکھی گئی ہے، شروع میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں، ان کے بعد عالمگیر کی حکومت کے آخری تین سالوں کے مجمل حالات، اور بعد ازاں وفات عالمگیر (۱۱۱۸ھ) سے فرخ سیر کی وفات (۱۱۳۱ھ) تک واقعات درج کئے ہیں،

ڈاکٹر ایٹے نے انڈیا آفس لائبریری کی فرسٹ مخطوطات فارسی میں نمبر ۳۹۲ و ۳۹۳ پر اس کتاب کا ذکر کیا ہے، مگر پہلے نمبر پر اس کا نام عبرت نامہ اور دوسرے پر تاریخ محمد بن محمد لکھا ہے ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فرسٹ (رج ۳۷۴ و ۳۷۵) میں محمد بن محمد کی "تاریخ محمد شاہی" کے ضمن میں اس کتاب کا اس لئے تذکرہ کیا ہے کہ آشوب اپنی تاریخ میں جا بجا اس کو حوالے دیتا ہے، اور اس پر اعتماد ظاہر کرتا ہے، ڈاکٹر ریو اسے "یادداشتہ میرزا محمد صاحب" کہتا ہے، ایسے کا خیال ہے کہ ان یادداشتوں سے یہی "عبرت نامہ" مراد ہے،



تاریخ محمدی | حارثی کی سب سے بڑی اور قابلِ قدر کتاب تاریخ محمدی ہے، ہمارے پاس اس کا جو

بخط مصنف موجود ہے، اُس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف دقتِ کاسن وار تذکرہ ہی، مگر

دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس میں ملتِ محمدیہ کے واقعات بھی بالاجمال بیان کئے گئے ہیں

مولانا احمد فی صاحب نے بھی پچھراٹھ سو کے نسخہ میں واقعات کا تذکرہ ہونا ظاہر فرمایا ہے،

کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں سیرتِ محمدی بعد ازاں سنہ ہجری کی ایجاد کا

قصہ اور پچھراٹھ سنہ وار دقتات درج ہیں، اس کتاب کے نام کے متعلق مصنف لکھتا ہے:-

”از انجا کہ این کتاب مستطاب محموی براحوال اکابر امت مرحومہ محمدیہ و زمان ظهور

دولت یافتہ آنحضرت است و ذکر اہم دیگر را شامل نیست، و جامع این اوراق پر نشان

نیز باسم سامی حضرت خیر الانامی تسمی دار و این کتاب والا انتساب را بدین دامنست

تاریخ محمدی نام نہادہ شد۔“

کتاب کی ترتیب و تالیف میں جن پچھلی تصنیفات سے مدد لی ہے، دیباچے میں ان کی فہرست

دیدہ ہے، اور چونکہ ہر بار پیدا نام لکھنے میں ہرج ہوتا، اسلئے دیباچہ میں ان کے مخفقات بتا کہ

اصل کتاب میں ہر شخص کے نام کے اوپر یہ مخفقات سرخ روشنائی سے لکھدئے ہیں، اپنے معاصرین

کے ناموں کے اوپر عصری سرخ روشنائی سے لکھدیا ہے، دوسری جلد کے شروع میں بھی ایک

دیباچہ لکھا ہے جس میں کتابوں کے رموز و علامات کا اعادہ کیا ہے،

سنہ تصنیف | مصنف دیباچہ میں آغاز تصنیف کے متعلق لکھتا ہے کہ

”بنابرین امور، روزِ دوشنبہ بیت و مفتاحِ جمادی الآخرہ سال یکہزار و یکصد و بیست

و چہار ہجری دریں محم اہم شروع نمودم۔“

۱۲۴۴ھ میں کتاب کے آغاز سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنف نے، جس کی پیدائش ۱۲۵۶ھ

میں واقع ہوئی تھی، اپنی عمر کے چھیسیوں سال میں اس انسائیکلو پیڈیا کو شروع کیا،

کتاب خانہ عالیہ امپور کے نسخے میں مصنف کے قلم کی تحریر ۱۱۶۱ھ میں ختم ہو جاتی ہے، یعنی یہ آخری سنہ ہے جس کے ماتحت اُس نے دنیا تہ درج کئے ہیں، اس کے بعد صرف ایک سنہ کا عنوان تو اس کے قلم کا لکھا ہوا ملتا ہے، مگر اس کے اندراجات دوسرے خط اور دوسرے انداز تحریر میں ہیں، بنا بریں میرا قیاس ہے کہ ۱۱۶۱ھ کے بعد کی کسی تاریخ کو مصنف کا انتقال ہو جانے کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہوا ہے، اور اس صورت میں ۳۷ سال کی طویل مدت اس کی ترتیب و تدوین میں صرف ہوئی ہے،

ڈاکٹر یو اپنی فہرست (ج ۳ صفحہ ۹۹) میں ۱۱۹۱ھ کو اس کا سالِ اتمام قرار دیتے ہیں، اور باقی آئندہ سالوں کے اندراجات کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتے ہیں، مگر میں اسے غلط فہمی پر محمول کرتا ہوں، اور اس کا منشا برنش میوزیم کے نسخے کو قرار دیتا ہوں، جس میں سنہ مذکور تک مسلسل ایک ہی قلم سے متوفی اصحاب کا تذکرہ لکھا گیا ہے، چونکہ میں ریو کے نسخے کو رامپور کے نسخہ کی نقل مانتا ہوں، اس بنا پر تاریخ اتمام کے فیصلے کے لئے نسخہ رامپور کو شہادت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، لہذا پہلے ریو کے نسخے کے بارہ میں دو چار اہم باتیں لکھ دینا مناسب ہوگا برنش میوزیم کے نسخے کے سرورق پر حسبِ نیل نوٹ مندرج ہے،

”منتجات از جلد اول و دوم تاریخ محمدی ملوکہ سید آل رسول ماہرہ والہ کتاب ہذا

کتابیکہ بذریعہ محمد نضر اللہ خان ڈپٹی کلکٹر ضلع علی گڑھ دستیاب شد، بطور انتخاب از نقل گرفتہ

شد، از جلد اول از ۱۲۱۱ھ لغتہ ۱۲۹۹ھ دہ ورق، جلد دوم از ۱۲۹۹ھ لغتہ ۱۳۱۲ھ“

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نضر اللہ خان کی معرفت تاریخ محمدی کا کوئی نسخہ سید آل رسول

صاحب ماہرہ وی نے حاصل کر کے اس کے منتجات جدا نقل کر لئے تھے، نیز یہ کہ اس نسخے میں

جلد دوم کا آغاز ۱۲۰۵ھ سے اور اختتام ۱۲۰۸ھ پر ہوا تھا، سید آل رسول صاحب کے لئے یہ منتخب نسخہ ایک خوشنویس نے نقل کیا، چونکہ اصل میں ۱۱۹۰ھ سے عنوانات پر سنہ لکھ کر ہر سنہ کے نیچے وفيات تھے، اس لئے کاتب نے بھی نقل میں اس کا ابتلع کیا، بعد ازاں بلا عنوان متعدد وفيات کا اصل میں نقل تھا، اس حصہ کو منتخب کے کاتب نے بھی یوں ہی نقل کر دیا، ڈاکٹر یو کے سامنے یہ نقل تھی، انھوں نے ۱۱۹۰ھ تک کے تسلسل کو پیش نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ اس سنہ تک اصل مصنف کا کام ہی انہذا ہی سالِ ختم ہو گا اب ہمیں نسخہ راہپور کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، یہ نسخہ ہمدی میاں صاحب نے جو ماہرہ کے مشورہ پر کاتی خاندان کے ایک فرد تھے، نواب جنت مکان کے حضور میں پیش کیا تھا، یہ اول سے ناقص ہونے کے باعث ورق ۹ سے شروع ہوتا ہے، جس کے حصہ الف پر ۶۷۲ھ کے بقیہ متوفین کے نام ہیں، اور حصہ ب سے ۱۲۰۵ھ کے وفيات شروع ہوتے ہیں، ۱۱۶۱ھ تک جو ورق ۵۹۹ الف پر ختم ہوتا ہے، ایک ہی قلم کی تحریر ہے، صرف دو چار جگہ دوسرے قلم سے سادہ جگہ پر ایک دو ایسے نام بڑھائے گئے ہیں جو اصل مصنف سے رہ گئے تھے، ۱۱۶۲ھ سے مذکورہ بالا دوسرے قلم کے اندراجات شروع ہوتے ہیں، ۱۱۷۳ھ سے سنوں کے سرخ عنوان بھی اسی قلم کے ہیں، ۱۱۹۰ھ تک کتاب سنہ دار ہے، مگر ورق ۶۱۸ ب پر ۱۱۹۰ھ سے ۱۱۹۶ھ تک متوفی اصحاب کو ایک ہی صفحہ پر لکھا ہے، اس کے بعد کا ورق ضائع ہو گیا ہے، ۱۱۶۲ھ کے ماتحت اساتذہ المحققین سید آل محمد قادری مارہروی کا نام لکھا ہے، اس نام کے ختم پر کسی اور شخص نے لکھا ہے میاں بن شاہ حمزہ دہلوی گویا یہ تیسرا قلم ہے، جو اس کتاب پر چلا ہے، ایک دو جگہ در بھی اس خط میں اضافے نظر آتے ہیں،

دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں خط کس کے معلوم ہوتے ہیں، کتابخانہ راہپور میں اس خاندان کے ایک بزرگ سید شاہ اکمل احمد بن سید شاہ محمد حمزہ مارہروی کی دو کتابیں، آئینہ محمدی جلد پنجم اور کنکھ محفوظ ہیں، ان دونوں کتابوں کی کتابت دو کاتبوں نے کی ہے، بلکہ ایک دو جگہ ایسا شبہ کنہ ہے کہ تیسرا شخص بھی شریک تھا، تاہم محمدی میں آخری دو خطوں میں سے جو خط زیادہ پایا جاتا ہے

وہ ان دونوں کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور دوسرے خط کی جہالت میں بھی مذکورہ بالا دونوں کتابوں میں پائی جاتی ہیں،

خطِ اول کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ شاہِ آل احمد صاحب مارہروی کا ہے، چونکہ آئینہ محمدی اور لکھنؤلِ مسوئے کی شکل میں ہیں، اس بنا پر یہ قرین قیاس ہے کہ ہم اسے بخطِ مصنف و بخطِ دیگر قرار دیں اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مصنف نے دوسرے کتابوں کو کیوں شریکِ کتابت کیا، تو اس کے جواب میں ان دونوں کی ضخامت کے عذر کو پیش کریں، اسی کے نسخے کے سرورق پر جو تحریر ہے، اس کا انداز بھی کسی قدر اس شاہِ آل احمد والی تحریر کے انداز سے ملتا جلتا ہے،

ان تمام امور کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تاریخِ محمدی "کالندنی نسخہ مارہرہ" میں شاہِ آل رسول صاحب کے لئے تیار ہوا، اور امپور کا نسخہ مارہرہ کے اسی خاندان کے ایک بزرگ نے دربارِ امپور میں پیش کیا تھا، اس نسخے کے اندر جن دو خطوں میں اضافے نظر آتے ہیں، ان میں سے ایک خط شاہِ آل احمد صاحب کی کتاب آئینہ محمدی اور لکھنؤل کے ایک خط کے مشابہ ہے، آئینہ محمدی اس خط کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ خود شاہِ آل احمد صاحب کا ہے، اگر یہ درست ہے تو پھر تاریخِ محمدی کے اندراجات بھی انہی کے ہونگے، اور چونکہ لندنی نسخے کے سرورق کی تحریر بھی انہی کی معلوم ہوتی ہے، اس بنا پر یہ قیاس درست ہو گا کہ لندنی نسخہ مارہرہ کے نسخہ کی نقل ہے،

یہ قیاس حدیقین تک پہنچ جاتا ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لندنی نسخے کی جلد ثانی میں انہی لفظ اور فقروں کے لئے سادی جگہیں چھوڑ دی گئی ہیں، جو مارہرہ کے نسخے میں یا تو حاشیہ کی شکل میں لکھے ہیں، یا کاغذ کے گل جانے کے باعث پڑھنے میں نہیں آتے، کیونکہ اگر وہ کسی دوسرے نسخہ کی نقل ہوتا تو دشوار تھا کہ دونوں نسخوں میں الفاظ و فقرات کا فقدان بالکل یکساں ہوتا،

مذکورہ بالا دعویٰ کے ثبوت کے بعد یہ تسلیم کر لینا پڑے گا کہ تاریخِ محمدی "ارشوال" ص ۶۱

کے بعد ختم ہو گئی، اور ڈاکٹر ریونے جو ۱۱۹ء تک اس کے زمانہ تالیف کو درازی کیا ہے، یہ درست نہیں ہے، کیونکہ ۱۶۱ء کے بعد کے اندراجات مارہرہ کے مشہور خاندانِ برکاتیہ کے بزرگوں نے اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ مولانا صدیقی صاحب نے تاریخِ محمدی میں واقعاتِ تاریخی کا مجل بیان بھی دیکھا ہے، ہمارے نسخہ میں بحرِ دس پانچ مقامات کے صرف دینیات درج ہیں، بابِ تاریخ کی دلچسپی کی خاطر اس کے ایک سال کے اندراجات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، مگر خوفِ طوالت ایسے سنہ کو چننا لگتا ہے، جس میں بہت کم اندراجات ہیں،

۱۲۳ء کے ماتحت لکھا ہے :-

”سنہ الف وثلث و عشرين و مائتہ متوفیان ایں سال“

عصری رسالہ تہ نصرت اللہ احمدی

”محمد منعم الملقب بنعم خاں ثم بمعظم خاں خاتماں بہادر ظفر جنگ و فادار، وزیر شاہ عالم بادشاہ روز دوشنبہ ۱۲ یا ۱۱ محرم دزدی کی بے دریغ بھری ناسورِ قدیم فوت شد، عمر شریف و چند ماہ، ہفت ہزاری۔“

کذا سمعت من اولادہ عاقبت محمود مخاطب بسراور خان بن نعمت اللہ مخاطب بہر آ  
خاں بن حسام الدین خاں بن نظام الدین خاں بن غیاث الدین علی مخاطب بآصف خاں  
از امرے عالمگیر شاہی در برہن پور فوت شد۔“

عصری،

میرزا شکر اللہ حسینی مخاطب برفعی خاں از کبار امرے شاہ عالمی و پسرش حفظ اللہ خاں

۱۶۱ء خود آمد۔“

عصری،

”ایشع عبدالباقی بن ایشع محمد وارث ترک لقرن الہدوی جامع العلم والعمل صاحب

السجایا الرضیۃ الاخلاق الرضیۃ مات بدہی ۱۲ صفر من جملة المائتہ وکان قد جاز النہیں“

نسخہ راہپور کی کیفیت | یہ نسخہ فلس کیپ سائز کے ۶۱۰ اوراق پر مشتمل ہے، کاغذ بادامی کشمیری ہے، عبارت کی روشنائی سیاہ اور عنوانوں کی شکرنی ہے، پرانے صفحہ داغ سے پتہ چلتا ہے کہ شروع کے ۸ ورق گم ہو گئے ہیں، کتاب پر آب رسیدگی کہ خود دگی اور پیوند کاری کے نشان جا بجا نظر آتے ہیں، خصوصاً پہلے ورق کی کچھ عبارت بھی ضائع ہو چکی ہے، کہیں کہیں مجلد کتابنے حاشیوں کیساتھ الفاظ بھی تراش دے ہیں، متعدد مقامات پر لکھا ہے ”در مسودہ اول باید دید“ ”یا تحقیق باید کرد“ متعدد جگہوں پر ایک دو لفظ کے بقدر بیاضیں چھوڑی ہیں، ان باتوں سے ترشح ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف کا میضیہ ہے، چونکہ اس کا خط میرزا محمد بن مستمداں کے ان خطوط جیسا ہے، جو مختلف کتابوں پر ثبت ہیں، اسلئے مجھے اس کتاب کے بخط مصنف ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے،

وفات مصنف | عارفی کے سال وفات کے متعلق ہیں کچھ معلوم نہیں، جس شخص نے ہزاروں انسانوں کے سینہ وفات تحقیق کر کے لکھے، خود اس کے سنہ انتقال کا معلوم نہ ہونا کتنا عبرتناک ہے، مگر یہ دنیا کی کوئی نئی رسم نہیں ہو، لاکھوں انسان آج اس زمین کے اندر دبے پڑے ہیں، جن کے بارے میں کوئی یہ بتانے والا ہمک نہیں، کہ کون تھے اور کیا تھے، ان میں حلیل القدر عالم بھی ہیں، جہانکشادہ شاہ بھی اور خدا رسیدہ صوفی بھی، مگر روح و مانے کی کوئی طاقت گمنامی کی تاریکی کو دودھ نہ کر سکی،

فاعلم و یا اولی الابصار،

## تایخ فقہ اسلامی

مصری عالم حفزی کی تایخ النشریح الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہاء پر مکمل اور ایسا ترجمہ جس جدید فقہ کی ترتیب میں مدون کی جاتی ہے، حجم ۲۸۰ صفحے، قیمت ۳۰ روپے

”منیجر“

## فارسی کے چند قدیم شعراء

از جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے ایل ایل بی (ریڈنگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امرتسار (پرا)  
فارسی کے چند قدیم شعراء یعنی مغزی، سنائی، ادیب صابر، آوری وغیرہ کے چند مثنوی کے متعلق یہ  
معلومات پیش کرتا ہوں، مجھے خود احساس ہو کہ ان کے متعلق ابھی بہت کچھ محنت کی ضرورت ہے لیکن انکی  
اسی کو پیش کیا جاتا ہے، اس مضمون میں کہیں کہیں بعض بزرگوں سے اختلاف رہے ہیں، لیکن اس کا مقصد  
صرف یہ ہے کہ وہ میری اصلاح فرمائیں تاکہ اس سلسلہ میں بعض اہم چیزیں بھی پردہ حفا سے باہر آجائیں  
اور ہمارے ملک کو فائدہ پہنچے،

مغزی مغزی کے سلسلہ میں اس کے باپ امیر الشعراء (عبد الملک) برہانی نیشاپوری کی تاریخ  
فات کے متعلق قیاس آرائی کرتا ہوں جو ممکن ہو کہ صحیح ہو سکے، اسکے متعلق چہار مقالہ (مقالہ دوم)  
نکایت پنجم میں مغزی کا بیان اس طرح ہے،

”..... پدر من امیر الشعراء برہانی رحمۃ اللہ علیہ در اول دولت ملک شاہ بہر فرزند

از عالم فناء بحال بقا تحویل کرد و در آن قطعہ کہ سخت معروف است مرا بسلطان ملک شاہ

سپرد دریں بیت ۷

من رفتم و فرزند من آمد غلب صدق اور ابجد او بجد او بند سپردم،

پس جاگی و اجرا پدید من تحویل افتاد و شاعر ملک شاہ شدم و سارے در خدمت بادشاہ

روز گاہ گذاشتم کہ جز وقتے از دور اور انتوا نستم دیدن و از اجساد و جاگی

یک مہینہ دینار نیا فتم ..... روزے کے فروغے آن رمضان خواست بود... دراپ  
دل تنگی بنزد علار الدولہ امیر علی فرامرز فتم کہ پادشاہ زادہ بود شعر دوست و ندیم خاص

سلطان بود و داماد او.....؟

علار الدولہ امیر علی فرامرز جس کو یہاں ملک شاہ کا داماد کہا گیا ہے میرزا قزوینی اپنے حواشی میں اس ل  
خاتون کا شوہر بتلاتے ہیں جو چغری بیگ (المستوفی ۴۵۲ھ) کی بیٹی اور ملک شاہ کی پھر چھی تھی اور جو  
خلیفہ قائم بامر اتد کی بیوی تھی، اخبار الدولۃ السلجوقیۃ (ص ۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ  
قائم بامر اتد کی یہ شادی ۴۵۸ھ میں ہوئی تھی اور صفحہ ۱۶ میں اس خلیفہ کی تاریخ وفات ۴۷۲ھ  
(مطابق پنجشنبہ ۲۲ اپریل ۱۰۸۰ء) ہے، اگر اس خاتون کا عقد ثانی خلیفہ کی وفات کے بعد ہوا تھا، تو وہ  
عدت کے ایام کے بعد ۴۶۸ھ کے پہلے کی ہوا ہوگا؟

اب دوسری طرف آئیے، ملک شاہ کی سلطنت کا زمانہ ۴۶۵ھ سے ۴۸۵ھ تک تھا چار چار سال  
کی حکایت میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ بُربانی کی وفات ملک شاہ کے ابتدائی عہد میں ہوئی تھی یعنی بیس  
کی حکومت کے پہلے چوتھائی حصہ میں گویا زیادہ سے زیادہ ۴۶۵ھ تک ضرور ہو چکی ہوگی، اور اس کی وفات  
کا زمانہ وہ تھا جبکہ علار الدولہ امیر علی فرامرز سے اس خاتون کا عقد ثانی ہو چکا تھا، جو ۴۶۸ھ کے پہلے نہیں  
ہو سکتا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ بُربانی کی وفات ۴۶۵ھ اور ۴۶۸ھ کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی

اب معری کے کچھ حالات اس کے کلام ہی سے معلوم کیجئے، اس کے کلام کے اجزاء ہندوستان کے  
بعض کتاب خانوں میں ملتے ہیں، لیکن شاید مکمل دیوان جیسا کہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے لکھا ہے، ڈائل  
کالج میگزین ص ۱۰، نومبر ۱۹۳۳ء) طہران میں پروفیسر سعید نفیسی کے یہاں ہے، بہر حال جو کچھ کہل سکتا ہو

۱۰ اخبار الدولۃ السلجوقیۃ (مطبوعہ لاہور) میں ملک شاہ کے باپ الپارسلان کی تاریخ وفات ۵۲۷ھ (۴۶۵ھ) بتائی  
اسی سال ملک شاہ (ص ۵) تخت نشین ہوا پھر ملک پر اس کی وفات کا سال ۵۲۸ھ بتایا گیا، لیکن راحت الصدوق  
میں ۵۲۷ھ سے ۵۲۸ھ تک ہی،



اس میں سے یہ چند باتیں پیش کی جاتی ہیں،

ہم کچھ کہتے ہیں کہ بُراہی کا انتقال ۳۴۱ھ کے پہلے ہو چکا تھا، یعنی اس وقت تک مغزی نے ملک شاہ کے دربار میں رسائی حاصل کر لی تھی، اور اس بادشاہ کی خدمت میں اس کا سب سے پہلا کلام وہ دو رباعیاں ہیں جو مقالہ دوم کی حکایت پنجم میں مذکور ہیں، لیکن جیسا کہ اسی حکایت میں ہو کہ نظام الملک کو شعر و شاعری پسند نہ تھی، اس لئے مغزی ان کی مدح کیا لکھتا، پھر بھی ہم کو چند قصیدے اُن کی مدح میں ملتے ہیں جن کے کچھ اشعار یہ ہیں :-

بہ ڈر و مشک از بر بہارِ یادِ شمال	موش است زمین و معطر است جبال
نظام ملک شہنشاہ قوام دین رسول	خدا یحسان دیزیران و قبلہ اقبال
ابو علی حسن آل صابجہ کہ حضرت اوست	امان لشکر امطال و قبلہ آمال

ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے،

اے توفیق و ہدایت دینِ یزداں را قوم  
اے بتدبیر و کفایت ملکِ سلطانِ نظام

ملک شاہ (المتوفی ۳۸۵ھ) کی مدح میں کئی قصیدے ہیں، ایک عید الفطر کے موقع پر لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

بر معز الدین ملک شہ آفتابِ ادو دیں  
روز عید روزہ دارانِ فرخ و فرخندہ باد

ذیل کا قصیدہ ۳۸۶ھ میں جب کہ ملک شاہ، مملکتِ روم کو فتح کر کے پہلی مرتبہ بغداد پہنچا ہے لکھا ہو گا، اس کے متعلق یہ شعر کافی ہیں :-

اس زمانہ درباری رسائی کی وجہ سے حاسدوں سے بھرا ہوا تھا، دولت شاہ نے قطران کے حال میں لکھا ہو کہ و طواظ اپنے محارمین میں صرف قطران کو شاعر سمجھتا تھا، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ و طواظ کی حدائقِ انجمن میں راتِ اصد و زوالے کو کئی شاعر نہیں ہیں مغزی کے حال میں دولت شاہ کہتے ہیں کہ خاقانی نے مغزی کو تسلیم کیا ہو، اور و طواظ کے منکر ہیں اور یہ عجیب تھا ہو کہ چار مقالہ افندی کو نہیں پہچاننا چاہتا، لے نوٹس لا حارثہ، حبیب گنج سے انتخاب و ادین شعرائے متقدمین درق ۸۲۵ء حمیدہ لا بُریری، جھوپال سے ایضاً درق ۵۸۲ ب،





بھی صبح صادق میں ہیں۔

قوام شرع غزا الملک فرزند قوام الدین      منظر کز نظردار و مزاج و صورت و جوہر  
اور غالباً جمال الملک بن نظام الملک کی مدح میں معری کہتا ہے:-

جمال دولت باز آمد وزمانہ بخواست      کہ بے جمال بود دولت شہ عالم  
ز گفتمہ پدر من سر زانے تست و دوست      کز ان دوست شود طبع شاد و دل خرم  
بلند بختا دولت خدای داد ترا      نہ خاص داد و نہ عام نہ خال داد و نہ عم  
بجاں عزیز بود تن خواستہ نہ بود      جو جان بجایے بود خواستہ نیاید کم  
لیکن مجھے اس مدوح کے متعلق کوئی یقین نہیں ہے جس طرح کہ اسی شاعر کے یہ دو شعر بے نشان  
معلوم ہوتے ہیں:-

مجلس پدرت عسجدی ز ہمسر طبع      مدیح برد بہ آیام جعفر و محمود

مجلس تو من آورده ام ز ہیر شرف      عزیز عقدے نگزیدہ از میان عفو و

سجڑے ۱۱۱۱ء میں بہرام شاہ کو غزنین میں تخت نشین کرایا، غالباً سحر کی اسی واپسی پر مغنی نے لکھا:

شہ مشرق ملک سجڑدار الملک باز آمد      سپاس و شکر و یزوان اکہ شاد و سر فراز

زدار الملک غائب شد ز ہیر فتح و فیروزی      کنوں با فتح و فیروزی بدار الملک باز

و گر چہ حرص و آرزو ما فزون است از ہیمہ چیز      عطاے او کہ بخشش را فزون از حرص و آرزو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱)

چوں گرفت آن زیر جام کف      بنظارہ ملوک صف و صف  
جملہ گفتند این چہ حال افتاد      و آنچه کردی چگونہات دل داد  
کیں جنیں جوہر ہے بہ آفتاب      صرف کردم بے خطاب و سمو  
ابن جنیں جوہر ہے ظریف لطیف      بود لائق ہاں مقام شریف  
لے جلد سوم ورق ۱۰۶۱ الف      لے انتخاب بحوالہ، ورق ۵۹۹ ب لے ایضاً ورق ۵۸۳ پ،

بجز رشید و پیرخ اور اکرم قشہ از ان معنی  
کہ خورشید کند آمد و پیرخ نیزہ باز آمد  
ہمیشہ با خبر باشد کہ محمود غازی را  
نشا طو شادی از زلف بنا گوش یا ز آند

پھر سحر کے وزیر وجہ الملک شرف الدین ابوطاہر سعد بن علی النعمی کی مدح میں معوی کے متعدد قصیدے ملتے ہیں، اس وزیر کا انتقال ۲۵ محرم ۱۲۵۸ھ (چہار شنبہ ۹ اپریل ۱۸۴۲ء) کو ہوا تھا، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

صاحب عدل ابوطاہر سعد بن علی  
کہ شد از سعد و علو در ہمہ آفاق علم  
اں کہ گشت از ہنرش فرع معالی عالی  
داں کہ گشت از سخنش اصل معانی حکم

آثار الوزر ارد درق ۱۱۷۲، الف) میں ان اشعار کے ساتھ معوی کی یہ باغی بھی اسی کی مدح میں شامل

لے بر سر خلق سایہ اقبال  
آراستہ اخلاق تو چوں احوال  
بے بہرہ نماندے کسے از افضالت  
کہ در خور بہت تو بودے مالت

اس کی مدح کا ایک طویل قصیدہ میرزا قزوینی کے بست مقالہ (صفحہ ۱۵۸) میں ہے، اس کے علاوہ حبیب گنج سے ایک قصیدہ صنعت سوال و جواب میں بھی پڑھے، اس میں وہ شعر ہیں لیکن صرف چند

گفتم بقل دوش کہ لے احسن الصور  
گفتا چگونہ یافتی از حسن من خبر  
گفتم ضمیر من شجر باغ حکمت ست  
گفتا شدہ ست باغ مزین بدین شجر  
گفتم کہ این شجر ہمہ سالہ نمدہد  
گفتا مدابغ شرف الدین دہ نمر  
گفتم وجہ ملک و پندیدہ ملوک  
گفتا کہ زین دولت و پیرایہ بشر  
گفتم سپہر سعد و علو سعد بن علی  
گفتا سر سعادت و پیرایہ ظفر  
گفتم جہاں تن است خراساں از دست  
گفتا ہرات و مرو از دھچ چشم و دست

اس وزیر کے بعد ہی نظام الدین تغری طغان بیگ محمد بن سلیمان الکاشغری محرم ۱۰۵۶ھ  
 داپریل ۱۲۲۵ء سے مقرر ہوا، آثار الوزراء (دورق ۷۲ ب) میں یہی تاریخ ہے اور اس کے علاوہ دستورالوزراء  
 (۱۹۲۵ء) میں بھی یہ بیان ہے کہ یہ وزیر دو سال اور کچھ ماہ تک مقرر رہا، مغزی نے وزارت کی تہنیت میں لکھا:

صدر نیک خضر محمد بن سلیمان اے کہ ہست چوں محمد دیں پرست چوں سلیمان ملک دار  
 از نظام رسم او شد شغل گیتی بر نظام وزیر نگار ملک او شد کار عالم چوں نگار  
 بارغ ملت راز رسم او پدید آمد درخت سال دولت راز عدل او پدید آمد قرا  
 پھر سبخر کے وزیر قوام الدین ابوالقاسم (المتوفی ۱۱۳۳ھ) کی مدح کی ہے:-

ہست شکر بار یا قوت تو لے عیار یار نیست کس راز دہاں یا قوت شکر بار بار  
 قاسم الارزاق قاسم آنکہ اندر حل و عقد ہست غم او میان نیک بد دیوار وار

حیب السیر دجزو چہارم، جلد دوم (۱۳۱) میں تاریخ گزیدہ کے حوالے سے مغزی کی دو رباعیاں  
 اور ہیں جو سبخر کے گھوڑے سے گرنے اور پھر اسی گھوڑے کے حاصل ہو جانے پر مغزی نے کہی تھیں لیکن  
 سبخر کی مدح میں ایک قصیدہ ہکو ایسا ملتا ہے جس سے شاعر کی مدح گوئی کا کچھ زمانہ معلوم ہو سکتا ہے:-

داور گیتی ملک سبخر کہ اندر کار ملک کس نیار دکر دبا و گفت و گوے وادری  
 آں جہاں دارے کہ گز تا زبہ بند وین تازہ گرداند مسلمان بی بجائے کافی

اس کے نام میں بہت اختلاف ہے لیکن میر خاں ہے کہ تغری طغان بیگ ہی صحیح ہے جیسا کہ سید حسن غزنوی نے لکھا ہے:-

امیر عادل تغری طغان دریادل کہ جاں سپار داز دل ہمہ سپاہ ترا  
 مغزی کا ایک قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے، (انتخاب جہوپال، ورق ۵۰۶ ب)  
 بقال فرخ و عزم درست مرے موآ سفر گزیدم و کردم سوے چیل شتاب  
 اور سید حسن غزنوی اس طرح شروع کرتے ہیں:-

جو عزم کردم سوے سفر برائے صواب بریدہ گشت امیدم ز دیدن اجاب  
 سلسلہ مجموعہ تصانیف فارسی مت ۵، حیب گنج یا حوض الاحرار ص ۱۰۹، حیب گنج،

در میان کفر و دین شیر توستے قویست  
در تو آن گفتم کہ در محمود گوید عنفری  
من جواز ز بر سخن گفتم نہم در مدح تو  
ہر آن ز را ملک شاہی بود یا بخری  
خدمت سی سالہ را آخر بناید حرمست  
حرمست سی سالہ در خدمت بناند سرسری

اگر اس خدمت سی سالہ کے متعلق ایک مٹا حساب عہد ملک شاہی سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ قصیدہ ۱۱۰۶ھ میں لکھا گیا ہے، کیونکہ ۱۱۰۶ھ تک جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، مغزی کو ملک شاہی دربار میں رسائی ہو چکی تھی، اور اگر بخری کا زمانہ لیا جائے تو پھر ۱۱۱۱ھ سے ۱۱۱۴ھ میں پورے ہوتے ہیں، اور بخر کے تیر سے زخمی ہونے اور پھر اچھے ہونے کے بعد مغزی کا ۱۱۱۲ھ میں مرنا صحیح ہو سکتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ مغزی کی وفات ۱۱۱۳ھ کے پہلے ہو چکی ہوگی، کیونکہ قوام الدین ابوالقاسم (المتوفی ۱۱۲۷ھ) کی مدح کے بعد کسی اور مدح کی مدح ہم کو نہیں ملتی، اس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے پاس مکمل ڈیوان نہیں ہے، یا یہ کہ مغزی نے آخر عمر میں مدح گوئی کو بہت ہی کم کر دیا ہوگا، لیکن اگر اسکی وفات ۱۱۲۲ھ میں مان لیا جائے تو پھر اس نے عمر بہت زیادہ بائی ہوگی، کیونکہ ۱۱۲۲ھ کے قریب اس نے جو رباعیاں درمقالہ دوم، حکایت پنجم، اکی تھیں وہ اس کی بچگی طبع کا ثبوت دیتی ہیں، جو اسے تقریباً ۲۵ سال سے پہلے کیا حاصل ہوئی ہوگی، اس حساب سے ۱۱۲۲ھ میں اس کی عمر ۹۰-۹۲ سال کی ہوگی جو محتاج ثبوت (باقی)

لے مجموعہ قصائد فارسی صفحہ ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱

# تَلَحُّصٌ وَتَبَصُّرٌ لَا

## کیسے

زندگی کا جوہر کیر کڑ ہے، زندگی کی رفعت اور عظمت کا مدار صرف کیر کڑ پر ہے، انسانی فطرت کا بہترین منظر کیر کڑ ہی ہے، کیر کڑ ایک اخلاقی نظام ہے، جس کا نمونہ ایک متوازن، مربوط اور مرصع شخصیت پیش کرتی ہے، سوسائٹی کا خمیر کیر کڑ ہی سے عبارت ہوتا ہے، صراح کیر کڑ ایک ایسی قوت ہے جو خلوت جلوت اور منبر و محراب کی ترغیبات سے بالاتر ہے، کھوٹے سکھ کی طرح کھوٹے کیر کڑ کی کمی نہیں، اس کو پرکھ لینا دشوار نہیں، صراح کیر کڑ آفتاب کی طرح بندوبالا اور روشن ہوتا ہے جس طرح آفتاب کی روشنی چھوٹے سے چھوٹے سوراخ سے دیکھی جاسکتی ہے، اسی طرح نہایت معمولی اور عام باتیں جو حسن، خوبی اور آبرو کی آئینہ دار ہوتی ہیں، کیر کڑ کو واضح کرتی ہیں،

کیر کڑ کی نگین بڑی صبر آزا ہوتی ہے جس طرح سمندر کے اندر مونگے کی چٹانیں فزوں میں چھوٹے چھوٹے کیروں کی مسلسل جدوجہد سے بنتی ہیں، صراح کیر کڑ اسی طرح دیر میں بنتا اور مکمل ہوتا ہے،

زندگی کی قدر و قیمت کا معیار اس کا اخلاقی وزن و وقار ہے، خمیر کی رہنمائی میں کیر کڑ ہی انسان کو زندگی کی حقیقی نعمتوں سے آشنا اور اُن سے سرور رکھتا ہے، زندگی میں حقیقی کامیابی کے لئے دولت، قوت، چالاکائی، نمود و نمائش اور شہرت ضروری نہیں، بلکہ صرف کیر کڑ سب سے زیادہ ضروری اور اہم چیز ہے، آپ کا کیر کڑ ویسا ہی ہو گا جیسا آپ اسکو بنانا چاہیں گے، فطرت کی بخششیں اور انعامات عام و ارباب



ہیں اور دماغ و ذہن کی روشنی میں یہ سب کا حصہ ہیں یہ روشنی مختلف زاویوں سے مختلف قوت کے ساتھ لوگوں تک پہنچتی ہے، اکثر ہم، کمین روشن کہیں، بالکل ہلکی اور کمین تقریباً معدوم اس کا نام جاننا نہیں، ان خوبیوں کا ثبوت دیجئے جو ہر شخص کے حصہ میں آچکی ہیں، اور آپ بھی اس کے حصہ دار ہیں، چلو، سنجیدگی، شفقت، رحم، عالی ظرفی، اہمیت اور تعینات اور خفیت اور حرکتی سے اجتناب، کیرکڑ انہی چیزوں سے بہت ہے، قدرت نے آپ کو ان سے محروم نہیں کیا ہے، ان بخششوں کے باوجود اگر آپ کیرکڑ سے محروم ہیں تو یہ صرف آپ کی محرومی اور ذمہ داری ہے،

وہ بات کبھی نہ کیجئے جو باعثِ مذمت ہو سکتی ہے، صرف ایک اچھی رائے آپ کے لئے سب سے زیادہ اہم ہونا چاہئے، اور وہ آپ ہی کی رائے ہے، یعنی آپ کا ضمیر مطمئن ہونا چاہئے، مطمئن ضمیر مستقل نشا ہے، یہ بات کیسی حیرت انگیز ہے کہ اکثر ہم دوسروں کو ترغیباتِ نفس کی دعوت نہیں دیتے لیکن خود کس آسانی سے ان کا شکار ہوتے رہتے ہیں،

ہم اگر بلند نظر ہونا نہ سیکھیں گے تو تنگ نظر اور پست نظر ہو جانا لازمی ہے، اُج ب جاہ اور ہوس پستی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُن کی تکمیل کبھی نہیں ہو سکتی جو لوگ ان کا شکار ہوتے ہیں، وہ سکینٹ اور تشکر کے جذبہ سے محروم ہو جاتے ہیں، انسان کو ترقی کرنی چاہئے، لیکن ہم میں اکثر اپنی ترقی کس قیمت حاصل کرنا چاہتے ہیں، حوصلہ کی تشکیل اور تکمیل کے لئے ذرائع میں احتیاط بہت ضروری ہے، ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ عروج جو بظاہر عروج ہے، لیکن درحقیقت زوال ہی،

ہمارا حوصلہ نفس پر قابو حاصل کرنا اور اس پر حکومت ہونا چاہئے، یہ حقیقی بادشاہت ہر شخص کے اختیار میں ہے، حقیقی ترقی شخصیت کی تربیت اور علم و عمل سے حاصل ہوتی ہے، فرض کی ادائیگی انسان کا اولین اور بلند ترین حوصلہ ہونا چاہئے، ہمارا علم، ہمارے خیالات و اعتقادات کچھ قیمت نہیں رکھتے اگر ہمارے اعمال ناقص ہیں،

دیانت اور صداقت کیر کٹر کے نہایت اہم اجزاء ہیں، دیانت نہ صرف بہترین بلکہ واحد صحیح ترین حکمت عملی ہے، صداقت انسان کی متاعِ گرانمایہ ہے، صداقت سے انحراف، احترامِ خداوندی سے محرومی اور انسانوں سے معروبیّت کی شہادت ہے، اپنی غلطی پر شرمندہ ہونا بہت مناسب ہے، لیکن غلطی کے اقرار پر کبھی بھی شرمندہ نہ ہونا چاہئے، انسان کو انسان بنانے کے لئے فرائض کی ادائیگی اور زندگی کا ناموں کے لئے بہت سی خوبیاں ضروری ہیں، ان میں سب اہم و ناگزیر خوبی جس کے بغیر انسان انسانیت اور زندگی کی بلندی و رفعت سے محروم رہتا ہے، صداقت ہے،

بڑوں کی بڑائیاں اور نیکیوں کی نیکیاں اسلئے زندہ ہیں کہ وہ ایسے جری اور بہادر تھے کہ ان کی حقیقی اور ظاہری زندگی میں کوئی پردہ حائل نہ تھا، ان کی شخصیت حقیقت تھی، جس نے انکی یاد کو دوام جو شخص تنگ مزاجی اور خیالاتِ فاسدہ کا شکار ہو جاتا ہے، وہ اپنے دل میں ایک ایسے عفرت کو جگہ دیتا ہے جو حاکم مطلق بن کر اس کے سکون و مسرت کا خاتمہ کر دیتا ہے، رنک و حد، فکر و بے چینی جو اور تنگ نظری سے اُس کی روح جسم کا امتزاج و توازن برباد ہو جاتا ہے،

اقتدار و قوت حاصل ہونے کے بعد حکو قمر و غضب کے بجائے انصاف و اخلاق کا نمونہ بننا چاہئے صاحب اختیار کو کبھی یہ نہ سوچنا چاہئے کہ وہ کیا کر سکتا ہے، بلکہ دیکھنا چاہئے کہ کیا کرنا مناسب ہوگا بہت کا سیدھا راستہ یہی ہے،

گنہ کی معافی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہماری سزا نہ ہوگی، سزا نہ ملنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ بڑی بد قسمتی بھی حقیقت یہ ہے کہ بدی میں خوشحالی سے محرومی ایک بڑی سخت محرومی ہے، گزشتہ غلطیوں کی یاد و حال و مستقبل کو تلخ بنا دیتی ہے جن کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے وہ معاف کر سکتے ہیں لیکن ان کی معافی سے مجرم بنے چور کی سپاہی اور اور سوزش میں اور زیادتی محسوس کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ طور و طریقہ اور طرز و روش ہی سے زندگی عبادت زندگی کی مسرت اور شاد کامی کا مدار انہی چیزوں پر ہے، ظاہری امور کوئی اہمیت نہیں رکھتے، ماحول اور

فضا کی کوئی اہمیت نہیں، سب سے زیادہ اہم ہمارے اعمال ہیں جن سے ہماری شخصیت بنتی ہے، اسلئے ہر نفس کا محاسبہ ضروری ہے، عمل سے عادات عادت سے کیر کڑ اور کیر کڑ سے قسمت کی تشکیل تکمیل ہوتی ہے ہم سب میں روزانہ کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے، خواہ اچھا ہو یا بُرا اس لئے ضروری ہے کہ ہم ہر شب میں سوچا کریں کہ ہم میں کیسا اضافہ ہوا،

ایک مشہور فلسفی شاعر کا خیال ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں، اہل خیر اور اہل شر، اگر خدا نخواستہ آپ کا تعلق موخر الذکر سے ہے تو آپ دوستوں کو دشمن، خوشگوار کو تلخ، زندگی کو پر غم اور دنیا کو زنداں بنا دیں گے اس کے برعکس اگر آپ کسی کے دل میں ایک بینک اور مبارک خیال پیدا کر سکتے ہیں، یا کسی کی زندگی کی ایک ساعت پر مسرت بنا سکتے ہیں تو آپ کا یہ کارنامہ ایک فرشتہ کی لائی ہوئی رحمت کے مانند ہوگا، چند لمحوں کے لئے نفس کا محاسبہ ذکر و شغل کا ضروری جزو ہونا چاہئے، صرف نیکیوں پر غور کرنے سے آپ ہر اُس چیز سے بالاتر ہو جائیں گے جس میں بدی یا بُرائی کی آلودگی ہوگی،

شباب کو بہانہ نہ بنائیے، خالق کو شباب میں یاد کیجئے کہ اعلیٰ صفات کی متوازن تھلیل سے کیر کڑ بنتا، پرورش پاتا اور استوار ہوتا ہے،  
”ن ص“

## سیرتِ نبویؐ حصہ ہفتم

یہ اخلاقی تعلیم پر مشتمل ہے، اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے اور پھر اسلامی و اخلاقی تعلیمات اور فضائل و ردائیل اور اسلامی آداب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ السلام کا پایہ کتنا اونچا ہے، یہ کتاب چھوٹی اور بڑی دونوں سائز پر چھپی ہے، قیمت حسب ذیل ہے :- تقطیع کلاں قسم اول ص ۵۵۰  
”منبر“  
لحمہ تقطیع خود قسم اول ص ۵۵۰ دوم ص ۵۵۰

# احسان علی شاہ

## ایک قدیم تاریخی کھیل

جس طرح شطرنج بادشاہوں کا قدیم دماغی کھیل رہا ہے اسی طرح گئے چوگاں یا پلو دودچہ درشتی کھیل رہا ہے، اس کا بہت قدیم زمانہ سربہ چلتا ہے اور قدیم تاریخوں اور شاعری دونوں میں اس کا ذکر موجود ہے، ہمیں میدان ہیں چوگاں ہیں گئے سے ہر شخص واقف ہے اس کا غالباً سب سے قدیم ذکر سکندر مقدونی کے حالات میں آتا ہے اس کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ دارلے اس کے پاس گیند اور بلایا تھا اس سے یہ اشارہ مقصود تھا کہ سکندر اپنی گھر کی چار دیواری میں اس قسم کے کھیل تماشوں میں مشغول رہے، اور نظام دنیا سنبھالنے کا خیال چھوڑ دے، سکندر نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ "دینا گیند ہو گی اور سکندر اس کا بلا ہو گا، ایران کا مشہور بادشاہ اردشیر اس کھیل کا بڑا ماہر تھا ایرانی داستانوں میں یہ افسانہ مشہور ہے کہ اس کو اس کھیل سے اتنی پچپی تھی کہ اُس نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص گئے چوگاں کا سب سے اچھا کھلاڑی ہو گا اس کو وہ اپنا بیٹا بنائے گا، اس اعلان پر ایک شخص نے اس کو اپنا کھیل دکھایا اور دیشر کو اتنا پسند آیا کہ اُس نے اس کو ولیعهد بنالیا، یہ متنبی ولیعهد بنا پور تھا، فارسی شاعری میں غالباً سب سے پہلے رباعیات عمر خیام میں اس کا ذکر ہے، ایران میں عورتیں تک گئے چوگاں کھیلی تھیں نظامی نے خسرو شیریں میں شیریں کے کھیل کا نہایت دلکش منظر دکھایا ہے، ہارون رشید کو بھی اس سے پچپی تھی، چنگیز خاں کا ایک لڑکا انوتی گئے چوگاں کا ماہر تھا، اور اُس نے اپنے

ماشینیں بھی اس کھیل کے ماہر بنے تھے، تیمور لنگ کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے دمشق میں انسانی سرور کو گیند بنا کر کھیلا تھا، اصفہان میں اب تک میدان شاہ کے نام سے ایک میدان مشہور ہے جس میں سو پہلی صدی میں گونے چوڑے گاہوں ہوا کرتا تھا اور شاہ عباس صفوی اپنے محل میں بیٹھ کر اس کا تماشا دیکھا کرتا تھا، اور کبھی کبھی خود بھی کھیل میں شریک ہوتا تھا، چین و جاپان میں بھی یہ کھیل ایک مختلف شکل میں رائج تھا، ہندوستان میں اس کھیل کا مرکز مینورہ، شمار کیا جاتا تھا، اور یہاں کے باشندے سارے ہندوستان میں اس کے ماہر سمجھے جاتے تھے کھیل کے میدان میں نہایت شاداب لان تھا اور چاروں طرف پتھر کی بلند فصیل تھی، یہاں کے باشندے اس کھیل کے ایسے شائق تھے کہ جب تک ان کے گھوڑے نہ تھک جاتے تھے وہ نہ تھکتے تھے اور دن سے رات کی تاریکی تک کھیلتے رہتے تھے،

## البجیر

آج کل تحت البحر یا دکنی کشتی کو بڑی جنگی اہمیت حاصل ہو گئی ہے، گو یہ بھی ایک قسم کی کشتی ہی ہے لیکن اسکی ساخت اور شکل و صورت سطح سمندر پر چلنے والے جہازوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے، چونکہ پانی کی سطح اس پر بڑا دباؤ پڑتا ہے اسلئے وہ نہایت ٹھوس اور مضبوط دھات کی بنائی جاتی ہے، اور سگاری طرح نیچے اوپر اس کے کئی پرت لپٹے ہوتے ہیں، غوطہ زنی کے وقت اس کے تمام منفذ جھینٹاں (مضامع) میں دھانہ یا کھڑکی کھاتا ہے، مضبوطی کے ساتھ بند کر دیئے جاتے ہیں، نئی طرز کی تحت البحر میں تین دھانے ہوتے ہیں، پانی کی سطح کے اوپر لاتے وقت آگے پیچھے کے دو دھانے بند کر دیئے جاتے ہیں، اوپر لانے کے لئے صرف درمیانی دھانہ کھلا رہتا ہے، غوطہ لگاتے وقت کشتی کو بھاری کرنے کے لئے اسکی ٹانگی میں ۷۰۰ ٹن سمندر کا پانی بھرا جاتا ہے، جس کے بوجھ سے کشتی اندر بیٹھ جاتی ہے، نئی طرز کی تحت البحر صرف بجلی کے پنکھوں کے ذریعہ چلائی جاتی ہے، اس میں اتنی کثرت سے اور ایسے باریک آلات ہوتے ہیں

کہ ساری جگہ گھیر لیتے ہیں اسلئے اس کا اندرونی حصہ بہت تنگ ہوتا ہے، کپتان کے چلنے پھرنے کے لئے صرف تنگ راستے ہوتے ہیں، تاہم اس کے سونے کھانے، پکانے اور نہانے وغیرہ کی جگہ کا مستقل انتظام ہنہی کپتان کیلئے سطح سمندر کے اوپر کی چیزوں کی نقل و حرکت کی نگرانی ضروری ہوتی ہے، ان کو دیکھنے کے لئے ایک خاص قسم کی دوربین ہوتی ہے، آسمیں اوپر نکلی ہوئی ٹکلی میں نشیہ لگے ہوتے ہیں اس اوپر کے جہازوں کی نقل و حرکت صاف نظر آتی ہے صرف کپتان دشمن کے جہازوں کا اندازہ کر سکتا ہے اور جہاز رانوں کو تحت البحر کارخانوں کی طرف پھرنے اور ان پر تار پیڈ مارنے کا حکم دیتا ہے، ہر تحت البحر میں عموماً اوسط درجے کے بارہ تار پیڈ ہوتے ہیں اور ایک بڑی مارکی توپ ہوتی ہے جب تحت البحر کو پانی کی سطح کے اوپر لانا مقصود ہوتا ہے، تو کپتان پانی نکالنے کا آلہ دبانے کا حکم دیتا ہے، پانی نکلنے کے بعد تحت البحر ہلکی ہو کر اوپر آجاتی ہے،

## ہندوستان میں پٹرول کا خزانہ

موٹر ہوائی جہاز، ٹینک اور دوسرے جنگی آلات کے علاوہ اکثر مشینوں کا دار و مدار بڑی تک پٹرول کے اوپر ہے، اس لئے موجودہ جنگ میں پٹرول کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس وقت دنیا کے پٹرول کے بڑے بڑے مخزن جن سے ۲۰۰ ملین ٹن سالانہ پٹرول نکلتا ہے، اتحادیوں کے قبضہ میں ہیں ۶۶ ملین ٹن ممالک متحدہ امریکہ سے نکلتا ہے، ۴۰ ملین ٹن سویٹ روس سے (اب سویٹ کا مخزن سخت خطرہ میں پڑ گیا ہے) اس کے مقابلہ میں محوری طاقتوں کے قبضہ میں صرف روایتی کا مخزن ہے، جس سے کل ۱۲ ملین ٹن سالانہ پٹرول نکلتا ہے، ہالینڈ نے جاوہ کے تمام مخزن برباد کر دیئے، ہندوستان میں کچھ نو پھیلے ہوئے پٹرول کے کارخانوں کی کوئی نشان نہ تھا، اب آسام اور شمالی ہند کے بعض حصوں میں اس کے کنوینینٹ بن چکے ہیں، جہاں پٹرول نکالنے کے کارخانے قائم کر دیئے گئے ہیں، ان میں سے پٹرول خانہ

صورت میں نکلتا ہے جسے پکار کر صاف کیا جاتا ہے، اس کے لئے بڑے بڑے مینارِ ماحض ہوتے ہیں ان میں نیچے اوپر کئی درجے ہوتے ہیں، خام پٹروں پکنے کے دوران میں ان تمام درجوں سے گزرتا ہوا آؤ کے آخری درجہ کا صاف شدہ پٹرول سب سے بہتر ہوتا ہے، یہی ہوائی جہازوں میں استعمال ہوتا ہے، دوسرے درجہ کا موٹروں کے اور میسرے درجہ کاروشنی کی گیس کے کام میں آتا ہے، ہندوستان میں سب سے اول ۱۹۱۵ء میں پٹروں کے کنوؤں کا اکتشاف ہوا، اور ۱۹۲۱ء میں اسکو نکالنے اور صاف کرنے کے لئے چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا گیا، لیکن ۱۹۳۰ء سے اس کو بڑے پیمانہ پر وسیع کر دیا گیا ہے، اور اس کے لئے جدید قسم کے تمام سامان دیتا کئے گئے ہیں،

### جنت میں ایسلا می عدالتوں کا قیام

جنت میں قدیم زمانہ سے مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے، اور یہاں ان کو ہر قسم کی مذہبی سہولتیں حاصل ہیں، ایسلا سلاسی بادشاہِ جنت کی مسلمانوں پر بڑی نظرِ توجہ ہے، اور ان کے مذہبی امور سے خاص دیکھی ہے، چنانچہ حال ہی میں انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی عدالتوں کے قیام اور ان کے لئے قضاۃ کے تقرر کا حکم دیا ہے، مسلمانوں کے نکاح و طلاق وراثت و وقف وغیرہ کے جملہ مذہبی مسائل ان عدالتوں کے سامنے پیش ہوا کریں گے، ابتدائی عدالت کے فیصلوں کی اپیل کے لئے عنقریب ایک عدالتِ عالیہ بھی قائم ہونے والی ہے،

### لندن میں ایک نئی مسجد کی تعمیر

لندن میں دو رنگ کی مسجد عرصہ سے موجود ہے، اب مغربی لندن ڈسٹ اینڈ میں ایک بڑی اور وسیع مسجد اس معلق ایک جگہ اور کتب خانہ کی تعمیر کا مسئلہ زیرِ تجویز ہے، اور اسکی ابتدائی کارروائی شروع ہو گئی ہے، حکومت نے مسجد کی تعمیر کیلئے ایک زمین کی قیمت ایک لاکھ گنی پونڈ کی تعمیر کی کمیٹی کے حوالہ کر دی ہے، اس عمارت کے مصارف کا تخمینہ کئی لاکھ گنی پونڈ تمام اسلامی مالک کو اس کا خرچ میں حصہ لینے کی دعوت دی جائیگی، لندن کے مغربی سفیر نشات پاشا نے اس کام کو شروع کر دیا،

# انجمنِ تہذیب

## جذبِ مجذوب

از جناب خواجہ عزیز الرحمن صاحب مجذوبے مارٹن لیسٹر مدراس،

یا فویدِ وصل تھی یا موت کا پیغام ہے  
 اب کہاں وہ دن کہاں وہ ساتی کلفاً  
 عشق کا آغاز کیا تھا اور کیا انجام ہے  
 اب بجائے دورِ ساغر گردشِ آیام ہے  
 خیرِ پرورش کیوں آج قصدِ بام ہے؟  
 آج ارادے کی ہیں کیا منظور قیل عام ہے؟  
 راہِ صحرائی جا مجنوں ابھی تو خام ہے  
 عشق کے ہم نچتہ کاروں میں تو کیا کام ہے  
 وہ مرا آغاز ہے اور وہ کا جو انجام ہے  
 کیا کہی ہے لفظِ حافظ ہیں اب کام ہے  
 دم یہاں اکھڑا ہوا ہے نزع کا ہنگام ہے  
 اُس مقامِ عشق پر اب ہوں کہ اے بلِ جلال  
 دل فقط دیکر تو بس تکلیف ہی تھکتی تھی  
 ربط و بے ربطی حسن و عشق کیا کہے یہاں  
 میں تو ہوں ہی زندہ زائدِ پارسا تو بھی نہیں  
 اگر دم سمجھو، اگر دم بھر بھی یہ ساغر کا  
 ہیں حرام اس مسلکِ ندی میں ایسی ستیاں



جذب میں مجذب متاثر ہو کر اکوٹھے پہ آ  
قابل دید اک تماشا آج زیرِ بام ہو  
ہو گئیں مفقود کیا دینا سے انکھیں لے خدا  
پوچھتے پھرتے ہیں سب مجذب کا نام ہو  
یہ معانی یہ حقائق یہ روائی یہ اثر  
شاعری تیری ہی اے مجذب یا الہام ہو

## فیض عشق

از جناب اسد ملتانوی

عشق کے فیض سے موجود ہیں دیوانے چند  
دیکھ لو آج بھی آباد ہیں ویرانے چند  
یہ نہ سمجھو کہ کوئی بندہ محرم نہ رہا  
نظر آتے ہیں اگر بزم میں بیگانے چند  
دامِ الفت میں خرد مند بھی بھنس جاتے ہیں  
مرغِ دانا کیلئے بھی ہیں یہاں دلانے چند  
آگیا حضرت اعظم کی زباں میں بھی اثر  
یا دتھے اہل محبت کے جو افسانے چند  
کم سے کم شہر کے ستوں میں تو ہمرنگی ہو  
ایک سی نے جو پلائیں یہی میخانے چند  
ہوں میں اُن شوخ نگاہوں کے فسون کا نال  
جن سے مال بہ جنوں ہو گئے فوزانے چند

حسن اور عشق میں ہے ربط بدستور اسد

شمع جلتی ہے تو آجاتے ہیں پروانے چند

## رباعی

از جناب سید احمد حسین صاحب تجدید آبادی

دن رات کے ہمدم کو سمجھتے ہوتے  
دم بھر دم آدم کو سمجھتے ہوتے  
یہ سچ ہے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں  
لے کاش کہ ہم ہم کو سمجھتے ہوتے

# مطبوعات جدیدہ

محمد (صلعم) مولفہ توفیق الٰہیئم تقطیع چھوٹی ہجرات ۳۵۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر،

قیمت معلوم نہیں بہتہ ہندریں ساگردت لین کلکتہ،

مصر کے ایک اہل قلم توفیق الٰہیئم نے عربی میں تنیس کے پیرایہ میں سیرت نبوی لکھی ہے، مولانا عبد القادر صاحب میح آبادی نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، جہاں تک واقعات کی صحت اور ان کی افادیت کا تعلق ہے، قریب قریب کل واقعات مستند اور سبق آموز ہیں، لیکن نفس تمیل نبوت کی عظمت اور اسکے تقدس کے منافی ہے، مثلاً ایک سلمان کو بغیر کسی تعظیمی لفظ کے ہر سطر میں تنہا محمدؐ میں سوئے ادب نظر آتا ہے، بعض مقامات پر ترجمہ میں بھی یہ فروگزاشت ہو گئی ہے اور اردو کے بعض پڑانے مصنفین سیرت کی طرح زبان کے مقابلہ میں احرام کے پہلو کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، مثلاً ”محمد ابو طالب کے گھنڈہ پر کودا کرتے تھے“ (ص ۷۸) ”محمد کو ہماری دیوار تک رگید لائے“ (ص ۷۹) گو یہ الفاظ کفار کی زبان سے ہیں لیکن ایسے سخیف ہیں کہ ایک سنجیدہ قلم سے کسی معمولی انسان کے لئے بھی ان کا استعمال زیبا نہیں ہے، نہ کہ خدا کے پیغمبرِ رحمت کے لئے، اس مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بھی ادا کیا جاسکتا تھا، یا آنحضرتؐ صلعم، حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے بکثرت ”چلانے“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کے بجائے آسانی کے ساتھ ”بلند آواز سے“ کہا جاسکتا تھا، اس ظاہری فروگزاشت کے علاوہ معنوی اعتبار سے بھی بعض انتہائی ضعیف روایتیں درج ہو گئی ہیں، خصوصاً حضرت عائشہؓ صدیقہ کی سیرت کا کوئی اچھا نمونہ نہیں پیش کیا گیا ہے، سو کنوں اور سوتیلی اولاد کے ساتھ ان کا طرز عمل نہ صرف ام المومنین

کی شان بلکہ احترام نبوت کے بھی خلاف ہے، مثلاً حضرت جویریہؓ کے بارہا یہی آنحضرت ﷺ سے ان کی تلخ گفتگو، حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش پر ان کا رشک و حسد، آنحضرت ﷺ کے ابراہیمؑ کو حضرت عائشہؓ کے پاس لانے پر آپ سے ان کی بے رنجی اور نامناسب گفتگو، ابراہیمؑ کی موت پر ان کی مسرت نہ صرف ام المومنین کی شان اور احترام نبوی کے خلاف ہے، بلکہ روایتی حیثیت سے بھی یہ واقعات حد درجہ ضعیف ہیں، لیکن ہوسیرت کی کسی کتاب میں مل جائیں، لیکن ہونا کو سیرت کی روایات کا پایہ معلوم ہوگا، ایسی حالت میں انھوں نے بغیر کسی تنقید کے انھیں کیسے قبول کر لیا، یہ صحیح ہے کہ اس کی ذمہ داری اصل مصنف پر ہی، لیکن کم از کم حاشیہ میں ایسی روایتوں کی حیثیت ظاہر کر دینا چاہئے تھا، پھر ایسے واقعات کا جن سے کوئی مفید سبق نہیں ملتا، بلکہ لٹا اثر پڑتا ہے، ترجمہ کرنا کیا ضروری تھا، اپنے بعض ترجموں کی طرح وہ انھیں آسانی کے ساتھ حذف کر سکتے تھے، اس قسم کی فروگزاشتیں اور بھی ہیں لیکن سب کا استقصاء مقصود نہیں بعض مقامات پر ترجمہ کی بھی فروگزاشت نظر آئی، مثلاً حضرت ابراہیمؑ کی وفات پر آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد ”انا بک یا ابراہیم لحزن و لون“ کا ترجمہ کیا گیا ہے، ابراہیمؑ ہم تیرے غم میں سو گواہیں، حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ہم تیری وجہ سے یا تیرے لئے غمگین ہیں، ”سو گواہی“ نبوت کی شان سے مفید ہے، ان فروگزاشتوں سے قطع نظر کتاب مختلف حیثیتوں سے مفید ہے، گو اس کا طرز ہمارے نزدیک سبب نہیں ہے، لیکن عام لوگ اسے دیکھی سے پڑھیں گے، اور سیرت نبوی کی اشاعت کا اس سے پورا فائدہ حاصل ہوگا،

جو اہر العلوم، مترجم مولانا عبد الرحیم صاحب مولوی فاضل تفتیح بڑی شخصیات ۲۱۹ صفحہ

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عام، پتہ، کتابت ن پوسٹ بکس ۳۱۶۲ ممبئی ۳۰

اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں اپنے وجود و اپنی توحید اور اپنی قدرت و حکمت کے ثبوت میں کائنات

عالم سے بکثرت شواہد پیش کئے ہیں، اور مختلف انواع حیوانات و قلوب نباتات، مروج سمندروں،

فلک بوس پہاڑوں ابرو باران، سیاروں کے نظام، آفتاب و آفتاب کی گردش اور اس قبیل کی دوسری  
ارضی و سماوی کائنات پر عبرت و بصیرت کے لئے غور و فکر کا حکم دیا ہی، ہر دور کے علماء نے اپنے زمانہ  
کے علم و نظر کے مطابق ان کے عجائبات کے اسرار و حکم اور اس کے فوائد و مصالح بیان کئے ہیں جو جو  
دور کے اکتشافات اور فلسفہ و سائنس کی ترقی نے اپنی تحقیقات سے پہلے زمانہ سے زیادہ خدا کی  
قدرت و عظمت اور اسکی حکمتوں کا ثبوت فراہم کر دیا ہے، چنانچہ اس زمانہ کے ایک مشہور مصری عالم <sup>مظاہر</sup>  
جوہری نے جو جدید علوم کے بھی فاضل ہیں، ان اکتشافات کی روشنی میں کلام مجید کے ان آیات <sup>آئمہ</sup>  
کی ایک مستقل تفسیر لکھی ہے، تفسیر کے علاوہ انھوں نے اس موضوع پر کالمہ اور گفتگو کے دلپذیر لہجہ  
میں ایک مستقل کتاب جو اہل علوم کے نام سے لکھی ہے، مولانا عبدالرحیم صاحب نے اس کا  
ترجمہ کیا ہے اس میں قدیم علوم اور جدید اکتشافات کی روشنی میں کلام مجید کے پیش کردہ عجائبات عالم  
اسرار و حکم اور فوائد و مصالح بیان کئے ہیں ترجمہ سلیس ہے، اور نئی تعلیم یافتہ جماعت خصوصاً نوجوان  
طالب علموں کے پڑھنے کے لائق ہے،

گنجنامے گرانمایہ از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی تہذیب جھوٹی، ضخامت ۲۱۵ صفحہ

کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عام پتہ اردو ایک ایجنسی علی گڑھ،

بعض گنجنامے گرانمایہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے  
فصل احباب اور قابل احترام اکابر کی وفات پر لکھے تھے، مولانا محمد علی ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان  
صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی، مولانا ابوبکر محمد شینت جو پوری ناظم دینیات، اصغر گوڈائی تری  
کے فصل دوست ایوب عباسی مرحوم، سراقبال مشہور شاعر مولوی احسن مارہروی مرحوم ان  
ایوب عباسی مرحوم کے علاوہ قریب قریب سب متعارف اشخاص ہیں اس سے پہلے رشید صاحب  
کے مضامین کے دو قابل قدر مجموعے نکل چکے ہیں، لیکن گنجنامے گرانمایہ کی نوعیت ان سے بالکل جدا ہے

پہلے مجموعوں کے مضامین اُن کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور یہ دلی محبت و احترام کا، اسلئے اُن سے دماغی تفریع ہوتی ہے، اور ان سے دل متاثر ہوتا ہے، کھنے والے کا دلی تاثر مضامین کی سطر سطر سے نمایاں ہے جس سے پڑھنے والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، جس سے جس نوعیت کا تعلق ہے، اسی نوعیت کا تحریر میں اثر ہے، مرنے والوں کی خصوصیات اور سیرت کا ایسا جاندار نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ان کا محکم وجود لگتا ہے ان کے سامنے آجاتا ہے، اور اس آئینہ میں خود مصنف کی سیرت، اس کے اخلاقی معیار اور مختلف خیالات و رجحانات کا عکس نظر آتا ہے، یہ مضامین ادبی حیثیت سے بھی بلند پایہ ہیں، اس کے بہت سے فقرے تخیل اور طرزِ ادا کے اعتبار سے ادبی اور اخلاقی معقولوں کا درجہ رکھتے ہیں، اس مجموعے سے مصنف "خدا ان کے قلم کا ایک نیا پرتاثر رخ سامنے آتا ہے،

**نشریات :-** از پروفیسر ہارون خاں شروانی صدر شہ تاج دیسیات جامعہ

عثمانیہ تقیص بڑی ضخامت، ۱۵ صفحے کا غذا کتابت و طباعت بہتر قیمت چم کدرا جا رہا

پتہ سید عبدالقادر ایڈسنس چارمینار و سید عبدالرزاق تاج کتب مصطفیٰ بازار حیدر آباد دکن،

یہ کتاب پروفیسر ہارون خاں شروانی کی اٹھارہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے، تاریخی، فلسفی،

اڈریا نوپل چین کا تمدن، قدیم ہندوستانی تمدن، زلزلہ، ناٹویہ، عید میلادِ بین الاقوامی سیاسیات، روزِ

ڈنمارک، ترکی عربوں کا تمدن، عومیت کا مستقبل، قومیت، عالمی وفاق کا مسئلہ، سیاسیات اور اردو

زبان چین، ہندوستان کے موجودہ مسائل، ان سب تقریروں میں اختصار کے باوجود موضوع

سے متعلق تمام فردری معلومات موجود ہیں، اندازِ بیان دلچسپ ہے، مذہبی تقریریں مقررہ دینی جذبہ

کی آئینہ دہیں، موجودہ حالات کا ظہر سے سیاسیات کی تقریریں خاص طور سے زیادہ مفید اور پڑھنے کے لائق ہیں، ایک

مقام پر غالب سہو، ابن رشد کو بھی علماء کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے، حالانکہ وہ عربی النسل ہے،

**ذکر حسین :-** از حنا بک کزاکر حسین خاں صاحب تقیص چھوٹی ضخامت ۳۲ صفحے کا غذا کتابت

وطاعت بہتر قیمت ۳ روپہ ۱۔ خان ایاس احمد مجیبی جامعہ نگر دہلی،

گزشتہ یادگار حسینی کے موقع پر ایک سچے ڈاکٹر حسین نے یہ تقریر کی تھی اس موقع پر ہندوستان میں سیکڑوں پُر جوش تقریریں ہوئیں، لیکن یہ تقریر ان سب مختلف ہی، اس میں نہ جذبات کا طوفان ہی نہ شاعرانہ طرز بیان نہ لفظ کا طلسم بلکہ سادہ زبان میں چند حقیقتیں بیان کی گئی ہیں اور قوت و جبروت اور ظلم و طغیان کے مقابلہ میں احسانِ حق کیلئے قربانی اور شہادت کی عظمت کی روشنی میں اتم شہادت کو نہایت موثر و نشین اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا اور ناکامی کی حکمت، عظمت اور حکم، حکمت اور حق کی وحدت کو بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے، گو یہ تقریر مختصر ہے، لیکن معنویت کے اعتبار سے بڑی بڑی تقریروں سے زیادہ مفید اور سادگی کے باوجود زبان میں پوری شیرینی موجود ہے،

ہماری زبان :- سرتیج بہادر سپر تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۹ صفحے کا غذکتابت و طباعت بہتر،

قیمت ۸ روپہ انجن ترقی اردو ہند نئی دہلی :-

ڈاکٹر سپر کو اردو زبان سے خواہش و محبت ہو، اس کا اظہار انکی زبان و قلم سے برابر ہوتا رہا ہے، انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں اردو کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں، ان کو انجن ترقی اردو نے ہماری زبان کے نام سے جگہ جمع کر دیا ہے، یہ تقریریں تنہا خیالات کا مجموعہ نہیں بلکہ اردو کی حمایت کے ساتھ اسکے دلائل بھی ہیں،

گرام سدھار :- از جناب عبدالشکور صاحب ایم اے بی ٹی علیگ بریلی کا سچ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۹ صفحے کا غذکتابت و طباعت بہتر، قیمت ۶ روپہ نیچر امڈامیہ گریس ہائی اسکول، بریلی،

ہندوستان کی آبادی کا سب سے اہم عنصر کسان ہیں، لیکن بدقسمتی سے سب سے زیادہ اہتر حالت اسی طبقہ کی ہے، اب حکومت نے برلے نام اسکی اصلاح کی طرف توجہ کی ہے، کانگریسی حکومت کے زمانہ گرام سدھار شروع ہو گیا ہے، مولف نے اس کتاب میں اسی گرام سدھار کا نقشہ پیش کیا ہے، اور کسانوں کی پستی ان کی زبون حالی اس کے وجود و اسباب اور انکی مجبوری کو دکھلا کر اسکی اصلاح و ترقی کی تدبیریں بتائی ہیں، جن لوگوں کو گرام سدھار سے دلچسپی ہو، ان کو اس کتاب میں بہت سی مفید باتیں ملیں گی،

”م“

”جلد ۵۰“ ماہ شعبان ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء ”عدو ۳“

## مضامین

۱۶۴-۱۶۲	سید سلیمان ندوی،	شذرات
۱۸۰-۱۶۵	مولانا عبد السلام ندوی،	امام رازی اور تنقید فلسفہ،
۱۹۳-۱۸۱	مولوی محمد اویس صاحب ندوی، رفیق	ابن جریر طبری،
	دارالمصنفین،	
۲۱۳-۱۹۴	جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے	فارسی کے چند قدیم شعرا،
	علیگ پکھارکنگ اڈورڈ کالج امر اوتی برار	
۲۲۱-۲۱۴	”ن ص“	ادب وادبی ذوق،
۲۲۵-۲۲۲	”م“	اخبار علیہ،
۲۲۶-۲۲۶	از جناب سحی اعظمی،	مواعظ تجدید،
۲۲۶-	جناب روش صدیقی،	شعلہ نو
۲۳۶-۲۲۸	مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کٹیلاگر	حضرت مجدد کما تصور توحید،
	اونیش پبلک لائبریری پٹنہ،	
۲۴۰-۲۳۶	”م“	مطبوعات جدیدہ،



## شہادت

الحمد للہ کہ اس ہنگامہ ہستی میں جس میں مشرقی اضلاع پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اور مفتون تک ریل، ڈاک اور تار کے سلسلہ کے کٹ جانے سے ایک وحشت ناک بیخبری طاری رہی، دارالاصنافین اور دارالمصنفین کے رفقا و بھائی رہے، اب دوبارہ امن و امان قائم اور آمد و رفت اور ڈاک کا سلسلہ جاری ہو چکا ہے، فللہ الحمد۔

پچھلے مہینہ کا سب سے اندوہناک علمی حادثہ مولانا محمد سورتی کی وفات ہی، مرحوم اس عہد کے مستثنیٰ دل و دماغ اور حافظہ کے صاحبِ علم تھے، جہاں تک میری اطلاع ہی، اس وقت اتنا وسیع نظر وسیع الملاحظہ، کثیر الحافظ عالم موجود نہیں، صرف و نحو و لغت و ادب و اخبار و انساب و رجال کے اس زمانہ میں درحقیقت وہ امام تھے، وہ چند ماہ سے مرض استسقا میں مبتلا تھے، علی گڑھ میں ان دنوں قیام تھا، اور وہیں، راکست کو بروز جمعہ وفات پائی،

مرحوم کا اصلی وطن سورت (گجرات) تھا، وطن میں ابتدائی تعلیم پا کر یہ دلی آئے، اور امپورین محمد طیب صاحب کی کالمند حاصل کیا، میری ان کی پہلی ملاقات سنہ ۱۳۹۷ میں ہوئی جب مولانا طیب کی راسخ و چھوڑ کر دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں ادیبِ اول کے عہدہ پر فائز تھے، فاضلِ استاد کے ساتھ یہ لائق شاگرد بھی لکھنؤ وارد ہوا، اور اس زمانہ سے لیکر اخیر تک ان کے ساتھ میری علمی رفاقت ہے



ذاتی دوستی کا سلسلہ قائم رہا، معارف بھی ان کے رشتہاتِ قلم سے کبھی کبھی مستفید ہوتا رہا ہے،  
 مرحوم اس فضل و کمال کے باوجود ہمیشہ پریشان حالی رہے، اور کہیں ایک جگہ جم کر بیٹھنا انکو  
 نصیب نہ ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم سے استفادہ بہت کم کیا جاسکا، اور کوئی کارآمد تصنیف  
 بھی اپنی یادگار نہ چھوڑ سکے، اور نہ کوئی لائق شاگرد ہی ان کا قائم مقام ہو سکا، البتہ چند جہانی اولاد انکی  
 یادگار ہیں،

ایک زمانہ میں جامعہ ملیہ دہلی میں معلم رہے، پھر بنارس کے جامعہ رحمانیہ میں مدرس ہوئے بعد کو  
 بمبئی میں ایک اہل حدیث مدرسہ میں حدیث کا درس دینے لگے تھے، ٹونک کے مشہور کتب خانہ کی کشش بھی  
 ان کو ٹونک یجاتی تھی، انھوں نے شادی بھی ٹونک ہی میں کر لی تھی، قلمی کتابوں کی تلاش اور فراہمی  
 اور نقل ان کا ذریعہ معاش رہ گیا تھا، اور اس تعلق سے وہ ٹونک، پٹنہ، رامپور، کلکتہ اور حیدرآباد کا سفر اکثر  
 کیا کرتے تھے، لیکن آخرت کے سفر کے لئے ان کی تقدیر میں علی گڑھ کی مٹی لکھی تھی، ساٹھ کے قریب عمر پا  
 سر ہڑا، بدن گداز اور ہاتھ پاؤں بھاری تھے،

مرحوم مسلک اہل حدیث تھے، اور اپنے مسلک میں سید غالی تھے، طبیعت بیقرار اور وارستہ تھی، کبھی  
 جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، ساتھ ہی نہایت سادہ مزاج، بے تکلف، احباب پرور، فیاض اور مستغنی تھے، کھانے  
 اور کھلانے کے سید شائق تھے، ہمیشہ مقروض اور خانہ بدوش رہتے تھے،

مرحوم کا پایہ علم ادب اور رجال و انساب و اخبار میں اتنا اونچا تھا کہ اس عہد میں اسکی نظیر مشکل تھی  
 جو کتاب دیکھتے تھے، وہ ان کے حافظہ کی قید میں آجاتی تھی، سیکڑوں نادر عربی تصانیف، ہزاروں عربی اشعار و  
 لغات اور انساب نوک زبان تھے، ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علماء ادباء اور  
 محدثین کی دستِ حافظہ کی جو عجیب و غریب مثالیں تاریخوں میں مذکور ہیں وہ یقیناً صحیح ہیں، دعا ہو کہ اللہ تعالیٰ  
 مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے،

نواب محمد یار جنگ بہادر (حیدر آباد دکن) کی وفات کا سانحہ بھی اسی آئنا میں پیش آیا، مرحوم نسلِ عرب تھے، اور ایک درج و مرجان بزرگ، نہایت فاضل، بے ریا، باخدا اور نیک طبع تھے، صوبہ داری کے منصب سے وظیفہ یاب ہو کر بلدہ میں مقیم تھے، حیدر آباد کی ہر علی تعلیمی تحریک میں وہ شریک رہتے تھے، دائرۃ المعارف اور مدرسہ نظامیہ کی اعزازی خدمت بھی ان کے سپرد تھی، دارالانفین سے مرحوم کو سیر و پسی تھی اور ہمیشہ وہ اسکی مدد فرماتے رہتے تھے، اہل علم کے لئے ان کا گھر ایک ہمان خانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے،

دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کی چند تازہ مطبوعات شائع ہوئی ہیں، ان میں سے ایک تاریخِ کبیر امام بخاری کی جو تھی جلد اور تاریخ منظم علامہ ابن جوزی کی دسویں جلد، رسائل محقق طوسی کا دوسرا حصہ اور ابو بکر محمد بن حسن الحاسب کا ایک اہم رسالہ انباط المیاء الخفیہ ہے، اس اخیر رسالہ میں طبیعیات کی بعض اہم عرب تحقیقات درج ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ زمین کے اندر سے پانی نکالنے، چشموں کا پتہ لگانے اور نہروں کے بنانے کے کیا طریق ہیں،

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اڈیشن بجا اللہ کہ تم ہو رہا ہے، اب اس کے دوسرے اڈیشن کی فکر ہو، اس دوسرے اڈیشن میں بعض تصحیحات کا بھی خیال ہو، اگر کوئی صاحبِ نظر اس باب میں کچھ مشورے دینا چاہتے ہوں تو وہ مہینہ دو مہینہ کے اندر مطلع فرمائیں کہ ان کے مشوروں سے مستفید ہوا جاسکے، اس کا ہندی ترجمہ بھی پریس میں جا رہا ہے،

ہمارے فاضل دوست جناب مولانا عبدالمجید صاحب دریا بادی کا انگریزی ترجمہ قرآن لاہور کی تاج کتبہ کی طرف سے چھپنا شروع ہو گیا ہے، مترجم نے اس ترجمہ میں خالص اہلسنت کی تفسیروں کی پیروی کی ہے، اور خوشی میں جو بکثرت ہیں شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، اور یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے تائیدات بعض آیات کی جفرانی و تاریخی تحقیقات درج کی ہیں، امید ہے کہ نوجوان انگریزی خواں طبقہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریگا،

# مقالہ

## امام رازی اور تنقید فلسفہ

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(ماخوذ از سوانح امام رازی)

جس طرح مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بوعلی سینا اور فارابی نے فلسفہ ارسطو کے شائع ہونے کی حیثیت سے شہرت عام حاصل کی ہو، اُسی طرح امام رازی نے فلسفہ ارسطو پر اعتراضات کرنے میں ناموری حاصل کی ہے، چنانچہ شہر زوری نے امام صاحب کے حالات میں لکھا ہے کہ ”وہ بحث و جدال اور قیل و قال میں انتہائی درجہ کو پہنچے ہوئے تھے، اور اُن کے زمانہ میں کوئی شخص بحث میں ان کا ہسر نہ تھا، انھوں نے حکما پر بہت سے مشکوک و شبہات وارد کئے، اور اُن کے بعض شبہ صحیح بھی ہیں!“ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفہ ارسطو پر رد و قدح کرنے کا آغاز جو اسلام میں نہایت ابتدائی زمانہ سے ہو چکا تھا، اُس کی انتہا امام صاحب پر ہوئی، چنانچہ سب سے پہلے کجی بخوی نے جو امیر معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں تھا، ارسطو کے رد میں ایک کتاب لکھی، اس کے بعد نظام معرزی نے جو مامون الرشید کے زمانہ میں تھا، ارسطو کی کتاب کا رد لکھا، پھر اُسی زمانہ کے قریب ابوعلی جبائی نے جو مشہور معرزی تھا، ارسطو کی کتاب کو ن و فساد کا رد لکھا، تیسری صدی میں جن بن موسیٰ یحییٰ نے کتاب الاراد والدیانات لکھی، جس میں ارسطو کی منطق کے مہات مسائل پر اعتراضات کئے جو

مستکملین اسلام سے ماخوذ تھے، نوختی کے بعد ابوبکر باقلانی نے دقانی کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں فلسفہ کار و دکھا، پھر علامہ شہرستانی المتوفی ۴۹۹ھ نے بفلس اور ارسطو کے رد میں ایک مستقل کتاب لکھی، ابوالبرکات بغدادی نے اس میں سب سے زیادہ ناموری حاصل کی اور اپنی کتاب معتبر میں ارسطو کے اکثر مسائل و خیالات کو غلط ثابت کیا، یہ وہ لوگ تھے جن کا مقصد صرف رد و قدح تھا، اور وہ کسی مستقل فلسفہ کے بانی اور پیرو نہ تھے لیکن شیخ شہاب الدین مقول المتوفی ۵۵۶ھ نے فلسفہ میں اپنا ایک مستقل طریقہ قائم کیا، جس کا نام انھوں نے فلسفہ اشراق رکھا، جو مشائیں یعنی ارسطو کے فلسفہ کا بالکل مخالف تھا، اس لئے انھوں نے اپنی کتاب حکمۃ الاشراق مشایخ و مطارحات میں فلسفہ ارسطو کے مسائل کی تردید کی، ان سب کے بعد امام رازی کی باری آئی اور انھوں نے اپنے اعتراضات کی کثرت سے فلسفہ ارسطو کی رہی سہی وقت بھی خاک میں ملا دی اور متاخرین کے لئے فلسفہ ارسطو پر رد و قدح کی ایک عام شاہراہ قائم کر دی، چنانچہ علامہ شہر زوری جو امام صاحب کے خلیفین میں ہیں ان کے حالات میں لکھتے ہیں :-

اور د علی الحکماء شلو کاوشیہا      انھوں نے حکما پر بہت سے شکوک و شبہات  
کنیرۃ .... و اکثر من جا وجد      وار کئے اور ان کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے  
ضل بسبہا .... و بعضہم      وہ ان شبہات کی وجہ سے گمراہ ہوئے اور  
زاد علیہا ایضاً<sup>۱</sup>      بعض لوگوں نے اس پر اضافہ بھی کیا،

یہ پتہ نہیں چلتا کہ امام صاحب نے حکما پر جو اعتراضات کئے ان کا ماخذ کیا تھا، اور اس معاملہ میں کون کون سی کتابیں ان کے لئے دلیل راہ نہیں، شہر زوری نے لکھا ہے کہ امام صاحب نے حکما پر جو اعتراضات کئے ہیں، وہ زیادہ تر ابوالبرکات یہودی سے ماخوذ ہیں، اور وہ اسی کی ایجادات سے ہیں، اور اس کی تصدیق

لے مولانا علی قاسم رحمہ نے "فلسفہ یونان اور اسلام" کے نام سے ایک مستقل تاریخی مضمون لکھا ہے، اور ہم نے اس موقع پر اسی کی بغیر کر دی ہے، شہر زوری ص ۳۱۱ ایضاً ص ۳۱۱،

اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام صاحب نے اپنی فلسفیانہ تصنیفات میں بابا جاس کی کتاب معتبر کا نام دیا ہے، جس ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کے پیش نظر رہتی تھی، اس کے علاوہ امام صاحب نے اگر کسی کتاب کا نام نہیں دیا ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے زمانہ سے پیشتر یہ کتابیں یا تو معدوم ہو گئی تھیں یا یہ کہ ان سے امام صاحب نے فائدہ ہی نہیں اٹھایا، یہ بھی واضح طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ فلسفہ کی تردید سے امام صاحب کا مقصد کیا تھا؟ مولانا شبلی مرحوم نے علم الکلام میں لکھا ہے کہ

”فلسفہ کے رد سے علم کلام کو صرف اس قدر تعلق تھا کہ اس کے جو مسائل مذہب اسلام کے مخالف ہوں وہ باطل کر دئے جائیں، لیکن متکلمین نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عام طور پر فلسفہ یونانی کی غلطیاں ثابت کیں جس کی وجہ یہ تھی کہ فلسفہ یونان کا جب ترجمہ ہوا تو لوگ نہایت شیفگی سے اس کے گرویدہ ہو گئے، اس گرویدگی نے یہ اثر پیدا کیا کہ فلسفہ کے ہر قسم کے مسائل پر خوش اعتقاد ہی کی نظر پڑتی تھی، اور اس ضعیف مسائل بھی قوی معلوم ہوتے تھے، انہی میں اقل قلیل وہ مسائل بھی تھے جو بظاہر اسلام کے خلاف معلوم ہوتے تھے، متکلمین جب خاص ان مسائل کو باطل کرتے تھے تو معتقدین فلسفہ کو خیال ہوتا تھا کہ جس علم کے اور تمام مسائل صحیح ہیں اس کے وہی مسائل کیوں ضعیف ہوں گے جو اسلام کے مخالف ہیں؟ اس ضرورت سے متکلمین نے عام طور پر فلسفہ پر نظر ڈالی اور سیکڑوں مسائل کی غلطی ثابت کی،

قد ماتے متکلمین نے قدر ضرورت پر اکتفا کیا تھا، لیکن متاخرین اور خصوصاً امام رازی نے سرے سے فلسفہ کی دھجیاں ارٹا دیں، لیکن مولانا نے مرحوم نے اس کی کوئی تائیدی شہادت پیش نہیں کی ہے اس میں شبہ نہیں کہ فلسفہ کی عام وقعت اور ارسطو و فلاطون کے پر عظمت ناموں سے بہت سے لوگ مرعوب ہو گئے تھے، اور ان کے دلوں سے مذہب کا اثر زائل ہو گیا تھا، اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کے مسائل اور مکالمے کے خیالات پر تنقید کر کے ان کی وقعت اور ان کے اثر کو کم کیا جائے، متکلمین

میں امام غزالی نے اسی ضرورت سے تہافتہ الفلاسفہ لکھی تھی، چنانچہ اوس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے ایک گروہ کو جو اپنے آپ کو ذمہ دانت و فطانت میں اپنے ہمسرؤں سے ممتاز سمجھتا ہے، دیکھا کہ وہ مذہبی قیود و احکام سے بالکل آزاد ہو گیا ہے، اور شعائر مذہبی اور عبادات وغیرہ کو چشم حقارت سے دیکھتا ہے، اور ان کے کفر کی وجہ صرف یہ ہے کہ جب انھوں نے سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے شاندار نام سنے اور ان کے متبعین نے ہندسہ منطق، طبیعیات اور اہلیات میں ان کی وقت نظری کی تعریف کی اور ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا کہ باوجود اس علم و فضل کے یہ لوگ مذہب کے منکر تھے اور اس کو ایک مصنوعی اور نمائشی چیز سمجھتے تھے تو وہ بھی مذہب کے منکر ہو گئے کہ وہ بھی حکماء کے زمرہ میں شامل ہو جائیں اور عوام جمہور کی تائید و مساعدت کی ذلت نہ گوارا کریں، اس بنا پر میں نے قدما و فلاسفہ کی تردید میں یہ کتاب لکھی اور اہلیات کے متعلق ان کے عقائد کی مکروریاں دکھائیں، اس کا صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ پہلے تمام فلاسفہ یونان کے مسائل و خیالات کی کمی جمع کئے جاتے، پھر یہ دیکھا جاتا کہ جن لوگوں نے یونانی زبان سے، ان کے فلسفہ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے، انھوں نے اس میں کیا کیا تحریف و تبدیلی کی ہے، امام غزالی ان دونوں باتوں سے واقف تھے لیکن انھوں نے تمام فلاسفہ یونان میں سے صرف ارسطو کو منتخب کیا، اور اس کے فلسفہ کی جو شرح و تفسیر فارابی اور بوعلی سینا نے کی تھی صرف اُسی کو پیش نظر رکھا، اور اسکی وجہ یہ بیان کی کہ او فلاسفہ کے مسائل و خیالات نہایت منتشر اور پراگندہ تھے، اور ارسطو ہی صرف ایک ایسا شخص تھا، جس نے فلاسفہ یونان کے فلسفہ کی منتزع و تہذیب کی، اور اس کو حشو و زوائد سے پاک کیا، اسلئے میں نے صرف اسی کی تردید پر قناعت کی، اور اسلامی فلسفیوں میں فارابی اور بوعلی سینا سے بہتر کسی اور نے ارسطو کے مذہب کو نقل نہیں کیا تھا، اسلئے دونوں جس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں، میں نے اسی کی تردید پر اکتفا کیا، لیکن امام غزالی نے عام طور پر ارسطو کے فلسفہ

مسائل کی بھی تردید نہیں کی، بلکہ اس کے صرف چند مسائل منتخب کر لئے، اور اس کی وجہ یہ لکھی کہ مذہبی حیثیت سے جن فلسفیانہ مسائل سے اختلاف کیا جاسکتا ہے ان کی چند قسمیں ہیں،

(۱) ایک اختلاف تو محض لفظی نزاع کی حیثیت رکھتا ہے، مثلاً فلاسفہ خدا کو جو ہر کہتے ہیں، لیکن جوہر سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ وہ کسی چیز میں ہے، بلکہ یہ مراد ہے کہ کسی محل میں موجود نہیں بلکہ بذاتِ خود قائم ہے، لیکن ہکو اسکی تردید کی ضرورت نہیں، کیونکہ خدا کا قائم بالذات ہونا تو بہر حال متفق علیہ ہے، اس لئے اگر اسکی تعبیر جوہر کے لفظ سے کی جائے تو یہ صرف ایک لغوی اختلاف ہو جاتا ہے،

(۲) دوسرے قسم کے وہ مسائل ہیں جن کے مان لینے سے مذہبی اصول کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا، جیسے چاند اور سورج کے گہن کا مسئلہ، لیکن اس قسم کے مسائل کی تردید کی بھی ضرورت نہیں بلکہ جو شخص ان مسائل کی تردید کو مذہبی حیثیت دیتا ہے وہ خود مذہب پر دست درازی کرتا ہے، کیونکہ ان مسائل پر ہندسی دلائل قائم ہیں جو بالکل یقینی ہیں، اس لئے اگر یہ ثابت کیا جائے کہ یہ مسئلہ شریعت کے خلاف ہیں تو جو شخص ان دلائل کی قطعیت سے واقف ہے اس کو ان دلائل میں تو شک پیدا نہ ہوگا، بلکہ اس کے برعکس خود مذہب ہی میں شک پیدا ہو جائے گا،

(۳) تیسرے قسم کے مسائل وہ ہیں جو اصولِ دین سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً حدوثِ عالم، صفاتِ باری اور حشرِ جساد کے مسائل، جن کا فلاسفہ یونان نے انکار کیا ہے، اور یہی مسائل قابلِ تردید ہیں،

اس بنا پر امام غزالی نے اکتلمات کے چند مسائل لئے اور مذہبی حیثیت سے ان کی تردید کی، لیکن امام رازی کی حیثیت اس معاملہ میں امام غزالی بلکہ فلسفہ و منطق کے دوسرے

معتزین سے بالکل مختلف تھی، ان سے پہلے صرف دو گروہ تھے، ایک گروہ تو حکماء قدیم کے جادو سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اور ہر چیز میں ان کی موافقت کرتا تھا، دوسرا گروہ ہر مسئلہ میں ان پر جا بجا اعتراضات کرتا تھا، اور ان اعتراضات کی بنیاد پر اپنے آپ کو ان کے زمرے میں شامل کرتا تھا، اس بنا پر اس بات کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کی موافقت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے ان سب کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور ان پر مجتہدانہ نظر ڈالی جائے، اس کے بعد جو مسائل صحیح ہوں ان کی تائید کی جائے، اور جو قابل اعتراض ہوں ان کی تردید کی جائے، اس بنا پر امام غزالی کو امام غزالی سے بہت زیادہ وسعت نظر سے کام لینا پڑا، امام غزالی کی کتاب تہافت الفلاسفہ صرف یحییٰ نحوی کی کتابوں سے جیسا کہ شہر زوری نے تاریخ الحکماء میں لکھا ہے اخذ تھی، اور یحییٰ نحوی نے مذہبی حیثیت سے صرف عیسائیوں کے خوش کرنے کے لئے ارسطو وغیرہ کے فلسفہ کی تردید کی تھی اور غالباً اسی قسم کے مسائل انتخاب کئے ہونگے، جو مذہب سے تعلق رکھتے ہوں گے یا یہ کہ فلسفہ کی وقعت کے کم کرنے کے لئے فلسفہ کے تمام مسائل پر جاوید ہر قسم کے اعتراضات کئے ہوں گے، بہر حال امام رازی سے پہلے صرف دو ہی قسم کے لوگ موجود تھے، ایک تو وہ جو تمام مسائل میں حکماء قدیم کی اندھا دھند تقلید کرتے تھے دوسرے وہ جو ان کے تمام مسائل پر اندھا دھند اعتراضات کرتے تھے، اس بنا پر امام صاحب نے ان دونوں کے درمیان ایک معتدل روش اختیار کی اور فلسفہ کے جو مسائل قابل تائید تھے ان کی تائید کی اور جو مسائل قابل تردید تھے ان کی تردید کی چنانچہ مباحث مشرقیہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

حکماء قدیم کی کتابوں کو پڑھ کر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر بات کا جو مغز ہو اسکو حاصل کر لیں

اس کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں جس میں نہ بہت زیادہ طوالت ہو نہ بہت زیادہ اختصار کہ اس سے پیچیدگی پیدا ہو جائے، اور اس کی ترتیب یہ ہو کہ پہلے تمام مطالب کو ایک



دوسرے سے جدا کر دیں، پھر اس کے بعد یا تو ان کو مضبوط کریں یا ان کی تردید کریں، پھر شک کو دلائل و اعتراضات کی باری آئے، اس کے بعد اگر ہم کو قدرت حاصل ہو تو ان شک کو دلائل و اعتراضات کو حل کریں، لیکن ان باتوں کے درمیان بعض اوقات ایسی باتیں پیش آجائیں گی جو مشہور کے مخالف ہوں گی اور ان سے جہود رکے کلام کی تردید ہوگی جو لوگ تمام مسائل میں حکماء قدیم کی موافقت پر اعتقاد رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ حکماء قدیم بھی بعض موقعوں پر اپنے قدام کی مخالفت کرتے تھے، ان کے کلام پر ان کو اعتراضات تھے، اور اس کا اظہار صراحتاً نہ کہ تعویضاً کرتے تھے، اس لئے اگر رد و قدح کی یہ روش پسند نہیں تو حکماء قدیم پر بھی یہی الزام عائد ہوتا ہے، اور اگر یہ روش عمدہ ہے اور اس مقلد کے خیال میں ہلکو حکماء قدیم کے نفقہ قدم پر چلنا چاہئے، تو یہ دشوار گزار راستہ جس سے گزرنے کے لئے بعض مقبول اور مشہور چیزوں کا چھوڑنا ضروری ہو، سیدھا راستہ ہے اس لئے وہ حکماء قدیم کی پیروی کا جو فتویٰ دے رہے ہیں، اسی سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان کی تقلید کو چھوڑ دیں، اب جس طرح تم کو اس گردہ کی باتوں کا تاقص معلوم ہو گیا، اسی طرح ان لوگوں کے طریقہ کی خرابی بھی معلوم ہونی چاہئے، جنہوں نے بڑے بڑے علماء و حکماء پر جاوید سچا رد و قدح کرنے کو اپنا مطمح نظر بنالیا اور ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے اس طریقہ سے اپنے آپ کو ان علماء و علماء کا حریف بنالیا ہے، اس لئے وہ بھی ان کے زمرے میں شامل ہو گئے ہیں، لیکن اس سے صرف ان کی بلادیت، غباوت اور جہالت کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے جب ہم کو معلوم ہو کہ یہ دونوں گروہ سیدھے راستہ سے ہٹ گئے ہیں، اور افراط و تفریط دونوں بری چیزیں ہیں، تو ہم نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی روش اختیار کی اور دونوں اقوال میں سے بہترین قول کو اختیار کیا اور یہ معتدل روش یہ ہے کہ حکماء کے جو مباحث و مسائل ہم تک پہنچے ہیں ان کے ثابت کرنے میں ہم سچے انتہائی کوشش صرف کریں گے، اور اگر ہم ان کی تخفیف امدان کے وجہ اثبات کے

انہار سے قاصر رہے، تو اعتراضات کے وجہ کی طرف اشارہ کریں گے پھر ان کے مجمل کی تاویل اور ان کے مفصل کی تخیص کی جو ان کی متفرق کتابوں میں مذکور ہیں کوشش کریں گے پھر اسکے بعد ان کے ساتھ ایسے اصول مثال کر جنکی تحریر تحصیل تقریر اور تفصیل کی توفیق خدا نے صرف یہیں کو دی ہے، قدام کو انکی باطل خبر تھی، اسلئے ہماری یہ کتاب ان تمام مباحث پر مشتمل ہوگی، جو اس کے علاوہ اسی قسم کی اور کتابوں میں مذکور ہیں لیکن اسی کے ساتھ اس میں اور بہت سے کلی اصول حقیقی قواعد علمی نکتوں اور سوالات و جوابات کا اضافہ بھی ہوگا اور ہمارے اس بیان کا اعتراف صرف وہی شخص کر سکے گا، جو عقلا کے اکثر مباحث اور علماء کی کتابوں کے مضمون سے پوری طور پر واقف ہوگا، اور اس طرح سے قدیم و جدید میں امتیاز کر سکے گا،

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۱، امام صاحب سے پہلے فلسفہ و حکمت کے متعلق قدام نے جو کچھ لکھا تھا، امام صاحب نے اس میں سے منتخب باتیں لے لیں، لیکن قدام کی تصنیفات اور ان کی معلومات سے واقف ہونے کے لئے نہایت وسعت نظر کی ضرورت تھی اور ہمارے نزدیک امام صاحب سے پہلے اور امام صاحب کے بعد اس معاملہ میں ان کا کوئی دوسرا ہمسر نہیں پیدا ہوا، شہر زوری نے تاریخ الحکما میں لکھا ہے کہ عمر بھران کا صرف یہی کام رہا کہ وہ لوگوں کے اقوال کو جمع کرتے تھے، پھر کبھی اودن کی تہذیب کرتے تھے، کبھی توضیح کبھی ان کا اختصار کرتے تھے، کبھی بطل تفصیل کبھی عبارت کے ذریعہ سے ان میں تصرف کرتے تھے، اور کبھی ایک ورق سے دوسرے ورق میں ایک مسودہ سے دوسرے مسودہ میں ان میں تغیر کرتے رہتے تھے، اس طرز تحریر نے اگرچہ ان کی تصنیفات میں یہ عیب پیدا کر دیا ہے کہ وہ ہر قسم کے رطب دیا بس اور مکررات کا مجموعہ ہو گئی ہیں اور وہ اپنی تمام تصنیفات میں تھوڑے سے تغیر اور حذف و اضافہ کے بعد صرف ایک ہی بات کو بار بار لکھتے ہیں اور ان ہی کو دہرائے ہیں، تاہم ان کی تصنیفات کو پڑھ کر ہر شخص کو ان کی وسعت معلومات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے،

(۲) امام صاحب سے پہلے فلسفہ و حکمت کی بعض کتابوں میں حد سے زیادہ طوالت اور بعض میں حد سے زیادہ اختصار پایا جاتا تھا جس سے معانی و مطالب میں نہایت پیچیدگی پیدا ہو جاتی تھی امام صاحب نے ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر ایک درمیانی راستہ اختیار کیا جس سے معانی و مطالب کی وضاحت مقصود تھی، اور ان کے اس طرزِ تحریر نے فلسفہ کو نہایت آسان اور سہل بنا دیا،

(۳) امام صاحب سے پہلے فلسفہ کے مسائل باہم گڈ بٹتے، امام صاحب نے ہر مسئلہ کو ایک دوسرے سے الگ کر کے ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیا،

(۴) ان تمام مراتب کے بعد یا تو ان مسائل کی تائید یا ان کی تردید کی، اگرچہ یہ ایک غیر عادی اور مضائقہ طریقہ تھا، تاہم اس طرزِ تحریر نے ان کو فقہاء، محدثین اور فلاسفہ دونوں کی نگاہ میں منبسط بنا دیا، فقہاء و محدثین کو تو ان پر یہ اعتراض ہے کہ وہ مخالفین کے شبہات کو نہایت قوت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور ان کے جوابات میں کو تاہی کرتے ہیں، انھوں نے نہایت العقول میں خود تصریح کی ہے کہ وہ فریقِ مخالف کے مذہب کو اس قوت کے ساتھ ثابت کریں گے کہ اگر خود ان کا فریق ان کو ثابت کرنا چاہتا تو اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا، اور فلاسفہ کو یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے بغیر سوچے سمجھے حکمائے قدیم پر اعتراضات کئے ہیں،

(۵) اس تائید و تردید کے سلسلہ میں امام صاحب کو بعض ایسی باتیں بھی کہنی پڑیں جو مشہور

اور مذہبِ جمہور کے مخالف تھیں،

(۶) ان باتوں کے ساتھ امام صاحب نے منطق و فلسفہ میں اور بھی بہت سی تصرفات و تغیرات کئے جن کی وجہ سے اون کی حالت بالکل بدل گئی، مثلاً حکمائے قدیم کے یہاں منطق علومِ آلیہ کی حیثیت رکھتا تھا، یعنی وہ خود مقصود بالذات علم نہ تھا، بلکہ وہ علومِ حکمیہ کا

ایک ذریعہ تھا، لیکن متاخرین حکماء اسلام نے اس میں جو تغیرات کئے ان کی وجہ سے وہ ایک مستقل علم بن گیا، اور سب سے پہلے امام صاحب نے اس کو ایک مستقل علم بنایا، چنانچہ علامہ ابن خلدون مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں،

ثم تكلّموا فيما وضعوا من ذلك  
كلّاماً مستقراً ونظروا فيه من  
حيث انهم فن براسم كل من حيث انه  
آلة للعلوم فطال الكلام فيه واتسع  
واول من فعل ذلك الامام فخر الدين  
ابن الخطيب ومن بعده افضل  
الدين الخوجني

پھر متاخرین نے منطق کی جو شکل قائم کی اس  
میں بڑے وسیع پیمانے پر کلام کیا اور اس کو  
اس حیثیت سے دیکھا کہ وہ ایک مستقل فن  
ہے، صرف علوم کا ذریعہ نہیں ہے، اس کے  
بڑی لمبی چوڑی بحث پیدا ہو گئی، اور سب سے  
پہلے ایسا امام رازی نے کیا، اور ان کے  
بعد افضل الدین الخوجنی نے،

اس بنا پر منطق کی جو موجودہ شکل ہے، اس کے بانی اول امام صاحب ہی ہیں، فلسفہ کی جو موجودہ  
شکل ہے، اس کو بھی سب سے پہلے امام صاحب ہی نے قائم کیا یونانیوں کے یہاں طبیعیات اور الہیات  
دونوں الگ الگ تھیں، اور الہیات کی ترتیب طبیعیات کے بعد تھی، اس کے بعد متاخرین حکماء اسلام  
نے فلسفہ و حکمت میں کتابیں لکھیں، اور امام غزالی نے فلسفہ کی تردید کی تو متاخرین نے علم کلام اور  
فلسفہ کے مسائل کو باہم مخلوط کر دیا جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان مسائل سے ان کو اپنے مباحث  
میں سابقہ پر تھتا تھا، دوسرے یہ کہ علم کلام کا موضوع اور اس کے مسائل فلسفہ الہیات کے موضوع  
و مسائل سے مشابہ تھے، اس لئے یہ دونوں گویا ایک علم ہو گئے تھے، اس کے بعد طبیعیات اور  
الہیات میں حکماء کا بڑا ترتیب تھی اس کو بدل کر دونوں کو ایک علم کر دیا، اور اس میں سب سے پہلے علامہ

سے پھر جسمانیات اور ان کے توابع سے پھر روحانیات اور ان کے توابع سے بحث کی، امام رازی نے مباحث مشرقیہ میں یہی روش اختیار کی اور ان کے بعد تمام علمائے کلام نے اسکی تقلید کی، اور علم کلام اور فلسفہ و حکمت کے تمام مسائل مخلوط ہو کر ایک بھون مرکب تیار ہو گیا،

بہر حال فلسفہ و منطق کی جو موجودہ شکل ہے وہ امام صاحب کی قائم کی ہوئی ہی، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ امام صاحب کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ کی شکل کو ہر ممکن طریقہ سے بگاڑا ہی، بلکہ ان کا اس سے بڑا کارنامہ یہ ہی کہ انھوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہی، فلسفہ کی تائید کی ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ حکمائے قدیم کے بالکل مقلد بھی نہ تھے، اس لئے تائید کے ساتھ فلسفہ کی تردید بھی کی ہی، چنانچہ جو شخص ان کی کتاب مباحث مشرقیہ کو پڑھے گا اس کو صاف نظر آجائیگا کہ انھوں نے سب سے پہلے فلسفہ کی دیوار کو جہاں تک ممکن ہو سکا ہے مضبوط بنیاد پر قائم کیا ہے، اس کے بعد اس کے انہدام کی کوشش کی ہے، مثلاً مباحث مشرقیہ میں میوئی کے اثبات پر پہلے دو دلیلیں قائم کی ہیں، اور ان پر اعتراضات کئے ہیں، پھر تیسری دلیل خود قائم کی ہی، اور لکھا ہے کہ تیسری دلیل ان کی تائید میں ہم نے خود بہ تکلف ایجاد کی ہی، اس دلیل کے بعد لکھا ہے کہ میں نے انکو بہت سے ذہین اشخاص کے سامنے پیش کیا، لیکن انھوں نے اس کے کسی مقدمہ پر اعتراض نہیں کیا، لیکن اس کے بعد خود مجھ کو اس کے بعض مقدمات میں شک پیدا ہوا، اس شک کے بعد لکھتے ہیں کہ اب تک ہم میوئی کے وجود پر کوئی دلیل نہیں قائم کر سکے ہیں، اس لئے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے ان سب سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اب تک ہم کو اس بات پر کوئی دلیل نہیں مل سکی ہی کہ جسم میوئی اور صورت سے مرکب ہے، اس لئے ہم اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، لیکن یہ بات کہ اس کی نفی کی بھی کوئی دلیل ہے، اس کی بحث اس کے بعد کی فصلوں میں آئے گی، غرض امام صاحب کا طرز یہ ہے کہ وہ ہر

مسئلہ پر مخالفت و موافق دونوں قسم کے دلائل کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان دلائل پر تنقید کرتے جاتے ہیں، فلسفہ کے تمام مسائل پر وہ اسی طرح بحث کرتے ہیں، اور اس میں اس بات کی تفریق نہیں کرتے کہ کون سے مسائل مذہب کے مخالفت ہیں، اور کون سے مسائل مذہب کے موافق ہیں، امام صاحب سے پہلے مسلمانوں میں جو حکماء و فلاسفہ گزرے ہیں یعنی یعقوب کنویں، فارابی، شیخ بوعلی سینا، وہ اگرچہ خود ارسطو و افلاطون کے ہمپا یہ تھے، لیکن ان میں سے کسی نے فلسفہ کے مسائل پر چون و چرا نہیں کی تھی، مستحکمین نے بے شبہ مذہبی خیال کی وجہ سے فلسفہ کے مسائل سے اختلاف کیا تھا، لیکن ان لوگوں کو صرف ان مسائل سے اختلاف تھا جو اسلام کے مخالف تھے، یہ طرز بالکل نہ تھا کہ عام طور پر یونانی فلسفہ کے مسائل لئے جائیں اور ساتھ ساتھ ان پر تنقید بھی ہوتی جائے، امام صاحب سے پہلے امام غزالی نے فلسفہ کے چند مسائل پر تنقید کی، پھر شیخ ابن عربی اور ابوبکر کاتب بند اوی نے فلسفہ ارسطو کے مسائل پر اعتراضات کئے، لیکن ان بزرگوں کی کوشش محدود تھیں، امام رازی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس طرز میں وسعت پیدا کی اور فلسفہ کے ہر قسم کے مسائل پر خواہ وہ مذہب کے موافق ہوں یا مخالفت عام طور پر اعتراض کیا، اور اس کے بعد ایک عام شاہراہ قائم ہو گئی اور متاخرین نے اسی طرز پر فلسفیانہ کتابیں لکھیں،

امام صاحب کے نزدیک فلسفہ کا جو ذخیرہ تھا وہ مختلف خیالات کا مجموعہ تھا، اس مجموعہ میں کچھ دلائل تو وہ تھے جن کو خود یونانیوں نے ایجاد کیا تھا، اور مستحکمین کو صرف انہی مسائل سے بحث تھی، لیکن حکماء اسلام نے اسلامی عقائد کو پیش نظر رکھ کر اس میں اور بھی بہت سے مسائل کا اضافہ کر دیا تھا، مثلاً نبوت، ہجرہ، اکرامت، وحی، الہام اور رویا وغیرہ کے متعلق فلسفہ کی کتابوں میں جو بحثیں ہیں، وہ حکماء اسلام کی ایجاد ہیں، فلاسفہ یونان نے ان مسائل پر کچھ نہیں لکھا ہے، حکماء اسلام میں اس قسم کے مسائل پر سب سے جامع اور اچھوتی بحث

شیخ بوعلی سینا نے کی تھی، چنانچہ شیخ نے منطق تاسع میں مقاماتِ عارفین پر جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق خود امام صاحب لکھتے ہیں کہ ”اس کتاب کا یہ باب سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ شیخ نے صوفیہ کے علوم کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ اس سے پہلے اور اسکے بعد کسی نے ان کو اس انداز سے مرتب نہیں کیا، لیکن باوجود اس اعتراف کے امام صاحب ان میں بہت مسائل کو فلسفیانہ اصول کے مطابق صحیح نہیں سمجھتے، مثلاً شیخ نے اشارات میں نبی کی ضرورت پر جو دلیل قائم کی ہے، اس کا خلاصہ امام صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ ”جب تک چند اشخاص ایک جگہ قیام کر کے زندگی نہ بسر کریں انکی معیشت مکمل نہیں ہو سکتی، لیکن ان اشخاص کا اجتماع شریعت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، اور شریعت کا وجود شارع کے بغیر نہیں ہو سکتا، پھر اس شارع کے پاس ایسے معجزات ہونے چاہئیں جن سے یہ ثابت ہو کہ وہ شریعت کو خدا کے پاس سے لایا ہے، اور اس شریعت کو مختلف قسم کی عبادات پر مشتمل ہونا چاہئے، غرض نبی کی ضرورت پانچ مقدمات سے ثابت ہوتی ہے،

(۱) ایک تو یہ کہ انسان اپنی معیشت کی اصلاح اجتماع کے بغیر نہیں کر سکتا کیونکہ انسان کی غذا لباس اور مکان سب مصنوعی چیزیں ہیں، قدرتی نہیں ہیں، لیکن ایک شخص ان تمام چیزوں کو نہیں بنا سکتا بلکہ ایک بہت بڑی جماعت کی ضرورت ہے، جن میں بعض لوگ کاشتکاری کریں اور بعض لوگ کاشتکاری کے آلات بنائیں، اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ انسان مدنی بالطبع ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ یہ اجتماع شریعت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہر شخص تمام فوائد کو خود حاصل کرنا چاہے گا، اس لئے اگر ایک ہی شخص کو تمام جسمانی فوائد حاصل ہو جائیں تو دوسرا شخص ان سے محروم رہے گا، اور اس سے اس کے دل میں عداوت پیدا ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ اجتماع انسانی جگہڑوں کے پیدا ہونے کا سبب ہے، ایسی حالت میں اگر کوئی شریعت نہ ہوگی تو نہایت فتنہ و فساد پیدا ہو جائے گا،

(۳) تیسرا یہ کہ ایک شارع کا وجود ضروری ہے، کیونکہ اگر ایک ایسے شخص کا وجود نہ ہو جو شریعت کو بیان کرے تو اس شریعت ہی کا وجود نہ ہوگا،

(۴) چوتھے یہ کہ اس شارع میں ایسی مخصوص باتیں ہونی ضرور ہیں جن سے یہ ثابت ہو کہ وہ اس شریعت کو خدا کے پاس سے لایا ہے، ورنہ اس کے قول کو دوسرے کے قول پر کوئی ترجیح نہ ہوگی، اور چونکہ اس بات کا علم کہ یہ معجزے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خدا اس کی تصدیق کرتا ہے اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک یہ علم نہ ہو کہ ایک خدا موجود ہے جو عذاب و ثواب دیتا ہے، اس لئے ان چیزوں کے علم کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ مصالحِ عالم کے انضباط میں شارع کا بہترین اصول ثواب کی ترغیب دینا اور عذاب سے ڈرانا ہے اس لئے عذاب و ثواب دینے والے خدا کا علم ضروری ہے۔

(۵) پانچویں یہ کہ اس شریعت کو عبادات پر شامل ہونا ضروری ہے، کیونکہ مصلحتِ عالم کے لئے چونکہ خدا کا علم ضروری ہے اس لئے ایک ایسی چیز ہونی چاہئے جو لوگوں کو اس مبعود کو یاد دلاتی ہے، اور یہ چیز صرف عباداتِ بدنیہ ہے، اس کے ساتھ حکمت کا اقتضایہ ہے کہ یہ عبادات واجب ہوں اور ان کے بار بار کرنے سے یہ یاد دہانی قائم رہے، مثلاً جب نمازات دن میں پانچ بار فرض ہوگی تو نماز پڑھنے والے کو لازمی طور پر پانچ بار مبعود کو یاد دلایگی، اور یہ تکرار اس یاد دہانی کے استحکام کا سبب بن جائیگا اور اس طریقہ سے یہ عادت لائے شریعت جو حیات انسانی کے بقا کا سبب ہے، ہمیشہ قائم رہے گی، یہ تو ان عبادات کا دنیوی فائدہ ہے، اور آخرت میں اس کا فائدہ بہت بڑا ثواب ہے، امام صاحب کو شرعی حیثیت سے ان باتوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ ان کے نزدیک فلسفہ کی کتابوں میں جو باتیں فلسفیانہ طریقہ پر ثابت کی جائیں ان کو فلاسفہ کے اصول کے مطابق ثابت کرنا چاہئے، اور نہوت کے اثبات کا یہ طریقہ فلاسفہ کے اصول کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ پیغمبر کی ضرورت کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے



کہ وہ واجب لذات ہے، البتہ اگر معتزلہ کے خیال کے مطابق اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا پر اس کا پیدا کرنا واجب ہے، تو یہ فلسفیوں کا قول نہیں ہے اور اگر اس سے یہ مراد ہے کہ پیغمبر کا وجود چونکہ نظام عالم کا سبب ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خدا تمام کمال اور تمام بھلائیوں کی علت ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس پیغمبر کی بھی علت ہو، تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز اس عالم کے لئے مفید ہو اس کا اس عالم میں موجود ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ اگر اہل دنیا کو تمام فضائل کا مجموعہ بنا کر پیدا کیا جاتا تو یہ بات ان کی موجودہ حالت سے بہتر اور مفید ہوتی، حالانکہ اہل دنیا کو اس طریقہ سے پیدا نہیں کیا گیا، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبر کا وجود اگرچہ اس کے عدم سے زیادہ مفید ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کا وجود ضروری نہیں ہے، اور اگر اس کے کوئی اور معنی ہیں تو اس کو بیان کرنا چاہئے تاکہ ہم اس کے صحت و فساد پر بحث کریں،

یہ بات بھی کہ ”پیغمبر کے لئے ایسے معجزات کی ضرورت ہے جن سے یہ ثابت ہو کہ وہ اس شریعت کو خدا کے پاس سے لایا ہے“ فلسفیوں کے اصول کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ شیخ نے غور و نظر سے بیان کیا ہے کہ پیغمبر کو معجزات پر اس لئے قدرت حاصل ہوتی ہے کہ اسے نفس میں ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو ان معجزات پر اس کو قادر کر دیتی ہے، لیکن وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ قوت ایک چھوٹے جادوگر کی روح میں بھی ہوتی ہے، اس لئے ایک سچے پیغمبر اور ایک جھوٹے جادوگر میں صرف یہ فرق ہے کہ پیغمبر کیسکون کی اور جادوگر برائیوں کی دعوت دیتا ہے اور نیکی اور بدی کا کافرق مضحکہ سے معلوم ہو سکتا ہے اور جب یہ حالت ہے تو پیغمبر اور غیر پیغمبر میں عقل بذات خود فرق کر سکتی ہے، اس کے لئے معجزات کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ معجزات پیغمبر کی صداقت پر اس لئے دلالت کرتے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ کی تصدیق کے قائم مقام ہوتے ہیں، اور یہ اس بات پر مبنی ہے کہ خداوند تعالیٰ جزئیات کا عالم اور فاعل بالاختیار ہے، لیکن فلاسفہ اس کا انکار کرتے ہیں

اس لئے یہ بات ان کے مذہب کے مطابق کیونکر صحیح ہو سکتی ہے، اسی طرح لوگوں کو گناہوں سے باز رکھنا فلاسفہ کے قول کے مطابق صحیح نہیں ہے، کیونکہ گناہ گار کے عذاب کے متعلق ان کے قول کا حاصل یہ ہے کہ جن روحوں کا میلان دنیا اور تعلقات دنیا کی طرف بہت زیادہ ہوتا ہے جب وہ اپنے جہنم سے الگ ہوتی ہیں تو انکی مشاق ہوتی ہیں، لیکن وہ ان کو حاصل نہیں کر سکتیں، اسلئے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہیں، لیکن اگر ہم یہ فرض کریں کہ ایک انسان نے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا اور انکے مال کو لوٹ لیا پھر سکو بھول گیا اور اسی حالت میں مر گیا تو اسکی وجہ سے اس پر عذاب ہوگا کیونکہ عذاب شوق کی وجہ سے ہوتا ہے، اور ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اس کی روح میں یہ شوق نہیں پایا جاتا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ فلاسفہ کے اصول کے مطابق صحیح نہیں ہے، ان اعتراضات کے بعد امام صاحب لکھتے ہیں،

واعلم ان السبب فی وقوع امثال	بانا چاہئے کہ اس قسم کی باتیں فلسفیوں کی زبان
هذه الکلمات فی السنة الفلا <sup>سفة</sup>	پر اس لئے آئیں کہ فلسفیوں کے مذہب اور
انهم کر هو التصویر بمخلص مذہب	اعتقاد کی تصریح کو انھوں نے پسند نہیں کیا اسلئے
ومحصل معتقد هم فاسادوا	اس قسم کے الفاظ کو بول کر مسلمانوں سے مشابہت
تشبه بالمسلمین فی اطلاق	پیدا کرنی چاہی اور محقق پر یہ پوشیدہ نہیں کہ
هذه الالفاظ والمحقق لا یجنی	ان میں کوئی چیز ان کے اصول کے مطابق
علیه ان شیئاً مھا لا یستقیم علی	صحیح نہیں۔

(باقی)

اصولہم

نٹشے

مشہور جرمن فلاسفر فریڈرک نٹشے کی سوانح عمری اور اس کے افکار و خیالات اور تصانیف پر بحث و تبصرہ ہے، قیمت ۱۲ صفحات ۱۰۲ صفحے، پبلشر

## ابن جریر طبری

از مولوی محمد اویس صاحب نگرانی ندوی

(۲)

تفسیر ابن جریر اور خود صرف عربی زبان کسوفی و نحو قواعد نزول قرآن کے بعد مرتب ہوئے ہیں، ان قواعد کی ترتیب اہل زبان کے استعمال کے استقراء سے ہوئی ہے، لیکن اس استقراء کے باوجود استعمالات عرب میں ایسی ترکیبیں اور اعراب بھی ملتے ہیں کہ یہ قوانین مدونہ جن کے خلاف پڑتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ترکیب و اعراب تو غلط نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ یہ اہل زبان کا استعمال ہے، جو کچھ قصور ہوگا وہ یا تو ان قواعد مدونہ کا کہ ان میں استقرائے تام سے کام نہیں لیا گیا، یا استقرائے تام تو ہوا لیکن بعض ترکیبیں اس استقراء سے پھر بھی الگ رہیں،

قرآن پاک کا نزول عرب کی فصیح و بلیغ زبان اور مذاق عرب پر ہوا ہے، اگر اس میں کوئی جملہ، کوئی ترکیب یا کوئی اعراب استعمالات عرب کے خلاف ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ عرب جھٹوں نے قرآن کے مقابلہ میں جان و مال کی بازی لگا دی تھی وہ اس پر اعتراض کرنے اور اس کا مضحکہ اڑانے سے باز نہ رہتے، حالانکہ ان کو اسی قرآن کی تحدی بھی کچا چلنی تھی، لیکن ہم کو پوری تاریخ میں اس قسم کے اعتراض یا استہزاء کی کوئی صحیح روایت نہیں ملتی،

غیر عرب مسلمانوں کو فہم قرآن کے لئے ان ہی قواعد مدونہ سے کام پڑتا تھا، وہ قرآن کو انہی اصول پر منطبق دیکھنا چاہتے تھے، اگر کہیں کوئی ترکیب یا اعراب ان کو مدونہ اصول و قواعد کے

خلافت نظر آتا تو شبہ ہوتا کہ یہ خود صرف کے قواعد کے خلاف ہے، حالانکہ جیسا ہم نے اوپر کہا کہ غلطی ان ترکیب اعراب کی نہیں بلکہ عدم استقرار تام کی ہے، یا اسکی غلطی ہے کہ انہی قواعد پر استعمالات عرب کو منحصر سمجھ لیا گیا ہے،

مفسر ابن جریر کے زمانہ میں یہ مشکلات بخوبی پیش آچکی تھیں، انھوں نے اپنی تفسیر میں ان پر تفصیل سے بحث کی، اور اس کا حل اس طرح کیا کہ آیت متعلقہ میں علماء خود صرف کے مذاہب بیان کئے اور اس میں علی بن حمزہ، کسائی، یحییٰ بن زیاد، الفراء، ابوالحسن نخش، ابوعلی قطرب کی کتابوں سے نفع اٹھایا، پھر انھوں نے یا تو ان مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو ترجیح دیا، اور اس ترجیح کو مدلل کیا، یا اس آیت کے متعلق دوسرے استعمالات عرب کو بطور نظیر کے پیش کیا، اور اس طرح مذاق عرب پر اس مشکل کا خاتمہ کیا،

مثال کے لئے ایک آیت پیش کی جاتی ہے،

سورہ مومنون رکوع ۴۴ میں ہے کہ بعض سقیتین عذاب جب عذاب میں گرفتار ہوں گے تو ان سے کہا جائیگا،

قُلْ كَانَتْ اَيَّامِي تَتَنَبَّأُ عَلَيْكُمْ  
فَكَذَّبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ  
مُسْتَكْبِرِينَ ۚ بَشَرًا مِّثْلَ نَحْرُونَ  
میری آیتیں تم کو پڑھ کر سنائی جا یا کرتی تھیں  
تو تم اٹھے پاؤں بھاگتے تھے بکبر کرتے ہو،  
قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے بیہوش کیتے ہو

اس آیت میں موقع شبہ یہ ہے کہ (سامرا) کو مستکبرین کی طرح جمع ہونا چاہئے واحد کیوں لائے؟ ابن جریر کہتے ہیں کہ یہاں (سمر) بمعنی وقت کے ہے یعنی تم لوگ رات کو بیہوش کیتے ہو، اسی لئے اسکو واحد لائے ہیں، اس کے بعد اپنے اس قول پر کلام عرب سے سند پیش کر کے اس کو مدلل کیا ہے، اور اسکی

تائید میں تابعین کے اقوال نقل کئے ہیں،

ابن جریر کی تفسیر کے نحوی پہلو کے متعلق یہ جان لینا ضروری ہے کہ جس وقت یہ تفسیر لپی ہوئی ہے برٹے برٹے علماء نے خود مثلاً ابوالعباس احمد بن یحییٰ ثعلب، ابوالعباس محمد بن یزید المبرد، ابو جعفر سبکی، ابوجن ابن کيسان، ابواسحاق الزجاج وغیرہ نے اس کو دیکھا کسی نے اختلافات نہیں کیا، بلکہ ان میں سے ہر شخص نے اس کی تعریف و توصیف کی ہے

تفسیر ابن جریر در فقہ | ابن جریر کا تفسیر کے وہ حصے بھی بہت اہم ہیں جہاں انھوں نے آیات سے مسائل فقہیہ کا استنباط کیا ہے، یہ خود مجتہد مستقل تھے، اور دوسرے مجتہدین کے مذاہب سے پوری طرح واقف تھے، اس لئے جو کچھ کہتے ہیں اس میں ایک خاص مجتہدانہ شان ہوتی ہے،

مثال کے طور پر ہم آیت وصیت کو پیش کرتے ہیں، سورہ بقرہ میں ہے،  
 كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا أَحْضَرَكُمْ أَحَدٌ كُمُ  
 أَلْهَوْتُمْ عَنْ تَرَكِكُمْ خَيْرٌ الْوَصِيَّةِ  
 لِيُؤْثِرَ عَلَيْكُمْ الْإِقْرَابُ وَالْيَتَامَى  
 وَالْمَسْكِينُ  
 تم پر فرض کیا جاتا ہے، جب کسی کی موت نزدیک  
 معلوم ہونے لگے، بشرطیکہ کچھ مال بھی ترک نہ  
 چھوڑا ہو تو والدین اور اقارب کے لئے مسؤل  
 طور پر کچھ نہ کچھ بتلادیا جائے، جن کو خدا کا حق  
 ہے، ان کے ذمہ یہ ضروری ہے،  
 الْمُتَّقِينَ،

اس آیت کا منشا یہ ہے کہ مرنے والے پر اگر اس کے پاس کچھ دولت ہو تو وصیت واجب ہے عام مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت سورہ نسا کی اس آیت سے منسوخ ہے جس میں وارثوں کے حقوق خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے مقرر فرمادیے ہیں، ابن جریر کو اس نسخ سے اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ نسخ تو اس حالت میں جائز ہوگا جب دونوں آیتوں میں جمع ممکن نہ ہو اور یہاں یہ صورت نہیں ہے، دونوں آیتوں

میں اس طرح جمع ممکن ہے کہ آیت میراث کو عام وارثوں کے حق میں رکھا جائے اور آیت وصیت کو ان وارث کے حق میں رکھا جائے جن کو قانوناً حق میراث نہیں پہنچتا ہے لیکن وہ ضرورت مند ہیں۔

ابن جریر کی اس رائے کو ہم حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی تقریر کے مطابق اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ آیات میراث کا تعلق ان مسلمانوں سے ہے جو ایک عائلی نظام رکھتے ہیں یعنی باپ، بیٹا، بھائی، بیوی، بہن الخرض تمام درجہ مسلمان ہیں، اس صورت میں بیشک آیت میراث کے احکام جاری ہوں گے، لیکن اگر کسی مسلمان کے پاس نظام عائلی نہ ہو، مثلاً باپ مسلمان ہو، بیٹا مسلمان نہیں ہے، یا بیٹا مسلمان ہے، باپ مسلمان نہیں ہو، اور یہ لوگ ضرورت مند بھی ہیں تو ان لوگوں کے لئے آیت وصیت کی رو سے ثلث مال میں وصیت کی جاسکتی ہے۔

قطع نظر اس غیر عائلی نظام سے خود عائلی نظام میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قریبی عزیز حق وراثت محروم ہو جاتے ہیں مثلاً محبوب لارث وغیرہ، شریعت نے ان کے لئے آیت وصیت کا نظام باقی رکھا ہے۔ ابن جریر کو وجوب وصیت پر اس قدر اصرار ہے کہ فرماتے ہیں، کہ جس طرح قدرت کے باوجود درود کا چھوڑنے والا گنہگار ہوگا، اسی طرح قدرت کے باوجود وصیت سے غفلت کرینا ابھی عاصی ہوگا۔ تفسیر ابن جریر اور علم کلام | مسائل فقہیہ کی طرح ابن جریر نے آیات قرآن سے کلامی مسائل کا بھی بہت بڑا کیا ہے جن کے پڑھنے کے بعد ابن جریر کی مشکلاۃ حیثیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے،

ان کے بعض استنباطات تو اس قدر اہم ہیں کہ آج تک وہ مسلم چلے آ رہے ہیں، مثلاً حضرت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج جسمانی کے متعلق قرآن پاک سے انھوں نے جو دلیل قائم کی ہے، اسکو ایسا حسن قبول حاصل ہوا کہ ان کے بعد سے امام رازی تک عام اہل علم اس کو نقل کرتے چلے آئے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ آیت اسرار میں قرآن نے ”تبعہ“ کا لفظ استعمال کیا ہے،

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ ۚ  
وہ پاک ذات ہو جو اپنے بندہ (محمد) کو  
لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى  
شب کے وقت مسجد حرام یعنی مسجد کعبہ سے  
الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى،  
مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک لے گئی،

اور عبد کا لفظ بول کر محض روح مراد لینا کسی طرح جائز نہیں، اس لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہو کہ حضور  
صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی تھی،

اس سلسلہ میں ابن جریر کی دقت نظر کے لئے ایک دوسری آیت پر غور فرمائیے،  
سورہ نسا میں ہے،

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ  
بیشک جو لوگ ہماری آیات کے منکر ہو گئے  
نُصَلِّبُهُمْ ذُرَاجًا لِّكُلِّ لَظِيظٍ جُلُودُهُمْ  
ہم ان کو عقرب ایک سخت آگ میں داخل  
بَدَلْنَا لَهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا  
کریں گے، جب ایک دفعہ ان کی کھال  
لِيَذُو قُلُوبَهُم ۚ  
جل پکے گی تو ہم اسکی پہلی کھال کی جگہ فوراً  
دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ عذاب  
(نساء-۸)

ابن جریر اس آیت کے ماتحت ایک سوال قائم کرتے ہیں کہ اگر یہ جائز قرار دیا جائے کہ یہ نیا  
جسم بدل دئے جائیں گے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ قیامت میں عذاب ان اجسام پر نہ ہوگا جو دنیا  
میں کفر و معصیت کے مرتکب ہوئے تھے، بلکہ ان کے سوا دوسرے اجسام ہوں گے؟

ابن جریر نے اس کے مختلف جوابات نقل کئے ہیں، پھر اپنے مختار مسلک کیوں بیان  
کیا ہے، کہ عذاب تو اصل میں انسان کو پہنچتا ہے نہ کہ گوشت و پوست کو، گوشت و پوست تو انسان  
کے عذاب کے لئے واسطہ اور ذریعہ ہیں، فی نفسہ لذت و الم میں ان کو دخل نہیں ہے، پس اگر ہر نقطہ

اللہ تبارک و تعالیٰ بے شمار اجسام و درخ میں بدلتا رہے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہو، اس لئے کہ انسان تو بہر حال تکلیف اٹھا رہا ہو، اس تکلیف کے وسائط و ذرائع البتہ بدل رہے ہیں، خود فرمایا ہے ابن جریر نہ صرف یہ کہ روحانی عذاب کے قائل اور اسی حجم پر عذاب کو منحصر جانتے ہیں، بلکہ اس آیت کے ماتحت ایکن میانی مسلک نکالتے ہیں کہ اصل عذاب روح پر ہے، لیکن اس عذاب کے لئے جسمانی واسطہ ضروری ہے، اور اس جسمانی واسطہ کا تغیر و تبدل انسان کے درد و دکھ کے لئے کچھ مضر نہیں، ان استنباطات کے سوا ابن جریر نے تفسیر میں فرق خالصہ کا رد بھی کیا ہے، چنانچہ قدیرہ، اجمیہ، معز، لہ، رافضہ کی تردید جا بجا موجود ہے،

دوسرے مباحث | مذکورہ بالا اہم مباحث کے سوا اور قابل قدر چیزیں بھی اس تفسیری ذخیرہ میں موجود ہیں، مثلاً مفردات قرآن کی بحث، الفاظ کی لغوی تفسیر، ان کے مصادر و تہنہ، جمع اور واحد کا ذکر، حضرات صحابہ و تابعین سے الفاظ کی جو تفسیر منقول تھی ان کا بیان، نیز کلام عرب کے بکثرت مستند و خود ابن جریر کا قابل رشک فصیح و بلیغ انداز بیان،

الغرض ابن جریر کی تفسیر کو محض روایات کا مجموعہ سمجھنا محض ناواقفیت ہے، تفسیر کا زمانہ تصنیف کی تلخیص، ابن جریر کی تفسیر کا زمانہ تصنیف ۳۲۹ھ سے ۳۲۹ھ تک ہے، اس کو پانچوں ترجمے اور اس کی اشاعت نے پچیس تیس ہزار صفحات میں لکھنا چاہا تھا، لیکن تلامذہ کی درخواست پر مختصر کر دیا، اور تین ہزار صفحات پر لکھا، خود تفسیر میں جا بجا کہتے ہیں کہ میں طوالت سے بچنے کے لئے اختصار سے کام لے رہا ہوں،

ابن ندیم کا بیان ہے کہ بعض لوگوں نے ان کی تفسیر کا اختصار بھی کیا ہے، ان میں سے ایک شخص ابو بکر بن الاشعث بھی ہیں،

لے ابن جریر ج ۵ ص ۵۰-۵۱ خطیب ج ۲ ص ۱۲۳ البغی ص ۱۲۳ تفسیر ابن جریر ج ۵ ص ۵۰-۵۱ فرستادہ



کشف الظنون میں ہے کہ بعض متاخرین نے منصور بن نوح سامانی کے لئے اس کا فارسی ترجمہ بھی کیا ہے، اس ترجمہ یا تلخیص کے کامل نسخے کسی کتب خانہ میں نہیں پائے جاتے ہیں، البتہ اس کے اجزاء دو ایک مشہور کتب خانوں میں موجود ہیں، جن میں سے ایک کا حوالہ پیرس کی لائبریری (بیلو تیک نیشنل) کی فہرست مرتبہ ڈاکٹر بلوشے میں پایا جاتا ہے، اس کے مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً دینا سے اسلام میں قرآن کی تفسیر کو عربی سے فارسی میں منتقل کرنے کی پہلی کوشش تھی، ذیل کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ علماء اور ارار النہر کے فتویٰ کے بعد منصور بن نوح سامانی نے اس کتاب کے ترجمہ یا تلخیص کا انتظام کرایا،

وایں کتاب تفسیر بزرگ است از روایت محمد بن جریر الطبری ترجمہ کردہ بزبان پارسی

و در ی راہ راست و این کتاب را بیاوردند از بغداد چیل معصن بوڈایں کتاب بنشتہ بزبان

تازی و بہ استاد ہاے دراز بود و بیاوردند سوے امیرتہ مظفر منصور بن نوح بن نصر بن احمد

ابن اسمعیل و چنان خواست کہ میں را ترجمہ کنند بزبان پارسی پس علماء ماوراء النہر را گرد کرد

و از ایشان فتویٰ کرد کہ روا باشد کہ این کتاب را بہ زبان پارسی گردانیم گفتند روا باشد...

تفسیر قرآن پارسی مراں کے را کہ او تازی نہ دانند

بہر حال یہ نادارہ روزگار تفسیر پورے ایک ہزار گیارہ برس کے بعد پہلی بار سنہ ۱۹۱۱ء میں

مطبعہ سیمینہ مصر سے طبع ہوئی، اسکے بعد مطبع انیرہ بولاق نے تیس جلدوں میں شائع کیا،

ابن جریر اور حدیث | ابن جریر کے علم حدیث میں مرتبہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ محدثین کے تذکروں

میں ان کو امام العلم الفرد کا قضا کا قضا کے انعاب یاد کیا جاتا ہے،

نوی کہتے ہیں کہ ان کا شمار ترمذی اور نسائی کے طبقہ میں ہے، اور ان کے مشائخ وہی

ہیں جو بخاری اور مسلم کے مشائخ ہیں، ذہبی کہتے ہیں کہ میں نے ابن جریر کے طرق حدیث پر ایک کتاب دیکھی تو ان کے کثرت طرق کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔

حدیث میں ان کی اہم ترین کتاب تہذیب الآثار ہے جس کے متعلق ذہبی کہتے ہیں ”وہومن عجائب کتبہ“ خلیب کا بیان ہے کہ میں نے ایسی کتاب نہیں دیکھی اس کتاب کو حضرت ابو بکر صدیق کی مرویات سے شروع کیا ہے، طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی مرویات کو نقل کرنے کے بعد احادیث کے طرق اور علل پر کلام کرتے ہیں، پھر اس سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں اعلیٰ کے اختلافات بیان کرتے ہیں، دلائل اور نکتے سے بحث کرتے ہیں،

افسوس کہ یہ کتاب نامتام رہی اس نادر کتاب کے بعض حصے استانبول کے کتب خانہ میں موجود ہیں، حدیث کے سلسلہ میں یا قوت نے بحکم الانبار بن جریر کی ایک مسند کا بھی ذکر کیا ہے، مگر اسکی تفصیل معلوم نہیں ہے، کتب حدیث کے ضمن میں ان کی چار کتابیں اور ذکر کیا جاسکتی ہیں، جن میں تین اگرچہ مناظرانہ طور پر لکھی گئی ہیں، تاہم حدیث ہی سے متعلق ہیں،

(۱) ایک کتاب فضائل حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما میں ہے جو روافض کے رد میں تھی  
(۲) دوسری کتاب حضرت علی کے فضائل پر تھی اس کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ ابن جریر کو معلوم ہوا کہ ابن ابی داؤد حدیث ”غدير خم“ پر معترض ہیں، اسی کے جواب میں اس کتاب کو لکھا اور اس حدیث کے کثرت طرق کو بیان کیا۔

(۳) تیسری کتاب فضائل نبی عباس پر تھی،

(۴) چوتھی کتاب عبارة الترویات ہے،

۱۔ تہذیب الاسماج ۱۴۲ ایضاً ۲۔ تاریخ آداب اللغة العربیہ ج ۲ ص ۱۹۹

۳۔ بحکم الادب ج ۶ ص ۴۵۰

ان میں سے ہر کتاب نام تام رہی،

ابن جریر اور فقہ | فقہ میں ابن جریر کا شمار ان کبار فقہاء میں ہے جو مجتہد مطلق اور صاحب مذہب تھے،  
ابو الجاس ابن سریح کہتے تھے کہ محمد بن جریر طبری فقہ العالم ہیں، ان کا مذہب پانچویں صدی  
ہجری کے نصف تک معمول رہا ہے، انھوں نے فقہ شافعی مصر میں ربیع بن سلیمان سے اور فقہ مالکی  
یونس بن عبد الاعلیٰ اور بنی عبد الحکم سے پڑھی، اہل عراق کی فقہ تہ سے یونس ابو مقاتل سے حاصل کی،  
بعد ازیں دس برس تک فقہ شافعی کے موافق فتویٰ دیتے رہے، لیکن ان کے علم کی وسعت نے  
ان کو کسی مذہب کا پابند نہ رکھا، بلکہ مجتہد کے درجہ پر پہنچا دیا، ان کی فقہ کے مشہور لوگوں میں سے  
علی بن عبد العزیز بن محمد وولاتی، ابوبکر محمد بن احمد بن محمد بن ابی الشیخ الکاتب، ابو الحسن احمد بن یحییٰ المنعم  
المستکرم، ابو الحسن الدقیقی اسکولانی، ابو الفرج المعانی بن زکریا النہروانی، ابو القاسم بن العراء، ابو الحسن بن  
یونس، ابوبکر بن کمال، ابواسحاق ابراہیم بن حبیب السقطی الطبری وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان میں ابو الفرج  
المعانی بن زکریا النہروانی فقہ طبری کے سب سے بڑے ماہر اور اس مذہب پر کثیر التصانیف تھے، اودان کے  
سوا مذکورہ بالا لوگوں میں سے ابو الحسن احمد بن یحییٰ المستکرم نے فقہ طبری کے متعلق المدخل الیٰ مذہب الطبری  
و نضرہ، اور کتاب الاجماع فی الفقہ علی مذہب الطبری کے نام سے دو کتابیں لکھیں، اور ابو الحسن بن  
یونس نے مذہب طبری پر کتاب جامع الفقہ، کتاب الحیض، کتاب الشروط، کتاب الوتوف وغیرہ لکھیں،  
ابن جریر کی فقہی تصانیف | افسوس کہ دست بردوزمانہ نے اس حلیں القدر امام کی ایک کتاب کے سوا کوئی  
فقہی تصنیف ہم تک نہ پہنچنے دی، اس سلسلہ میں ہمارے پاس جو کچھ ہے، وہ ان کی کتابوں کے  
نام اور کسی قدر ان کے مضامین و عنوانات کا ذکر،

۱۔ طبقات شافعیہ سبکی ج ۲، ص ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، تاریخ التشریح الاسلامی، ص ۲۴۵، طبقات سبکی ج ۲

ص ۱۳۴، تاریخ التشریح الاسلامی، ص ۲۴۵، وفہرست ابن ندیم، ص ۲۴۵، ابن ندیم، ص ۳۲۷

ان کی فقہی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور کتاب اختلافات علماء الامصار فی احکام شرائع الاسلام ہے جس کے بعض حصے مصر میں چھپ گئے ہیں اس کتاب کے متعلق خود ابن جریر کا قول تھا کہ کوئی فقہ اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے، یہی ان کی پہلی تصنیف بھی ہو، اس میں فقہاء کے اختلافات سے بحث کی گئی ہے، تین ہزار صفحات پر مشتمل تھی، اس کتاب پر جو ہنگامہ برپا ہوا تھا، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔  
 دوسری اہم کتاب لطیف القول فی احکام شرائع الاسلام ہے، یہ کتاب ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل تھی، اور ابن جریر کے متبعین کا مدار تھی، اس کے متعلق بھی ابن جریر کا قول تھا کہ اس سے کوئی فقہ بے نیاز نہیں ہو سکتا!

ان دونوں کتابوں کے لئے انھوں نے الگ الگ غالباً بطور مقدمہ کے، دو کتبیں لکھی ہیں، چنانچہ اختلافات العلماء کے لئے جو رسالہ لکھا تھا وہ اگرچہ ناتمام رہا، مگر اس میں اجماع اخبار آحاد وغیرہ پر بحث تھی اسی طرح کتاب لطیف القول کے رسالہ میں اصول فقہ، اجماع، اخبار آحاد، مراسل، ہاشخ منسوخ، محمل، مفسر وغیرہ کے مباحث تھے،

فقہ میں ان کی ایک اور اہم تصنیف بیض القول فی احکام شرائع الاسلام ہے اس کے لئے بھی انھوں نے مراتب العلماء کے نام سے بطور مقدمہ کے ایک کتاب لکھی، جس میں طلب علم اور تفقہ فی الدین کی ترغیب دلائی، فقہاء اور غیر فقہاء کی بحث کی،

ان کتابوں کے سوا امثلة العدول، آداب القضاء، مختصر مناسک الحج، مختصر لفائف کے نام سے فقہی رسائل لکھے،

بسکی کا بیان ہے کہ عباس بن حسن وزیر نے فقہ پر، ابن جریر سے ایک مختصر کی فرمائش کی، تو انھوں نے انجیف فی احکام شرائع الاسلام تصنیف کی، یہ درحقیقت لطیف القول کا اختصار تھا

لے تمام حواویں کے لئے دیکھو معجم الادب ج ۶

جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل تھا، فقہ سے متعلق ان کی ایک اور کتاب ہے کتاب البیان عن اصول الحکام، اس کا ذکر خود ابن جریر نے اپنی تفسیر میں آیت "والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین" کے ضمن میں کیا ہے،

ابن جریر اور تاریخ | ابن جریر کو دنیا میں شہرت دوام بخشے والی تفسیر کی طرح ان کی تاریخ بھی تفسیر کی طرح یہ بھی چھ ہزار صفحات پر مشتمل تھی لیکن شاگردوں کی خواہش پر اس کو بھی مختصر کر دیا، یہی مختصر تاریخ ہے جو اخبار الرسل والملوک کے نام سے اس وقت اہل علم کے پاس موجود ہے، ابتدا سے آفرینش سے لیکر ۳۱۲ء تک کے واقعات سند کے ساتھ اس میں مذکور ہیں، تفسیر کی طرح یہ تاریخ بھی بعد کے مؤلفوں کے لئے مدار ہوگی،

اس تاریخ کے دو ذیل لکھے گئے، ایک ذیل عرب بن سعد الکاتب القرطبی کا ہے، جو ۳۲۰ء سے ۳۲۱ء تک کے حالات پر مشتمل ہے، دوسرا ذیل محمد بن عبد الملک ہمدانی متوفی ۳۲۱ء کا ہے جو ۳۲۱ء تک کے حالات پر مشتمل ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ پیرس کے کتب خانہ میں موجود ہے، صاحب کشف الطغون نے ابو محمد عبد اللہ بن محمد الفراءانی کے ایک ذیل کا ذکر کیا ہے، اور سبکی نے طبقات میں یاوت نے معجم الادوار میں اسکے حوالہ سے واقعات بھی بیان کئے ہیں،

ابن جریر کی تاریخ کا اختصار بھی کیا گیا اور اس کو حذف سند کے ساتھ لکھا گیا، اس سلسلہ میں ابن ندیم نے محمد بن سلیمان ہاشمی ابو احسین شمشاطی معلم کے نام لے لے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے، کہ جن لوگوں نے ابن جریر کے بعد سے لیکر ہمارے اس زمانہ (۳۳۰ء) زمانہ تصنیف الفہرست تک اس میں اصلاحات کئے ہیں، وہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں، اسلئے کہ یہ لوگ صاحب علم و خبر نہ تھے،

۱۔ سبکی ج ۲ ص ۱۱۱ معجم الادوار ج ۲ ص ۲۷۲ تفسیر ابن جریر ج ۲ ص ۳۳۲ معجم المبلوگ العربیہ ج ۲ ص ۱۲۳ ۲۔ تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۱۱

العربیہ ج ۲ ص ۱۱۱ کشف الطغون ج ۱ ص ۲۱۲ ابن ندیم ص ۳۲،

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب تحفۃ اثنا عشریہ میں فرماتے ہیں:-

”دیس کتاب یعنی تاریخ کبیر بیا عزیز الوجود است کم کے نسخہ اور میر آمدہ پنجہ نزد مردم

مشہور است مختصر دست، کہ از عمرات سمساطی انشعی است دیسی حال انتشار اللہ تعالیٰ،

و مترجمین آن مختصر نیز اکثر شیعہ گذشتہ اند ہیں تحریف در تحریف در آن راہ یافتہ“

ابن جریر کی تاریخ کے حسن قبول نے اس کو مختلف زبانوں میں پہنچایا، چنانچہ منصور بن نوح سامانی

کے حکم سے ابو علی محمد لمعی نے اس کا فارسی خلاصہ کیا، ترکی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہوا، بلعمی کے ترجمہ

سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا، اور ۸۶۲ھ میں چار جلدوں میں شائع ہوا، بعض حصوں کا ترجمہ لاطینی

زبان میں ہوا جو ۸۶۳ھ میں شائع ہوا ہے، ابن جریر کی دوسری تاریخی کتاب ذیل المذیل ہے جس کا

زمانہ تصنیف ۸۶۳ھ ہے، یہ کتاب بھی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بہت اہم ہے، اس میں ایک خاص

ترتیب کے ساتھ حضرات صحابہ و تابعین سے لیکر اپنے زمانہ کے شیوخ تک کے حالات لکھے ہیں، اور

اگر انہیں سے کسی پر کوئی اعتراض ہوا ہے، تو اس کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا انتخاب تاریخ طبری

کے ساتھ شائع ہو چکا ہے، تیسری تاریخی کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ ہے جو مصر میں ۱۱۱۹ھ

میں طبع ہوئی ہے،

دیگر تصانیف | ان اہم تصانیف کے سوا دوسرے علوم پر بھی ابن جریر نے قابل قدر تصنیفیں کی ہیں،

مثلاً اخلاق و تصوف میں ادب النفوس البیضاء و الاخلاق النقیۃ کے نام سے ایک کتاب ۸۳۱ھ یعنی

اتصال کے سال لکھنا شروع کیا پانچ سو صفحات تک پہنچ کر ناتمام چھوٹ گئی،

صاحب معجم المطبوعات نے الاعتقاد کے نام سے ایک مطبوعہ رسالہ کا ذکر کیا ہے، یہ رسالہ

۱۱۱۹ھ کشف القفون ج ۱ ص ۲۲۱، تاریخ ادب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۱۹، معجم الادب ج ۷ ص ۱۳۱

معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۳۳،

ہماری نظر سے نہیں گذرا البتہ صریح السنۃ کے نام سے عقائد میں ایک رسالہ کا ذکر یا قوت نہ کیا ہے اس میں اپنے مذہبی عقائد بیان کئے ہیں،

اہل طبرستان میں کچھ مذہبی اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان میں سے ایک مسئلہ "اسم اور مسمیٰ" کا بھی تھا اس پر تقریباً تیس صفحہ کا ایک رسالہ البصیر فی معالم الدین کے نام سے لکھا،

اسی طرح داؤد بن علی الصہبانی کے رد میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ارد علی ذی الاسفار ہے، ایک کتاب علی بن عبد الحکیم کے رد میں لکھی، المو جز فی الاصول کے نام سے بھی ایک نام تمام کتاب کا ذکر آتا ہے، الرمی بالنشاب کے نام سے ایک رسالہ ان کی طرف منسوب ہے، لیکن اہل تحقیق کا خیال ہے کہ غالباً یہ نسبت صحیح ہے،

۱۷ علامہ صابونی رحمہ اللہ نے اپنی رسالہ عقیدۃ السلف و اصحاب الحدیث میں الاعتقاد کے نام سے دو کتابوں کا ذکر کیا ہے، دونوں کو انھوں نے دیکھا ہے اور دونوں کی کچھ عبارتیں بھی اس کتاب میں نقل کی ہیں ان میں سے ایک "الاعتقاد" تو ابن ہی ابن جریر طبری کی ہے، صابونی کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ابن ہی نے خلق قرآن کی بحث پر لکھا ہے،

دوسرا رسالہ الاعتقاد ابن ہدی طبری کا ہے، جس کو انھوں نے اپنے اہل وطن کے لئے لکھا تھا صابونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن ہدی طبری کا فن کلام میں خاص پایہ تھا، اور اس میں انھوں نے کئی تصنیفیں کی ہیں یہ تمام حواہن کے لئے معجم الادباء ۶

### چینی مسلمان

ایک دروہند صاحب قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی حالات ہندوستانی زبان میں لکھے ہیں، ضخامت ۲۴۲ صفحہ، قیمت پیر "مینجر"

## فارسی کے چند قدیم شعراء

انجناب غلام مصطفیٰ خان صاحب ایم اے (ایل ایل بی) علیگ (پکڑکنگ ایڈورڈ کالج امر دہلی براہ)

(۲)

سنائی | حضرت سنائی غزنوی کی وفات کے متعلق ڈاکٹر ایتھے نے بوٹولین لائبریری کے فارسی مخطوطات کی فہرست (صفحہ ۲۶۳) میں اور پھر علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف (مارچ ۳۳ء) میں تفصیل کی گئی بحث کی ہے، اس کا اختصار یہ ہے کہ محمد بن علی الرقدا (ارقا) نے حدیث سنائی کا جو دیباچہ لکھا ہے اس پر استاد دیابیسنا کی وفات کا دن یکشنبہ ۱۱ شعبان (۳۳ دسمبر) تو صحیح لکھا لیکن ۵۲۵ھ کی بجائے ۵۲۵ھ لکھ دیا ہے جو یقیناً غلط ہے، کیونکہ ۵۲۵ھ میں تو حدیث ہی لکھا گیا تھا، اس کے بعد ۵۲۵ھ میں سنائی نے ایک اور ثنوی طریق تحقیق لکھی جس کی تاریخ خود اس کے ایک شعر میں اس طرح ہے:

پانصد و بہشت و ہشت ز آخر سال بود کیں نظم نغز یافت کمال

پھر سنائی نے مغربی (م ۵۲۲ھ) کی وفات پر مرثیہ لکھے جن کا یہاں نقل کرنا تحصیل حاصل ہے، غرض ہمارے محققین نے اتنا ثابت کر دیا ہے کہ سنائی ۵۲۲ھ تک ضرور زندہ تھے، ورنہ مغربی کا مرثیہ نہ لکھتے، علامہ سید سلیمان ندوی نے اُسی مضمون میں ایک مفید اشارہ یہ بھی کر دیا ہے کہ اگر سنائی کی زندگی میں سلطان بہرام شاہ غزنوی کا انتقال ہوتا، تو وہ ضرور اپنے اس مدوح کا مرثیہ لکھتے،

اب ہم کو دوسری باتوں پر غور کرنا ہے، محمد بن علی کے دیباچہ میں جو حدیث کے بیسی ایڈیشن ہیں

لے پروفیسر براؤن نے (جلد دوم صفحہ ۳۱) سنائی کو غزنی یا بلخ کا موطن بتایا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنائی کا مولد غزنی ہی حدیث میں وہ خود کہتے ہیں، اگرچہ مولد مراد غزنی نہیں ہست، نظم شعرم چو نقش ابین ہست



بھی موجود ہے، ایک جگہ یہ عبارت ہے،

”اُنچلشن کی گفتہ بود قریب دہ ہزار بیت مسودہ اصل بہ بخدا فرستاد نزد یک خواجہ امام

برہان الدین علی رحمۃ اللہ علیہ و انچہ بدست او بماند چند نخت بداد ....“

اس عبارت میں ”رحمۃ اللہ علیہ“ کے فقرے سے معلوم ہوا کہ خواجہ امام برہان الدین علی (بن نامر غزنوی) جن کے نام سنائی کا منظوم خط حدیقہ کے آخر میں موجود ہے، اس دیباچہ کی ترتیب کے پہلے قصاکر چکے تھے، اُسی دیباچہ میں ایک جگہ یہ عبارت ہے،

”یمین الدور امین الملت شاہنشاہ بہرام شاہ خلد اللہ ملکہ ..... وچوں از

دیوان اعلیٰ شاہنشاہی معنی مثل فرمودند من خادم ایں دہ ہزار بیت منتخب (؟) نمودم از بہر

بارگاہ اعلیٰ شاہنشاہی اعز اللہ انصارہ، و بموقع احاد او قناد و پسندیدہ مجلس اعلیٰ آمد۔“

اس عبارت میں بہرام شاہ کے متعلق دعائیہ فقرے ”خلد اللہ ملکہ“ اور ”اعز اللہ انصارہ“ صاف

بتا رہے ہیں کہ یہ بادشاہ اُس وقت ضرور زندہ تھا، لیکن جیسا کہ ہم اوپر بھی لکھ چکے ہیں سنائی اور امام برہان الدین علی انتقال کر چکے تھے، اب اگر ہم امام موصوف کی تاریخ وفات سے واقف ہو جائیں تو کم از کم یہ ضرور مسلم ہو جائیگا کہ اُس وقت تک بہرام شاہ زندہ تھا، جیسا کہ اس دیباچہ سے ظاہر ہے، اس کے لئے ہم کو ذرا تفصیل سے کام لینا پڑے گا،

۱۔ بہرام شاہ کی تاریخ وفات ابن اثیر نے (جلد یازدہم ص ۱۱۵ مصری) رجب ۷۵۳ھ لکھی ہے، لیکن طبقات ناصری (ص ۲۴ طبع کلکتہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۷۵۳ھ سے ۷۵۴ھ یعنی ۷۵۳ھ تک سلطان رہا، اور یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ رادرٹی کے انگریزی ترجمے میں (ص ۱۱) بہرام شاہ کے بیٹے خسرو کے ایک سکے کی عبارت کا یہ ترجمہ ہے ۱۔

”اول سال جلوس یعنی ۷۵۳ھ میں یہ سکہ مضروب ہوا۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ نے ۷۵۳ھ میں وفات پائی ہوگی،

بہرام شاہ کے درباری شعراء میں سید حسن غزنوی (م ۷۱۶ھ) ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے اس کی سیف الدین سوری کی شگست پر بہرام شاہ کی مدح میں ایک طویل قصیدہ کیا نوے اشعار کا کچھ تھا جس کا مطلع یہ ہے:

سز و گرجہ ریل آید بریں فیروزہ گوں منبر کنہ آفاق را خطبہ بنام شاہ دیں پرور  
اسکی تفصیل انشاء اللہ پھر کبھی لکھوں گا، ابھی صرف اس فتح کی تاریخ دیکھ لیجئے جو اسی قصیدہ کے ایک شعر (جلد دوم صفحہ ۲) پر مرقوم سال درشت ہم، دہ

یعنی جمعہ ۲، مرقوم ۴۴۵ھ (۱۲ مئی ۱۰۵۲ء) میں بہرام شاہ کو یہ فتح حاصل ہوئی تھی، باب لا بآ (جلد دوم صفحہ ۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر (اس قصیدہ کی تصنیف کے پہلے) سیف الدین سوری سے مل گیا تھا، لیکن بہرام شاہ نے اس کی ایک فی البدیہہ رباعی کی وجہ سے اسے معاف کر دیا، بلکہ اپنا نذیم بھی بنالیا، لیکن دوسرے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کا یہ عروج دیر تک قائم نہ رہا، کیونکہ اس کی سحر بانی اور اس کے مریدوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر بادشاہ کو خطرہ پیدا ہوا، چنانچہ شہر بدر کرنے کیلئے اس کے پاس دو تلواریں اور ایک میان روانہ کیا، شاعر اشارہ سمجھ کر چل کھڑا اور جرین الشیرین روانہ ہو گیا، برٹش میوزیم کے محفوظ نمبر ۴۱۴۴ (دورق ۳۱۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باوہر سپائی میں سید لعل فرشتہ (صف ۱) اور طبقات نامری (صف ۲) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ کی تخت نشینی پر اس شاعر نے ایک قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے،

مناوی برآمد ز ہفت آسمان کہ بہرام شاہ مست شاہ جہاں  
راورٹی کے ترجمہ (صف ۷۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل یہی مضمون (شعر) بہرام شاہ کے ایک سیکرٹری تھا، اگر واقعی یہی شعر تھا تو اس سے زیادہ ایک شاعر کی قدر دانی اور کیا ہو سکتی ہے؟  
لعل در بائی یہ تھی :-

آئی کہ فلک پیشِ تخت ناید بخش جز از کت چو نیست ناید زخم زکبیل کہ پیکر نہ کند بر پشہ ہی زنی دینت ناید  
اسی سے ملتا قصہ مولانا روم کے والد سے بھی منسوب ہے،

نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے :-

جان ہی بدبختِ حورانِ گلشنم      دل کی کشتِ بختِ دیوانِ گلشنم  
اس کا آخری شعر ہے :-

از سالِ پانصد و چل و پنج گو بسا      در من نگر کہ معجزہ جَدِّ خود منم  
اس کے بعد یہ کہ معظمہ پہنچا، اور پھر مدینہ طیبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ایک زندہ جاوید ترجیع بند پڑھا جس کا یہ مرجع اب تک اہل دل حضرات کی جان ہے :-

سلموایا قوہ بل صلو علی صلاک الامین      مصطفیٰ ماجاء الا لرحمة للعالمین  
کہ معظمہ سے ایک قصیدہ سلطانِ بحر (م ۱۱۵۰ھ) کے دربار میں بھیجا تھا جس کا مطلع یہ ہے،  
ہرگز بود کہ باز بہیم تقاے شاہ      شکرانہ در دودیدہ کشم خاکِ پلے شاہ  
لیکن تاریخِ بدایونی (طبعِ مکتبہ جلد اول ص ۱۸۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ بہرام شاہ کو بھیجا تھا جس میں اس کا نام بھی آیا ہے :-

بہرام شہ کہ جانِ سلاطینِ فداش باد      باشد کہ جانِ ایناں باشد سزلے شاہ  
غرض یہ شاعرِ حرمینِ الشرفین سے واپسی پر بغداد پہنچا جہاں وہ یقیناً ۱۱۵۴ھ سے پہلے نہ گیا ہوگا  
کیونکہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ ۱۱۵۵ھ میں وہ بادشاہِ پیائی کرتے ہوئے راج کو جا رہا تھا، اسی قصیدہ میں ایک  
شعریہ بھی ہے جس سے غالباً بیت المقدس کا عزم ظاہر ہوتا ہے :-

اکتوں غزیتِ سفرِ قدسِ کردہ ام      ہم کردہ داں بدولتِ بے منتہاے شاہ  
لیکن اگر بیت المقدس نہ بھی گیا ہو اور ۱۱۵۵ھ ہی کے ذی الحجہ میں حج کے بعد ہی بغداد کو پہنچا

۱۵ اس عربی شعر کا دوسرا مصرع مولانا روم نے سنائی کا کچھ لیا ہے، (دیوان شمس تبریز طبع کھنؤ ص ۲۳۷)

لے راحت الصدور (ورق ۱۱۵)

ہو تو وہ زمانہ ۱۱۵۲ھ سے پہلے نہیں ہو سکتا، یہاں پہنچ کر اُس نے امام برہان الدین علی بن ناصر غزنوی (سنائی کے مکتوبیلید) کی مدح میں ایک قطعہ لکھا، جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

امام عالم برہان دین لسانِ احمق      توئی کہ خامہ زد دست تو میگار شود  
اُس کا آخر شعر یہ ہے جس میں شاعر نے غالباً اپنا ہموطن (غزنوی) ہونا ظاہر کیا ہو،  
منم کہ باز ہمایون آشیانِ تو ام      و فاسے باز نہ پرواز را نشکار شود  
ایک اور قطعہ لکھا، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:-

اے کہ یزدان پادشاہت کرد بر ملکِ علوم      دیں گواہی پیش یزدانِ دزدِ مخرمی دہر  
اسی شاعر نے ایک ترجیع بند سلطان ملک شاہ (بن محمود بن محمد بن ملک شاہ اعظم سلجوقی) کی  
تاجپوشی کے دن پڑھا تھا، یہ بادشاہ رجب سے شوال ۵۴۴ھ (اکتوبر ۱۱۵۲ھ سے جنوری ۱۱۵۳ھ)  
تک یعنی صرف چار ماہ حکومت کرتا رہا، اس کی مدح کے اس ترجیع بند میں ایک شعر انہی خواجہ برہان الدین  
(علی بن ناصر) سے متعلق ہے، وہ شعر یہ ہے:-

بر در بعد از گفتم خواجہ برہان دین      کائے ملک تا پنج مہ سلطان شوی اینک  
اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ رجب ۵۴۴ھ میں جب یہ ترجیع بند پڑھا گیا تھا، اس کے تقریباً  
۵ ماہ قبل خواجہ برہان الدین یقیناً زندہ تھے، اس کے بعد ان کا حال مجھے کہیں نہیں ملا،

اتنا ثابت ہو جانے کے بعد اب محمد بن علی الرقا کے اُس دیباچہ کی طرف آئیے جو بہرام شاہ  
کی زندگی میں اور خواجہ برہان الدین اور سنائی کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا، گویا اب یہ ثابت ہوا کہ  
وہ دیباچہ ۵۴۴ھ کے بعد لکھا گیا کیونکہ اُس سال تک تو خواجہ موصوف زندہ تھے، اور بہرام شاہ  
بھی یقیناً اس کے بعد تک زندہ رہا، لیکن سنائی ضرور انتقال کر چکے تھے، جیسا کہ محققین ثابت کر چکے  
ہے۔ راحت الصدور میں یہ ترجیع بند ۵۴۴ھ سے شروع ہوتا ہے، لیکن مذکورہ بعد شعر کی تیس کے متعلق ڈاکٹر محمد اقبال جہا کوئی

ہیں، حالانکہ انوری نے اپنے قصیدہ میں جو نامہ الدین ابو الفتح طاہر بن فخر الملک (وزیرِ سخن، الموتیؒ) کے بیٹے قوام الدین حسن کی مدح میں ہوا اور جس کی تفصیل انشراح اللہ انوری کے حال میں آئیگی، سنائی اور صابر کو (دستِ ۵۵) کے بعد بھی زندہ لکھا ہو جو صرف طرزِ سخن پر دلالت کرتا ہو، درحقیقت تاریخ نہیں معلوم ہوتی، وہ شعر یہ ہیں:-

گرچہ در بستم و در مدح و غزل یکبارگی	غن مبرکز نظم و الفاظ معانی قاصر م
ایں ہمہ بگذار باشعربجز آدم	چوں سنائی نیستم آخر نہ بچوں صابر م
ہر کیے آخرازا نشان بے کفائے نیستند	ایں منم کہ مغضی چوں وزیر دش طاہر م

لیکن سنائی ہرگز اس وقت تک زندہ نہ تھے جیسا کہ ابو العلاء بخوی کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

سخن رواں بن امر و ز اقتدا آرند	روا بود کہ منم قد وہ ہمہ شعرا
چو رفت جانِ عبادی بن گذشت لطف	چو شد روانِ سنائی بن گذشت سنا
تبارک اللہ بخواہ و پنج بشمر دم	بہشت باشد بہتیم چوشت گشتہ دوتا
بعقدتین گشتہ نست پیچہ عمر م	گہ و دواع رحیل ست ازیں فنا فنا
سر ملوک منوچہر ہر چہ سر کرد	شدہ است نہ و فرخندہ خاندانِ نیا

ان کیاب اور اہم اشعار سے اتنی باتیں معلوم ہوتی ہیں:-

(۱) دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادیؒ (غزنوی) اس وقت انتقال کر چکے تھے

لے کیا تازی، مشہور ہے کہ بچاؤ میب گنج، مجموعہ قصائد فارسی، استاد یقیند پروفسر ضیاء احمد صاحب بدایونی مدظلہ دہلی گم نے ان اشعار کی تصحیح فرادی ہے اور ان کا خیال ہے کہ دوسرے شعریں لطف "کی بچا" عبادیؒ ہوگا۔ لے انھوں نے ملک ارسلان ارغون (دم ۷۳۵ھ) کی مدح بھی لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت عرصہ پہلے (مونس الاحرار ۶۹۹ھ) میب گنج یہ عبادی غزنوی ہیں، سنائی جب بچ کر گئے اس وقت عبادی نے لکھا، (مجموعہ قصائد فارسی ۶۹۹ھ) میب گنج (بقیہ مایشائیدہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

(۲) تیسرے اور چوتھے شعر سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت ابوالعلا رگنجی کی عمر ۵۰ سال کی ہو چکی تھی اور چھٹی دہائی میں تھی،

(۳) آخری شعر کہہ رہا ہے کہ ممدوح یعنی منوچہر خاقان شروان اُس وقت زندہ تھا،

موسیو خانیکوف (Khanikoff) نے تذکرہ خاقانی (ترجمہ اور تہلیل کا کالج میگزین

اگست ۱۹۳۷ء صفحہ ۵۲) میں ابوالعلا رگنجی کی مفروضہ تاریخ پیدائش ۱۰۸۵ء اور ۱۰۹۰ء کے درمیان بتائی ہے، اس حساب سے مذکورہ بالا اشعار شاعر کی ۵۵ سالہ عمر میں یعنی ۱۱۴۰ء اور ۱۱۴۵ء کے

درمیان لکھے گئے ہوں گے، یعنی اُس وقت تک عمادی اور سنائی نصا کر چکے تھے، لیکن صحیح یہ ہے کہ ۱۱۴۲ء میں تو سنائی نے مغربی کار مشیہ لکھا تھا، اس لئے وہ اشعار یقیناً ۱۱۴۲ء کے بعد کے ہوں گے،

اب دوسری طرف آئیے، تو معلوم ہو گا کہ منوچہر خاقان شروان جس کی وفات Zarn Bozar (Manuel de Genealogie ص ۱۲) کے قول کے مطابق ۱۱۵۵ء ہے ان اشعار

میں ممدوح ہے اس سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ وہ اشعار ۱۱۵۵ء کے پہلے اور ۱۱۴۲ء کے بعد لکھے گئے، یعنی سنائی کی وفات ان دو سنوں کے درمیان کسی وقت ہوئی ہوگی، اور بہت ممکن ہے کہ وہ زمانہ ۱۱۵۵ء ہی کا ہو گا جیسا کہ محققین کا خیال ہے،

چوں سنائی افتاد از خط غزنین بہ بلخ،	تازہ کرد از دہجہ قاضی حسن لے سخن
چوں مرا از لشکر سلطان بری یوست بخت	برد قاضی حسن دیدم معالی را وطن
اندر ان فکر ت کہ این قاضی چوں قاضی بود	از عرق در آب آتش رے دیدم خوشیتن
آسمان گفت آفتابا عمادی گو.....	خاک این قاضی حسن از خون آن مہنی حسن
اے دیغا روے آب بوشے کہ دیش گفتے	تازمانہ فری کردہ شعرا و از شعر من

حدیث کے دیباچے سے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سنائی نے چالیس سال سے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، لیکن ان اشعار کے علاوہ عثمان قناری (۱۱۵۵ء) نے بہرام شاہ کے باپ سود سوم کی مدح میں یہی شعر کا جو طویل قصیدہ لکھا ہے، اس میں سنائی کی دنیا داری نظر آتی ہے، اس کا ایک شعر یہ ہے: سے سنائی را صلتہا خوش تا اوچین سے  
 بیرواز کہ ہست است از شعرا و از  
 (دیوان قناری - ورق ۱۵ - ۱۶ بائیں پور)

اور اگر وہ اشعار ۱۱۵۴ء میں لکھے گئے ہوں گے تو پھر ابو العلاء گنوی کی پیدائش بھی (۷۵۵ سال)

۱۱۵۴ء میں مانتا پڑیگی،

ادیب صابر | ادیب صابر کی تاریخ وفات کے متعلق بہت اختلاف ہے، پروفیسر براؤن (جلد دوم)

۳۳۳ حاشیہ نمبر ۲ نے جمادی الاول ۱۱۵۴ء (اکتوبر ۱۱۵۴ء) دولت شاہ نے ۱۱۵۴ء اور ڈاکٹر ایتھے

(فہرست انڈیا آف جلد دوم ص ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷ اور ۳۳۸ء کی تاریخیں نقل کر دی ہیں،

ان اختلافات کو رفع کرنے کے لئے فی الحال چند باتیں پیش کرتا ہوں،

ادیب صابر کا مکمل دیوان کا لائبریری (مبئی) میں موجود ہے، اس کے علاوہ حبیب گنج اور حیدر

لائبریری بمبئی سے بھی میں نے استفادہ کیا ہے، ان کے یہاں زیادہ تر سید محمد الدین ابو القاسم علی بن جعفر

موسوی (رئیس خراسان) کی مدح پائی جاتی ہے، نام اور خطاب کے لئے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں،

صدر اہل البیت محمد الدین ابو القاسم علی      ناقد لفظ و معانی صاحب کلک کتاب

سلالہ نبوی، صدر شرق، محمد الدین      کہ پیش ہمت او ہست پیش کار آتش

زاصل گوہر پاک پیمبران عرب      ز نسل نسبت شاہان خسروان، عجم

تو جعفری و عمت ہست جعفر طیار      ہی شنائے تو گوید بہ پیش جبر فوعم

اگر حضرت تو دور بودہ ام بودہ ست      دعائے دولت تو بادلم ہمیشہ ہم

کہ من ز اول ایام عمر تا امروز      ز خدمت تو مقصر نہ بودہ ام یک دم

جمال تاج معالی علی بن جعفر      کز الکتاب معالی ہی نیا ساید

محمد دین صدر معالی تاج عرفہ و مدثر      عمدۃ الاسلام، ابو القاسم علی الموسوی

۱۔ ان کے علاوہ چند محدثین یہ ہیں۔

نصیر الدین محمد بن حسن، علامہ الدین محمد بن حیدر، جمال الدین عبد اللہ

یہ ابوالقاسم علی ضرور سحر کے وزیر شیر رہ چکے ہیں جو ابوالقاسم (بن) حسن الدین رکنی (الموتی) سے مختلف معلوم ہوتے ہیں، اور جن کا حال مجھے کسی تاریخ یا تذکرے میں نہیں ملا، لیکن جلد ۵۰ جیلی (الموتی ۵۵۵) کے کلام سے ان کی وزارت کا ثبوت ملتا ہے،

خداوند سے کہ در تیرش نشاند سر طائر  
شہنشاہ ہے کہ بر تاجش فغان چرخ دار فر  
سلاطین راجی وارث معز الدین ابوالحار  
شہ آفاق را برہان امیر المومنین بسفر  
سلاطین و خلافت را بد و فراست ہوا  
چو سادات و اکابر ابجد دین پیغمبر  
رئیس مشرق و مغرب ابوالقاسم علی صدر  
کہ چون ہم کینت ہم نام پوش اند فضل  
امیر سادہ عالم چراغ گوہر آدم  
نشین خسرو اعظم، جمال دودہ جعفر  
بزرگی کر بیان و طبع دست جش افزہ  
ادیب صابر کی تاریخ وفات کے متعلق روحانی غزنوی کے اس اہم سوگند نامے کی جو بہرام شاہ کے

وزیر نجیب الملک حسین بن منتخب الملک حسن کی مدح سے شروع ہوتا ہے، مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں،  
نہے بفکر توشن ز چشمہ جواں  
در آفرینش عالم دلت معما خواں  
توئی توئی کہ اگر خولت عطار دارض  
درین سخن نبو خلق را، مجال گمان  
نجیب ملک حسین حسن بر لے خدا  
بیتین دولت انصافم از جہاں بتاں  
شیندہ نو کہ سوگند نامہا دیدی  
زگفتہ دوستہ محراب کولت اپناں  
یکے از ایشاں پنجک ستاں و نہ فروش  
کہ کردگش چرخش جو چرخ سرگرداں

لے سانی کی طرح عمامہ غزنوی نے بھی اس کی مدح کی ہے۔

گردوں تو می فرازی چون خولت سحاب  
سلطان تو می نشانی چون گویت و زبر  
از ہر قومستاند و از کین تو دہر  
ابروے شام و سہم دبستان صبح شیر

۲۔ جلی کا کمن دیوان حبیب گنج میں ہے، اور انتخاب جامع مسجد بیہی کے کتابخانے میں ہے

دارالافتاء اسلامیہ



دوم ادیب پریشان سخن کہ پیودہ ست ہزار بار بسینہ ہمہ دبیر ستاں  
 سوم رشید کطواطہ نزار خالے کہت جو کلم گندہ دماغ و چودرخ پنہ ہاں  
 چہارم شاں کاں سہ کجا نیم بائے (؟) چہارم مردہ دانش فرزدوق نبیان (؟)  
 سیاہ روئے، خنک خستہ ہنید تنے کہ روزگار برو کرد خانہ چون ندان  
 چہ کفر اوچہ سو گند نامہ دروغ کہ چشم شرع باندہ ست در تخرآن  
 ویک ہم جڈے کہ آفریدہ دوست باتفاق نبات و معادن و حیوان  
 بعز ملک خڈے و یکام عالم امر بنوہ جو ہر عقل و بنطق گو ہر جال  
 پھر قسمیں شروع ہوتی ہیں اور یہ چاروں شاعر (سید حسن غزنوی، ادیب صابر، رشید الدین  
 طواط اور فرزدوق) جن کے سو گند نامے مردود کئے گئے ہیں، اسی سو گند نامے میں موجود ہیں:-

نفوذ باندہ مرد و زمثل صابر کیست کہ روزگار بہ اشعار او زند دستاں  
 بجز رشید نامہ دریں زمانہ کے کہ زاد فکر او ہست چہنمہ حیوان  
 حسن کہ آئینہ نور نفس ناطقہ دوست از و چگونہ برم گوے نطق در میداں  
 فرزدوق نبیانی (؟) کہ آیدیش بلا، فروں زیریگ بیابان و قطرہ ہاں

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ یہ شعرا اس وقت زندہ تھے اور جس کی تفصیل آئندہ آئے گی  
 یہ سو گند نامہ تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے، کیونکہ اس میں سلطان بہرام شاہ غزنوی کے زمانہ کے  
 متعلق بہت کچھ صحیح مواد ملتا ہے جس کو میں انشائاً اللہ سلطان کی مفصل تاریخ میں کبھی پیش کر سکو گا  
 ابھی صرف اتنا کچھ لکھ لیجئے کہ یہ سو گند نامہ جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے، ادیب صابر رشید اللہ

۱۔ یہ سہ شعروں کا سو گند نامہ حبیب گنج میں دو کتابوں میں ہو، مونس لاہور (ص ۲۱۵-۲۱۶) اور مجموعہ قصائد قدسی  
 (ص ۱۵۳-۱۵۶) اس کے اٹھویں شوکی اصلاح کے لئے میں اپنے ادیبوں سے درخواست کرتا ہوں،

وطواط اور سید حسن غزنوی کے سوگند ناموں کے بعد لکھا گیا، ادیب صابر کا سوگند نامہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

دلہا بہر اسیر است دین معنی فدائی      ہی بگوش من آید زلف عشق ندائی  
اس میں صابر کے اسی ممدوح یعنی ابوالقاسم علی بن جعفر موسوی کی مدح ہے:

اہل رئیس خراسان و فخر موسویاں      کہ دوست مانش فرعون ظلم راموسی  
نخستہ تاج معالی علی بن جعفر      کہ علم جعفر صادق ہی کسند اعلیٰ

لیکن اس کی تاریخ ہم کو معلوم نہیں، اب رشید الدین وطواط کا سوگند نامہ دیکھئے، اس کے اشعار میرے استاد قبلہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی نے علی گڑھ کے خطوط سے نقل کر کے بھیجے ہیں، وہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

زہے بہ جو تو ایام کرمیت مشہور      بنے بہ جاہ تو اعلام محمدت منصور

لیکن اس میں کسی ممدوح کا نام نہیں ہے، ظن غالب یہ ہے کہ ابوالمظفر التسرخوار زم شاہ (متوفی ۵۵۵ھ) کی مدح میں ہوگا،

اب سید حسن غزنوی کا سوگند نامہ دیکھئے جس کے وزن کے علاوہ قافیہ تک کی تقلید روحانی غزنوی نے اپنے سوگند نامہ میں کی ہے،

کشا و صورت دولت بشکر شاہ دہاں      چوبست زیور اقبال بر عروس جہاں

خدا یگان سلاطین مشرق و مغرب      علاء دینی و دیں خسرو زین و زماں

ابوالمظفر بہرام شاہ بن مسعود      کہ ہست مانش بر نامہ مظفر عفاں

یہ سوگند نامہ غالباً سید حسن نے ۵۴۴ھ میں لکھا ہوگا، جب وہ پکڑا گیا تھا، اور بہرام شاہ

اس سکاراض ہو گیا تھاں فغلی کے متعلق قسموں کے بعد اشارہ ملتا ہے۔

خدا یگانا گندم نہ خوردہ چوں آدمؑ      بروں فقام ناگہ ز روضہ رضواں  
من اولاً کیم و آخراًں چہ سہو بود      اگر کنم کہ بختنایش تو از زرد آں  
امید خلعتِ شتم اجتباہ می دارم      کہ روز و شب شدہ ام رہنا ظلمنا خواں  
اور اس سو گند نامہ کے بعد یعنی ۵۴۴ھ کے بہت بعد روحانی غزنوی کا سو گند نامہ لکھا گیا  
ہو گا کیونکہ اس کا مدوح جیسا کہ ہم اس کے اشعار میں دیکھ چکے ہیں، نجیب الملک حسین بن حسن (وزیر  
ہرام شاہ) ہے، ۵۴۴ھ میں جب ہرام شاہ نے سورجی کو قتل کیا، اُس وقت ہرام شاہ کا وزیر منتخب الملک  
حسن تھا، جو اسی نجیب الملک کا باپ تھا، دیکھئے سید حسن نے اپنے ایک قصیدہ میں اس سال کی فتح  
کی طرف اشارہ کیا ہے :-

منت خدایے را کہ بہ اقبالِ پادشاہ	ایمن شد از حاق و کسوف آفتاب و ماہ
منت خدایے را کہ شگفت و چمید باز	ہم گلبنِ سعادت و ہم سروِ بارگاہ
منت خدایے را کہ بہ طبعِ لطیف داشت	روئے نکوے منتخب از چشمِ بدنگاہ
بس چشمِ شور و روئے ترش بود متظر	تا چشمِ شاں سپید شد و روئے شاں سیاہ
بائے ہاوج ماہ نہ ہنید کے سہا	بائے بجائے سرو نہ بنید کے گیاہ
خورشیدِ مملکت حسن احمدؑ کہ ساخت	در سایہ سعادتِ او ملک دیں پناہ
باز آدمی چوں باز سپید از گریز جا	باز آدمی چو شیر سیہ در شکار گاہ

ان میں چوتھا شعراُسی سورجی (یا بقول ابن الاثیر، شوری) سے متعلق ہے، اور تیسرے شعریں

اس وزیر حسن بن احمد کا لقب ”منتخب الملک“ مذکور ہے، دوسرے اور آخر شعریں صاف کہا گیا ہے

کہ وہ وزیرِ سورہی کے قتل پر اپنی جگہ پر واپس آگیا، اس وزیر کا ایک جگہ اور ذکر ہے:-

فرزادہ حسینِ احمد خاصہ      آن کردہ خدائیش زہمہ خلقِ خلاصہ

فرخندہ جمالت کہ گلِ دولتِ دیاست      باغِ نظرِ منتخبِ الملک حسن باد

ان اشعار میں بہرام شاہ کے تین وزیر (۱) احمد (۲) منتخب الملک حن اور (۳) نجیب الملک

حسین جو نسلاً بعد نسل مقرر ہوئے تھے مذکور ہیں، اسی حسین کی مدح میں روحانی کا سوگند نامہ ہے

جو یقیناً ۵۴۴ھ کے بعد لکھا گیا ہوگا، کیونکہ اس سال تک تو اس وزیر کا باپ حسن بن احمد ہی زندہ

اور اپنے عہدہ وزارت پر جنگِ سورہی کے بعد دوبارہ آیا تھا،

اد پر معلوم ہو چکا ہے کہ روحانی کے سوگند نامے میں ادیب صابر و طوطا، سید حسن غزنوی

اور فرزدق (۹) کو زندہ شمار کیا گیا ہے، اور جب یہ شعر کہ

نغوز باد امر و ز مثل صابر کیت؟      کہ روزگار بہ اشعارِ او زندہ دستان

اس شعر سے ادیب صابر کی زندگی کا کھلا ہوا ثبوت ملتا ہے تو وہ لوگ جو اُسے ۵۴۲ھ میں مرد

سمجھ رہے ہیں، یقیناً غلطی پر ہیں، کیونکہ یہ مصرع اور اس کا سوگند نامہ خود تاریخ کی سوگند کھا کر کہتا

ہے کہ اس کی تصنیف ہی ۵۴۵ھ کے پہلے نہیں ہوئی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ ادیب صابر کی وفات

۵۴۶ھ یا ۵۴۷ھ کے پہلے نہ ہوئی ہوگی،

ادیب صابر کے یہاں ایک قصیدہ اتسر خوارزم شاہ (م ۵۵۱ھ) کی مدح میں بھی پایا

۱۔ اڈیا آتشِ مخطوط ۳۱ و ذوقِ آلف ۳۲ کے بہرام شاہ کے ان تینوں وزیروں کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں، وزیر احمد کے متعلق مسعود سعد سلمان (م ۵۱۱ھ) کے یہاں بھی صاف تذکرہ ہے:-

تا بر آد ز آتشِ شمشیرِ بہرامی شرار      واد کیتی را فلک بر ملکِ بہرامی قرار

کہ در بہرام افتخار از ملکِ شہ بہرام شاہ      در ہمہ معنی کہ بر تردیدہ از لیس افتخار

در ہمہ معنی چو احمد بود بہرامی مضا      از بے صدر وزارت کرد او را اختیار

(دیوانِ مسعود، مطبوعہ طران، ۲۸۹)

جاتا ہے، اُس میں خوارزم کے سیلاب کے متعلق اشارہ ہے، جسکی تاریخ مجھے معلوم نہ ہو سکی، لیکن اس کا منشا شاید جاسوسانہ ہو جس کیلئے تنازع سلطان سنجر کی طرف سے مقرر ہو کر گیا تھا، اس قصیدہ کے بعض شعاریہ

توئی کہ روئے تو در مہرگاں بہارِ سنست      کہ چہرہ تو گلستان و لالہ زارِ منست  
اگر دلایتِ خوارزم رازِ دہ سیلاب      زیاں رسید ز چوئوں کہ در جوارِ منست  
سببِ منم ز پئے آل کہ آبِ بیچوں را      ہمہ مد و زغرلہاے آبدارِ منست  
دلِ ز عشق تو آخر بختی خویش رسید      کہ روزگار بوصلِ تو حتی گزاردِ منست  
بہر چہ رائے کنم یا کم از ملک یا رمی      ازان کہ دولتِ خوارزم شاہِ یارِ منست  
لیکن وہاں وطوآط کے مقابلے میں ادیب صابر کی کوئی وقعت نہ تھی، غالباً اسی وجہ سے اس نے وطوآط کی ہجو قبیح لکھی جس کا صرف ایک شعر یہ ہے۔

آں محنتِ رشید دیں وطوآط      جہل را بچو علم را بقتراط

انوری | اخبار ہماری زبان "مورخہ ۱۶ جون ۱۳۲۲ء سے معلوم ہوا کہ پروفیسر حافظ محمود صاحب شیرازی کی تنقید شعرا لکچم اب کتابی صورت میں شائع ہوگی، جو بیشک بہت مفید ثابت ہوگی، انوری کے متعلق ان کا بلند پایہ مضمون "اردو" (اکتوبر ۱۹۲۳ء) میں شائع ہوا تھا، کلیات انوری میری نظر سے بھی گذرا ہے، اُس میں چند باتیں مجھے بھی مفید نظر آئیں جو اسی مضمون کے سلسلہ میں بیان کرنا ہوں

۱۔ انتخابِ دواوین شعر لے مقدمین، درق ۱۹۱۱ء حیدر لائبریری بھوپال ۲۔ ایضاً درق ۱۹۱۱ء لیکن جلی تعوین کرتے ہیں۔

عالمِ علم رشید الدین نہ بانغِ حسد      آن دختِ ست کہ پیوستہ ہنر بار دہد  
گرچہ در گفتن اشعار چنان مغرورست      کہ ہمہ کس بیزرگی وے استدار دہد  
از قبلِ پیچ کہ در افواجِ علوم مست اورا      خاطر خویش نہ زبید کہ بہ اشعار دہد  
گرچہ (ادبیت) ز احرار و سلاطین کو      کہ مرا و ما نہ ہمہ خدمت بسیار دہد  
فلعت آنت کہ اور سخن خویش ہی      بلوک و بسلامتیں و بہ احرار دہد  
کلیات انوری ملت میں بھی غالب و طوآط ہی کا ذکر ہے،  
(مخطوطہ مصیب گنج)

اور جہاں کہیں "تقیہ" کا حالہ دوں گا، اس سے اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہوگا، تنقید میں صحیح فرمایا گیا ہے کہ انور آفریدی کے مکان پر کوئی وزیر آیا تھا، اس کے خیر مقدم کے جو اشعار بعد میں پیش کئے گئے ہیں ان میں سے کلیات انوری ص ۳۶۹ کے دو شعر یہ ہیں:-

میر دولت دینی و اندر دیدہ دولت      زر لے تست بینائی ز بخت تست بیداری  
تو اں صدری کہ عالم را کمال آمد وجود تو      نگر تا خوشن را کتر از عالم نہ پنداری  
اسی وزیر کی مدح میں شہ کا یہ قصیدہ بھی معلوم ہوتا ہے:-

لے وزارت را جمال و آفرینش را کمال      لے جہاں را صدر و دیں را مجد و دولت نما  
(یعنی صدر جہاں مجد الدین محمد الملک)

پھر شہ میں غالباً اسی وزیر کی آمد کا حال ہے:-

فرخندہ قدم تو کہ کتر اثرے زو      تکلیف دلاست و مراعات رعایت  
بوسیدن دست تو در آور و بمن جاں      در قلزم دست تو مگر آب حیات  
اقبال مرا ز آمدت نشو و نمودار      ابرست قدم تو کہ اقبال بنات  
اس قصیدے کا مطلع یہ ہے،

صدرے کہ از دولت دین جنت بنات      آں خواجہ شرع است کہ سلطان تقی

"خواجہ شرع" صدر جہاں، اور مجد الدین کے خطابات کا اطلاق جس وزیر پر ہو سکتا ہے

مجد الدین ابوطالب بن نعمہ معلوم ہوتا ہے جس کا حال آگے آیا تھا،

معزی اور انور آفریدی کے قصے کے تعلق تنقید میں لکھا گیا ہے کہ پروفیسر براؤن نے "اس پر کوئی

یقین ظاہر نہیں کیا" جو بے شک صحیح ہے، لیکن براؤن نے "اس پر بحث کرنے کی بجائے" تنازعہ کیا،

"...Thoug not worthy of much credence"

سلطان احمد پیروز شاہ کے متعلق غالباً تنقید میں صحیح فرمایا گیا، ہی کہ سخر (المتوفی ۱۱۵۶ھ) کے عہد

سے آٹھ نو سال بعد وہ بلخ اور ترمذ وغیرہ پر قابض ہوا تھا، اس کے متعلق کچھ تفصیل ملتی ہے،

اس پیروز شاہ (فیروز شاہ) احمد کے باپ کا نام "ابوبکر" تھا جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے،

پیروز شاہ باند از زمانہ این پیروز شاہ احمد بوبکر شاہ تست (ص ۵۷)

لیکن ص ۵۶ پر جو رباعی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باپ کا نام طغان تکین تھا۔

از چرخ کہ گائے بسرا دم نہاد دز بخت کہ بندے ز امیدم نکشاد

فیروز شہ طغان تکین دادم داد فیروز شہ طغان تکین شاد شواد

ص ۵۹ پر بھی اسی طرح ہے،

ہم تو سن چرخ زیر زیں را شاید ہم گوہر خورشید نکین را شاید

تا من نہ بری کہ آن دایں را شاید فیروز شہ طغان تکین را شاید

اس لئے خیال یہی ہے کہ فیروز شاہ کے باپ کا نام "ابوبکر" تھا لیکن خطاب "طغان تکین" تھا اسی طغان تکین کا دوسرا بیٹا ملک شاہ تھا، جیسا کہ صاف بیان کیا گیا ہے،

مذکور بفرزند تاج دار ایں جاہلک شہ طغان تکین (ص ۳۳۳)

پھر ص ۳۳۳-۳۳۴ پر بھی اسی ملک شاہ کی مدح ہے۔

شاد باش لے خسرو عادل عماد او دلی دیر ماں لے ناصر جاہ امیر المومنین

لے ملک شاہ منظم لے خداوند جہاں لے قدار لے ماں ہم تو دار لے زمیں

خسرو انت زیر قراں پہلوانان یر حکم آفتابت زیر رے و آسمان یر نگین

یہ ملک شاہ (براہر فیروز شاہ) یقیناً سخر (المتوفی ۱۱۵۶ھ) کے بعد تخت نشین ہوا، اور ی

صاف کہتے ہیں :-

ما تم سحر اگر قتل ملک شہ تازہ کرد      لے ملک شاہ معظم سوراں ماتم توئی (ضام)  
دوسرے مصرع میں اسی ملک شاہ بن طغان تکین کی طرف اشارہ ہے جو سحر کے بعد ہوا ہے، میرا  
خیال ہے کہ فیروز شاہ جب بلخ سے نزدکو ہجرت کرتا ہے تب اس کے بھائی ملک شاہ کو بلخ کی حکومت  
حاصل ہوتی ہے، اس کے متعلق انوری کے یہاں صاف اشارہ ملتا ہے :-

از پس آن کہ بیک ہر دو الف ملکی      داشت در بلخ ملک شاہ بتوار زانی  
وز پس آن کہ ز انعام جلال الوزرا      بتو ہر سال دہ ہری و پانصد کافی  
دوسرے مصرع میں اسی ملک شاہ کی طرف اشارہ ہے، جو بلخ کا حاکم تھا، اور جس کی نسبت  
حاصل کرنے کے بعد انوری اس کے بھائی فیروز شاہ کے وزیر جلال الوزرا کا مداح ہوا، اور  
مکن ہے کہ ان دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کا خطاب طفل تکین ہو جس کے عہد میں انوری  
کو حاسدوں کی وجہ سے بلخ والی مصیبت بھگتنی پڑی ہو اور جس کے سو گند نامے کی تاریخ انوری  
نے لکھی ہے :-

جدا تاریخ ایں انشا کہ فرماندہ بہ بلخ      رایت طفل تکین بودہ رے نامری

جلال الوزرا کی مدح میں منال پر جو قصیدہ ہے اس کے چند شعر یہ ہیں :-

من بندہ کر نیں بیش نزد زخم درشتی      گردوں کہ نہ احوال من اور اسپہا آمد

در مدت دہ سال کہ ایں گوشہ و سکنہ      در قبہ اسلام مرا مستقر آمد

ہر فرد نطلے کہ درآمد ز دہر من      از جوہر تو آمد نہ ز جاے دگر آمد

اس کے پہلے شعر میں مکن ہے کہ اسی بلخ والی مصیبت کی طرف اشارہ ہو، جہاں وہ

دس سال سے تھا، قبہ اسلام سے مراد یقیناً بلخ ہے جیسا کہ سو گند نامے (ضام) میں بھی ہے :-



قبتہ الاسلام را جوئے مسلمانان کہ گفت  
 عاشق قد بائد ارگوید جو و خیریں  
 اس قبتہ الاسلام (بلخ) میں انوری دس سال رہ چکا تھا، اور اسی وجہ سے اس کے حاسدوں  
 نے اس کے ساتھ شرارت کی تھی۔

تا وقت فرصت جوئے کردی از کہیں گاہ  
 خصمہ وہ سالہ را با من بصر آوری (ص ۳۴)  
 ہجو بلخ والا زمانہ جیسا کہ تنقید میں کہا گیا ہے، وفات سحر (۵۹۶ھ) کے بعد اور وقت قاضی  
 حمید الدین (المتوفی ۵۹۹ھ) کے پہلے ہوا ہوگا، کیونکہ قاضی صاحب سوگند نامے میں زندہ معلوم  
 ہوتے ہیں، اور طفول تکین اس وقت حاکم بلخ تھا، جو یقیناً سحر کے بعد ہوا تھا، لیکن ظن غالب  
 یہی ہے کہ ہجو بلخ کا زمانہ ۵۹۹ھ کے قریب کچھ پہلے ہوگا، کیونکہ سوگند نامے میں جیسا کہ اوپر  
 مذکور ہوا، بلخ دس سال کے حسد کا تذکرہ کیا ہے، اور یہ حسد غالباً مجد الدین  
 ابوطالب بن نعمہ اور قاضی حمید الدین وغیرہ یعنی مدوحین کی مدح کی وجہ سے پیدا ہوا ہوگا، اور ان  
 لوگوں کی مدح اور تعلق کا زمانہ ۵۹۵ھ کے پہلے نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اس کے پہلے انوری اپنے  
 خاص مدوح ناصر الدین ابوالفتح (المتوفی ۶۲۸ھ) کی تربیت سے مستفیض تھا، جس کے بعد ہی  
 اُسے کسی اور مدوح کی ضرورت ہو سکتی تھی،

۵۹۵ھ میں بلخ کے قاضی حمید الدین کی مدح میں ایک قطعہ لکھا، جیسا کہ اُس کے ایک شعر سے

صاف معلوم ہوتا ہے۔

۵۹۵ھ وفات سحر کی تاریخ راحت الصدور (ورق ۷۶ ب) میں ہے، ورنہ روضۃ الصفا (جلد چہارم ص ۷۹) وغیرہ  
 میں ۵۹۵ھ ہے، کچھ مفید شعرا اس کے متعلق یہ ہیں۔

ازدگر با نشان شکوہ و غم و غم و غم  
 صبر کن تا پنج گز دو نوبت طفول تینیں  
 شد جوان بار دگر از نوبت طفول تینیں  
 اختیار تاج و تخت نیست ورنہ حیات کم  
 ہفت کسود زیر فرمان کرد و نوبت ہم نوبت  
 ملک اگر دو نوبت سحر بہ آخر ہر گشت

۵۹۵ھ براؤن نے (ج ۲ ص ۳۴) ہجو بلخ کو ۵۹۵ھ کے بعد قرار دیا ہے،

دیر ماں لے بعد اُن کہ پانصد و پنجاہ سال  
نظم و خط بر نبوتِ حجت پیغمبر است  
(کلیات انوری ص ۶۲)

اسی قطعہ کے کچھ اشعار یہ بھی ہیں :-

قطعہ صدر اجل قاضی قضاۃ مشرق و مغرب  
اُن کہ بر عالم نفاذِ اوقضاے دیگر است  
چاکرانِ حشر تش را نزدِ من آور دے  
چاکرانِ حضرت اور اچو من صد چاکر است  
چوں نہ ادم بر سر و بر دیدہ آں تشریف  
کز عزیزی داشت بچو دیدگانم در سر است  
اور پھر ۱۱۵۵ھ میں ہی جب مقاماتِ حمیدی کی تالیف ہوئی تھی یہ شعر لکھے گئے ہونگے :-  
ہر سخن کاں نیست قرآن یا حدیث مصطفیٰ  
از مقامات حمید الدین شد اکنوں تر (ص ۶۲)  
ان اشعار کے علاوہ یوں بھی ۱۱۵۵ھ کے پہلے انوری برخ کی طرف متوجہ نہ ہوا ہوگا، کیونکہ  
۱۱۵۳ھ تک اس کا مدوح ناصر الدین ابوالفتح اس کا کفیل ہوگا، پھر اسی سال اس کا مدوح  
کے انتقال کے بعد اور آخر سال میں سخن کی قید پر اُس نے ”فغانِ خراسان“ لکھی ہوگی جس کا  
مطلع یہ ہے :-

بر سمرقند اگر بگذری لے با و حشر  
نامہ اہل حسر اسان بیر خاقان بر (ص ۶۳)  
اس کی تاریخ پر و فیسّر بر اوُن نے (جلد دوم ص ۳۸۶) لکھی ہے، لیکن میرا خیال ہے  
کہ وہ یقیناً ۱۱۵۴ھ کے بعد ہی کی تصنیف ہے، کیونکہ اس سال والی مصیبت ایسی نہ تھی کہ دو  
سے پہلے اس کے خلائِ جوش نہ پیدا ہوتا،

پھر سخن کی قید کے بعد ہی جب غزوؤں کا اچھی طوطی حاکم بن بیٹھا تو انوری نے اس کی بھی مدح  
کی ہے جو ۱۱۵۴ھ میں لکھی ہوگی، مطلع یہ ہے :-

لے بہ ستقاق شاہِ شرع را قائم مقام  
وز قدیم الدہر شاہاں پیشو لے خاص دعاء (ص ۶۴)

اور اس کے بعد ہی انوری بلخ کی طرف متوجہ ہوا ہوگا، جس کی تاریخ اور مذکور ہو چکی ہے۔  
تاریخ (۵۱۱ھ) میں جوبجو بلخ والے واقعہ کے تقریباً دس سال پہلے واقع ہوئی تھی،  
۵۱۱ھ سے قاضی حمید الدین ضرور انوری کے مدوح بن گئے تھے، لیکن بلخ کے ”صدر“  
مجد الدین ابوطالب بن نعمہ جن کا تذکرہ آگے آئیگا انوری کی طرف جلد متوجہ نہیں معلوم ہوتا  
اسی لئے انوری کو کہنا پڑا:-

مدتے شد کہ دریں شهر مقیم است ہنوز      بیچ در بانس نداند بد را بیچ سراے  
خدمت حضرت تو یک دوشہ بارش دیا      اندر ان موسم غم پر ورنہ شادی فرماے  
دوسرے شعر میں ”موسم غم پرور“ کا ذکر ہے وہ غالباً سحر کی قید کا زمانہ ہے جس کو غالباً پیرو  
احمد کی مدح والے قصیدہ میں بھی اس طرح کہا ہے:-

ہر شادی کہ فتنہ زانفت کردہ بود      آن را بہ یک لطیفه قضا کرد روزگار (دش)  
اسی قصیدہ میں بلخ والے مجد الدین ابوطالب کی مدح بھی ہے اور پھر رے والے مجد الدین  
ابو الحسن عمرانی سے مقابلہ بھی ہے:-

لے مجد دین و صاحب ایام و صدر بشرق      دیدی چہ خدمتے بسزا کرد روزگار  
د آنجا کہ ذکر صاحب سے رفت و ذکر تو      بر عہد دولت تو دعا کرد روزگار  
(باقی)

### شعر اجم حصہ چہارم

اس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری  
پر کیا اثر کیا، کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور شاعری کے تمام انواع و اقسام میں سے مثنوی پر بسیط  
تبصرہ، قیمت عمر  
”مینجر“

# تَلَخِصٌ بَبَصَارِكَ

## ادب ادبی ذوق

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ادبی ذوق ایک ایسا بلند کمال ہے جس کا حاصل کرنا نہ صرف ان کی شخصیت کی تکمیل کا باعث ہوگا بلکہ انہیں ایک معقول سوسائٹی کا موزون رکن بنا دیگا، وہ اپنی ادب ناشناسی سے دل میں اسی طرح شرمندہ ہوتے ہیں، جیسے بعض ضروری ادب سے ناواقفیت پر ان کا خیال ہے کہ انسان کو جن چند مخصوص چیزوں سے واقف ہونا چاہئے انہیں سے ادب ایک ضروری چیز ہے اور لباس و اطوار و گفتار و کردار کے محاسن کے ساتھ ادب سے روشناس ہونا بھی ان کے لئے لازمی ہے، ادبی ذوق ایک دلچسپ مشغلہ ہے جس سے دو مقام کی تکمیل ہوتی ہے، وہ صحیح معاشرت کی سند اور ذاتی تفریح کا وسیلہ ہے،

لیکن یہ خیال صحیح نہیں، جو دراصل ادب اور اس کے منصب کو سمجھتا ہے، اس کی نظر میں یہ خیال بالکل مضحکہ انگیز ہے، جو لوگ ادبی ذوق کو صرف ایک کمال اور ادب کو صرف ایک دلچسپ مشغلہ سمجھتے ہیں ان کو نہ تو اس کمال کے حصول میں حقیقی کامیابی حاصل ہوگی اور نہ اس کو وہ بطور دلچسپ مشغلہ کے اختیار کر سکیں گے، گو ادبی ذوق ایک اعلیٰ ترین کمال اور ادب ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہے،

اصل یہ ہے کہ ادب بجائے ایک ضمنی شے کے، مکمل معاشرت اور زندگی کا سنگ بنیاد ہے، جو ذوق ادب محروم ہے، اس کی مثال اس شخص کی ہے جو آزاد شہری کے حقوق سے

محروم ہے، یا قبل پیدائش کی نیند سے بیدار نہیں ہوا ہے، بلکہ پیدا ہی نہیں ہوا ہے، وہ پورے طور سے دیکھ نہیں سکتا، صرف سکم پروری کر سکتا ہے، جو لوگ ادب کے حقیقی منصب واقف ہیں اور اس سے استفادہ کر چکے ہیں ان کے لئے اس سے زیادہ اذیت کا کوئی سامان نہیں کہ کس طرح ہزاروں آدمی اس خود فریبی میں مبتلا ہیں، کہ وہ بیدار ہیں، حالانکہ ان کی بیداری کسی طرح غنودگی سے کم نہیں،

ادب کیا چیز ہے؟ اس کا واضح جواب کوئی نہیں دے سکتا، یہ ایک راز ہے جس پر صرف شاعین ڈالی جاسکتی ہیں، اور اشارے کئے جاسکتے ہیں، میں آپ ہی کے واقعہ سے اس راز کی جانب آپ کی رہنمائی کروں گا، ایک مخلص اور رازدار دوست کے ساتھ چل قدمی میں کسی حسین منظر کے پر کیف نظارہ سے آپ لطف اندوز ہوتے رہے، مقوڑی دیر تک یہ مسئلہ آپ کے دل کا راز اور آپ کی توجہ کا مرکز بنا رہا، بالآخر وارداتِ قلب کی لطافت اور جذبات کے کیف سے سرشار ہو کر آپ نے ہمدرد دوست سے پورے لطف بیان کے ساتھ اس راز کو بیان کر دیا جس وقت ان تاثرات کا بے ساختہ اظہار آپسے ہوا، اس وقت آپ ادب کی دنیا میں تھے،

اصل یہ ہے کہ بیان حقیقت کا سوال نہیں، یہ سب دل کے تاثرات کا اعجاز ہے، تاثرات سے آپ متاثر ہو سکتے ہیں، اور آپ کو ہونا چاہئے، دنیا معجزات سے معمور ہے، جمال کا منظر سن کا ایک معجزہ تھا، نظر نے اس کا انکشاف کیا، دل نے اس کو قبول کیا، اس انکشاف کے کیف سے آپ لبریز ہو گئے، آپ نے محسوس کیا کہ دوسروں کو اس نظارے سے لذت آشنا کرنا آپ کا فرض ہے، آپ ایک جذبہ سے سرشار تھے، دوسروں سے اس کا اظہار لازمی تھا، آپ کے سامنے دنیا تھی جس کو آپ دعوتِ کیف دینا چاہتے تھے، غور کیجئے آپ کے دوست

آپ کے تاثرات اور گفتگو کا کیا اثر ہوا، دوست کو معلوم تھا کہ جو کچھ آپ نے دیکھا تھا وہ حسن مطلق نہ تھا، کوئی اس کو اس بات کا یقین دلا سکتا تھا، لیکن آپ نے اس کا نظارہ ایسی نگاہ اور اس اخلاص سے کیا اور وہ فوراً کیف سے کچھ اس طرح بیخود ہو کر دوست کو اس سے آشنا کرنا چاہا کہ دوست محسوس کرنے لگا کہ وہ اس سے قبل اس حسن کا نظارہ کرنے کے لئے محروم بصارت تھا، محروم تماشا کو حسن، حیرت اور اعجاز کے کرشموں کی دعوت دینا، اور ان سے آسودہ کرنا ادب کا منصب ہے، ادب کا احیاء اسی طرح ہوتا ہے، اور یہی ادب آفرینی کہلاتی ہے، آپ بیدار ہو گئے اور کسی حد تک دنیا کے حسن و جمال اور اس کی بوقلمونی کا نظارہ کرنے کے لئے آپ کی آنکھوں اور کانوں سے پردے ہٹ گئے، لیکن خود تنہا دیکھنا اور سننا کافی نہ تھا، بلکہ دوسروں کو بھی اس لطف میں شریک کرنا ضروری تھا، ان کو شریک کر کے آپ بیدار کر دیا، ممکن ہے دوسرے ہی دن آپ کے دوست نے حسن کا نظارہ کیا ہو، اور اس کو حسن کا معجزہ سمجھا ہو، یہ ادب کی کار فرمائی ہے،

بانیانِ ادب وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے کائنات کی معجزانہ چمپی اور دلکشی کو دیکھا اور محسوس کیا ہے، ادب کے بانیانِ اعظم وہ لوگ ہیں جن کی نظریں نہایت وسیع اور جن کے احساں نہایت عمیق ہیں، ان کی زندگی کیف و انبساط کی ایک مسلسل کڑی ہوتی ہے، اسی لئے وہ ایک خشک و بے کیف دنیا کے وجود یا تصور سے انکار کرتے ہیں، کیا یہ تصور کچھ کم اہم نہیں کہ دنیا کوئی خشک و بے رنگ جگہ نہیں ہے، اور کیا پہاڑی کے تنگ و تاریک سرنگ سے نکل کر کشادہ سرسبز وادی میں پہنچ جانا کوئی بات ہی نہیں اور احساسات کی بیداری اور زندگی کے کیف و سرور سے دل میں تپش اور قلب میں حرکت کا پیدا ہونا بے معنی ہے، ادب کے بانی آپ کو اپنا ہمسر بنانے اور اپنی سطح پر لاتے ہیں،

ادب کے مطالعہ کا مقصد فرصت کے اوقات کو لطف کے ساتھ گزارنا نہیں ہے، بلکہ

اپنے کو بیدار کرنا، متحرک زندگی بسر کرنا، لطف، ہمدردی اور ادراک کی صلاحیتوں میں زور اور قوت پیدا کرنا ہے، ادب کا اثر ایک انہیں بلکہ جو میں گھنٹہ ہونا چاہئے، ادب دنیاوی تعلقات میں یکسر انقلاب پیدا کر دیتا ہے، ادب کو پوری طرح سمجھنے سے دنیا کو صحیح طور پر سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، ادب کا مقصد اس سے زیادہ ہرگز نہیں ہے، ادب زندگی کے تمام شعبوں کا مربوط اور متوازن خاکہ پیش کرتا ہے، ادب کی روح مختلف چیزوں کو اتحاد کی لڑی میں پرو دیتی ہے، ادب شمع اور تارہ کو متحد کر دیتا ہے، ادب کے پیش کردہ خاکہ میں ایسا سحر ہوتا ہے کہ کل کا حسن جز میں نظر آنے لگتا ہے، جمال کو بے نقاب کرنے اور مختلف النوع چیزوں کو اپنی روشنی کے گرداب میں لینے سے ادب آسودہ انہیں ہوتا، بلکہ ہر جگہ سبب اور اثر کی بحث سے اخلاقی حکمت پیش کرتا اور اس کو قبول کرتا ہی غرض ادب بول و آخر زندگی کا ایک وسیلہ ہے، اور ادبی ذوق حاصل کرنا ایک کارنامہ ہے جو ادب کو بہترین مصرف میں لانے سے مکمل ہوتا ہے، جو لوگ بیدار زندگی سے بیزار اور صرف سونا اور اونگھنا چاہتے ہیں ان کا ادب سے دور ہی رہنا مناسب ہے،

ادب عالی | ہر ادب کی بلند پایہ، مستند اور معتبر تصانیف اور ان کے مصنفین کلاسیک (ادبی عالی) کا درجہ اور نام حاصل کرتے ہیں، یہ درجہ ان کو دوام بخشتا ہے، ان کی قدر و قیمت عوام کی قدر و ثناء سے بلند اور اکثریت ان سے نا آشنا اور فروتر ہوتی ہے، ادب عالی کا واسطہ صرف مخصوصین سے ہوتا ہے، بہت تھوڑی تعداد ادب عالی کے وزن و وقار کا تحمل کر سکتی ہے، اگر کج اس ناول کے متعلق ان لاکھوں آدمیوں کی رائے طلب کی جائے جو دس سال قبل اس کتاب کو پڑھ کر بے اختیار وجد کرتے تھے تو آپ کو معلوم ہو گا، کہ وہ اس کتاب کو بالکل بھول چکے ہیں، اس کے پڑھنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، اور اگر اس کو پڑھیں گے بھی تو لطف اندوز

نہ ہوں گے، اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ کتاب اس مدت میں پست ہو گئی یا پڑھنے والوں کا مذاق بلند ہو گیا ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے مذاق پر اعتماد کرنا نہیں سیکھا جس کی مشق دائمی لطف اندوزی کا باعث ہوتی، آج بھی انھیں یہ نہیں معلوم کہ کس چیز سے وہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں،

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کلاسیکل مصنفین کی اہمیت اور مالگیر شہرت اب تک کیوں قائم ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان مصنفین کی شہرت اکثریت کی بالکل مرہونِ منت نہیں، وہ اکثریت کی داد و قدر دانی سے بالاتر ہیں، ان کی شہرت بنیادی ہوتی ہے جس کو وہ مخصوصین قائم رکھتے ہیں جن کے قلب میں جذبات کی حرارت ہوتی ہے، کیا آپ کا خیال ہے کہ ٹیکسپیئر کی شہرت ہفتہ عشرہ بھی قائم رہ سکتی تھی، اگر اس کے نقیب معمولی درجہ کے لوگ ہوتے؟ صف اول کے مصنفین کی شہرت کو ہمیشہ ان چند مخصوص ہستیوں کی گرمیِ ذوق سے قوت پہنچتی ہے جن کے قلب جذبات سو گرم ہوتے ہیں، مصنفین کی بعد از مرگ شہرت بھی صرف چند مخصوص عقیدت مندوں کی عقیدت، اور استعلاال کا نتیجہ ہوتی ہے، یہ مختصر لیکن عقیدت مند جماعت اپنے مصنف سے کبھی بے تعلق نہیں ہو سکتی اور اس لطف اندوز ہوتی رہتی ہو اسکا تذکرہ ہو دھالو ایسے ذوق و شوق سو کرتی ہے اور اس کے بارے میں اپنے کو ایسا حکم سمجھتی ہے، اور اپنے میں ایسی خود اعتمادی محسوس کرتی ہو کہ بالآخر اکثریت اس مصنف کے نام سے انوس ہو جاتی ہے، اور خاموشی کے ساتھ اس کے نظریہ سے اتفاق کرتی ہے کہ وہ مصنف عام انسانوں کی سطح سے اونچا تھا،

ایسے مصنفین کی شہرت کا مدار صرف ان کے چند مخصوص اور پُر شوق پڑھنے والوں پر ہوتا ہے جس کو وہ ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں، وہ جوہر کی تلاش کر کے اس کو روشن کرتے ہیں، ان کا شوق دائمی ہوتا ہے، اس لئے بلند پایہ مصنفین کے فراموش ہو جانے کا امکان نہیں، اکثریت شہرت



کو وجود میں ضرور لاسکتی ہے، لیکن وہ پھر اس سے بالکل بے پروا بھی ہو جاتی ہے، قلیل المقداد پرستاروں کی کامیابی کا راز ادب کے ان حقیقی شغف ہے، ادب میں شراب کی کیفیت محسوس کرتے ہیں، یہ کیف ان کے ذوق اور دلچسپی کو زندہ رکھتا ہے، اور تجربہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کا ذوق صحیح اور پختہ ہوتا جاتا ہے، اسی لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ آج کسی کتاب کے مروجہ کے متعلق ان کی ایک رائے ہو اور کل بدل جائے، جو کتاب ان کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے، عوام میں اس کی مقبولیت کے باوجود وہ اس کے محاسن کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے، اسی طرح کسی بلند پایہ کتاب سے عوام کی سردمہری ان کے یقین کو متزلزل نہیں کر سکتی، کتاب کی وہ کوئی خوبی ان میں جو ان چند پر شوق ہستیوں کو اس کا گرویدہ بنا دیتی ہیں، یہ ایک ایسا دشوار سوال ہے جس کا تشفی بخش جواب اب تک نہیں دیا گیا ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ صداقت، بصیرت، آگہی، فراست، ظرافت اور دلکشی (حسن) خوبیوں کے عناصر ہیں، لیکن ان محفل الفاظ سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، ان میں سے ہر لفظ محتاج تشریح ہے، خصوصاً اول و آخر کے الفاظ ایک بلند پایہ شاعر اپنے لطیف انداز میں حسن کو صداقت اور صداقت کو حسن بتاتا ہے، بڑے بڑے ناقدین اس کی وضاحت نہ کر سکے کہ وہ کسی تصنیف کو کیوں دلکش سمجھتے ہیں، کتاب کی دلکشی کا سبب اس کا دلچسپ اور انبساط انگیز ہونا ہے، لیکن ایسا کیوں ہے اس کا کوئی جواب دے سکا، مخصوص اصحاب ذوق کا مخصوص بلند پایہ تصانیف سے لطف اندوز ہونا ایک راز ہے،

ادبیات عالیہ (کلاکس) سے صرف مخصوصین لطف اندوز ہوتے ہیں، ان سے ان کی دلچسپی گہری اور دائمی ہوتی ہے، ادب عالی کا بقا کسی اخلاقی بنا پر نہیں ہے، بلکہ وہ صرف اسلوب سے زندہ و باقی ہیں کہ لطف و انبساط کا سرچشمہ ہیں، خاص اصحاب ذوق اس کو اسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے، جس طرح شہد کی کمی پھول سے بے نیا نہیں کر سکتی، ادب عالی مبالغہ سے مبرا

اور آدھے پاک ہوتا ہے، اس کو مالی و مانع مصنف کا ذہنی توازن نشیب و فراز سے بلند رکھتا ہے، کلاکسس کے انبساط میں شدت نہیں، بلکہ لطف و نزاکت ہے، اس کا حسن روح میں جذب ہوتا ہے، ضرب نہیں پہنچاتا،

اسلوب بیان | موضوع اور اسلوب بیان کا حقیقی و بنیادی تعلق ہے، خیال کی آفرینش الفاظ کے باطن میں ہوتی ہے، یہی الفاظ کا جامہ اسلوب بیان ہوتا ہے جو بالکل خیال کا پابند ہوتا ہے، اسلوب بیان کی وضاحت اور دلنشینی کا مدار خیالات کی وضاحت و حسن پر ہوتا ہے، سلاست خیال اور سلاست بیان دونوں لازم ملزوم ہیں، مصنف کا اسلوب بیان مقرر کے لہجہ و طرز بیان کا مترادف ہوتا ہے، جس طرح کسی کا طور طریقہ اس کے کیر کڑ کا آئینہ ہوتا ہے، اسی طرح مصنف کا اسلوب بیان اس کے خیال یا پیام کا آئینہ دار ہوتا ہے، موضوع کی خوبی و خرابی طرز تحریر میں جھلکتی ہے، مصنف کی کیفیات اس کی طرز نگارش میں نظر آتی ہیں، وہ اس کا ایسا مرقع ہوتی ہے جس میں وہ خود مجسم نظر آتا ہے،

جب مصنف اپنے مدد سے بڑھکر آتش نوازی کرنے لگتا ہے تو اس وقت اسلوب بیان کا سوال نہیں رہ جاتا، بلکہ وہ اپنے موضوع سے فضا کو گرم و متلاطم کر دیتا ہے، طرز نگارش موضوع میں گم ہو جاتی ہے، اس کیفیت کا تعلق صرف موضوع سے ہوتا ہے، اس وقت اسلوب کا حسن مطلق اور مردہ ہو جاتا ہے، صرف موضوع کی کار فرمائی رہ جاتی ہے، لیکن جب مصنف اپنے صحیح مقام پر ہوتا ہے اور وہ اپنے جذبات کو متوازن اور مربوط رکھتا ہے، اس وقت اس کی طرز نگارش اس کی حقیقت بلکہ اس کی کاملیت کی آئینہ دار ہوتی ہے، معلوم نہیں تہا طرز نگارش کی فریفتگی کا کیا مقصد؟ بعض حسن بیان سے کلام یا تحریر میں حقیقی روح اور دائمی زندگی پیدا نہیں ہوتی، جب تک خیالات میں بندگی کی بجلی نہ کوندتی ہو، جو لوگ کسی مصنف کا مطالعہ صرف اس کی طرز تحریر کی کشش کیوجہ سے کرتے ہیں

وہ بہت جلد اس سے اکتا جائیں گے،

اصل شے مصنف کے خیالات و جذبات ہیں، اس لئے کسی تصنیف کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو اپنے جذبات کا تجزیہ کرنا چاہئے کہ آپ اس سے کچھ مستفید بھی ہوئے یا صرف مصنف کی شیریں زبانی ہی سے محفوظ ہوتے رہے، اگر صرف شیریں زبانی سے محفوظ ہوتے رہے تو آپ کو غور کرنا چاہئے کہ جو لطف و تفریح کا زمانہ آپ نے کسی شکر و مہن کے ساتھ بسر کیا ہے اس سے آپ کس طور پر متاثر ہوئے ہیں، اور اگر مصنف کی ظرافت سے لطف اندوز ہوئے تو ایسے مصنف کا درجہ ایک مسخرے سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اگر مصنف نے وہ بات کہی ہے جس کی اثر پذیری مسلم ہے، تو اس کی تحریر کی بے لطفی نظر انداز کرنے کے لائق ہے، دوست کا جسمانی انظار اور سیما و شئی کسی حد تک گراں خاطر ہو سکتی ہے، لیکن اس کے اطوار کو ناپسندیدہ نہیں کیا جاسکتا، اگر کسی مصنف کی طرز ادا نے فوراً ہی آپ کو بخود و سرشار کر دیا، تو یہ آپ کو سوچنا چاہئے کہ اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی جو پہلی ہی ملاقات میں آپ پر اپنی شخصیت کی بارطبع مارتا ہے، آپ کو غور کرنا چاہئے کہ جس شخص کو آپ اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اس نے آہستہ آہستہ اپنا پیام آپ کو دیا ہے، یا تماشا کی ابتداء آتش بازی سے کی ہے،

طرز انشاء پر اسی طرح نگاہ ڈالنی چاہئے جس طرح زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے، بلاشبہ طرز انشاء شخصیت کی بالکل تفسیر ہوتی ہے، اور اسکی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اور یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موضوع سے لطف اندوز ہونے میں، طرز انشاء عامل نہیں ہو سکتا لیکن یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ صرف طرز انشاء کی خوبی کافی ہے، یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ پر اہم ہیں، اور ایک بلند پایہ مصنف کے لئے دونوں کا لحاظ رکھنا ضروری اسوقت اس کی تصنیف کامیاب تصنیف کہلانے کی سستی ہوگی،

# انجیل

## چاند کا کرہ اور زندگی

تمام سیاروں میں سب سے چھوٹا چاند ہے، اور سورج سے تو بہت ہی چھوٹا ہے، ہم کو اتنا بڑا اس لئے دکھائی دیتا ہے کہ زمین سے سب سے قریب ہی سیارہ ہے، اس کا فاصلہ زمین سے کل ۳۵۸,۹۰۰ کیلو میٹر ہے، جو دوسرے سیاروں کے فاصلہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے، لیکن اس قربت کے باوجود ہم کو اس کے اندرونی حالات سے بہت کم واقفیت ہے، بڑی اور طاقتور دوربینوں سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں خشک زمین اور بے آب و گیاہ صحرا موجود ہیں، لیکن زندگی کا کوئی سراغ نہیں ملتا، ممکن ہے اس میں نباتات اور حیوانات کا وجود ہو، لیکن موجودہ دوربینیں اس کے بتانے سے قاصر ہیں، چاند کے اندر جو سب سے چھوٹی چیز دکھائی دیتی ہے وہ ایک عمارت کے حجم کے برابر ہے، اس سے چھوٹی کوئی چیز نظر نہیں آتی، اس کے گرد ہاں زندگی ہے بھی تو اس کا دیکھنا ممکن نہیں ہے، اور ہمارے پاس قیاسات و قرائن کے علاوہ اس کے علم کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے، نباتی اور حیوانی زندگی کے لئے سب سے ضروری چیز پانی ہے، جس کے بغیر ان کا وجود ممکن نہیں ہے، اور پانی کا مشاہدہ دوربین کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے، مثلاً اگر چاند کے کرہ سے کرہ زمین کو دوربین سے دیکھا جائے تو اس کے سمندر اور بانی کے بادل نظر آئیں گے لیکن زمین سے چاند میں بانی اور

اور اس کے بھارات کا کوئی نشان نہیں ملتا، اس سے محققین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ چاند کا کرہ بے آب و گیاہ بیابان ہے جس میں زندگی ممکن نہیں ہے، زندگی کا دوسرا ضروری عنصر ہوا بھی اس میں موجود نہیں ہے، ممکن ہے تھوڑی بہت گیس پائی جاتی ہو، لیکن وہ ہوا نہیں ہے، اس لئے وہاں زندگی کا کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا، زمین میں، ہوا، بارش، جنگل اور برف کے عوامل ہمیشہ پہاڑوں سے پانی رساتے رہتے ہیں، لیکن چاند میں سرے سے یہ عوامل موجود نہیں ہیں، چاند کے اس پار ثلث کرے ہیں لیکن اس کاظم کہ وہ آباد ہیں یا ویران ممکن نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں گھاس جو زندگی کا ادنیٰ ترین مظہر ہے موجود ہے، لیکن چاند کا کرہ ہوا اور پانی دونوں سے خالی ہے، اس لئے اس میں کسی قسم کی نباتی اور حیوانی زندگی کا امکان نہیں ہے،

## ترکی میں پارچہ بانی کی ترقی

ترکی میں جمہوریت کے قیام سے پہلے رونی اور سوت کی کوئی قابل ذکر صنعت نہ تھی، اور اس میں وہ دوسرے ملکوں کی محتاج تھی، لیکن اب رونی کی کاشت اور سوت کے کارخانوں میں غیر معمولی ترقی ہو رہی ہے، سب سے پہلے ترکی نے رونی کے بیج ہندوستان سے حاصل کئے تھے جمہوریہ ترکی رونی کی کاشت اور سوت کے کارخانوں کی ترقی کی انتہائی کوشش کر رہی ہے تاکہ مستقبل قریب میں کپڑوں کے لئے وہ دوسرے ملکوں کی محتاج نہ رہ جائے، اس کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹۲۳ء سے لیکر ۱۹۳۱ء کے درمیان رونی کی کاشت یگنی ہو گئی ہے، چنانچہ اب ۱۰۰،۰۰۰ سے لیکر ۳۰۰،۰۰۰ ہیکر (ایک ہیکر ۲۰ کیلوگرام کا ہوتا ہے) تک رونی پیدا ہوتی ہے، بھمت انونو نے اپنی وزارت کے زمانہ میں ایک پروگرام بنایا تھا جس کے مطابق رونی کی کاشت کا قریب پچاس



ہو چکے ہیں، طلبہ کے موجودہ رجحان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو سب سے زیادہ ذوق شہسواری، تیراکی اور امداد عامہ (ریلین) کی تعلیم سے ہے، محقریب فوجی افسر و جوانوں کے سامنے ان کی ان ذمہ داریوں پر جو جنگ کے بعد ان پر عاید ہوں گی کچھ دینگے، برطانوی مشرقی افریقہ میں جمعیت انجمن اسلام کی جانب سے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے بہت سے مدارس قائم ہیں، حال میں اس انجمن نے مصر کی وزارت تعلیم سے ان مدارس کو اپنی نگرانی میں لینے کی درخواست کی ہے، اور اس کے شرائط دریافت کئے ہیں،

## سیال شکر

حال میں ایک امریکن ماہر کیمیا نے فلسطین میں سیال شکر بنانے کا تجربہ کیا ہے، یہ شکر سیب اور کیلہ وغیرہ ترمیوون سے بنتی ہے، یہ بازار میں بھی آگئی ہے، ہٹلون اور تموہ خانوں میں شکر کے صرف میں پابندی کے قوانین پر بڑی سختی سے عمل ہو رہا ہے چنانچہ خریداروں کو تھوہ وغیرہ بغیر شکر کے دیا جاتا ہے، یہ لوگ تھوڑی شکر خود اپنے ساتھ رکھتے ہیں جسے منہ کا فرہ بدلنے کیلئے ڈال لیتے ہیں،

## زمین کی موجودہ آبادی

دنیا کی اقتصادی حالت کے سلسلہ میں جمعیت اقوام کی جانب سے جو تازہ بیان شائع ہوا اس معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۹ء کے آخر میں دنیا کی آبادی دو ارب ۱۰۰ ملین تک پہنچ گئی ہے، اس میں ۵۰ ملین چین ۳۸ ملین ہندوستان اور ۳۰ ملین جاپان کی آبادی ہے، مختلف ملکوں کے اموات کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے مقتولین کی تعداد کے علاوہ جو ابھی صحیح نہیں معلوم ہو سکی ہے ۱۹۴۰ء میں عام طور سے یورپ کے اکثر حصوں میں اموات کی شرح بڑھ گئی ہے، ”م“

# ایک بیکار

## ”مواعظ تجدید“

از

جانبی علی

عجیب فتنہ ہی رہا رب جہان میں دورِ جدید  
 ہے اس کی عقلِ تجدید و نوا از کافوئی  
 اسے پسند نہیں اب یہ بزمِ فرسودہ  
 نئی اساس پہ دنیا سے نو کرو تعمیر  
 غرض یہ ہے کہ یہ بزمِ جہان بدل جائے  
 جدید طرز پہ ہوا اجتہادِ فکر و نظر  
 عبث ہیں آج روایاتِ سیرۂ صد سال  
 قدیم عہد کے سرمایہ اسے منقولات  
 سننِ اصحاب و مساند کا دفترِ پاریں  
 اصولِ شرع میں بھی ناگزیر ہی ترمیم  
 اسے بھی ڈھال دو اب عہدِ نو کے سانچوں  
 جہانِ نو میں نہیں اعتبار کے قابل  
 نہ فکرِ روزِ قیامت نہ خوفِ یومِ وعید  
 جہانِ کمزور کی ہر شے ہے لائقِ تجدید  
 زبان پہ اس کی ہوا کا تازہ بخن کی نوید  
 بنائے کمزور کے ڈھانے کی ہر مہین تائید  
 وہ کر رہا ہے ہر اک انقلاب کی تائید  
 کہ عہدِ نو میں خطا ہے قدیم کی تقلید  
 ہے اب یہ دفترِ پارینہ لائقِ تردید  
 جدید دور کے عقل و قیاس کو ہیں بعید  
 نئے سرے سے ہو محتاجِ عامہ تنقید  
 کہ انقلابِ زمانہ کا اقتضا ہے شدید  
 تہا نہ پاس ہے موجود جو کتابِ مجید  
 یہ فلسفہِ شریعت یہ فقرِ بے تجدید



ضرورت اب ہو کہ ان کو جہان میں پیش کرو یہ ذوقِ دانشِ حاضر، آبِ زنگِ جدید  
 زبانِ پاک پہ دانشِ دورانِ حاضر کے بڑی ہی شانِ سہین یہ مواظظِ تجدید  
 ہزار حیف یہ نکتہ ہے ان سے پوشیدہ  
 بری ہے نسخ و تغیر سے مذہبِ توحید

## شعلہ نو

از

جنابِ روشِ صدیقی

دیرِ دہِ انجم نہ سرِ چرخِ برین ہے اے خوابِ محبت تری تعبیر ہیں ہے  
 محسوس ہوا سرحدِ امکان سے گذر کر اربابِ فانی کوئی منزل ہی نہیں ہے  
 انجام سے آزاد ہے آغازِ محبت اس صبح کی آغوش میں خوشی یقین ہے  
 اے اہلِ نظریہ بھی کسی پر ہوا روشن عالم ہے حسین یا نگہِ شوقِ حسین ہے  
 باطن میں ہر اک لمحہ احساس ہو سچہ ظاہر میں کوئی در ہے نہ آغوشِ جبین ہے  
 افلاکِ نشین جس کی پٹ سہ نہ سکیں گے وہ شعلہ نو زینتِ دامنِ زمین ہے  
 دنیا سے ہے دل شاد و بھتی لہو و دانوس تسکینِ محبتِ زمیں ہو نہ وہین ہے  
 جس قہرِ مسرت میں فروکش ہو محبت وہ قہرِ مسرت تو مرا قلبِ حزین ہے

اے شیخِ حرمِ عالِ روش بھی ہوا معلوم

سنتے ہیں کہ اک رندِ خرابات نشین ہے

# بِالتَّقْوَىٰ وَالتَّحْقِيقِ

## حضرت مجدد کا تصور توحید

*The Mujaddids Conception of Tauhid*

مصنفہ ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (علیگ) تقطیع اور سطحیست  
۱۹۶۷ء، کانڈ سپید ٹائپ روٹشن، قیمت تین روپے، لئے لاپتہ شیخ محمد اشرف، کنیر کارار، لاہور،  
از مولانا مسعود عالم ندوی کئیلار اور نیٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ

(۱)

توحید اسلامی تعلیمات کی اصل اور بنیاد ہے، یہ ایک واضح اور صاف تصور تھا جسے عرب کے بدو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے، اور جس پر عسک سلف عقل و فلسفہ کی خوشہ چینی کے بغیر بحیثیت اعتقاد رکھتے تھے، کچھ سرچشمہ نبوت سے دوری اور کچھ بیرونی اثرات کے ماتحت، یہ صاف اور شفاف چشمہ رفتہ رفتہ گدلا ہونے لگا، اور ویدانت اور نو افلاطونی فلسفہ کے اثر سے مسلمان صوفیوں نے اسے "وحد الوجود" کا نیم فلسفیانہ لباس پہنا دیا، یہ عقیدہ مسلم سوسائٹی کے جسم و جان میں اس طرح حلول کر گیا کہ زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر نظر آنے لگا، مذہب، اخلاق، ادب، شعر، فنون لطیفہ کوئی چیز اس کے دائرہ اثر و نفوذ سے باہر نہیں تھی، پوری سوسائٹی کو ماریا کا انجشن و کیرسٹ اور ڈھیلا کر دیا گیا۔ — "یہ سب بڑی صداقت" قرار دی گئی، جہانمک ایک متراض انسان کی رسائی ہو سکتی تھی، بلکہ اسے اسلامی تعلیمات کا حاصل بنایا گیا، بزرگون، ولیون، صوفیوں اور مقدس روحوں نے اس کا تہرہ

کیا کشف و شهود کے واسطے سے ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی، ایون تو وحدۃ الوجود کا عقیدہ مسلمان صوفیوں کے دلوں میں تیسری صدی ہجری ہی کے اختتام پر اپنی جگہ پیدا کر چکا تھا، اور احسان کے حدود سے گذر کر تصوف نے راہبانہ جاہلیت کی شکل اختیار کر لی تھی، لیکن اس فلسفہ کی باضابطہ تدوین و تشکیل چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے متفلسف صوفیوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں ہوئی، جس نے تصوف کو فلسفہ کے رنگ میں رنگ کر ایک مخصوص قسم کی غیر اسلامی الہیات (Metaphysics) کا فکری نظام قائم کر دیا، اس طائفہ کے ممتاز افراد ابو الفتوح شہاب الدین یحییٰ بن بشیر سمرقندی مقتول (ف ۵۸۵ھ) ابن عربی (ف ۶۳۰ھ) ابن فارض (ف ۶۳۲ھ) ابن سبعین (ف ۶۶۵ھ) عقیف الدین تلمسانی (ف ۶۹۰ھ) اور ان کے ہم نوا حضرات ہیں، ان میں سے اکثر صاحبوں کا کلام اور تصنیفات عام آدمیوں کے لئے ناقابل فہم اور ایسے الفاظ و اوہام کا مجموعہ ہیں جنہیں کتاب و سنت سے دور کا بھی تعلق نہیں، لیکن جس شخص نے اس عقیدے کی سرگرم تبلیغ کی اور جس کے ہاں جا کر یہ فلسفہ مکمل طور پر پختہ اور مدُن ہو وہ شیخ محی الدین ابن عربی ہیں، جو شیخ اکبر کے نقیب یا دکنے جاتے ہیں، سچی بات یہ ہے ان کی ذات اس فلسفیانہ تصوف کے عروج کی آخری منزل ثابت ہوئی، ان کی تبلیغ نے وحدۃ الوجود کو ایک اسلامی عقیدہ کی حیثیت دیدی، جس سے بڑے بڑے عالموں اور محققوں کے قدم بھی ڈگمگائے، اور اس غیر اسلامی نظریے نے ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر لی،

(۲)

اس وبائے عام کے خلاف جن برگزیدہ ہستیوں اور سنگ شیدائیوں نے آواز

۱۰ حسین بن منصور طاع (ف ۸۳۵ھ) کی شخصیت اس کا دین ثبوت ہے،

آواز بلند کی، ان میں دو شخصیتیں بہت ممتاز ہیں، میری مراد امام تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) اور مجدد الف ثانی حضرت احمد سرہندی (ف ۱۰۳۲ھ) سے ہے، لیکن امام ابن تیمیہ کی تردید ان مارگزیدہ لوگوں کے حق میں اتنی کارگر نہیں ہوئی، جتنی مجدد الف ثانی کی، کچھ تو اس لئے کہ ابن تیمیہ کے زمانے میں (۷۶۱ھ - ۷۶۲ھ) یہ زہرا بھی پوری طرح نہیں پھیل سکا تھا، بعد کی صدیوں میں جب پوری قوم اخلاقی زوال اور سیاسی جمود و قنطل سے دوچار تھی، اس افیون کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، اور زیادہ اسوجہ سے کہ اس مشرب کے صوفیائے پاس قرآن و حدیث اور فہم عام، ہر دلیل کا ایک جواب ہے، "یہ خشتک ملا تصوف اور طریقت کیا جا میں؟ جہاں قرآن کریم کا ظاہر اور باطن الگ الگ ہو، جہاں طریقت کے آئین شریعت کے قانون سے میل نہ نکھلتے ہوں، جہاں تصوف اور تمام قیود سے آزادی ہم معنی تصور کی جاتی ہو، وہاں پچارے امام ابن تیمیہ کی کیا چل سکتی تھی؟ لیکن مجدد الف ثانی کے بارے میں یہ لوگ کیا کہہ سکتے تھے، وہ خود تصوف کے تمام مقامات سے آگاہ تھے، سلوک کی تمام جانی اور انجانی منزلیں طے کر چکے تھے، اور اس راہ کی ان بلندیوں تک ان کی رسائی تھی، جہاں اس زمرہ کے صوفیوں کا ظاہر خیال بھی نہیں گیا تھا، انھوں نے اسی راہ کے واردات کی بنیاد پر وحدۃ الوجود کے عقیدے کی تردید کی، انھوں نے کہا کہ ابن عربی کو دھوکا ہوا جس مقام پر جا کر انھیں وحدۃ وجود محسوس ہوا، وہ سلوک کی آخری منزل نہیں، وحدۃ وجود کے تجربے تو اس عالم کی درمیانی منزلوں کی واردات ہیں، ان پر اعتماد کرنا بڑی غلطی ہوگی، ان درمیانی منزلوں میں سالک کے محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہی ہے، اور اس ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہیں، لیکن آگے بڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض "وحدت شہود" ہے، (یعنی صرف ایسا نظر آتا ہے) وحدت وجود نہیں، (یعنی واقع میں ایسا نہیں)

ابن عربی اور ان کے ہم مشربوں کو کشف اور اپنی باطنی حس پر ناز تھا، مجددِ عالم ثانیؒ نے بھی اسی باطنی حس کے ذریعہ حقیقتوں کا بلا واسطہ مشاہدہ کرنا چاہا اور ”وجودیت“ و ”ظہیت“ کے مدارج کو طے کرتے ہوئے ”عبدیت“ کے مقام بلند تک پہنچے، جہاں انھیں معلوم ہوا کہ ”وجودیت“ اور ”ظہیت“ درمیانی مدارج میں کین ”وحدت“ اور کین ”ظہیت“ کا وہوکا ہوتا ہے اور ایک عرصہ تک ”ظہیت“ کی درمیانی منزل میں جد و جہد کے بعد وہ ”عبدیت“ کے مقام رفیع تک پہنچ کر دم لیتے ہیں، جہاں خالق کائنات اور کائنات کی جد اگانہ حقیقتیں ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہیں، ”اللہ اور دنیا دو چیزیں ہیں، انھیں اس کا پورا یقین ہو جاتا ہے، اور اسی مقام عبدیت پر آکر انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ابتک کے صوفیانہ تجربے حقیقت میں داخلی (subjective) یعنی ان کے محسوسات کا پر تو اور اس لئے ناقابل اعتبار تھے اور ان کی کوئی خارجی حیثیت (Objective Validity) نہیں تھی، اور صوفیانہ کشف و شہود کی واقعی قدر و قیمت پر انہیں شک ہونے لگتا ہے، تا آنکہ وہ ایک تبع سنت مومن کامل کی طرح اعتراف کرتے ہیں، کہ کشف و باطنی حس کے ذریعہ ادراک حقیقت کا ادعا ہی غلط ہے اور جس چیز کے ادراک و شہود کے لئے صوفیہ اتنی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، وہ دراصل ادراک و شہود کی چیز ہی نہیں، اللہ کی ذات یا اس کی صفات کا کسی کو براہ راست ادراک نہیں ہو سکتا، اللہ کی ذات ہمارے عقل و ادراک کی گرفت سے پرے ہے اور بہت پرے ہے۔“

”ان اللہ و لاء الوصاء فہ و لاء الوصاء، اس مقام پر اگر حضرت مجدد و صاف صاف فرماتے ہیں کہ حقیقت کے ادراک کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے، یعنی ”ایمان بالغیب“،

ڈاکٹر بہان احمد صاحب کی زیر نظر کتاب میں حضرت مجددؒ کے اس کارنامے کی تحقیق و تفصیل کی گئی ہے، کتاب کا آغاز ”تہید“ (Proliminary) سے ہوتا ہے،

جس میں مجدد کی حقیقت، مجدد الف ثانی کا مرتبہ، اور وحدت وجود کے متعلق ان کا نقطہ نظر، یہ تفصیلی طور پر پیش کرتے ہوئے، یہ چیز بھی واضح کر دی گئی ہے، کہ شیخ احمد سرہندی نے وحدت وجود کی مخالفت کلامی مذہب یا فلسفیانہ استدلال کی بنیاد پر نہیں کی، بلکہ ان کی تردید کیسکشف پر مبنی ہے (صفحہ ۱۰۵) اس کے بعد مختصر سوانح حیات درج کئے گئے ہیں، (صفحہ ۱۰۶) اس سلسلہ میں ذاتی حالات ماحول، صوفیوں اور علماء کا حال، اکبر کی پالیسی، کارنامے، بعد والوں پر ان کا اثر۔ تمام چیزیں اچانک طور پر آگئی ہے،

سوانح کے بعد "تعارف" (Introduction) کو جگہ دی گئی ہے (صفحہ ۱۰۸-۱۱۰) اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ شعور کی مختلف قسمیں ہیں، نظری اور عقلی شعور کے حدود اخلاقی شعور سے جدا ہیں، اسی طرح منطق اور اخلاقیات میں بھی فرق ہے، ایک اگر نظری شعور کے نتائج و احوال سے بحث کرتا ہے، تو دوسرے کا تعلق اخلاقی شعور کے قوانین و نتائج سے ہو بالکل اسی طرح ایک مذہبی شعور بھی ہے، اور اس کے حدود نظری شعور سے قطعاً جدا ہیں، ان میں سے ہر شعور اسی وقت کارآمد اور منتج ہوگا، جب وہ اپنے حدود کے اندر کام کرے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے شعور ایک دوسرے کے حدود میں دخل انداز ہو جاتے ہیں، یہ کام فلسفہ کا ہے کہ ہر شعور کے حدود کی تعیین کرے، غلطیوں کو واضح کرے، اور یہ بتائے کہ کون شعور کہاں صحیح نتیجہ دے گا، مصنف کا کہنا یہ ہے کہ کائنات اور خالی کائنات کی وحدت کے تصور میں بھی ایسا ہی پیش آیا ہے، یہاں مذہبی وحدت اور نظری وحدت کے درمیان خلط ملط ہو گیا ہے، اور غیر ارادی طور پر ایک کی خصوصیات اور صفات دوسرے سے وابستہ کر دی گئی ہیں، فاضل مصنف نے اس مقام پر نہایت تحقیقی اور دلنشین گفتگو کی ہے، اور پوری کتاب میں یہی پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ جدید فلسفہ کے ایک سنجیدہ طالب علم (مکالمہ)

ہیں، یہ حصہ کتاب کی جان ہے، اور اس فصل کے آخری صفحوں پر اگر دل سے بے ساختہ  
داؤ نکل جاتی ہے،

تعارف کے بعد حسب ذیل ابواب ہیں۔

(۱) حضرت مجدد کا تصور توحید (ص ۱۳۹-۸۵)

(۲) مجدد الف ثانی کے تصور پر بعد والوں کی موافق و مخالف رائیں (ص ۱۶۰-۱۸۱)

آخر میں نتیجہ (Conclusion) ہے (ص ۱۸۷-۱۶۱) جس میں ساری بحث

کا خلاصہ اگیا ہے، اور موافق و مخالف رایوں پر محاکمہ کے ساتھ دلنشین پیرائے میں حضرت  
مجدد کے تصور توحید کی تائید کی گئی ہے، مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (ف) کے  
کے اس خیال کی خاص طور پر تردید کی ہے کہ ابن عربی اور مجدد الف ثانی کے نظریوں میں کو  
بنیادی فرق نہیں، بلکہ یہ صرف استعارات کا الٹ پھیر ہے، مصنف کا خیال ہے کہ دونوں  
کے تصور کے درمیان صاف بنیادی فرق ہے، اور انھوں نے اس کو مدلل طور پر ثابت کیا

کتاب کا انتساب مصنف نے اپنے استاد ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب (صدر شعبہ فلسفہ مسلم  
یونیورسٹی، علی گڑھ) کے نام کیا ہے، اور آخر میں اشارہ یہ بھی ہے، کتاب کا سرسری خاکہ اور بحث  
کا خلاصہ اوپر کی سطروں میں اگیا ہے، جہاں تک اصل موضوع یعنی حضرت مجدد الف ثانی کی  
توضیح، تشریح اور تفہیم کا تعلق ہے، یہیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ فاضل مصنف اپنی کوشش  
میں بڑی کامیابی کے ساتھ عمدہ برآہوئے ہیں، جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، یہ کوشش  
اس لحاظ سے اور بھی قابل قدر ہے کہ یہ اپنے موضوع پر پہلی تحقیقی چیز ہے، اور فلسفہ کے ایک  
ایک فاضل کے قلم سے نکلی ہے، مسلم یونیورسٹی نے مصنف کو اس مقالے پر کالمیت (ڈاکٹریٹ)  
کی سند دیکر اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا ہے، ہم نے ابھی کہا ہے کہ جہاں تک اصل موضوع

کا تعلق ہے، مصنف اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں، باقی جو چیزیں انھوں نے موضوع سے الگ ضمنی طور پر لکھی ہیں، ان میں کچھ فروگزاشتیں ہیں جن سے اصل کتاب پر حرف نہیں آتا، نمونے کے طور پر ہم بعض کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں،

بعد والوں پر حضرت مجدد کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے، شاہ ولی اللہ، حضرت

سید احمد شہیدؒ، اور دوسرے خواص امت کے ساتھ سرسید احمد خان اور مولوی عبد اللہ

چکرا لوی کو شامل کر کے تو مصنف نے غضب ہی کر دیا ہے، سرسید کی تحریفات کو ”اصلاح“

اور تنقید عالی سے تعبیر کرنا انتہائی حیرت انگیز ہے، اگر واقعی ان صاحبوں کو ”مصلحین امت“

میں شمار کرتے ہیں تو یہ ان کی ایک افسوس ناک غلطی ہے، یہ ”خاصانِ خدا“ کی بزم ہے،

یہاں فرنگی تہذیب کے شیدائیوں اور فرنگی عقلیت کے فریب خوردوں کا گذر نہیں، غلو

نیت پر شک کئے بغیر، ان کے لئے دعا، مغفرت ہی کی جائے تو بہتر ہے، اور اگر اپنے

علمی مرکز کی چاہ ہیں وہ ایسا لکھ گئے ہیں تو یہ ایک محقق کی شایان شان نہیں، یہی حکمِ اولیٰ

تو وہ قرآن مجید کے عالم کیا ہو سکتے ہیں، کوئی حدیث کا منکر قرآن کا صحیح عالم ہو ہی نہیں

سکتا، ہونگا ہیں کتاب و سنت کو ایک دوسرے سے الگ دیکھتی ہیں، وہ بنیائی سحر محروم ہیں،

۳۹ کے حاشیہ میں شیخ محمد بن عبد الوہاب (ف ۱۲۰۳ھ) اہل حدیث اور حضرت

سید احمد بریلوی (ف ۱۲۳۳ھ) کے تعلق پر غیروں کی گڑھی ہوئی پرانی داستان دہرائی گئی ہے،

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے نامدار رفقاء کا نجد کی دعوت تجدید یا شیخ محمد بن عبد الوہاب سے

کوئی تعلق ثابت نہیں، یہ اور بات ہے کہ اصل ماخذ (کتاب و سنت) کے ایک ہونے کے باعث

دونوں کے درمیان مماثلت پائی جاتی ہے، تو یہ ان دو بزرگوں اور ان کے ماننے والوں پر

کیا منحصر ہے؟ کتاب و سنت کے علم بردار جہاں بھی ہوں گے ان کی روش ایک دوسرے سے



ملتی جلتی ہوگی، اس سلسلہ میں محمد بن عبد الوہاب کو عبد الوہاب کہا گیا ہے، اور ان کا سال وفات ۱۲۰۱ھ بتایا گیا ہے، یہ غلطی مارگو لیوٹہ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، مقالہ دہابیت) سے ہوتی ہے، اور غالباً فاروقی صاحب نے اسی پر اعتماد کیا ہے، شیخ کی وفات ۱۲۰۲ھ میں ہوئی ہے، (ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ محمد بن عبد الوہاب: معارف مئی، جون ۱۹۷۷ء)

مصنف نے ایک جگہ سنت کا ترجمہ عادت (Habits) کیا ہے، (حاشیہ صفحہ ۳۳)  
اور دوسری جگہ سنت اور سنی کو ایک کر دیا ہے، (صفحہ ۳۴) پہلی بات غلط ہے، سنت کے  
لغوی معنی عادت کے نہیں، دوسری جگہ تعبیر کی غلطی ہے، کتاب و سنت کو دوسری زبانوں  
میں بھی قرآن اور سنت رسول ہی کہنا چاہئے، کتاب کا آخری فقرہ بھی (Back to  
Muhammad) ہے (صفحہ ۱۸) اگر یہ (Back to the Quran) ہوتا تو زیادہ مناسب  
ہوتا، گو آخری دونوں صورتوں میں مدعا میں خاص فرق نہیں پڑتا۔

مقلد کے حاشیہ میں مقلد کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ جو اجماع اور قیاس کو اسلام کا ماخذ (Source) مانتا ہو، یہ بالکل صحیح نہیں، اجماع اور قیاس اسلام کے ماخذ نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں، اگرچہ تو احکام اسلامی کے، نہ کہ اسلام کے، اور عام طور پر اصطلاح فقہاء میں مقلد اس کو کہتے ہیں، جو ایسے اربعہ میں سے کسی کے اجتہادات کا پابند ہو، (اور خود براہ راست کتاب و سنت سے استنباط سائل نہ کرتا ہو)۔ (ص ۹) کے حاشیہ میں بھی اجماع کو اسلام کا متیسرا ماخذ (Additional source) بتایا گیا ہے، اور اسی بنیاد پر بالکل غلط تعریف کی گئی ہے،

امطلاحی عربی کلمات کہ الاما غنیمت ہے کہین کہین کو تا ہی رہ گئی ہے، جیسے وحی

کو بار بار *wake* کہا گیا ہے، حالانکہ صحیح *wakey* ہوگا، اسی طرح *shn*

Shu Zaimiyak Zaimigya ہونا چاہئے، وغیرہ۔

بہر حال تھوڑی بہت معمولی فروگزاشتیں ہیں، ان سے کتاب کی قدر و قیمت پر ذرہ برابر حرف نہیں آتا کہ اس کی مرکزی بحث نہایت مکمل، مدلل اور شافی ہے،

کتاب چونکہ انگریزی میں ہے اس لئے افادہ کا دائرہ محدود رہے گا، حالانکہ اس قسم کے تریاق کی ضرورت زیادہ تر ان لوگوں کو ہے جن کی اکثریت انگریزی نہیں جانتی، فاروقی صاحب اسے اردو کا جامہ پہنا دیتے تو ایک علمی خدمت ہوتی، یہی یقین ہے کہ وہ اند خود اس کام کو کر چکے ہوں گے، یا کر رہے ہوں گے، گذارش صرف احتیاط پیش کر دی گئی ہے،

## الغزالی

امام غزالی کی سوانح عمری اور ان کا فلسفہ، ادب، علم، کلام، اخلاق اور تصوف میں ان کے مجددانہ کارنامے، علمائے سلف میں امام غزالی کی اہمیت سے کوئی شخص ناواقف نہیں، مگر ان کے حالات خیالات اور تحقیقات سے کم لوگ واقف ہیں، ضرورت یہ کہ مسلمان ان کو پڑھ کر فائدہ اٹھائیں، قیمت بدلمر

## سوانح مولانا روم

اسلام کے مشہور صوفی متکلم مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانح عمری، فضائل و مناقب ان کے تصوف کے اسرار، علم کلام کے رموز اور مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ، قیمت: ۱۰۶ صفحہ

## رسالہ اہل سنت

فرقہ اہل سنت و الجماعت کے اصولی عقائد کی تحقیق اور سلف صالحین کے عقائد صحیحہ کی تشریح، قیمت: ۸

## منہج دَارِ الْمُصَنِّفِ

# مکالمہ عاجلہ

وحی الہی، مولفہ مولانا سعید احمد صاحب ایم اے تقیہ بڑی ضخامت ۱۹۲ صفحے کا تذکرہ کتابت و طباعت

بہترین قیمت مجلد عام غیر مجلد ۱۰/- تہہ :- قزوین، ندوۃ المصنفین، دہلی،

انکارِ حدیث کا فتنہ بڑھتے بڑھتے اب انکارِ وحی تک نوبت پہنچ گئی ہے جس کا مظاہرہ کچھ عرصہ پہلے رائج الوقت متاعِ ادب کی ایک دکان سے ہو چکا ہے، اسی زمانہ میں اہل علم نے اس کے جواب اب دیئے تھے، جسے البیان امرِ سر نے براہینِ الہی کے نام سے ایک خاص نمبر میں شائع کر دیا تھا، ان جواب دینے والوں میں مولانا سعید احمد صاحب بھی تھے، اب انھوں نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تالیف فرمائی ہے، اس میں عقلی و نقلی دونوں پہلوؤں سے وحی کے منجانب اللہ ہونے کے دلائل اور اس کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں، سب کے تشفی جو بات دیئے ہیں وحی الہی کی ضرورت اور اس کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کے بعد آیاتِ قرآنی سے وحی قرآنی کے منجانب اللہ ہونے کے دلائل، صفاتِ باری، مثلاً نطق و کلام وغیرہ کی عینیت اور غیریت کے مسئلہ میں بعض غیر اہل سنت فرقوں کی جانب سے جو اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں اس کے جوابات دیئے ہیں، اور ملکہ نبوت پر بحث کر کے اس بارہ میں محققین یورپ کے خیالات نقل کئے ہیں، آخرین کلام اللہ کے وجہ اعجاز پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، ہر بحث نہایت مفصل اور بہت سی مفید بحثوں پر مشتمل ہے، انہیں سے اکثر بحثیں سیرۃ النبوی جلد سوم، الکلام اور معارف میں اس سے زیادہ مفصل موجود ہیں، مولانا کی یہ دینی خدمت قابلِ قدر ہے اور امید ہے کہ اس سے ان لوگوں کو جو خود دینی بصیرت نین رکھتے فائدہ پہنچے گا،

## جگ بیتی حصہ اول، پنڈت جواہر لال نہرو، تقطیع چھوٹی خفایت ۲۵۲ صفحہ، کاغذ

کتابت وطاعت بہتر قیمت جلد سے رہتہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی نمبر ۳

پنڈت جواہر لال نہرو نے جیل کی فرصت میں اپنی لڑکی کے نام دنیا کے تمدنی ارتقار کی تاریخ پر خطوط کا ایک سلسلہ انگریزی زبان میں لکھا تھا، اس میں تمدنی دور کے آغاز سے لیکر اس وقت تک دنیا کی تمام تمدن قوموں، ملتوں اور ملکوں کے تمدنی حالات عروج و زوال اور زمانوں کو اس طرح لکھا تھا، جس سے مختلف تہذیبوں کی پیدائش، دنیا کی مختلف قوموں کی تمدنی حالت عہد بعد کی ترقیان، قدیم و جدید تہذیب کی ارتقائی تاریخ سامنے آجاتی ہے، اصل انگریزی خطوط عرصہ ہوا کتابی شکل میں شائع ہو چکے تھے، اب جناب محمود علی خان صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے، اس حصہ میں عہد قدیم سے لیکر عہد وسطی کے خاتمہ اور دور جدید کے آغاز تک کے حالات ہیں اس میں ایشیا اور یورپ کی قدیم تہذیبوں کی پوری سرگزشت آگئی ہے، اجابجا ہندوستان کی سیاست کی جانب بھی اشارے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ پر صحیح تبصرہ کیا گیا ہے، اہل نفاق انگیز واقعات کی تردید کی گئی ہے، اردو میں دنیا کی تمدنی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب موجود نہیں تھی، جناب مترجم نے اسے اردو میں نقل کر کے ایک مفید خدمت انجام دی ہے، یہ کتاب تاریخ کے طلبہ اور تاریخ سے ذوق رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، لیکن ان خطوط کے لکھے وقت حوالہ کی کتابیں سامنے نہ تھیں، اور نہ ان کی اشاعت کا خیال تھا، اس لئے ان میں عموماً مین نہیں دیئے ہیں، اور ترتیب کا لحاظ بھی نہیں رکھا گیا ہے، اگر یہ دونوں خامیاں نہ ہوتیں تو کتاب کا فائدہ اور زیادہ بڑھ جاتا،

گارشان دی تاسی، مولفہ ڈاکٹر محمدی الدین، زور قادی تقطیع چھوٹی خفایت ۱۷۸

صفحہ، کاغذ کتابت وطاعت بہتر قیمت ہم، پتہ سب رس کتاب گھر فریت آباد جدیدہ بلوکن

مشہور فرانسیسی متشرق کارستان دی تاسی اردو زبان کے ان محنتوں میں ہے جس کے احسان سے اردو کبھی سکدوش نہیں ہو سکتی، اس نے اس زمانہ میں اردو کی خدمت اور حمایت کی، جب خود ہندوستان میں اس کی قدر و قیمت پہچاننے والے کم تھے، عام طور پر لوگ اس کے خطبات کے علاوہ اردو زبان کے متعلق اس کی دوسری خدمات سے کم واقف ہیں، اس کی ساری عمر اردو کی خدمت اور حمایت میں گزری، اردو کتابوں کے فرانسیسی ترجمے کے اس کے مختلف پہلوؤں پر مستقل کتابیں اور بکثرت مضامین لکھے، یورپ میں اردو زبان کی اہمیت قائم کرنے اور وہاں کی تعلیم گاہوں میں اس کو مستقل زبان کا درجہ دینے کی کوشش کی، غرض اردو کی ترقی، اشاعت اور حمایت میں ہر ممکن کوشش صرف کی، جناب مصنف نے اس کتاب میں دی تاسی کے سوانح اور اس کی ان تمام خدمات کو تفصیل سے دکھایا ہے، اس سلسلہ میں اس کے کتب خانے کے اردو مخطوطات کی فہرست، اس کے اردو کے یورپین تلامذہ یورپ کی درس گاہوں میں اردو کی تعلیم، دی تاسی کے دوسرے ہم عصر حامیان اردو اور متشرقین کے مفید حالات بھی آگئے ہیں،

ہماری غذا، مترجمہ جناب مبارز الدین احمد صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۱۵۲ صفحے،

کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت پیم پتر۔ انجن ترقی اردو ہندی، دہلی،

انسانی صحت کے بقا و تحفظ اور جسمانی نشوونما کا دار و مدار بڑی حد تک صحیح اور مناسب غذا پر ہے، لیکن اردو میں اس ضروری موضوع پر کوئی علمی کتاب نہ تھی، جناب مترجم نے ڈاکٹر ڈاربرٹ کی کتاب کی ایک انگریزی کتاب کا جو اس موضوع پر عالمانہ تصنیف ہے، ترجمہ کیا ہے، اس میں ان دونوں امور یعنی جسمانی نشوونما اور صحت کے بقا و تحفظ کے لئے جن حیاتی عناصر اور غذائی اجزاء کی ضرورت ہے ان کو بتانے کے بعد مختلف نباتی اور حیوانی غذاؤں میں ان کی مقدار کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، اس ضمن میں انسانی جسم اور غذا کے متعلق بہت سے ضروری اور مفید معلومات آگئے ہیں، اپنے

موضوع پر کتاب علی اور محققانہ ہے، عام لوگوں کے علاوہ اطباء کے لئے بھی اسکا مطالعہ مفید ہے،

**رضاشاہ پہلوی**، مولفہ جناب محمد اشرف خان صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۶، صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۶ روپے، بر مکتبہ اردو لاہور

اس کتاب میں رضاشاہ پہلوی کے مختصر حالات ہیں، قاجاری دور کے ایران کی حالت و کھانے کے بعد اس کی تجدید و ترقی میں رضاشاہ کے مساعی اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ان کے دور کے فوجی، تعلیمی، سلسلہ رسل و رسائل، دوسری قوموں سے معاہدوں اور دوسرے سیاسی اور اصطلاحی کارناموں اور ترقیوں پر مختصر تبصرہ ہے، آخر میں مغزولی کا ذکر رضاشاہ کی شخصیت اور کارناموں کے مقابلہ میں یہ کتاب نہایت مختصر اور ناکافی ہے، اور اس کی حیثیت ایک مضمون سے زیادہ نہیں تاہم کچھ نہ ہونے کے مقابلہ میں غنیمت ہے،

**فارسی بھگوت گیتا**، مرتبہ جناب محمد شفیع صاحب کنوہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۳۲ صفحے، کاغذ

نفیس، کتابت و طباعت بہتر قیمت معلوم نہیں، پتہ: ایم ایس کنوہ، خیاستاں، گڑھی شاہو لاہور  
ہندوستان کی مشہور و مقدس کتاب بھگوت گیتا کا سب سے پہلا منظوم فارسی ترجمہ غالباً فیضی نے کیا  
لیکن اس میں محققین کا اختلاف ہے، کہ موجودہ ترجمے پائے جاتے ہیں، وہ درحقیقت فیضی ہی کے ہیں یا کسی اور  
یہ ترجمہ اس سے پہلے بھی چھپ چکا ہے، لیکن نہایت سخی اور غلط تھا، اس لئے جناب محمد شفیع صاحب نے اسے  
کے اہتمام سے اسے دوبارہ مرتب کر کے شائع کیا ہے، کتاب کے شروع میں گیتا کے منظوم ترجمہ کے مختلف نسخوں  
کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ ترجمہ فیضی ہی کا ہے، اور گیتا کے موضوع اور مضامین پر مختصر  
تبصرہ ہے، اصل کتاب دو سو صفحوں میں ہے، یہ ترجمہ ایک تاریخی یا وگاری کی حیثیت سے قابل قدر اور جن  
لوگوں کو ہندو تصوف اور ویدانت سے دلچسپی ہو ان کے ذوق کی چیز ہے،

جلد ۵۰ "ماہ رمضان المبارک مطابق ماہ اکتوبر، ۱۹۴۲ء" "عدد ۴"

مضامین

شذرات

۲۴۴-۲۴۲ سید سلیمان ندوی،

۲۵۴-۲۴۵ مولانا عبدالسلام ندوی، امام رازی اور تنقید فلسفہ،

۲۴۴-۲۵۵ جناب عبدالرزاق صاحب قریشی، حضرت میرزا منظر جانجنان،

۲۹۰-۲۴۵ جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے فارسی کے چند قدیم شعراء،

علیگ لکچرار ایڈورڈ کالج امراتہ برار،

۳۰۰-۲۹۱ جناب ابو نعیم محمد بن ابی الیاس علیگ، اردو صحافت کا ارتقاء،

۳۰۸-۳۰۱ راجہ ٹوڈر مل کے لڑکے،

۳۱۲-۳۰۹ اخبار علیہ،

۳۱۲ جناب یحییٰ اعظمی، مقدمہ ماہ میام

۳۱۳ جناب روش صدیقی، سجدہ گہ افلاک،

جناب حسرت ترمذی بی اے ال غزل

ال بی،

۳۲۰-۳۱۵ "ر" مطبوعات جدیدہ



# مشق

۱۳۵۷ھ کو صوبہ بہار کے مشہور متاثر کنندہ شاعر حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی نے اس دنیا سے دونوں کو اوداع کیا، مرحوم کی عمر اس وقت غالباً پچاسی سے زیادہ ہوگی کانوں سے اونچی سننے لگے تھے، مگر اس سن وسال میں بھی ان کی شاعری کے شباب کا وہی عالم تھا، غزلوں کے کہنے کا اتفاق کم ہوتا تھا، مگر قومی وطنی و اخلاقی اور فلسفیانہ نظموں کا شوق زیادہ تھا، زیادہ تر اردو میں اور کبھی کبھی فارسی میں کہتے تھے، اور شاہدِ آزاد عربی میں بھی طبع آزمائی کی نوبت آجاتی تھی،

پٹنہ میں سرسید مرحوم کی تعلیمی و قومی تحریک کے علمبردار قاضی رضا حسین صاحب مرحوم تھے، یہ ان کے حیدر آباد کے وفد کے ایک رکن بھی تھے، قاضی صاحب مرحوم کی فیض بخش علمی صحبتوں میں بہار کے جو چند نوجوان ابھرے، بڑھے اور پھیلے ان میں ایک نام حافظ آزاد مرحوم کا بھی ہے، چنانچہ سرسید مرحوم کے اُس ۱۸۹۱ء والے حیدر آبادی وفد میں جس کے دوسرے ممبر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالی وغیرہ تھے، قاضی رضا حسین صاحب کے ساتھ آزاد مرحوم بھی تھے،

میں نے ان کو سب سے پہلے ۱۹۰۷ء میں جب میری نو عمری تھی زندہ کے اجلاس پٹنہ میں اپنا ترنہ پڑھتے سنا، بلند قد، اونچی آواز، خود اعتمادی کے تیور، لہجہ پرجوش، کٹھڑے میں شیر کی گرج سی سنائی دیتی تھی، سامنے علماء اور مشائخ کی صفیں تھیں جن کی تعداد کئی سو سے کم نہ ہوگی، اکثر کی نورانی شکلوں کی یاد اب بھی دل کو منور کرتی ہے، شاعر نے جب ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے یہ شعر پڑھا ہوا،  
نشانِ کاروانِ رفتہ میں دل کے اجاے ہیں غنیمت ہی غنیمت ہیں کہ سب اللہ و اے ہیں



تو تحسین و آفرین کی آوازوں سے ساری فضا گونج گئی تھی، اسی جلسہ میں آغا بھرپورانی بھی تھے اور انھوں نے بھی اپنا وہ فارسی قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع تھا

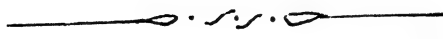
ستایش می سر و البتہ کیا ذاتِ یزدوں را کہ او از لفظ تشریف شرف بخشید انسان را

مولانا شبلی مرحوم سے ان کی ملاقات اسی عہد جوانی کی تھی، مولانا مرحوم نے جن دنوں مشہورہ میں اپنی اُن فارسی غزلوں کا سلسلہ شروع کیا تھا جو بوسے گل اور دست گل کے نام سے چھپ چکی ہیں اور ملک میں اُن غزلوں کا پرجوش خیر مقدم کیا جا رہا تھا، اور اہل سخن انکے جواب میں غزلیں لکھا کرتے تھے تو ان میں سے ایک حافظ صاحب مرحوم بھی تھے، غالباً یہی سلسلہ تھا مولانا مرحوم کلکتہ سے لوٹ کر تپنہ میں مولوی خدابخش خاں مرحوم (کتنی یاد وائے) کے یہاں ٹھہرے تھے، خاکسار بھی حاضر تھا، اتنے میں مولانا سے ملنے حافظ صاحب مرحوم بھی آگئے، اس زمانہ میں مولانا کی ایک فارسی غزل نئی نئی شائق افتادہ بود، طاق افتادہ بود لکھی تھی وہ مولانا نے ان کو سنائی، انھوں نے بعد کو اس کا جواب لکھا، سب سے آخری دفعہ وہ ۱۹۲۷ء کے اجلاسِ ندوہ کانپور میں جس کے صدر حکیم اجل خاں مرحوم تھے اور اصرائے تھے اور اپنی ایک نظم پڑھی تھی،

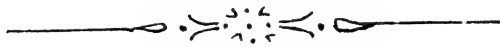
مرحوم فطری شاعر تھے، کسی استاد سے کبھی اصلاح نہیں لی، مشکل قافیوں اور ردیفوں کا بھی شوق تھا، زبان و محاورات و روزمرہ کے بجائے دقیق مضامین و معانی کا شوق زیادہ تھا، اسی لئے مشکل الفاظ سے پرہیز نہ تھا، طبیعت میں ذکاوت و ذہانت تھی، اور اپنے لئے آپ راستہ پیدا کرنے کی دھن تھی، اقلیدام سے نفور تھے، جوانی میں شاہِ عظیم آبادی سے بھی بھڑتے رہتے تھے اور اپنیج میں مذاقہ وادِ نظم بھی دیتے تھے، اور مدت سے خانہ نشین تھے، باہر کی آمد و رفت بند تھی کبھی کبھی ایک آدھ نظم کسی رسالہ میں نکل جاتی تھی، اسی حالت میں اپنی وطن شاہوگنہ ضلع گیا میں داعی اجل کو لبیک کہا،

حقِ مغفرت کرے عجب آزارِ مردِ تھا

اگست ۱۹۲۷ء کے معارف میں بیرونی کی کتاب الصید لیا کتاب الصیدۃ کی اصل عربی یا فارسی ترجمہ کی بابت اہل علم سے استفسار کیا گیا تھا، مولوی سید حسن صاحب برنی مولف البیرونی نے اطلاع دی ہے کہ اس کا خلاصہ فارسی ترجمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے، اور اس کا ذکر ان کی کتاب البیرونی کے ملام پر ملے گا،



ان کی کتاب البیرونی کو نحال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب لغات الطب میں ہے، نسخہ ششہ کا لکھا ہے، اس کا ترجمہ ہندوستان ہی میں عثمان الکاشانی نے کیا تھا، کتاب کا طرز یہ ہے کہ پہلے ہر دوا کا عام نام لکھا ہے، پھر عربی، یونانی، سریانی، جرجانی، خوارزمی، فارسی، عراقی، ہندی، سندھی نام لکھے ہیں، اور پھر اس کی خاصیت بیان کی ہے،



جنوبی ہند کی دو یونیورسٹیوں میں اردو، فارسی اور عربی کی دو کرسیوں کے قیام سے اس دور افتادہ حصہ ملک میں اسلامی ادبیات کی ترقی کی نئی راہیں نکلی ہیں، میسر یونیورسٹی نے اپنی یہاں اردو اور فارسی کی ایک کرسی قائم کی ہے اور اس پر حیدر آباد کے نوجوان ادیب پروفیسر عبدالقادر سردری کا انتخاب کیا ہے جس کے لئے یونیورسٹی اور پروفیسر دونوں کی خدمت میں ہدیہ تہنیت پیش ہو، ڈاکٹر یونیورسٹی نے سری پتر تر نال ہمارا جہ کی منظوری سواپنے یہاں عربی کی کرسی بڑھائی ہو اور اس کے لئے اے کے محمد ایم اے کو جو عربی کے لائق فاضل ہیں اور جن کے عربی میں خطوط میرے پاس وقتاً فوقتاً آیا کرتے ہیں، لکچر مقرر کیا ہو، ان اطراف میں عربوں کی پرانی نوآبادی ہونے کے سبب عربی کی خاصی اہمیت ہو، اور اس بنا پر ڈاکٹر یونیورسٹی کے اس ضروری اضافہ کی قدر سارے ملک میں کی جائیگی



# مقالہ

## امام رازی اور تنقید فلسفہ

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۲)

ملاحظہ کا ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر خدا موجود ہے اور اُس نے دنیا کو علم و حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے، تو اس میں برائیاں کیوں پائی جاتی ہیں، اگر وہ دنیا کو خیر محض کے ساتھ پیدا کرتا تو اس کی قدرت و حکمت زیادہ نمایاں ہوتی اُس بنا پر شیخ نے اشارات میں خیر و شر پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے، جس کا خلاصہ امام صاحب کی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ خیر و شر کے محاط سے موجودات کی صرف پانچ قسمیں ہو سکتی ہیں،

- (۱) وہ موجودات جن میں صرف بھلائی ہی بھلائی پائی جائے،
  - (۲) وہ موجودات جن میں اگرچہ کچھ برائیاں بھی ہوں لیکن ان میں بھلائی برائی سے زیادہ ہو،
  - (۳) وہ موجودات جن میں بُرائی اور بھلائی دونوں برابر برابر پائی جائیں،
  - (۴) وہ موجودات جن میں برائیاں بھلائی سے زیادہ پائی جائیں،
  - (۵) وہ موجودات جن میں صرف برائی ہی بُرائی پائی جائے،
- ان میں پہلی قسم کا وجود تو خدا کی حکمت اور رحمت کے بالکل مطابق ہے، دوسری قسم بھی

حکمت سے خالی نہیں، کیونکہ اگر چند برائیوں کی وجہ سے ان کا وجود نہ ہو تو بے شمار بھلائیوں سے دست بردار ہونا پڑیگا، مثلاً آگ میں جلانے کی جو خاصیت ہے، اس سے ہزاروں فائدے حاصل ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھی اس سے بعض انسان یا جانور جل بھی جاتے ہیں، اس لئے اگر اس برائی کی وجہ اس کو پیدا نہ کیا جائے تو یہ تمام فوائد بھی حاصل نہ ہوں گے،

دنیا میں جتنی قسمیں ہیں وہ انہی دونوں قسموں میں داخل ہیں، ان کے علاوہ تیسری، چوتھی یا پانچویں قسم کا وجود نہیں ہے، کیونکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اگرچہ آلام و اسقام نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، لیکن صحت و سلامت کا وجود ان سے بہت زیادہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ برائیاں بالکل عرضی ہیں، یعنی جن چیزوں میں بھلائیاں زیادہ ہیں ان کے لئے یہ ضروری سی برائیاں بھی لازم ہیں، اور اسی لزوم کی وجہ سے وہ برائیاں ان سے الگ نہیں ہو سکتیں، لیکن امام صاحب کے نزدیک حکماء کے اصول کے مطابق خیر و شر کی بحث ہی نہیں پیدا ہو سکتی، کیونکہ حکماء نہ خدا کو فاعلِ مختار مانتے ہیں اور نہ حسن و قبح عقلی کے قائل ہیں، اور یہ بحث انہی دونوں اصول سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ جو لوگ خدا کو فاعلِ مختار مانتے ہیں اور ان کے نزدیک خدا کو ہر کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے، ان سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ خدا نے ایسا کیوں کیا؟ اور ایسا کیوں نہیں کیا، لیکن جب حکماء کے نزدیک خدا موجب بالذات ہے، اور اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں، ان کا صادر نہ ہونا محال ہے، تو یہ سوال ہی نہیں کیا جاسکتا، آفتاب سے روشنی بہر حال نکلے گی، خواہ یہ روشنی مضر ہو یا مفید؟ کیونکہ روشنی آفتاب کے لئے لازمی ہے، اور اس سے روشنی کا نہ نکلنا محال ہے، اسی طرح اس سوال کے لئے حسن و قبح عقلی کا قائل ہونا بھی ضروری ہے، جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے، اور نہ جو لوگ حسن و قبح عقلی کے قائل نہیں ان کے نزدیک خدا کے کسی فعل میں برائی نہیں ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے وہ بہتر و پسندیدہ ہے، جیسا کہ اشاعرہ کا خیال ہے، بہر حال یہ بحث صرف

کے اصول کے مطابق صحیح ہو سکتی ہے، جو خدا کو فاعل مختار مانتے ہیں اور اس کے ساتھ حسن و قبح عقلی کے بھی قائل ہیں، لیکن جو لوگ ان دونوں اصولوں کو نہیں مانتے یعنی حکماء و اشاعرہ ان کے لئے ایک غیر ضروری بحث ہے، البتہ حکماء اس مسئلہ پر دو حیثیتوں سے بحث کر سکتے ہیں،

(۱) ایک تو یہ کہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مخلوقات الہی ان پانچوں قسموں میں سے کس قسم میں داخل ہیں، یعنی ان میں صرف بھلائی ہی بھلائی یا بُرائی ہی بُرائی پائی جاتی ہے، یا ان میں بُرائی اور بھلائی دونوں مخلوط ہیں،

(۲) دوسرے یہ کہ خدا کو ایک کامل ترین نظام کا علم ہونا اس نظام کے وجود کی علت ہو اس لئے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ وہ کامل ترین نظام کیا ہے؟ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہی نظام پیدا کیا گیا ہے،

بہر حال امام صاحب نے فلسفیانہ مسائل کی تردید میں اس کی کوئی تفریق نہیں کی ہے کہ وہ ہند کے موافق ہیں یا مخالف؟ بلکہ وہ فلسفہ کے تمام مسائل پر اعتراضات کرتے ہیں، البتہ انھوں نے فلسفیانہ مسائل پر جو اعتراضات کئے ہیں، ان کے پیش نظر رکھنے کے بعد انسان کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ فلسفہ کوئی تشفی بخش چیز نہیں ہے، اس لئے اُس کے دل سے فلسفہ کی عظمت کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے اور وہ ایک ایسے علم کی جستجو میں مصروف ہو جاتا ہے، جو نکتہ چینی اور خرد گرد گیری سے بالاتر ہو اور یہ چیز امام صاحب کے نزدیک قرآن مجید ہے، چنانچہ وہ خود اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ ”میں نے فلسفہ اور علم کلام دونوں کے طرز و روش کی جانچ کی تو ان میں وہ فائدہ نہیں دیکھا جو اس فائدہ کے برابر ہو جس کو میں نے قرآن مجید میں پایا کیونکہ وہ تمام عظمت و جلال کو صرف خدا کے لئے تسلیم کر دیتا ہے اور اعتراضات و مناقضات میں تفتق کرنے سے روکتا ہے۔“

فلسفیانہ مسائل پر رد و قدح کی ابتدا اگرچہ ابتدا ہی سے ہو چکی تھی، لیکن امام صاحب نے

اس کو انجام تک پہنچایا اسلئے جو لوگ فلسفہ کے حامی تھے، انھوں نے خاص طور پر امام صاحب کی نصیحت کی، اور ان کے اعتراضات کے جوابات دیئے، فلسفہ و حکمت کی دوسیں تھیں، ایک حکمت ذوقیہ جس کا موجد افلاطون تھا اور دوسری حکمت نظریہ جو ارسطو کی طرف منسوب تھی مسلمانوں میں اگر علمِ طور پر حکمت نظریہ یعنی ارسطو کے فلسفہ کی اشاعت ہوئی اور امام صاحب نے اسی فلسفہ کو اپنے اعتراضات کا آماجگاہ بنایا تاہم شیخ الاشراق کی وجہ سے بعض مسلمان فلسفیوں میں حکمت ذوقیہ کا ذوق بھی پیدا ہو چکا تھا، اس لئے ان لوگوں کو فلسفہ کی یہ بے وقعتی گوارا نہیں ہوئی اور انھوں نے امام صاحب کے اعتراضات کو اسی ذوق کی ناآشنائی کا نتیجہ قرار دیا، اور امام صاحب کی اس فلسفیانہ روش کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، چنانچہ شہرِ ہمدانی نے جو غالباً حکمت ذوقیہ کا ذوق شناس اور شیخ الاشراق کا نہایت مدافع امام صاحب پر نہایت سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی، وہ امام صاحب کے تذکرے میں لکھا ہی کہ وہ بحث و مناظرہ اور رد و قرح میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اور ان کے زمانہ میں کوئی شخص بحث و نظر میں ان کا ہمر نہ تھا، وہ نہایت ذہین، اور کثیر التفکر تھے، اکثر علوم میں ان کی تصنیفات ہیں، لیکن حکماء و محققین کے ذمے میں ان کا ذکر نہیں کیا جاسکتا، اور دقیق النظر لوگوں کی صحبت اور ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، انھوں نے حکماء پر یہ کثرتِ تشکوک و شبہات کئے، اور ان سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے، ان کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے، ان میں اکثر لوگ ان کی وجہ سے گمراہ ہوئے اور ان شبہات سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے اور بعض لوگوں نے ان شبہات میں اور اضافہ کیا، ان شبہات کے حل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے حکماءِ قدیم کے مقاصد نہیں سمجھے، انھوں نے بحث کی بنیاد مشائخ کے قواعد پر رکھی جو حکماءے کشفِ ذوق کے نزدیک خود نہایت بے بنیاد تھے، ورنہ اگر انسان کو ذوق کے ذریعہ سے اصولِ صحیح کا علم ہو جائے تو اس کو ان کے حل کا طریقہ بخود ہی کوشش میں معلوم ہو جائے، اس قسم کے شبہات صرف اُن عامی اور زنگ آلود فوس میں پیدا ہو سکتے

ہیں، جو فیض قدسی اور نزولِ نور الہی کے لئے تیار نہیں ہیں، یہی نور ہے جس سے دل کھل جاتا ہے۔ اور اسی نور سے شبہات کا ازالہ ہوتا ہے اور حقائق و معارف حاصل ہوتے ہیں، اور نہ صرف ان کتابوں کے مطالعہ سے یقین علمی کا حاصل ہونا محال ہی تھا، اس کے ملائکہ، اور اس کے ملکوت کے لطائف نے وہ کی علامت ان شبہات کا دلوں میں جوڑ پکڑ جانا ہے، خلاصہ یہ کہ انھوں نے (امام رازی) حکماء متاہلین کا کوئی بھید نہیں پایا، اور علمائے قدیم کا فحشی علم حاصل نہیں کیا، بلکہ ان کا عمر بھر یہ کام رہا کہ لوگوں کے اقوال کو جمع کرتے تھے، ان سے تفریعات کرتے تھے، ان کی تحریر و تہذیب و توضیح کرتے تھے، کبھی ان میں اختصار پیدا کرتے تھے، کبھی ان کی تفصیل کرتے تھے، کبھی ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں اور ایک مسودہ سے دوسرے مسودہ میں عبارات کے تغیر کے ساتھ ان کو منتقل کرتے رہتے تھے اور اس کا مقصد محض وہی جاہ اور خیالی ریاست کا حاصل کرنا تھا، اور حکمت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھانا تھا، ان کی سب سے عجیب و غریب حالت یہ ہے کہ انھوں نے حکمت میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں جس سے ان کو یہ وہم پیدا ہو گیا کہ وہ ان حکماء میں سے ہیں جو انتہائی مرتبہ اور انتہائی مقاصد پہنچ گئے ہیں، حالانکہ وہ ان میں سے کمترین لوگوں کے مرتبہ کو بھی نہیں پہنچے، پھر وہ ابوالحسن اشعری متکلم کے مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کے دونوں ہاتھوں میں سے کون سا ہاتھ زیادہ لمبا ہے، کیونکہ وہ حکمت بختیہ اور حکمت ذوقیہ دونوں سے معارف تھے، اور حد کو نہ کرنا اور دلیل کو قائم کرنا نہیں جانتے تھے، بلکہ وہ ایک غریب بڈھے ہیں، جو اپنے مذہب میں متحیر ہیں اگرچہ وہ (امام رازی) حکمت کے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے، تاہم ان میں حکمت کی بڑی استعداد موجود تھی، اور حکماء کے کلام سے فوائد اور لطائف کے نکالنے کی ان کے فہم بہت زیادہ قوت تھی، لیکن ان کا عیب یہ ہے کہ وہ تجر و سلوک سے بالکل نا آشنا تھے، اس لئے وہ فراغتِ قلب نہ حاصل کر سکے، اور یہ چیز صرف اسی سے حاصل ہوتی ہے، اس لئے وہ حکماء کے

مقامات تک ترقی نہ کر سکے اور ان کے رموز و اسرار سے واقف نہ ہو سکے، ان کے بعض شبہات صحیح بھی ہیں، لیکن اخیر میں وہ ان کی طرف اشارہ کرنے سے عاجز ہو گئے، کیونکہ ان کے پاس وہ اصل نہ تھی جس پر وہ اپنی بحث کی بنیاد رکھتے۔

اس میں شبہ نہیں کہ امام صاحب نے حکمت ذوقیہ کی تحصیل نہیں کی اور اس کے لئے بجا ہر دور یا ضمت کی زحمت کبھی نہیں اٹھائی، اس وقت مسلمانوں میں عام طور پر فلسفہ مشائیہ کا رواج تھا، اور امام صاحب نے اسی فلسفہ کی تعلیم پائی تھی، اور اسی فلسفہ کے مسائل کو انھوں نے رد و قدح کے لئے سامنے رکھا تھا، اور اس فلسفہ کی نسبت خود شہزوری کو قیلم ہے کہ اس کی بنیاد مضبوط نہیں ہے، لیکن بد قسمتی سے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ اسی فلسفہ کا گرویدہ تھا، اس لئے امام صاحب نے اسی بے بنیاد فلسفہ کی بنیاد کو اور بھی کھوکھلا کیا، اس لئے فلسفہ کی تردید سے ان کا جو مقصد تھا حاصل ہو گیا،

امام صاحب کا دوسرا فلسفیانہ کارنامہ یہ ہے کہ فلسفہ کے متعلق جو اقوال اور دلائل فلسفہ کی کتابوں میں منتشر اور پراگندہ تھے، امام صاحب نے ان سب کو ایک جگہ جمع کیا، ان کی توضیح و تشریح کی اور ان سے نتائج نکالے، اس بنا پر انھوں نے فلسفہ کو نئے سرے سے مرتب کیا اور موجودہ شکل میں فلسفہ کی جو ترتیب باقی جاتی ہے وہ امام ہی صاحب کی ساختہ پر واختہ ہے اور شہزوری نے خود قیلم کیا ہے کہ وہ عمر بھر اسی کام میں مصروف رہے،

شہزوری امام صاحب کی ذہانت، اور فطانت کا بھی معترف ہے، اور ان کے بعض شبہات کو بھی صحیح سمجھتا ہے، اس بنا پر گو فلسفہ ذوقیہ کی نا آشنائی کی بنا پر وہ امام صاحب کو حکماء محققین کے زمرہ میں نہیں شمار کرتا، تاہم جہان تک حکمت بخینیہ یعنی فلسفہ مشائیہ کا تعلق ہے شہزوری کے نزدیک امام صاحب کے زمانہ میں بلکہ ان کے بعد بھی کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا،

حکمت بخینیہ یعنی فلسفہ مشائیہ کے مایوں نے بھی امام صاحب کی فلسفیانہ تصنیفات کی



تردید میں کتابیں لکھیں، اور ان کے اعتراضات کے جواب دیئے، چنانچہ سب سے پہلے سیف الدین آمدی نے امام صاحب کی شرح اشارات کی تردید میں ایک کتاب لکھی، اس کے بعد محقق طوسی نے بذات خود اشارات کی شرح لکھی، اور اس میں امام صاحب کے اعتراضات کے جوابات دیئے، پھر قطب الدین رازی نے محاکمات کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں امام صاحب کے اعتراضات اور محقق طوسی کے جوابات کے درمیان محاکمہ کیا اور بدر الدین محمد بن اسعد یامانی نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی، غرض امام صاحب کے زمانہ سے فلسفیانہ ہنگامہ آرائی کا ایک نیا دور شروع ہوا، اور فلسفیانہ مسائل کے ساتھ لوگوں کو جو عام دلچسپی پیدا ہوئی وہ اسی زمانہ سے ہوئی، اور فلسفیانہ مسائل کے بحث و تنقید کا کوئی پہلو نقشہ نہ رہ سکا، اس بنا پر فلسفہ کا جو ذوق آج تک موجود ہے وہ درحقیقت امام صاحب ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، امام غزالی کے زمانہ تک فقہاء و محدثین فلسفہ و منطق سے بالکل نا آشنا تھے، امام غزالی نے اس بیگانگی کو دور کیا، اور امام رازی نے اپنے زور تحریر اور دلائل کی قوت سے اس کو فقہاء و محدثین کا دلچسپ ترین مشغلہ بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کے زمانہ سے لوگوں نے قدما کی کتابیں چھوڑ دیں اور امام صاحب کی تصنیفات کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے،

امام صاحب نے فلسفہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، محقق طوسی نے ان کے جو جوابات دیئے ہیں اور قطب الدین رازی نے ان کے درمیان جو محاکمہ کیا ہے، اس موقع پر مناسب تو یہ تھا کہ ان سب کو نقل کر کے ان کے درمیان موازنہ کیا جاتا، لیکن یہ اعتراضات و جوابات نہایت دقیق اور غیر محجب ہیں، اور ان کے موازنہ کے لئے نہایت دقیق اور طویل الذیل بحث کی ضرورت ہوگی، جس سے اس مضمون کے ناظرین کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی، اس لئے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں، البتہ ایک آسان مسئلہ

کے متعلق امام صاحب اور محقق طوسی دونوں کی شرحوں کی عبارت کا خلاصہ درج کرتے ہیں، جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ امام صاحب فلسفیانہ مسائل کی تشریح کس جامعیت اور وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں، شیخ نے قوت قدسیہ کے اثبات پر اشارات میں جو کچھ لکھا ہے اس کی شرح امام صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

”یہ شیخ جب فکر و حدس کے درمیان فرق بیان کر چکا، اور اس سے پہلے یہ بیان کر چکا تھا کہ انتقال حدسی نہایت دور رس اور عمدہ ہوتا ہے، اور جس روح میں یہ ہوتا ہے اسی کا نام قوت قدسیہ تو اب اسی قوت قدسیہ کو ثابت کرنا چاہتا ہے، کیونکہ تقسیم عقلی کے رو سے جس چیز کا فرض کرنا صحیح ہو اس کا وجود ضروری نہیں ہے، (اس لئے اس پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت ہے) اور اس پر جو دلیل لائی جاتی ہے وہ کبھی اتنی ہوتی ہے، اور کبھی لمبی اور شیخ نے اس فصل میں دلیں انی کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ قوت قدسیہ حدس کی ایک قسم ہے، اس لئے حدس کا ثابت کرنا ضروری ہے، لیکن تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حدس کا علم بدیسی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جس میں تھوڑی سی ذہانت بھی پائی جاتی ہو جب اپنی روح کا تجربہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کو بعض اوقات ایسی چیزوں کا علم ہو جاتا ہے جن کے حاصل کرنے کی وہ کوئی کوشش نہیں کرتا، لیکن حدس تو یہی قوت قدسیہ کے اسباب تو ہم کو یہ معلوم ہے کہ فکر کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں، بعض ایسے غبی انسان ہوتے ہیں جن کو فکر سے کسی نامعلوم چیز کا علم سرے سے حاصل ہی نہیں ہوتا، بعض میں تھوڑی سی ذہانت ہوتی ہے بعض میں اس سے زیادہ قوت پائی جاتی ہے، اور وہ حدس کے قابل ہوتا ہے، اس لئے جس طرح نقصان کی انتہا ایسے شخص کی طرف ہوتی ہو، جس میں حدس سرے سے ہوتا ہی نہیں، اسی طرح زیادتی کی جانب ایسے شخص کی طرف انتہا ہونی چاہئے، جو اکثر حالات میں تعلم اور فکر سے بے نیاز ہو،

جانتا چاہئے کہ یہ دلیل دو طریقوں سے بیان کی جاسکتی ہے، ایک تو یہ کہ حدس میں کمی اور بیشی کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے اسلئے اس طرح اس کمی کی انتہا، ایسے شخص کی طرف ہو سکتی ہے جس میں حدس موجود ہی نہ ہو، اسی طرح زیادتی کی انتہا، ایسے شخص کی طرف ہونی چاہئے جس میں غیر معمولی حدس پایا جائے، دوسرے یہ کہ حدس کو فکر کے ساتھ نسبت ہے، اس لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ فکر کا جو طرف ناقص ہے، اس کے مقابلہ میں ایک طرف کامل بھی ہونا چاہئے، اُسی طرح حدس میں بھی جس کا ایک پہلو ناقص ہے، اس کے مقابلے میں ایک پہلو کامل بھی ہونا چاہئے، لیکن یہ دلیل دونوں طریقوں سے کمزور ہے، کیونکہ یہ محض ایک تمثیل ہے،

وقت قدسیہ کے اثبات کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ تصدیقات نظریہ کی انتہا تصدیقات بدیہ پر ہوتی ہے، اور تصدیقات بدیہ اپنے اجزاء کے تصورات پر موقوف ہیں، مثلاً اس بدیہی قضیہ کا علم کہ ”کل جزو سے بڑا ہوتا ہے“، جزا کل اور بڑے کے تصور پر موقوف ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نفوس انسانی ان تصورات کے قابل ہیں پھر جب تصدیقات بدیہ کسی معلم کی تعلیم پر موقوف نہیں ہیں، تو ان مفرد تصورات کو بھی بطریق ادنیٰ کسی معلم کی تعلیم پر موقوف نہیں ہونا چاہئے، پھر تصدیقات بدیہ کی حقیقت جب یہ قرار پائی کہ ان کے اجزاء کا تصور ان کی تصدیق کے یقین کے لئے کافی ہو تو نفس انسانی بذات خود ان بدیہی قضایا کا علم حاصل کر سکتا ہے، اور ان کا اجتماع ممکن ہے، اور ان کی یہ حالت ہے کہ جب وہ مجتمع ہو جائیں گے، تو ان کے اجتماع سے لازمی طور پر علم نظری حاصل ہو جائیگا، تو جب تنہا نفس کا ان تمام قضایا سے جن کے اجتماع سے لازمی طور پر علم نظری حاصل ہو جاتا ہے، متصف ہونا ممکن ہے تو اس علم نظری سے بھی کسی معلم کی تعلیم کے بغیر اس کا مستفہ ہونا ممکن ہوگا، پھر جب علوم نظریہ کو باہم ترکیب دیجائیگی، تو اسکو دوسرے نظری علوم لازم ہونگے، اس لئے ہمارے اس بیان کا اقتضا یہ ہے کہ تمام نفوس انسانی کو تمام علوم نظریہ بغیر کسی گوش

کے فوراً حاصل ہو جائیں، اور حدس کے یہی معنی ہیں، لیکن نفس کا تدبیر بدن میں مشغول رہنا، اس میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے، اور خیال بھی سدراہ ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حدس قوی فطرتِ صلیہ کا اقتضار ہے، اور فکر کی ضرورت محض عوارض کی وجہ سے ہوتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔“

یہ شیخ کی اسی عبارت کی شرح محقق طوسی نے ان الفاظ میں کی ہے:

”یہ شیخ قوتِ قدسیہ کے وجود کو ثابت کرنا چاہتا ہے، اور اس کے اثبات کا طریقہ یہ ہے کہ مطلوب تک پہنچانے میں کیفیت و کم کے لحاظ سے حدس اور فکر کے مختلف درجے ہیں، کیفیت کے لحاظ سے تو اس لئے کہ مطلوب تک یہ کبھی تیزی سے پہنچاتے ہیں اور کبھی دیر سے اور کم کے لحاظ سے اس لئے کہ کبھی مطلوب کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اور کبھی کم، کیفیت کا یہ اختلاف فکر میں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں حرکت پائی جاتی ہے اور کم کا اختلاف حدس میں زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں حرکت نہیں پائی جاتی اور حدس نفس کی قوت سے پیدا ہوتا ہے، ان مختلف درجوں میں نقصان و کمال کی دو حدیں ہیں، نقصان کی حد تو یہ ہے کہ ایک شخص کی تمام فکریں مطالب کے حاصل کرنے سے قاصر ہیں اور کمال کی حد یہ ہے کہ ایک ہی شخص کو وہ تمام علوم و فنون حاصل ہو جائیں جو اس کی نوع کو مقدار کے لحاظ سے حاصل ہو سکتے ہیں، یا اسی کے قریب کیفیت کے لحاظ سے ایسے طریقہ پر کہ حدود و سطری پر مشتمل تقلیدی نہ ہو، اور چونکہ نقصان کا پہلو عام طور پر نظر آتا ہے، اس لئے کمال کا پہلو بھی ممکن الوجود ہوگا۔“

ان دونوں عبارتوں کے موازنہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ امام صاحب پہلے تو خود دلیل کی تکمیل نہایت وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں، پھر اسکی کمزوریوں کو دکھاتے ہیں، اسکے بعد اگر ممکن ہوتا تو خود اس مسئلہ پر مستقل دلیل قائم کرتے ہیں، لیکن محقق طوسی کی عبارت ان باتوں سے بالکل خالی ہے

# حضرت میرزا مظہر جان جانا

از

جناب عبدالرزاق صاحب قریشی

جانِ جان نام، منظرِ تخلص، شمس الدین حبیب اللہ لقب، علوی نسب، نقشبندی مشرب،  
مرزا صاحب کا سلسلہ نسب ۲۸ واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ  
تک پہنچتا ہے، مصحفی کا بیان ہے کہ

”والدہ اغتسانی در ریاض الشعراء مرزا غرور از سادات علویہ فوشہ و ایں غلط محض

است چرا کہ مرزا بقول صحیح از اتراک توران است“

نہیں معلوم مصحفی کو یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی، تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں، اور خود  
مرزا صاحب کا اپنا بیان ہے کہ ان کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی  
کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے، محض اس بنا پر کہ ان کے جد بزرگوار نے ترکستان میں سکونت اختیار  
کر لی تھی، ان کا سلسلہ نسب تو نہیں بدل سکتا،

مرزا صاحب کے اجداد میں ایک بزرگ امیر کمال الدین (جن کا سلسلہ نسب ۱۹ واسطوں  
محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے) آٹھویں صدی ہجری میں طائف سے  
ترکستان گئے، اور وہاں کے حاکم سردار اوس قاتقشلاں کی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی، چونکہ

۱۵ عقد ثریا ۱۵ کلمات طبیات و سرواژاد ۲۳۱،

اس حاکم کے کوئی اولاد نہ رہی تھی، اس کی حکومت امیر کمال الدین کو مل گئی، جب ہمایوں نے شاہ ایران کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کی تو اس خاندان کے دو بھائی بخون خان اور بابا خان بھی اس کے ساتھ ہندوستان آئے، حضرت میرزا منظر جانانا، بابا خان کی اولاد ہیں مختصر شجرہ نسب یہ ہے۔

میرزا جان خان بن مرزا جان بن مرزا عبد الجان بن مرزا محمد امان بن شاہ بابا سلطان  
ابن بابا خان بن امیر غلام محمد بن امیر محمد بن خواجہ رستم شاہ بن امیر کمال الدین  
بابا خان نے اکبر کے زمانہ میں بغاوت کی جس کی پاداش میں اس خاندان کے لئے مناصب تمام  
کے دروازے بند کر دیئے گئے، خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ  
”پریم بچم خان مذکور (بابا خان) کہ در عہد اکبری مصدر بنی شدہ بود بجار کم منصبی گرفتار  
لیکن خوشگوار کا یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ  
”ایں خاندان را در سرکار پادشاہی نوکر نیگرفتند مگر میرزا جان والد شریفش  
منصبدار عالمگیر بادشاہ بود“

یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ بغاوت کی پاداش میں پنچہاری، ہفت ہزاری وغیرہ کے عہدے  
اس خاندان کے لئے بند کر دیئے گئے ہوں، لیکن یہ کمنا کہ سرکار شاہی میں کوئی عہدہ ہی نہ ملتا تھا  
حالات کو جانتے ہوئے، بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ  
”خدمت در فاقہ سلاطین گورگانیہ شعار مردم این خاندان بود“

۱۷ کلمات طبابت سفینہ خوش گو میں ہے۔ کہ ”از بنا بخون خان قاتل است“ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ  
ہم خوش گو کے بیان کو مرزا صاحب کے بیان پر ترجیح دیں، ۱۸ ان کے حالات کے لئے دیکھئے اکبر نامہ، ۱۹  
۲۰ کلمات طبابت ۲۱ سرواژاد ۲۲

مرزا صاحب کے بڑے دادا مرزا محمد امان (بابا خاں کے پوتے) کی شادی اکبر بادشاہ کی رُک

سے ہوئی تھی، اس طرح ان کے دادا مرزا عبد الباقی تیموری خاندان کے نواسہ ہوتے ہیں،

مرزا عبد الباقی منصب شاہی پرفائز تھے، وہ مرتبہ عالی پرفائز ہونے کے باوجود بہت

خدا ترس و خدا پرست تھے، طریقہ چشتیہ میں لوگوں کو مرید کرتے تھے، اُن کی ماتحتی میں جتنے سپاہی

سوار اور خدمت گزار تھے، سب تہجد گزار تھے،

مرزا صاحب کی دادی، وزیر الممالک آصف الدولہ نواب اسد خاں عالمگیر شاہی کی بیٹی

تھیں، وہ شیعہ تھیں، لیکن شوہر کے فیض صحبت سے سنی ہو گئی تھیں، وہ اس قدر عبادت گزار

تھیں، اور اُن کی صفائی باطن اتنی بڑھ گئی تھی کہ تسبیح چادرات سُن سکتی تھیں، وہ عورتوں کو منویٰ

مولانا روم کا درس بھی دیتی تھیں،

مرزا صاحب کی والدہ بیجا پور کے شاہی خاندان سے تھیں، وہ بہت پارسا، نیک و عبادت

تھیں، اور جو دو سو بیاس تو اپنی نظیر نہیں رکھتی تھیں،

مرزا جان | حضرت مرزا کے والد بزرگوار کا نام مرزا محمد جان تھا، وہ اکثر علوم میں ماہر تھے، شعر و

شاعری سے بھی لگاؤ تھا، جانی تخلص کرتے تھے، حضرت شاہ عبد الرحمن قادری کے مرید تھے،

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵

مرزا جان ابتداً سرکاری ملازموں میں تھے، لیکن دیناوی بادشاہ کا مدبار انھیں کچھ پسند نہ آیا، بادشاہ بادشاہان کے دربار میں عالی منصب حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس لئے اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے، صاحب گلشن بیچار کا بیان ہے کہ مرزا صاحب کسی سبب سے اورنگزیب سے ناراض ہو کر اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے تھے، لیکن اس بیان کی تصدیق اور کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی، بہر حال یہ یقینی ہے کہ مرزا جان نے اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر فقیری اختیار کر لی اور اپنا سارا مال و دولت راہِ خدا میں فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیا، پچیس ہزار روپے لڑکی کے نکاح کے لئے رکھ چھوڑے تھے، ایک دن سنا کہ ایک دوست مالی مشکلات میں آن پڑے ہیں، پوری رقم ان کے حوالہ کر دی،

مرزا صاحب میں توکل بہت تھا، ایک بار گھر میں کدو کا بیج بویا تھا تو بڑی نے کہا اپنے توکل کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی گھر میں کدو کی بیل لگائی ہے، ممکن ہے فاقہ کی حالت میں یہ خیال گزرسے کہ اس کے پھل اور پتوں سے پیٹ بھریں، مرزا صاحب نے فوراً بیل کو اکھڑا دیا،

مرزا جان نے ۱۳۱۳ھ میں انتقال کیا،

میرزا جان | مولانا محمد حسین آزاد، آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ:

دوبہ تسمیہ | آئین سلطنت تھا کہ امراء کے ہاں اولاد ہو تو حضور میں عرض کریں بادشاہ

خود نام رکھیں یا پیش کئے ہوئے ناموں میں سے پسند کر دیں، کسی کو خود بھی بیٹا بیٹی کو لیتے تھے، یہ امور طرفین کے دلوں میں اتحاد اور محبت پیدا کرتے تھے، ان کیلئے ایک وقت پر سند ترقی ہوتے تھے، اور بادشاہوں کو ان سے وفاداری اور جان نثاری کی امیدیں ہوتی تھیں۔



چونکہ حضرت میرزا کے والد بزرگوار بھی امرائیں سے تھے (گو حضرت کی پیدائش کے وقت وہ مستعفی ہو چکے تھے) اس لئے جب حضرت مرزا پیدا ہوئے تو اورنگ زیب کو خبر بھی گئی، اس نے کہا چونکہ بیٹا، باپ کی جان ہوتا ہے، اور اس بچے کے باپ کا نام مرزا جان ہے، اس لئے اس کا نام ہم نے جان جان رکھا، لوگوں نے بڑھا کر جان جان کو جاننا بنا دیا، اور یہ تغیر خود مرزا صاحب کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، چنانچہ خود مرزا صاحب نے اپنے مکاتیب میں ہمیشہ جانناں لکھا ہے، صاحب مجمع النفائس مرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ان کا بھی بیان ہے کہ

”حالا بجان جاناں شہرت گرفتہ“

آزاد بلگرامی بھی مرزا صاحب کے ہم عصر تھے، وہ ان کے نام اور تخلص کے سلسلہ میں ایک دلچسپ نکتہ پیدا کرتے ہیں، لکھتے ہیں کہ

”نام و تخلص اوگو یا عنایت رحمان اسرار قومی مولاناے رومی است کہ پانصد سال

پیش ازیں در دفتر ششم شہنوی ارشاد فرمودہ و کرامتی بھضار انجن استقبال و انودہ یعنی

جان اول منظر درگاہ شد جان جان خود منظر افتد شد“

اس کے بعد آزاد لکھتے ہیں کہ

”لیکن نام او براسنہ میرزا جانناں جاری شدہ“

میر تقی میر کا بیان ہے کہ ان کے والد کا نام مرزا جان تھا بیٹے کو فرط محبت سے جان جان کہا کرتے تھے، اور بالآخر وہ اسی نام سے مشہور ہوئے، لیکن یہ صحیح نہیں، مرزا صاحب کے نام کی اصل وجہ تسمیہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی، ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں مصحفی کا یہ بیان پیش کر سکتے ہیں ”روزی وجہ تسمیہ خود را پیش فقیر بیان کردہ معنی اسم والد من مرزا جان بود و چون“

اور عصر خلد مکان قدم بہالم وجود گذارتم وایں خبر بمعین ہند مکان اقدس رسید، ارشاد شد کہ

نام ایں پسر جان جاں باید گذارشت<sup>۱</sup>۔

مولانا محمد حسین آزاد، مرزا صاحب کے نام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ ان کے والد نے اپنے طور پر ان کا نام شمس الدین رکھا لیکن وہ عالمگیری نام کے سامنے نہ چک سکا، مولانا عبدالحی (جس کا کنعنا) نے بھی ”شمس الدین جانجاناں“ نام لکھا ہی، لیکن اس کی تصدیق کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی، بلکہ معمولات منظر یہ ہیں جو مرزا صاحب کے ایک مرید کی لکھی ہوئی کتاب ہے شمس الدین حبیب اللہ لقب بتایا گیا ہے، سال ولادت حضرت میرزا کے والد بزرگوار جب اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر دکن سے آکر آ رہے تھے تو حضرت میرزا کا لا باغ میں جو حدود مالوہ میں واقع ہے، ۱۱۱۱ رمضان المبارک، شب جمعہ وقت فجر پیدا ہوئے، مرزا صاحب کا سال ولادت عام طور پر تذکروں میں ۱۱۱۱ھ ملتا ہے، معمولات منظر اور مقامات منظر، دو کتابیں خاص مرزا صاحب کے حالات میں لکھی گئی ہیں، صاحب معمولات نے ۱۱۱۱ھ اور صاحب مقامات نے ۱۱۱۲ھ یا ۱۱۱۳ھ سال ولادت لکھا ہے، صاحب مقامات نے تاریخ پیدائش کے دو ماہے بھی دیئے ہیں (۱)، تو لہذا صاحب شریع (۲)، طلوع شمس الملت والدین، ان دونوں ماہوں سے ۱۱۱۲ھ نکلتا ہے، لیکن یہ تاریخ کسی قدر مشکوک ہے، اور خود مرزا صاحب کے اپنے مختلف بیانات نے ان کے سال ولادت کے متعلق اختلاف پیدا کر دیا ہے، مرزا صاحب نے اپنے سال پیدائش کا ذکر تین مختلف موقعوں پر کیا ہے،

(۱) مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کی اسد عا پر جب اپنے حالات (سر و آزاد) کے لئے لکھ کر بھیجے ہیں تو اس میں لکھا ہے کہ

”..... در عشرہ ادلی مانہ ثانیہ بعد الف ولادتش (ولادت مرزا صاحب اتفاقاً ۱۱۱۲ھ)۔“

اس بیان کے مطابق ان کا سنہ ولادت ۱۱۱۳ھ سے پہلے ہونا چاہئے،

(۲) اپنے فارسی دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

”امروز ہزار و صد و ہفتاد ہجری است و عمر بنعت رسیدہ“

اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو ان کا سال ولادت ۱۱۱۳ھ اور ۱۱۱۴ھ کے مابین

قرار پاتا ہے،

(۳) اپنے ایک مرید کے اصرار پر اپنے مختصر حالات اسکو لکھ کر بھیجتے ہیں، اس میں اپنا سال

پیدائش ۱۱۱۳ھ لکھتے ہیں، خود مرزا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:-

”در ہزار و صد و سیزدہ ولادت غیر اتفاق افتاد“

اسی مکتوب میں اپنے والد ماجد کے سال وفات کے متعلق فرماتے ہیں کہ

”در سال ہزار و صد و سی ہجری انتقال از این عالم فرمودہ . . . . . در غر شترؤ

سالگی گردیمی بر روز شست“

مرزا صاحب کے والد کا انتقال ۱۱۱۳ھ میں ہوتا ہے اور مرزا صاحب کی عمر اس وقت

سولہ سال کی ہے، تمام تذکرے مرزا صاحب کی اس عمر کے بارے میں متفق اللفظ ہیں، لہذا اگر

اس بیان کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مرزا صاحب کا سال پیدائش ۱۱۱۳ھ زیادہ قرین صحت

معلوم ہوتا ہے،

بہر نوع اس قدر یقینی ہے کہ مرزا صاحب کا سال پیدائش ۱۱۱۳ھ اور ۱۱۱۴ھ کے مابین

صاحب معمولات منظر یہ مولوی نعیم اللہ بھراچھی نے اس اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے

اور نہایت وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ مرزا صاحب کا سال ولادت ۱۱۱۳ھ ہے نہ کہ ۱۱۱۴ھ،

انکے کلمات طیبات،

لیکن، فسوس کہ اُنھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی، محض ان کا مرزا صاحب کا مرید ہونا تو ان کے دعوے کی سچائی کا ثبوت نہیں ہو سکتا،

وطن | جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، مرزا صاحب کے آبا و اجداد دراصل طائف کے رہنے والے تھے، وہاں سے ان کے جد بزرگوار امیر کمال الدین، ترکستان چلے گئے اور تین چار تیس وہیں گذر گئیں، پھر امیر بابا خاں اور محبوں خاں ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے، پہلے تو یقیناً اُنھوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا ہوگا، لیکن جب اکبر نے آگرہ کو اپنا دار الخلافہ بنایا تو قیاس کہتا ہے کہ مرزا محمد امان (داماد اکبر بادشاہ) بھی آگرہ اُٹھ آئے ہوں گے، بہر حال یہ یقینی ہے کہ مرزا صاحب کے والد مرزا جان کا مسکن شہر آگرہ تھا، چنانچہ مرزا صاحب کی نشوونما اور ابتدائی تعلیم و تربیت اکبر آباد ہی میں ہوئی، لیکن خود مرزا صاحب نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا، اور یہیں ان کی تربیت باطنی ہوئی، دہلی میں مرزا صاحب کی خانقاہ جامع مسجد کے قرب کوچہ امام میں تھی؛

تعلیم و تربیت | مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات میں مرزا صاحب کی تعلیم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

”مرزا صاحب کی تعلیم عالمانہ نہ تھی، مگر علم حدیث با اصول پڑھا تھا“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب کی تعلیم ہر حیثیت سے نہایت اچھے پیمانہ پر ہوئی تھی، صاحب خزینۃ الاصفیاء کا بیان یہ ہے کہ

”ازہر فن و علم ظاہری برہ کمال حاصل نمود“

مرزا صاحب بہت چھوٹے تھے کہ اسی وقت سے ان کے والد نے ان کی تعلیم کا اہتمام

کیا اور ہمیشہ ان کو تاکید فرماتے کہ وقت اور عمر کا کوئی نعم البدل نہیں، اس کو ضائع نہ کرنا چاہیے،  
اس سلسلہ میں مرزا صاحب کے ایک ہم عصر تذکرہ نویس کا بیان بھی سننے کے قابل ہے، احمد علی شاہ  
اپنے تذکرہ مخزن الغرائب میں لکھتے ہیں کہ

”در صغر سن صرف و نحو، پارہ از معقول و حدیث و تفسیر و عروض و قافیہ تلمیذ المتبحر

خواندہ متوجہ بنوعرگوشی شدند“

ایک دوسرے ہم عصر تذکرہ نویس فتح علی گریزی (صاحب تذکرہ ریختہ گو یاں) کا بیان یہ ہے کہ

”از آنجا کہ علم فقہ و حدیث فطری وافر دار و از کتب سیر و تواریخ بہرہ متکاثر ....“

مرزا صاحب نے فارسی کی تکمیل اپنے والد ماجد سے کی، کلام اللہ قاری حافظ عبد الرسول دہلوی  
تلمیذ شیخ القرائین عبد الخالق سے پڑھا اور علم تجوید و قرأت کی سند بھی انہی سے لی، والد کی وفات  
کے بعد علم حدیث و تفسیر اور دوسری کتب مبسوطہ حضرت حاجی محمد فضل سیالکوٹی تلمیذ شیخ الحدیث  
شیخ عبد اللہ بن سالم کی سے پڑھیں،

مرزا صاحب کے والد ماجد ان کو اکثر یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ

”از برائے فہم معانی قرآن مجید و تدبیر در احادیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، از محاورات

عرب و قون و اطلاع ضرورت، بچنین برائے فہم معانی مقصودہ از محاورات مردم این دیار

وقت ہنگامی نیز از وقت تمام چارہ نیست تا در حضور عقلا از عدم فہم معانی مقصودہ انفعالی

کشیدہ نشود“

درسی اور متداول علوم کے علاوہ آداب بادشاہی، فن پسہ گری اور دوسرے متداول  
فنون کی بھی مرزا صاحب کو تعلیم دی گئی تھی اور انھوں نے ہر ہنر میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ وہ

ان سے اپنے اپنے ہنر کی داد مانگتے اور ان کو اپنا اُستاد تسلیم کرتے،  
استعمالِ اسلحہ میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر میں آدمی تلوار سے مجھ پر حملہ  
کریں اور میرے ہاتھ میں صرف ایک لکڑی ہو تو انتشارِ اُند کوئی مجھے زخمی نہیں کر سکتا،  
ایک مرتبہ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، جب سلام پھیرا تو ابر کی تاریکی میں کسی شخص نے  
ان پر خنجر کا وار کیا، اتفاق سے بجلی چلی اور اُنھوں نے اس کی چمک میں خنجر کو دیکھ لیا، اور اس کے  
ہاتھ سے چھین کر پھر اس کو دیدیا اُس نے پھر حملہ کیا، اُنھوں نے پھر چھین لیا، اور اس کو دیدیا  
اس نے سات بار حملہ کیا اور ساتوں بار مرزا صاحب نے خنجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا، آخر وہ  
قدموں پر گر پڑا، اور معافی کا خواستگار ہوا،

ایک بار گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں سامنے سے ایک مست ہاتھی آ رہا  
تھا، ہاتھی نے قریب پہنچ کر ان کو سوئڈن میں پیٹ لیا، اُنھوں نے میان سے خنجر نکالا، اور ہاتھی  
کے سوئڈ پر اس زور سے مارا کہ اُس نے بیتاب ہو کر ان کو چھوڑ دیا اور وہ سلامت چل گئے،  
مرزا صاحب کپڑا کاٹنا خوب جانتے تھے، چنانچہ صاحبِ مقامات کا بیان ہے :-

”تقیع سراویل ایشان را بہ پنجاہ طرزی آید“

زیت باطنی | مرزا صاحب کے والد مرزا جان نے سن ۱۱۱۳ھ میں وفات پائی، اُس وقت مرزا صاحب  
کی عمر سولہ سال تھی، مصحفی عقد ثریا میں لکھتے ہیں کہ

”بعد فوت والد ماجد خود مال و اسباب فراوان کہ بدستش افتادہ بود بذلِ مجالس

و دعوتِ یاران نمود و در ہیزہ سالگی ہمہ را پاک فروختہ کلاہ و رویشی بر سر گذاشت“

مرزا صاحب نے والد کی وفات کے بعد دو سال دنیا طلبی میں گزارے اور اس بات کی

کوشش کی کہ دربار میں کوئی منصب مل جائے، اُن کے والد کو انتقال کئے ہوئے کوئی دو برس ہو چکے تھے، کہ ایک دن کچھ لوگ سفارش کی غرض سے اُن کو بادشاہ (فرخ سیر) کی خدمت میں لے گئے، اتفاق سے بادشاہ کو زکام ہو گیا تھا، اور وہ اس دن دربار میں نہ آسکا، اس لئے مرزا صاحب کو مایوس و نا کامیاب لوٹنا پڑا، اُسی رات خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ کے مزار پر گئے ہیں، صاحب مزار قبر سے باہر آئے، اور اپنی ٹوپی (طاقی) ان کے سر پر رکھی، اس خواب کے بعد مرزا صاحب نے دینا طلبی کا خیال چھوڑ دیا،

ایک دن اپنے گھر بیٹھے تھے، اسبابِ طرب بھی تھا، اور مجمعِ احباب بھی، اتفاقاً کسی حضرت سید نور محمد بدایونی کا ذکر کر دیا، اور ان کے اوصافِ حمیدہ بیان کئے، نہ جانے مرزا صاحب کے دل میں کیا سہائی کہ تمام دوستوں کو چھوڑ کر اسی وقت آستانِ بوسی کے لئے روانہ ہو گئے، حضرت سید نے استخارہ مسنونہ کے بعد ان کی صلاحیت و استعداد کے مطابق ان کو ذکرِ طریقہِ عالیہ بتایا، ان سے کہا کہ آنکھیں بند کرو اور خود توجہ دینی شروع کی، چنانچہ ایک ہی توجہ میں ”لطائفِ خمسہ“ ذکر کر وہ رخصت نمودند۔

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مرزا صاحب کا حضرت سید نور محمد بدایونی کی خدمت میں حاضر

۱۔ معمولاتِ منظر یہ ۱۵۱ حضرت سید نور محمد بدایونی نے کپ سلوک حضرت شیخ سیف الدین فرزندِ غلامِ عروۃ الثقی حضرت محمد معصوم فرزندِ سجادہ نشین حضرت مجدد سے کیا تھا، علوم ظاہر و باطن دونوں میں کمال حاصل تھا، ان کا استغراق اور قوتِ جذبی بہت بڑھی ہوئی تھی، سنتِ نبوی کا اتباع بہت سختی سے کرتے تھے، کثرتِ مراقبہ کی وجہ سے بیٹھ خنم ہو گئی تھی، اہل دنیا کی محبت سے سخت اجتناب تھا،

مرزا صاحب کو ان سے غایتِ درجہ محبت تھی، ان کا نام زبان پر آتے ہی آنکھیں پر ہم ہوجاتیں (مقاماتِ منظر) ۱۱، ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ کو انتقال فرمایا، مزار شریف بیرونِ کوٹہ سلطان المشائخ، جانبِ پائین واقع

ہے ۱۲ معمولاتِ منظر یہ ۱۵۲،

ہونا محض ایک اتفاقی بات نہ تھی، بلکہ عشقِ ایزدی ان کے خیر میں موجود تھا، اور یحییٰ ہی سے ان کے والد نے ہمیشہ ان کے کانوں میں اسی قسم کی باتیں ڈالی تھیں، صاحبِ معمولات مظہر یہ کے الفاظ میں مرزا جان مرزا صاحب کو ہمیشہ یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ

”ہر کہ دلش بد رخ عشق برشتہ نمی شود خاشاکِ طبیعت او سوختہ و پاک نمی گردد و زمین  
طینتِ او صلاحیتِ تخمِ محبتِ الہی ندارد و زیرا کہ عشق مجازی زنیہ عشقِ حقیقت پس مادامیکہ  
رشتہ عشقِ مجازی طوقِ گلو کردہ، در کوچہ و بازار رسوا و خوار نسازد، روح فقیر از شمار نمی  
خواہد شد اما غیر از وسیلہ امری دریں راہ منظور نباشد، چون بوسیلہ ایں دولت را ہمیں مطلب  
کشاود گردد و جا بنازی در راہ مولی کہ پادشاہِ پادشاهان معشوقانِ اعلیٰ و ادنی است افتنا  
باید نمود کہ سعادتِ جاودانی مربوط بآست“

”آشنائی در حقیقت کیش و آئین مردانست ..... جزو اعظم دریں

باب جوش و گرمیت“

بہر حال ۱۸ سال کی عمر میں مرزا صاحب حضرت سید نور محمد بدایونی کے حلقہٴ مریدین میں داخل ہوئے اور طریقہٴ نقشبندیہ پر عمل کرنے لگے، چار سال تک اُن کی خدمت میں رہنے کے بعد ولایتِ کبریٰ و خرقہ و اجازتِ مطلقہ حاصل کی

حضرت سید نور محمد بدایونی نے ۱۱۳۵ھ میں انتقال فرمایا، لیکن مرزا صاحب نے اب بھی اس آشتی کو نہ چھوڑا، چھ سال تک ان کے مزار کی بجاوری کی اور بطریقِ اویسیہ کسبِ ولایت کیا، یہ شیخ علی کثیری شیخ العرب حمہ اللہ علیہ نے جو حضرت شیخ محمد صدیق سرہندی بنبرہ حضرت مجدد الف ثانی کے خلفائے اجل میں سے تھے اس بشارت کی شہادت دی تھی،



حضرت سید نے انتقال کے چھ سال بعد ان کو خواب میں فرمایا کہ

”مقصود حق امت و آں غیر تنہا ہی! پس عمر تنہا ہی خود را تمام در طلب صرں باید کرد“

مقصود بدست باید آورد“

اس خواب کے بعد مرزا صاحب حضرت جیو کی خدمت میں جو ان کے شیخ الحدیث تھے پہنچے، انھوں نے فرمایا تم نے تو حضرت سید سے علی السبیل البصیرۃ کسب سلوک کیا ہے اور مجھ میں قوت کشفی اتنی نہیں ہے، چنانچہ شیخ جیو سے مرزا صاحب نے صرف کتب احادیث پڑھیں، لیکن خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اٹناے سبق میں فیض باطن بھی ان کو ضرور پہنچتا تھا،

اس کے بعد مرزا صاحب، حضرت شاہ گلشن رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بغرض استفا

۱۷ معمولات مظہریہ ص ۱۷ حاجی محمد فضل سیالکوٹی عالم بحر اور فاضل دانشور تھے، مجتہد نقشبند فرزند خلیفہ حضرت محمد معصوم سے دس سال تک استفادہ فیوض باطنی کیا تھا، بارہ سال تک حضرت شیخ عبدالاحد فرزند خلیفہ شیخ محمد سعید فرزند سجادہ نشین حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر مقامات عالیہ طے کر کے علوم معقول و منقول و حدیث بھی حضرت شیخ عبدالاحد سے حاصل کئے تھے، شیخ سالم بصری ثم المکی سے بھی حدیث پڑھی تھی، حاجی صاحب کا استغراق بہت قوی تھا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حدیث حاجی صاحب ہی سے پڑھی تھی،

۱۸ حاجی صاحب کو کتابوں سے بہت شغف تھا، نقد کی صورت میں جو یہ ملتا اسکی کتابیں خرید لیتے اور وقف کر دیتے، ایک بار کہیں سے پندرہ ہزار روپے آئے، انھوں نے پوری رقم کتابیں خرید لیں اور حسبِ سہولت کو دیا، حاجی صاحب نے ۱۹۷۷ء میں وفات پائی، مزار شریف حضرت خواجہ باقی باللہ کے مزار کے متصل ہے،

۱۹ معمولات مظہریہ ص ۱۷،

۲۰ حضرت شاہ گلشن، حضرت شیخ عبدالاحد مجددی نمبرہ حضرت مجدد کے خلیفہ تھے، کمال ظاہری و باطنی، علوم مرتبہ و طریقت و حقیقت و زہد و ورع و تقویٰ میں کمال حاصل تھا، تین تین دن کے بعد کھانا کھاتے، تیس سال ایک ہی کلمہ میں گزار دیتے، جامع مہمدہلی میں سکونت تھی، جب پیاس لگتی تو مسجد کے حوض میں سے دو تین چلو پانی، جو اکثر گرم ہوتا، پی لیتے، ۱۱۵۳ھ میں انتقال فرمایا،

حاضر ہوئے، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو حضرت محمد زبیر قدس سرہ کو سپرد کر دیا ہے، مرزا صاحب ان کی خدمت میں پہنچے، انھوں نے فرمایا کہ تم کو حضرت سیدہ نسبت صحیحہ مل چکی ہے، اسی کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، اس کے بعد مرزا صاحب حضرت حافظ سعدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بارہ سال تک اُن سے استفادہ کیا،

حضرت حافظ سعدؒ کے انتقال کے بعد جب حضرت شیخ محمد عابد سنائی، سرہند سے شہنشاہ آباد آئے تو مرزا صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے،

”حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ تاملی بشارات حضرت سیدرا مسلمہ داشتہ از ہماں نقطہ آخر ولایت علیا و آقا زکات نبوت کسب مقامات گنایند و در عرصہ ہفت سال بحقیقت مملوۃ سائنہ“

اس کے بعد ”بطور سیر مرادی“ ایک بار پھر ابتدا سے انتہا تک ایک سال کے اندر ان تمام مقامات کو طے کرایا، اور خصوصیات مجددیہ میں محبت و محبوبیت، غنیمت کبریٰ وغیرہ کی بشارات دی، اور طریقہ قادریہ، چشتیہ و سہروردیہ کی بھی اجازت دی، اس دوران میں اکثر مبتدیان خانقاہ نے حضرت میرزا سے کسب فیض کیا، مرزا صاحب حضرت شیخ عابد کی خدمت میں اُن کی وفات (سنہ ۱۰۶۰) تک رہے،

شیخت و ارشاد | تقریباً تیس سال تک مشائخ نقشبندیہ و مجددیہ سے کسب فیض کرنے کے بعد

۱۷ حضرت محمد زبیر حضرت محبت اللہ نقشبندی کے خلیفہ تھے، بہت عبادت گزار تھے، سنہ ۱۰۵۰ھ میں انتقال فرمایا،  
 ۱۸ حضرت حافظ سعدؒ، حضرت محمد صدیقی فرزند و خلیفہ حضرت محمد معصوم کے خلیفہ ہیں، تیس سال تک ان کی خدمت میں رہ کر مقامات عالیہ طے کیے، حافظ صاحب کا لقب خانقاہ میں ”سید الصوفیہ“ تھا، مزاج میں خاکی و فروتنی بہت تھی، علوم ظاہری میں کوئی خاص مرتبہ نہ تھا، لیکن نسبت باطنی بہت قوی تھی، ارشوال سنہ ۱۰۵۰ھ کو انتقال فرمایا، مرزا شریف بیرون ہجیری دروازہ، شاہجہاں آباد میں ۱۰۳۰ھ حضرت شیخ عبداللہ کے خلیفہ تھے، سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ملتا ہے، بہت کثیر العبادت اور کثیر الذکر تھے، حرمین شریفین کو پیادہ تشریف لے گئے تھے، ۱۸ رمضان المبارک سنہ ۱۰۵۰ھ کو انتقال فرمایا، معمولات منظرہ مشا،

جب مرزا صاحب خود صاحب کمال ہو گئے تو مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھے اور اپنا سارا وقت طالبان حق کی رہنمائی کے لئے وقف کر دیا، ان کی ساری دہچھپیاں مریدوں اور ان کی فلاح و بہبود کیلئے وقت تھیں، ۳۵ سال تک خانقاہ مجددیہ کو رونق بخشی، کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ تقریباً سو طالبان حق کو قوجہ نہ دیتے رہے ہوں، چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

”در حلقہ ہر دو وقت قریب صد کس حاضر میشوند، حیرانم کہ قوت توجہ از کجی می آید“

(کلمات طیبات، مکتوب سی و پنجم)

ابتداء میں کچھ دنوں تک درس و تدریس کا بھی سلسلہ رہا، لیکن جب نسبت باطنی نے غلبہ کیا تو شیغل ختم ہو گیا، اور صرف رشد و ہدایت کا سلسلہ باقی رہا، مرزا صاحب کا آفتاب شد و درآ صرف دہلی تک محدود نہ تھا، بلکہ اس کی شعاعیں دہلی سے باہر دوسرے علاقوں کو بھی منور کر چکی تھیں، وہ باوجود شکایت ضعف پیری دہلی سے باہر دوسرے علاقوں میں خصوصاً روہیلکند اکثر جایا کرتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب میں خود فرماتے ہیں کہ

”انشاء اللہ تعالیٰ در ماہ صفر اودہ سنہ ۱۲۸۱م کہ از چندین سال ہر سال اتفاق می افتد تیرم

(مکتوب بست و ختم)

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:-

”فقیر از سیر امر وہ و مراد آباد فارغ شدہ است و قصد تماشائے شاہجاں پور دارد“

انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب می رسد، دوسرے مقام دہری کی کردہ روانہ بیشتر می شود و پنج خوش تھا

در شاہجاں پور نمودہ مراجعت بہ سبیل می نماید بعد از ان بدہلی می رود، و باوجود ضعف پیری

ایں حرکت عنایت را بر خود پسندیدن بنا بر اغراض صحیحہ اخرویہ است کہ خدا امید انداختہ اند

استیاقِ صاحبان است : (مکتوب پنجاہ و دوم)

مرزا صاحب کے مریدوں میں روہیلوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی، چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

”ہجومِ روہیلہ ہارے اخذ طریقہ تجدیدیت کہ تمام روز توجہ فرست نیت“ (مکتوب پنجاہ و چہارم)

اسی مکتوب میں مندرجہ ذیل عبارت بھی ملتی ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے حلقہٴ مریدین میں روہیلوں کی تعداد زیادہ تھی، لکھتے ہیں :-

”مردم از قوم روہیلہ اکثر از مردم ہندی کمتر اخذ طریقہ علیہ نمودند و متاثر گردیدند“

غالباً یہی وجہ ہے کہ جب دہلی کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی تو مرزا صاحب کے دل میں ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا کہ دہلی چھوڑ کر اور کہیں اپنا مسکن بنائیں چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

”بجذبِ قہمت و جاذبہٴ اجاب فقیر از دہلی سنبھل رسید و امر وہم و مراد آباد را ہم دید تا

بانتخابِ پردہ دار و کہ رختِ اقامت در کجا اندازد و متعلقات را طلبیدہ نگاہ دارد کہ از تشویشات

ہر روزہٴ دہلی تنگ آمدہ ام..... مردم سنبھل و مراد آباد امر وہم کہ سہ بلاد سماجت نمودند کہ

ایجا باید بود جاذبہٴ حقوق و اباءِ رشاد خان بہادر سلمہ رنگداشت کہ قصد جائے دیگر کم و طالبان

طریقہ نیز دریں شہر بسیار اند، عزمِ اقامت نمودہ ام برائے طلبِ متعلقان فرستادم، آہنا

عذر ہائے سموغ نوشتند، ناچار ہر اجابت دہلی اتفاق افتاد“ (مکتوب چہلم)

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مرزا صاحب تقریباً سو آدمیوں کو ہر روز توجہ دیتے تھے، ان کے

ایک اور مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ مریدوں کی بہت کثرت تھی، فرماتے ہیں :-

”میر حسین خان را کہ از مقامات مصطلحہ گذشتہ و اجازت مطلقہ یافتہ و در توجہ گری بسیار

دادند و اتفاقاً دریں ایام از شہر ہارے دیدن فقیر رسیدہ بودند، بجائے خود دریں بلاد گذشتہ

ام، مردم از محبت این بزرگ زادہ بسیار فیض می گیرند، و خیلی رجوع کردہ اند، اما کاریک کس

نہیں کہ از عمدہ اس قافلہ برآید، بخاطر دارم کہ شمار ہم طلبیدہ بعض شہر اہل شہر را

بر میر میں خاں توفیق نمایم“ (مکتوب ہفتاد و چہارم)

مولوی شہر احمد سنبھلی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”شمار آغا رفتہ جائے فیر گرم سازید کہ در آن ضلع عالی فہیدہ و درویشی صاحب نسبت

(مکتوب بست و ہفتم)

آخر عمر میں مرزا صاحب کی صحت خراب اور قوی کمزور ہو گئے تھے، اس کے اشارات

بھی ان کے مکتوبات میں ملتے ہیں، ایک مکتوب میں ار قام فرماتے ہیں:-

”قوی آں قدر تجلیل رفتہ کہ طاقت قیام در نماز فرض ماندہ است و بس“ (مکتوب بست و ہفتم)

ایک اور خط میں ہے،

”ضعف پیریت مع امراض و عوارض“ (مکتوب سی و یکم)

ایک دوسرے مکتوب میں ہے:-

”تحریر جواب خطوط از ضعف نمی توانم نمود، حال بدوستان نوشته ام کہ امید وار و

منتظر جو ابمانہ باشد کہ معذورم و مردہ ام و مرا طاقت رفتن بسجد جامع بروز جمعہ ماندہ است

..... ضعف و ناتوانی از حد گذشتہ است و امراض متعدده مستولی شدہ، نماز فرض

ایتادہ خوانم و بس“ (مکتوب سی و پنجم)

ایک دوسرے صاحب کو لکھتے ہیں:-

”عمر آخر است و ضعف و پیری از حد زیادہ، خدا خاتمہ بخیر گرداند، توقع ملاقات

ضعیف است اما از قدر الہی امید و قوت“ (مکتوب پناہ و ہفتم)

ایک پیری و صد عیب، بڑھاپے میں صرف ہاتھ پیر ہی نہیں کمزور ہو جاتے ہیں، بلکہ دوسرے

اعضای جواب دیدیتے ہیں چنانچہ درازی عمر کے باعث مرزا صاحب کی بصارت میں بھی کمی آگئی تھی خود فرماتے ہیں:-

”از ضعف بصر و فی در تحریر نماز و طاقت تحریر ہم نہ، یاران بعد ازین از جواب خطوط

معذور دارند“ (مکتوب سی و یکم)

لیکن اس ضعف و ناتوانی کے باوجود وہ اپنے کام میں برابر لگے رہے اور اپنے مریدوں کو فیوضِ باطنی پہنچاتے رہے، خود فرماتے ہیں:-

”چونکہ از ضعف پیری و کثرت تعلیم طریقہ کہ روزی صد کس را بن زیادہ از آن توجہ اتفاق

می افتد“ (مکتوب بست و ہفتم)

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

”فقیر معہ توابع باکمال ضعف و ناتوانی زندہ است و ہنوز قریب صد کس را ہر دو وقت

توجہ میسر می آید“ (مکتوب ہفتاد و پنجم)

ارشاد و ہدایت کا یہ سلسلہ بذریعہ مکاتیب بھی جاری رہتا تھا، ایک مرید کو تنبیہ کرتے ہیں،

”فقر و معاملہ معلوم کردم کہ والدہ شما در باطن ناخوش اند، ناخوشی والدہ موجب خسارت

دنیا و آخرت است“ (مکتوب سی و ہشتم)

ایک دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:-

”تا رسیدن فقیر بایان طریقہ کہ در پہلی ہیئت اند بخدمت مولوی عبدالرزاق، کہ بظاہر

(مکتوب چالیس و پنجم)

و باطن یاقوت ارشاد و تعلیم طریقہ دارند، رجوع نمایند و صحبت ایشان را غنیمت دانند،

عزیزان دیگر کہ از فقر استفادہ کردہ اند و اجازت یافتہ صحبت آہنا ہم خالی از فائدہ نیست“

ایک مرید کو یوں نصیحت فرماتے ہیں:-

”باید برخودار بظاہر متقدم بشرع و در باطن مشغول بذکر طریقہ باشد کہ فلاح دو جہاں

دریں منحصر است“ (مکتوب سہمتم)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو تنبیہ فرماتے ہیں،

”برادر من! عجب کاریست کہ ہر واحد از مردم پانی پت لبریز شکایت شامی آید معلوم

نیست چہ عمل از شما واقع میشود، اگر راستی و دیانت شما باعث آزار مردم است ازاں

راستی بگذرید، برائے حفظ حرمت بتاویل ہم خاطر مردم امرعی دارید کہ طریقہ پیرا طریقہ بنام میشود

برائے خاطر لیئمان دیگران را آزرده کردن و خود را بدنام ساختن بایں کمالات ظاہری و

باطنی دور از عقل است“ (مکتوب ہفتم و ہفتم)

مریدوں کی تربیت باطنی کے علاوہ جہاں تک ہو سکنا مرزا صاحب ان کے دنیاوی

امور میں بھی کوشش پیروی سے دریغ نہ کرتے، لیکن یہ سفارشیں زیادہ تر اپنے مریدوں اور دوستوں

ہی سے کرتے، اس لئے کہ مرزا صاحب نے امرار و وسا اور ادب با بقدر سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھا،

ظفر علیخان خلف نواب ارشاد خاں بہادر سے مرزا صاحب کو خاص طور پر محبت تھی انکی

تعریف میں لکھتے ہیں کہ

”جواہر پارہ ایست کہ قیمت ندارد، فقیر بے سبب گرفتار او نیستم، خوبہاے اورا

شناختہ ام“

ان کی سفارش کسی سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

”بخدمت تصدیق میدہم کہ حق دوستی اے قدیم و اتفاقی کہ بر فقیر مزدول است شفقتی

کہ لائق بزرگہاے آں ہریاں باشد و رقی این جگر گوشہ کہ مرا عزیز تر از جان است بذل

فرمائید“ (مکتوب چہل و چہارم)

اسی طرح ایک مکتوب میں لالہ برج لال کی سفارش ہے، لالہ صاحب تلاش معاش میں ہی گئے ہیں، لالہ صاحب کے متعلق مرزا صاحب نے یہ الفاظ فرمائے ہیں :-

”لالہ برج لال نام جوانی از دوستان مقرری کہ در حق سلیقہ متصدیر گری و صحبت داری

بزعم فقیر نظیر ندارد و عمدہ زادہ و عمدہ روزگار بوده است“ (مکتوب سکا دہشتم)

اسی خط میں آکے پلکار ان کو ”نسخہ صحیح آدمیت“ کے لقب سے یاد کرتے ہیں،

غرض اسی طرح مختلف مریدوں اور دوستوں کی سفارش اپنے ذی استطاعت دوستوں اور مریدوں سے کرتے ہیں،

## خیام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ، اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیات خیام مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر اس سے زیادہ مفصل، مکمل اور محققانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی، قیمت مجلد ملعہ سر غیر مجلد ہے، ۵۲۰ صفحے از مولانا سید سلیمان ندوی،

## انتخابات شبلی

مولانا شبلی کی شعراجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و بوج اور عیب و ہنر اور شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے، قیمت پیر، ضخامت ۲۲۰ صفحے،  
”یہ بیچر“



فارسی کے چند قدیم شعراء

از جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے (علیگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امر اوتی

(۲)

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ۱۱۵۴ھ میں جب معاتِ حمیدی تالیف ہوئی تو قری نے اسکی تصنیف میں کچھ اضافہ رکھے تھے لیکن اس سال کے بعد اور ۱۱۵۳ھ کے پہلے ضرور کوئی ایسا وقت گزرا ہو گا جب کہ قوری نے مدح سرائی کچھ عرصہ کے لئے روک دی تھی، اس کا ثبوت ہم کو مصافحہ طبرہ پر کلیات میں ملتا ہے :-

نہیں تم بیگانہ از اعمال و احکام نجوم  
من زلقمان و فلاطون نیستم کم در حکم  
بازرگان مستفیدم با فرو دستان مفید  
غصہ دارم ز نقصان از تہم نوسے و لیک  
گرچہ در بستم در دج و غزل یکبارگی  
ابن تہم بگذار باشعر مجر د آدم  
ہر یکے آخر ایشاں بے کفانی نیستند  
آخری شعر ہے ۔

صدر اور ایادگار از ناصر الدین طاهر

قدیر من صاحب قوام الدین حسن داندا

پیر جی کا بچہ  
فتح اور رشید  
عالمی اولادیں  
خاندان جی سنگھ  
اور زمین کی  
اندر کاشت خانہ  
طالع نجوم کا ضبط

یہ قوام الدین حسن دراصل ناصر الدین ابوالفتح طاہر بن فخر الملک بن نظام الملک (المتوفی ۵۵۳ھ) کے بیٹے ہیں، ان کے متعلق تاریخ ہیت (ص ۷۷) میں ہے:-

”اقوام الدین الحسن بن ناصر الدین کہ وزارت سلطان سلیمان و ذر سلطان محمود خان بکا  
اور آراستہ بود، و بہت قیم است من ستہ ثلاث و خمیں و خمس مائتہ الی یومنا ہذا (انعام کتاب ہفتولہ ۵۷۳ھ)

سلطان سلیمان (بن محمد بن ملک شاہ ۵۵۶ھ) کے عہد میں اس قوام الدین حسن کی وزارت کا وقت مجھے معلوم نہیں ہو سکا، لیکن سلطان محمود خان (بن محمد خان بن بغرا خان المتوفی ۵۵۸ھ) جو سخر کا بھانجا تھا اور سخر کی قید اور وفات کے بعد اس کا قائم مقام ہوا، ضرور اس کی وزارت سے مستفید ہوا ہوگا، اور یہ وزیر وزارت کے بعد ۵۵۳ھ سے تاریخ ہیت کے بیان کے مطابق ہیت میں مستقل طور پر مقیم ہو گیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ انوری نے جیسا کہ اوپر ولے پانچویں شعر سے معلوم ہوتا ہے ۵۵۳ھ کے پہلے ضرور کسی وقت مدح سرائی اور غزل گوئی چھوڑ دی تھی، اور وقت ۵۵۶ھ کے بعد ہوگا، کیونکہ اس سال مقامات حمیدی کی تالیف پر انوری نے اشعار لکھے تھے مدح سرائی ترک کرنے کی وجہ غالباً مدح کو وفات سخر (المتوفی ۵۵۶ھ) کا غم دکھانا ہے، یا خود مدح کے والد ناصر الدین ابوالفتح طاہر (المتوفی ۵۴۴ھ) کی وفات کا اثر ظاہر کرنا ہو جس سے شاعر نے یکبارگی شاعری چھوڑ دی، یا انوری شاعری کرتے کرتے اُکتا گیا ہو، تنقید میں یہ صحیح فرمایا گیا ہے کہ سلطان احمد میرزا شاہ نے انوری کو ترنہ بلایا تھا، اس کی تاریخ نکلیات انوری (ص ۳۵) میں یہ ہے:-

اندر آمدن در حجرہ من نیم شب  
روز بہمنہ یعنی دوم بہمن ماہ

سال بد پانصدویں نہ تاریخ عجم  
گفت بر خیز کہ از شہر ہوں شد ہمارا

لے لے نصیحی، ورق چلا، باکی پور لے لے، شہر بفر دشاہ کی بہت بڑے متعلق اشعار ہیں، جہاں وہ پھرایا ہو،

علامہ شبلی نے بھی یہی قصیدہ اور تاریخ نقل کی ہے لیکن سہو ایک جگہ اس تاریخ غم کو ۳۳۳ھ لکھ دیا ہے جو چنداں قابل اعتراض نہیں تھا، کیونکہ سہو ظاہر ہے تنقید میں اس تاریخ غم (یزدجر) کی مطابقت ۳۳۳ھ سے کی ہے، اور قیاس سے بھی یہی زمانہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہجو بلخ والا معاملہ ۱۱۴ھ کے قریب ہی واقع ہوا تھا، اور اس پر اتفاق بھی ہے کہ زند کو انوری اس واقعہ کے بعد گیا تھا، کیونکہ اس کے پہلے دہلیج ہی میں دس سال کے قریب رہ چکا تھا، در مدت وہ سال کہ اس گوشہ و سکنا در قبتہ اسلام مرا مستقر آمد (۱۱۴ھ) اور یہ قیام جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں ۳۳۳ھ کے بعد ہی سے شروع ہو سکتا تھا، انوری کی طلبی کا زمانہ ایک جگہ اس طرح مذکور ہے :-

نشانی عالی و ستور چوں بہ بندہ رسید	قیام کرد و بسوسید و بر دودیدہ نہاد
مرا بخدمت شہ خواندہ کہ خدمت او	کنہ سپہر کہ ہست او زمانہ را بنیاد
عماد دولت دین آنکہ حصن دولت و دین	پس از و فورخرانی شدند از و آباد
شہ مظفر فیروز شہ کہ فتح و ظفر	ز سایہ علم و شعلہ سناش زاد
بر دوز یاز دہم از جیب روانہ شوم	کہ کپاڑ شہر ثموز است بیج از مرداد
اگر ستارہ بہ تمام عزم باشد رام	و گر زمانہ یہ اعطای عمر باشد زاد
بشکل باد و رم زان کہ باد در حرکت	ینا و وز بیابان آب جھوں یاد
چو زیر ران کشم آن مر کبے کہ ایضاً	کہ در ریاضت او باد را بود استاد (۱۱۴ھ)
عنانِ صولت جھوں چنان فرو گیرم	کہ از رکاب گر انم بر آورد فریاد (۱۱۴ھ)

یعنی جلال الوزراء (وزیر فیروز شاہ) نے بادشاہ کے ایما سے انوری کو ترند طلب کیا تھا، اور پانچویں شعر میں ارجب کو انوری کی رودنگی کی تاریخ لٹھی ہجو ترند کی بجائے "خزاد" (یزدجر) ماہ

ہی کے مطابق ہو سکتی تھی، لیکن یہ تاریخ ضرور ٹل گئی ہوگی، کیونکہ ترجمہ پہنچنے کا زمانہ تقریباً ۱۰ ماہ بعد بہمن کا مہینہ تھا، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، تنقید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ ۱۵۰ پر ذیل کا قصیدہ کسی شاعر نے انوری کی مدح میں لکھا تھا،

لے در ہنرمندم اعیان روزگار در نظم و نثر اخطل و حسان روزگار  
لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اشعار انوری ہی کے ہیں اور ایک ہی سلسلے میں آخر تک ہیں،  
اس کے تین شعر قابل توجہ ہیں :-

داند ہنم تراں بقلم انوری و لیک چرخم ہی چہ خواند خاقان روزگار  
لے خرسوار ہ پیش کے لاف می زنی کوشد سوار فضل بمیدان روزگار  
نے نے مدح باز شود ہیں بگوئے زود کا نے ثابت از وجود توادکان روزگار  
شعر انجم میں غالباً کاتب کی بے اعتنائی سے ابوطالب نعمہ صفی الدین عمر مفتی، تاج الدین  
محسب اور نظام الدین احمد کے نام کچھ تبدیل ہو گئے تھے، جن کی صحت بے شک ضروری ہے  
یہ وہ لوگ ہیں جن کو براؤن (ج ۲ صفحہ ۳۲) اور مولانا بشلی دونوں نے انوری کے نجات دہندگان  
میں شمار کیا ہے، لیکن تنقید میں صحیح فرمایا ہے کہ شاعر کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب بلخیوں  
ایسے ایسے مشاہیر فضلا و علما جمع ہیں تو ان کی موجودگی میں بھلا میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ  
بلخی کی جھوکا خیال بھی دل میں لاؤں :- اور اس کے ثبوت میں دو شعر بھی دے دیے ہیں،

ان بزرگوں میں نظام الدین احمد کو پروفیسر شیرانی صاحب نے قاضی القضاۃ کہا ہے او  
سو گند تارے سے یہ شعر پیش کیے ہیں :-

لے مجھے خود اس یز و جردی تاریخ کی مطابقت کے لئے عیسوی اور ہجری سال کی تحقیق نہیں ہے، اس کے لئے -  
من کی کتاب Manuel اس صوبے میں سننے میں بھی نہ آئی ہوگی جبکہ یہاں مولوی کتابیں بھی نہیں ہیں،

افتخارِ خاندانِ مصطفیٰ دریغ و من      کروہ ام و درخش حسانی و ہم بوری  
آں نظامِ دولتِ دین کا نظامِ عدل      در دلِ اغصانِ کند بادِ صبارِ ہری  
در پناہِ سدہ جاہِ رعیت پرورش      بر عقابِ آسمانِ فرماں دہد کبکِ دری  
ہم نبوت در نسب ہم پادشاہی در جب      کو سیلماں تا در انگشتش کند انگشتی  
منہ قاضی القضاۃ شرق و غرب فراتہ      آں کہ ہست از منہش بعبایاں رابری  
آنکہ پیشِ کلکِ طبعش آں دوسرِ آنکہ حلال      صد چو من ہستند چوں گو سالہ پیشِ ساری  
آب و آتش را اگر مجلسِ حاضر کنند      از میانِ ہر دو بردار دشتکوشِ داوی

ان اشعار میں سے آخری تین شعور میرے خیال میں قاضی القضاۃ حمید الدین کی مدح میں ہیں کیونکہ نظام الدین کو پہلے شعور میں ”سید“ کہا ہے اور ان تین شعروں میں سے دوسرا مصرع کسے بجا کی مدح میں ہے یعنی حمید الدین جن کو ”قاضی قضاۃ“ کے خطاب سے ص ۶۳ پر بھی یاد کیا ہے، ع قطعہ صدر اجل قاضی قضاۃ شرق و غرب

اور نظام الدین کی مدح میں تو سو گند نامے کا یہ شعر بھی کافی مبالغہ نہ پیدا کر دیتا ہے :-

بازوے برہاں ز تقدیر نظام الدین توست      آنکہ از تعظیم کرے جبرئیل چاکری

علامہ الدین غوری کے دربار میں انوری کی طلبی کا واقعہ مولانا شبلی کی طرح پروفیسر براؤن (جلد دوم صفحہ ۳۲۷) نے بھی نقل کیا ہے لیکن تنقید میں اس کی صحت سے انکار کیا گیا ہے۔ یہ دیئے ہیں، (۱) بروایت مشہور علامہ الدین انوری سے صاف نہیں تھا (۲) انوری ۶۸۰ھ میں بیروز شاہ کے پاس تہذیب جاتا ہے اور اس کی مدح عرصہ تک کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سنہ سے ایک عرصہ بعد تک وہ مدح سرائی اور شعور گوئی سے تائب نہیں ہوتا، اور (۳) علامہ الدین غوری ۷۵۶ھ میں وفات پاتا ہے اس لئے انوری کی عزالت نشینی کے زمانہ تک اس کا زندہ

ناممکن ہے اور پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ بادشاہ جس نے طلب کیا تھا اور جس کو انوری نے ۵۹۳ھ و  
معانی نامہ لکھ بھیجا تھا وہ غوری کے علاوہ کوئی اور تھا، جس نے ۵۹۰ھ و اے انصار انوری کو لکھے تھے  
مجھے خود اس واقعہ کے متعلق شک ہے لیکن اسی کے ساتھ مذکورہ بالادلائل میں بھی شک ہے، وہ  
"روایت مشہور" محل فصیحی میں ۵۴۷ھ کے تحت اس طرح ہے جو اجمالاً عرض ہے۔

سلطان سخر کے مقابلے کے لئے علاء الدین حسین شمس الدین محمد اور علی چتری مل کر درابہ پر  
آئے لیکن ان لوگوں کو شکست ہوئی، علی چتری قتل کر دیا گیا اور شمس الدین کو پچاس ہزار دینار پر رہا  
کر دیا، لیکن علاء الدین حسین نظر بند رہا، ایک رات سحر نے اس کو قیمتی جوہرات کا ایک طبق ڈا  
اُس نے یہ رُباعی فی البدیہہ کہی:-

بگرفت و نہ کشت نہ مراد صفت کیس      یا اں کہ بدم کشتی اذروے یقین  
واں کہ طبق می دہم در شیس      بخشایش و بخشیم چناں کرد و چین  
سخر خوش ہوا تو علاء الدین نے جانے کی اجازت مانگی، انوری نے کہا:-

چوں بندگی شمت نمی آید خوشش      بالک چو آب و دود لے تچوں آتش  
بر خیز و بسج آں جہاں خوش خوشش      و آنجا علف و گلخن دوزخ می کش  
علاء الدین کو اس بات سے بہت خفت اور ناراضی ہوئی، سخر کی وفات کے بعد خالد  
خالد سے ایک خط انوری کو لکھوایا کہ وہ غزنین آئے، لیکن اس شاعر نے ایک خط علیحدہ بھی لکھا،  
جس میں یہ شعر تھے:-

لے آنکہ در ہنر بہم جا رسیدہ      نیک و بد ز مائے عندار دیدہ

لے غلط بانگی پور ورق پلید ۲ صیح صادق ورق پلید میں سخر کی خوشنودی کی وجہ یہ ہے کہ غوری نے اس کے  
پاؤں کے خال کا بوسہ لیا اور ایک اور رباعی کہی،

اصلت ز قان است نوشتت بہ کوشنگ دام کہ نیم بیت دگر را شنیدہ

انوری سمجھ گیا کہ جانا مناسب نہیں ہو، چنانچہ اُس نے وہ قطعہ مکھ بھیجا، رع

کلمہ کا نذر و بروز دلشب انحر

اس قطعہ میں انوری کو قاضی کہا ہے، حالانکہ خاوران اس کا وطن تھا، ممکن ہے اس کے آباء

اجداد کی اصل قاین کی رہی ہو، بہر حال اگر یہ قصہ صحیح ہے تو گویا انوری کی طلبی کے لئے انتقام کی

خاطر یہی ایک معقول بات ہو سکتی تھی، اس قصہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انوری کو سحر کی وفات کے بعد

اور وہ بھی غزنین میں بلوانا چاہتا تھا، اور یہی زمانہ یعنی ۵۵۳ھ کے بعد اور ۵۵۳ھ کے پہلے ایسا

جب کہ انوری نے کچھ عرصے کے لئے یقیناً شاعری اور مدح سرائی چھوڑ دی تھی، اور اس کا ثبوت

ہم اوپر دے چکے ہیں، اور پھر ۵۵۴ھ والے شعر جو کسی بادشاہ کی طرف سے ہیں ہمارے خیال کی تائید

کرتے ہیں، کیونکہ علار الدین غوری کے اشعار کئی جگہ ملتے ہیں، ایک رباعی تو اوپر مذکور ہوئی، اور دو یہیں

غزنین کے تباہ کرنے کے زمانہ میں اس نے لکھی تھیں، جو طبقاتِ ناصری میں مذکور ہیں، ایک رباعی اور

ملتی ہے جو اُس نے ہرام شاہ کے بیٹے خسرو شاہ کو نیکین آباد کے متعلق لکھ بھیجی تھی، اور جو فرشتہ ۵۵۵ھ

اور مجملِ نصیحی (ورق ۱۱۱) میں ملتی ہے، اس لئے ممکن ہے کہ وہ شعر بھی اسی بادشاہ کے ہوں، بہر حال جیسا کہ

میں نے عرض کیا، اس واقعہ میں شک ضرور ہو سکتا ہے،

اب انوری کے چند ممدوحوں کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں، انوری کے خاص ممدوح و زوڑے

سجڑ میں سے ناصر الدین ابو الفتح طاہر بن خزا ملک بن نظام الملک تھے، جو قوام الدین ابوالقاسم کے

معزول ہونے پر مقرر ہوئے تھے، قوام الدین ابوالقاسم کے قتل کی تاریخ مجملِ نصیحی (ورق ۱۱۳) میں

اور تاریخِ صبح صادق (جلد سوم، ورق ۱۱۳) میں ۵۵۳ھ ہے، لیکن ناصر الدین طاہر کی تاریخ

لے قوام الدین نے میں انصاف ہمدانی کو جو قتل کرایا تھا اس کی تاریخ خزانۃ الاصغار (جلد ۲ ص ۱۱۳) (باقی صفحہ ۲۸۲ پر)

وزارت کے متعلق آثار الوزراء ورق ۳۱۱۱ بانگی پور) تک میں غلط بیانی ہو :-

”ناصر الدین طاہر..... بعد از قوام الدین ابوالقاسم، وزارت بختر تقلد نمودا  
در آن سال سلطان را بکبک مغز بر سید و این وزیر از منصب تمتع نیافت و در ناکامی و وفات  
تاریخ صحیح صادق (ورق ۱۰۶۲) میں بھی بالکل یہی ہے :-

”ناصر الدین) بعد از قوام الدین ابوالقاسم درگزنی وزیر بختر شد و در ہاں سال  
سلطان بدست غزاں گرفتار گشت و ناصر الدین از وزارت تمتع نیافتہ ہدراں آوان در گزشت۔  
لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناصر الدین طاہر ۵۴۶ھ کے بہت پہلے وزیر ہو چکا تھا مثلاً مزی ابی نجم  
دیکھتہ ۱۱۴۶ھ) کو انوری نے اس کی مدح میں لکھا ہے :-

بجلم دعوی ز یح و گو ابی تقدیم	شب چہارم ذی حجر و سن بنامیم
شبے کہ بود شب ہفتم ز آباں ماہ	شبے کہ بود نم شب تیر ماہ قدیم
نماز خشن یکشنبہ از مسہمیں	کہ با و دال سفندار بود از تقویم
چو در گذشت ز شب بہت ساعت رصد	براں قیاس کہ رائے منجمت و حکم
بجز واصل رسید آفتاب نہ گردوں	بخانہ نہیں آفتاب ہفت اقلیم
خدا یگانہ وزیراں کہ جز کمال خدے	نیافت هیچ شرف بر کمال او تقدیم
پہر فتح ابو الفتح طاہر اں کہ شرف	ابد ز زادن امثال او شدہ ست عقیم

اس زمانہ میں بختر کے دربار میں انوری کی رسانی ہو چکی تھی، کیونکہ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ بختر نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) میں ۵۳۳ھ قیلاً غلط ہے، مسائل سا لیکن (جلد دوم صفحہ ۲۶) میں لکھا ہے کہ ہمدانی کو اگ میں  
بھی ڈالا تھا، ہمدانی کی ایک رباعی مذہ کے بیاض اشعار ۱۴۶ میں بھی ملتی ہو :-

در کوئی مہر او منزلے باید نیست	در کشتہ عشق عاصیے باید نیست
لفظی کہ بصیر کار تو نیک شود	با صبر تو دانی کہ دلے باید نیست



السنر خوارزم شاہ کو وہ تیر بھیجا تھا، جس پر انوری کے اشعار لکھے ہوئے تھے، اسی ناصر الدین ابوالفتح طاہر نے قلعہ ہزار اسپ کو (۵۴۲ھ) فتح کرنے میں کوشش کی تھی، جس کے متعلق انوری صاف طور پر کہتا ہے -۱-

صدر جہاں خواجہ زنان و زین را	نصرتزائیدہ بادنا سر دیں را
صبح سعادت دید دولت و دیں را	صاحب ابوالفتح طاہر اُن کہ ز رایش
سد قدیم است حصنہاے حصیں را	حصن ہزار اسپ اگرچہ برد آں ملک
سجدہ کنان بر زین نہاد جبین را	کعبہ دہلیز شد چو دید نصیانش
رحم چناں صد ہزار دیو لعین را	تیر سرخ شہاب کلک تو بس بود
خاصہ تہیائے کار ہائے چینیں را	خود مدو تیغ باد شہ بچہ کار است
چشمہ خوں کرد چشم حادثہ میں را	غیبت خوارزم شاہ کز پس شش ماہ
مستقیم ملک کرد جہل متیں را	دست بفرکاب اصطاف تو ورزد

یہ وزیر انوری کے علم و رقابت سے مرعوب معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اس شعر میں اشارہ پایا جاتا ہے۔  
 بن سوال و جواب امور دیواں را  
 تعلقے بنود کاں شعار و رسم شامت  
 د کلیات انوری ص ۱۷۱

اسی قصیدے کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ انوری کا تعلق آس وزیر سے ایک عرصہ سے ہے، لیکن حاضری سے معذور ہے، چنانچہ کہتا ہے -۱-

۱۔ راحت الصدور (دورق ۱۱۱) سے معلوم ہوتا ہے، کہ چغری بیگ (التوفی ۷۶۰ھ) کے زمانہ سے

مرو بخوئی دار الحکومت ہو گئی تھی، لیکن کلیات انوری (صفحہ ۶۵ - ۱۴۳) سے معلوم ہوتا ہے، کہ ناصر الدین

ابوالفتح، نشتا یور میں ہے اور وہی دار الحکومت بھی معلوم ہوتا ہے،

نہ صاحبِ ملک ازارِ روئے خدمتِ تو دلم قرینِ عذابِ ست ویدہ جفتِ بکا  
 دیک آہِ خمِ نیست ممکن از پئے آں کہ رفتیم بہرین و نشستیم بقفاست  
 ہمیں بہشتِ چو کشتیِ سفرِ نیارم کرد کہ راہِ وادیِ دشوار و عبرہ چوں دریا  
 سرمِ نطلِ رعایتِ پرورشِ بس باشد کہ ساهماست کہ در لعلِ آفتابِ عشا  
 انوری کے کلام میں دو مجید الدین ہیں، ایک مجد الدین ابوطالب بن نعمہ جن کا صحیح نام مولانا شبلی  
 نے بھی لکھا تھا، یکایک انوری (مشت) میں ہے۔

عالمِ مجد کہ برابرِ خدا یاں ملکِ ست مجد دیں لے بسزا بر ملکاں بار خدائے  
 میریِ طالبِ بنِ نعمہ کہ بے نسبتِ او آسمانِ تنگ وز میں مغلّسِ خوشید گدا  
 اسی "نعمہ" کی رعایت اس رباعی میں ہے، ہرگز غمِ این جہانِ خو خوارِ نخورد  
 ہر طالبِ نعمت کہ بدورِ روئے آورد از نامِ پردا منِ حرصِ پُر کرد  
 یہ ابوطالب، سید بھی تھے،

سید و صدرِ روزگار کہ هست ز آلِ یاسین چو از نبیِ یاسین  
 میرِ ابوطالبِ آں کہ مطلوبِ بیش نیست در ملکِ آسمان و زمین  
 ادبِ بلخ میں تھے۔

در بلخِ چو پیری و جوانی ہم افتاد اسبابِ فراغتِ ہم افتاد جہاں را  
 بو طالبِ نعمہ چو شہابِ کی از جود یک چند کم آورد چہ دریا و چہ کاں را  
 سو گندناے میں بھی مذکور ہیں۔

مجد دیں بو طالبِ آں عالمِ کرہ گم شد در؟ عقلِ کلِ آں کردہ از بیرونِ عالمِ اطہر

دوسرے مجد الدین کا نام ابوالحسن عمرانی تھا، اور وہ پنج میں نہیں بلکہ رے میں تھے :-

چوں مراد خوش را با ملکِ رے کردم نیاں در خراسان تازه بہادامِ اقامتِ اراک

تا خداوندے چو مجد وین دولتِ بوالحسن حق شناس بندگان باشند چہ غم اور آشتی

صفحہ ۳۸۹ میں بھی اسی صاحبِ رے کا حال ہے جس کا مطلع یہ ہے :-

لے بدرگاہِ تو بر قصہ رساں صاحبِ رے رہ نشین سرِ کوئے کرماتِ حاتمِ طے

صاحبِ صدرِ جہانی و جہانِ مذہبِ تست عقل دانکہ بجائِ زندہ بود و قابِ رے

اس قصیدہ میں ایک نئی بات اور ملتی ہے :-

بجلائِ پدِ رت سرِ جو نیاور دفرود بوزارت کہ کند رے ترا قانعِ کئے

ان کا پورا نام مجد الدین ابوالحسن علی (ابن عمر) عمرانی معلوم ہوتا ہے، اور وہ وزیر بھی رہ چکے تھے

دستورِ شہر یارِ جہاں مجد دین کہ دین از جاہِ اولیٰ بفتحِ جاوداں رسید

محمودِ جاوداں علی ابنِ عمر کہ عدل از رے او برویتِ نوشیرواں رسید

یہ یقیناً وہی خوش قسمت بزرگ ہیں جن کی مدح سنائی (دیوانِ امیرِ میمنی) نے بھی کی ہے اور

انورِ قی کے ان اشعار کے ساتھ سید حسن غزنوی کے اشعار ملکر آگئے ہیں، پہلے انورِ قی کے اشعار سنئے۔

دلِ لے دست تو داری دانی جاں بیر نیسز اگر بتوانی

بدے صحبت تو نیست گراں چہ حدیث ست بجائِ ارزانی

نہ گرم بوسہ دہی جانِ منی کہ گرم جاں بیری ہم جانی

گا ہم از عشوہ گری می خوانی گاہم از طیسرہ گری می رانی

با فلک یار مشو در بر من از بہرِ نکوئیے ارزانی

تا چو از حد بیری فاش کنم قصہ درد زبے در مانی

تاترا از سر من باز کنند  
مجددین بواحسنِ عمرانی  
اب سید حسن غزنوی کے چند اشعار سنئے اور لطف اٹھائے:-

لے کہ تن را دل و دل را جانی      از دل و جاں چہ نکو تر آنی  
از تو دل در بر من عاریتے      بے تو جاں در تن من زندانی  
گاہ در دل چو جہاں پیدائی      گاہ در سینہ چو جاں پسنائی  
عاشق زار تو ام بے بسنی      بندہ خاص تو ام می دانی  
قصہ آتش دل من چہ کنم      خود چو تو آب من و می خوانی  
زلف پر فتنہ نشانی ہر دم      فتنہ زلف چہ را نہ نشانی  
بر دل من کہ تو داری مسکن      ہر چہ از جود و جفا، توانی  
عذر من از تو نہ خواہد روزے      مجددین بواحسنِ عمرانی  
یہ مجدد الدین بواحسنِ عمرانی کم از کم ۵۳۵ھ تک یقیناً زندہ تھے، انوری کہتا ہے،

مجددین بواحسن کہ ہست عقیقہ      ما در عالم از چو او سرزند  
عدو سالہائے عمرش باد      بچو تاریخ پا نصیب و چیل اند  
انوری کو اس ممدوح سے جلد فائدہ حاصل ہوا تھا، اور یہ مبالغہ حقیقت آمیز معلوم ہوتا ہے  
بندہ را در دوستہ میر تربیت دلت      کار ہستند ہمہ بار و نوبت و ترتیب نظام  
گشت در مجلس اراکان جہاں از یعیان      تاکہ در خدمت در گاہ تو بہت از خدام  
صفحہ ۱۹۲ پر بھی ہے:-

اے خطوط برٹن میوزیم ۲۵۱۴ ورق ۱۱۱۱، شہر لوم (صلوں) میں منوچہری کا بھی ایک قصیدہ اس ممدوح کے متعلق ہے جو بیجا علی قلی ہر ایکے اوشن سے ماخوذ ہے، لیکن وہ قصیدہ یقیناً اٹائی ہے، کیونکہ منوچہری کے بہت جدید ممدوح ہوا ہے،

نام من بندہ بہ یک ماہ بہر سہفت اقلیم گشت مشہور صغارا ز تو و معروف کجا

یہ وزیر جیسا کہ مذکور ہوا ۵۴۵ھ تک یقیناً زندہ تھا لیکن شاید اسکے بعد وہ "مخوس" ہوا،

خلق را بہ وجہ وزی عمر خواہد بودنے و جہ روزی از کجا چون بوخن مجہوش (۵۴۵ھ)  
اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔

پانزدہ سال فزون باشد تا کشتہ شدہ بوخن آن کہ ز احسانش سخن می رانی (۵۴۵ھ)

اس کے قتل سے انوری کو دلی صدمہ ہوا

یہ سچ می دانی کہ دگیتی زمرگ بوخن چرخ جز قہر و ستم دیگر چہ دارد فائدہ (۵۴۵ھ)

یہ مجدالدین ابوالحسن عمرانی تید نہ تھے لیکن مجدالدین ابوطالب نعمہ کی سیادت او پر ظاہر ہو چکی

ہے، غالباً یہی تید تھے جن کی وفات کسی سلج رجب کو (بلخ میں) واقع ہوئی تھی جس کے متعلق  
انوری کہتا ہے:-

شہر رقیتمہ و پر مشعلہ و پر غوغاست سید و صدر جہاں بار نہ دادہ مت کجاست

لے ز اولادیمیر و سبط عقد ہمس کز فراق تو بر اولادیمیر چہ عناست (۵۴۵ھ)

بر وفات تو جہاں ماتم اولاد رسول تازہ تر کردگر سلج رجب عاشور است

بہت ممکن ہے کہ ان کا شمار راحت الصدور دہشت و لے ان صدر جہاں "میں ہو جن کو

مذہب نے وہ سیاسی اقتدار بخشا تھا، کہ گورخاں خطائی (۵۳۶ھ) کو بھی اسکے سامنے تسلیم خم کرنا پڑا تھا،

یہ ابوطالب انوری کے سو گند نامے کی تالیف کے وقت تک یعنی ۵۵۵ھ کے قریب رحیم

پیشہ ثابت ہو چکا ہے) ضرور زندہ تھے، اس کے بعد ان کا پتہ نہیں چلتا،

لے محل فصیحی (مدق ۱۱۱ھ) میں در لے سحر کا فرست میں کشتی تغیر کے ساتھ یہی نام ملتا ہے، جس کے ساتھ یہ جملہ بھی

ہے "اور اد آفریمی و غز جے بقیل رانیدند اسلے انوری کا یہ قول یہ ہے کہ وہ در بھی تھے اور غز میں قتل ہوئے،

افوری کا ایک ممدوح مودود شاہ (مؤید الدین) ہے، جس نے سب کے بعد وفات پائی، ۷۰۹ھ پر ہے۔

جہاں زرقن مودود شہ موید دیں بمانود مزاج و بمانود سرشت

چہ دفریت جہاں لا الہ الا اللہ کہ روزگار درو جز قضاے بد نوشت

چہ سودا زان کہ ازیں پیش خسرواں کردہ ز رزم گاہ قیامت بہ بزم گاہ بہشت

چو عاقبت ہمہ راتا بہ سبخر اندر مرد شدہ ست بہتر خاک شدہ ست بایں خشت

کدام جاں کہ قضا شازور لے چرخ بنرد کدام تن کہ فنا شازور فرو خاک نہشت

اھ! آخری شعریں اس کے باپ ناصر الدین کی طرف اشارہ ہے:-

خداے ناصر دیں را بزرگ اجر سے داد کہ دہر خور و بساطے ز ملک دزشت

اسی مودود شاہ بن ناصر الدین کا لقب مؤید الدین، بعد میں ہوا، افوری نے اُس وقت لکھا تھا:-

حاسد امودود شاہ ناصر الدین القب اگر مؤید شد تو زین مخنی جو اباشی بدرد

چوں پدر مودود دانش کرد تا یزد خدا از سیم حوت و چہارم حوت او یک گت کرد

یہ مودود شاہ "مؤید" غالباً "ملک مؤید" ہے جو سب کے خاص غلاموں میں تھا اور جو سب کے دفا

کے بعد محمود خاں بغرا خانی پر غالب آگیا تھا، یہ غالباً قطب الدین مودود شاہ بن عماد الدین زرنگی

دوالی موصل و مضافات سے مختلف ہے، مؤخر الذکر کی طرح مثلاً سے اس طرح شروع ہوتی ہے:-

خوشاواجی بجا و جلی فضل و ہنر کہ کس نشان نہ دہد در جہاں جنیں کشور

افوری اس کے پاس پہنچا ہے،

بریں نوید رسیدم دریں دیار و ز من بگوش حضرت شاہ جہاں رسید خبر

مرا بحضرت عالی تقریبے فرمود بر لے شاہ پیر دا ختم یکے دفر

بہر دو ماہ بسازم ز علم تصنیف  
برائے دولت منصور خسرو صفدر

لیکن وہاں مایوسی رہتی ہے۔

دیک شاہ بفتح بلاد مشغول است  
نئی کند پرستندگانِ خویش نظر

مودود نام کا ایک اور ممدوح ہے یعنی ضیاء الدین مودود احمد عصمی، یہ مجد الدین بوہنچہ

کا ہم عصر تھا، جو تقریباً ۵۴۳ھ میں ضرور برسرِ اقتدار تھا اس کا ہم عصر ہونا ان اشعار سے ثابت ہے:

با آن کہ چند سال بدیدم بخریت  
کز کلِ خواجگانِ جہاں بو آئینِ بہت

پنداشتہم کہ بازوے احسان قوی تر است  
آنجا کہ برکتِ علمِ پیرین بہ است

مودود احمد عصمی عشوہ ایم داد  
گفتم کہ او سر است، سرِ آخر زن بہ است

راغب شدم بخد مت او تا شدم چنانک  
حالِ سگانِ بو آئینِ احوالِ من بہ است

اور یہ مودود در اصل "نائبِ ستور" تھا،

گفتا کہ کلکِ نائبِ دستور بحر و بر  
اں لطفِ گاہِ بزو سیاستِ بروز بار

مودود احمد عصمی کزنمکانِ اوست  
بنیاد دیں وقاعدہ دولت استوار

اسی لئے اس کو صدرِ آلِ نظام، یعنی ناصر الدین ابو الفتح طاہر دین فرخ الملک بن نظام الملک

کا "ثانیِ ثنین" (نائب) کہا ہے،

ملکت را بکلک داد نظام  
ثانیِ ثنین صدرِ آلِ نظام

بچنیں جاوداں ز ملکش یاد  
ملک گیتی برونی و بہ نظام

صدرِ دنیا ضیاء الدین خدا  
سرد دولت مؤید الاسلام

میر مودود احمد عصمی،  
اں بہ از جنبش و بہ ازارام

اس ضیاء الدین مؤید الاسلام مودود احمد عصمی کی مدح میں جیبِ گنج کے مخطوطہ

سے بعد الواسع جہلی کے بھی کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے،

اے بزرگے کہ ذوالجلال بخود از عدم تاورد چہ او موجود  
صدر کافی مؤید اسلام بلعالی ضیاء دیں مودود  
لیکن جہلی کے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضیاء الدین مودود غزنویں میں بھی  
رہ چکے ہیں:-

پاس از ایزد کا مدبشارت غزنیں بصحت تن صدر اجل ضیاء الدین  
ابو المعالی مودود احمد عصی کہ وقت خشم چون راست کا علم چو طیں  
موتیدے کہ ز خلق وز قدر او گویند شرف پہر اثیر و لطف بہشت بریں  
ان کے علاوہ انوری کے اور بھی ممدوح ہیں جن کا حال تحقیق طلب ہے،

## شعر حسنہ اول

فارسی کی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بہد کی ترقی اور ان کے خصوصیات  
و اسباب مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام مشہور شعراء (عباس مروزی سے  
نظامی تک) کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہو، قیمت:- ۱۰ روپے

## ایضاً حصہ دوم

شعراء متوسطین کا تذکرہ و خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ اور ابن یمن تک (معہ  
تنقید کلام، قیمت:- ۱۰ روپے)

”مینجر“



## اردو صحافت کا ارتقا

از جناب سید ابو عاصم صاحب ایم اے علیگ

۱۴۹۸ء میں داسکوڈی گاما نے ہندوستان کیا دریافت کیا کہ اس سونے کی چڑیا پر اہل یورپ کی حریصانہ نظروں پڑنے لگیں، کہیں اقتصادی اور معاشی سدھار کے لئے تجارتی تعلقات کے ریشمی پھندے ڈالے گئے، کہیں روحانی اصلاح کے لئے مشنریوں کا جال بچھایا گیا، اس کا رخیر میں یورپ کا ہر ملک ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، اور یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، آخر کار برطانیہ اپنی فطری صلاحیت کی وجہ سے دوسری قوموں پر غالب رہی اور ہندوستان کو تہذیب و شائستگی کا سبق پڑھانے لگی اور اس کے مذہبی اداروں نے بچھاپے کی بنیاد ڈالی، اور اب یہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں برٹش پریس کی بانی اول مشنریاں تھیں مشنریوں کا سب سے پہلا قدم مدراس میں آیا، اس لئے یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ پہلا تامل ٹائپ ۱۷۸۶ء میں جاری ہوا، اور دوسری کوشش ۱۸۱۸ء میں ٹرانکور بارشین کے لئے ہوئی، پھر ۱۸۱۸ء میں حکومت مدراس نے دیوبری پاڈیچری مشین کو پریس کے استعمال کی اجازت دی، بنگال میں یوں تو انگریز اور انگریز کی اجازت سے بہت پہلے فورٹ ولیم تعمیر کر چکے تھے، لیکن بھی ان کے قدم جے نہیں تھے، اور انگریز کے انتقال کے بعد ۱۸۳۷ء میں انھوں نے فرخ سیر

۱. Rise of Christian power by Basu. ۲. Newspaper -  
Epitomy Times. Page ۱۱۸. ۳. Encyclopedia of India -  
Vol II P. ۵۸۸.

سے گجرات، دکن اور بنگال میں بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ ۱۸۳۹ء میں نادرتھ کے حملے نے سلطنت مغلیہ کو ہلا دیا، اسکی مرکزیت ختم ہونے لگی، اور اس کے صوبے آزاد اور خود مختار ہونے لگے، اُس وقت بنگال میں علی ودی خاں نواب بن بیٹھا، مرہٹے الگ اپنی طاقت بڑھا رہے تھے، اور دکن کا تعلق دلی سے برلے نام رہ گیا تھا، اور سکھ بھی ہاتھ پاؤں نکال رہے تھے، بنگال میں علی ودی خاں کے انتقال کے بعد ۱۸۵۶ء میں سراج الدولہ تخت پر بیٹھا، اسکی اور انگریزوں کی نہ بنی کیونکہ وہ اب تجارت سے ملک گیری کا خواب دیکھنے لگے اور پھر سازشوں کا ایک جال بچھ کر اور جنگ پلاسی ۱۸۵۷ء میں بنگال اور جنگ بکسر ۱۸۵۷ء میں دہلی اور اودھ کبھنی کے زیر اثر آ گئے، اور اس کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی مل گئی، گویا بنگال برطانوی علاقہ ہو گیا، اس کے بعد وہ ایسی لوٹ پوٹ مچی کہ وہاں کے تمدن و معاشرت اور صنعت و حرفت کو شدید نقصان پہنچا، اس ظلم و ستم کی داستان اتنی عام ہو چکی تھی کہ جب کھلایو نے خود کشی کی تو ڈاکٹر جانسن نے اس کے متعلق کہا کہ ”جس شخص نے اپنی قیمت ایسے جرائم سے بنائی تھی، اسکے ضمیر نے اُسے خود کشی پر مجبور کر دیا“ اگر اس وقت کی دلی کا تابا ہی کا نقشہ دیکھنا ہو تو سودا کا شہر آشوب دیکھ لیجئے،

۱۸۵۷ء تک گئینی نے مدراس، بمبئی اور بنگال کی پریسڈنسی قائم کر لی، اور جنوبی ہند میں بہت بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا، گویا کل کے تاجراب تاجدار بن بیٹھے، انگلستان کی پارلیمنٹ نے ۱۸۵۷ء میں ”ریگولیشن ایکٹ“ پاس کیا اس سے کبھنی پارلیمنٹ کے ماتحت ہو گئی، اور تین پریسڈنسیاں ایک نظام میں آ گئیں، جس پر ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا، اور چار ممبر کونسل، بنگال دارالسلطنت اور ہٹنڈر پہلا گورنر جنرل بنا، اس زمانہ سے انگلستان اور ہندوستان کے تمدنی اور معاشرتی تعلق اور مضبوط ہوئے، اس سے پہلے جو انگریز آتے تھے وہ ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے نہایت پست ہوتے تھے، اس دور سے کچھ انسان بھی آنے لگے، مآربن ۱۸۶۵ء میں ہندو

آیا، وہ فارسی اور بنگالی نائپ کا بانیِ اول تھا، یہ پریس اٹھارہویں صدی کے آخر اور ایسویں صدی کے شروع میں رائج ہوا، یہ بات قابلِ غور ہے کہ نائپ لیتھوگرافی کے قبل وجود میں آیا، اس نائپ کا استعمال نہ صرف فورٹ ولیم کے سرکاری کاغذات کے لئے ہوتا تھا، بلکہ مولانا سید احمد بریلوی شہید

اور مولوی کرامت علی صاحب جوپوری نے اپنی اصلاحی تحریک ۱۸۲۶ء کی اشاعت کے لئے بھی اسی سے فائدہ اٹھایا، جب کلکتہ میں پورا استحکام ہو گیا تو سب سے پہلے جس گیسٹ

James Augustus Abernethy نے ۱۹ جنوری ۱۸۲۸ء میں بنگال گزٹ

نکالا، یہی ہندوستان کا پہلا اخبار کہا جاسکتا ہے، یہ سینکڑوں پرغوب حملہ کرتا تھا، اس لئے زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا، ۱۸۲۸ء سے ۱۸۲۹ء تک ہندوستانی اخباروں پر جو زیادہ تر انگریزی تھے، بہت سی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں، عبدالرزاق صاحب نے پنڈت کیفی پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”سب سے پہلا اخبار ۱۸۲۸ء میں شائع ہونا بتایا گیا ہے یہ صحیح نہیں ہے، اگر نمٹ ہند نے فتح دہلی کے بعد یہ ضروری سمجھا تھا کہ سرکاری کاروبار کی اطلاع اہل ہند کو دی جانی چاہئے، یہ ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں پر اخبارات سختی کے ساتھ منظر آتے کرتے تھے اور وہ ان کو بعض اوقات جلا وطن کر دیتی تھی، اس لئے اول اول بعض حکام کی سرکاری

تحریرات کے ذریعہ اطلاعیں دی گئیں، بالآخر ۱۸۲۸ء میں انڈین گزٹ جاری کیا گیا، اس کی اشاعت ہفتہ ہوتی تھی، ملاحظہ ہو ”دی بنگال اینول ۱۸۵۳ء“، انڈین ویلی میل ۱۸۳۱ء، معلوم نہیں فتح دہلی سے کون فتح مراد ہے، میرا خیال ہے کہ موصوف کو غلط فہمی ہوئی، اس کی مزید تشریح کی ضرورت تھی، اٹھارہویں صدی کے آخر میں انگریزی کے بہت سے اخبار نکلتے گئے تھے، مثلاً کلکتہ گزٹ، اور نیلس ایڈورٹائزر، لیکن ۱۸۲۸ء کے قبل کسی اخبار کا وجود ثابت نہیں

انڈین گزٹ ضرور ایک اخبار تھا، جو بعد میں شائع ہوا،

۱۸۵۸ء میں فورٹ ولیم کالج میں پریس کھل گیا، اور یہاں سے ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے فنیشنوں کی تصانیف شائع ہونے لگیں، اسی زمانہ میں سر ام پور کے پادریوں نے بھی ایک مطبع کھولا، جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں میں کتابیں چھپتی تھیں، یہ وہ وقت تھا جب ولزلی گورنر جنرل تھا، اور ابھی تک ہندو مسلم تعلقات بہت خوفگوار تھے، ان کے لباس اور طرز معاشرت میں بڑی حد تک یکسانیت تھی، سراج الدولہ اور ہمارا جہ نمیب کشن کا لباس ملائے تو کوئی فرق نظر نہ آئیگا، تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان فارسی تھی جس کو ہندو مسلمان دونوں یکھتے تھے، اسی لئے جب شاہ عالم نے کلایو کو بنگال کی دیوانی عطا کی تو یہ شرط بھی رکھی تھی کہ سرکاری زبان فارسی رہے گی، اس کا اثر یہ ہوا کہ جتنے اخبارات نکلتے سب فارسی زبان میں، سب سے قدیم فارسی اخبار جام جہاں نام ہے، جو غالباً ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے نکلا تھا، سر ام پور سے ایک بنگالی اخبار سماچار درپن ۱۸۱۵ء میں پہلے ہی نکل چکا تھا، فارسی کا یہ پہلا اخبار تھا ۱۸۲۳ء میں ایک اردو ضمیمہ بھی شائع کرنے لگا تھا، لیکن یہ ضمیمہ مقبول نہ ہو سکا، اس کے بعد بہت سے فارسی اخبارات جاری ہوئے، آئینہ سکندر ۱۸۳۱ء، سلطان الاخبار ۱۸۳۵ء میں، اس کے اڈیٹر دو کے مشہور انشا پرداز رجب علی سرور تھے، سراج الاخبار ۱۸۳۱ء یہ مغل دربار کا کورٹ گزٹ تھا، اور بہادر شاہ کے زیر سرپرستی دلی سے نکلتا تھا، اور بھی بہت سے اخبار نکلتے جن کی تفصیل غیر ضروری ہے، ۱۸۳۵ء ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہم ہے، کیونکہ اسی سال لارڈ لیک نے دلی پر قبضہ کر لیا، اور مرہٹوں کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، شاہ عالم مرہٹوں کے بجائے انگریزوں کے لئے انسائیکلو پیڈیا آن انڈیا، نیو سپر سٹریٹس لندن، ہسٹوریکل جرنل میں ایک مضمون بہ عنوان تھمڈ کلچر لکھا،

۱۸۴۰ء میں دلی کی تحقیق میں، کی بنگال گزٹ پہلا اخبار ہے،

ہاتھوں کٹھ بتلی بن گیا، گویا سلطنت منگیلہ کی راجدھانی بھی بدیسی ہاتھوں میں چلی گئی اور قدیم  
 ویر غنٹ ہندوستانی معاشرت کے مرکز میں بھی گھن لگ گیا، گو شاہ عالم <sup>۱۸۵۶ء</sup> تک زندہ رہا،  
 اور اکبر ثانی <sup>۱۸۵۶-۳۷ء</sup> بخاور بہادر شاہ <sup>۱۸۳۷-۵۶ء</sup> تک بادشاہ کہلائے، لیکن ان کی حقیقت شاہ شطرنج  
 سے زیادہ نہ تھی، اس وقت سے عجیب ذہنی کنکشن شروع ہوئی، نئی تہذیب و تعلیم پرانی معاشرت  
 و تعلیم سے دست و گریباں نظر آنے لگی، اس کنکشن کا ہلکا سا عکس مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب  
 ابن الوقت میں نظر آتا ہے، سیاسی اقتدار کے بعد <sup>۱۸۵۶-۸۱ء</sup> سے اقتصادی، تعلیمی اور ادبی ترقی  
 کا دور شروع ہوا، تعلیمی دھبے کی کچھ بڑھ گئی، جدید تعلیم کی بنیاد رکھی جانے لگی، اور بہت سی معاشرتی  
 تحریکیں اس تعلیم کا نتیجہ تھیں شروع ہو گئیں، اس زمانہ میں بنگال کی خاص اہمیت ہو گئی تھی، اور  
 وہاں کا متوسط طبقہ ترقی کر رہا تھا، اس ترقی نے دوسروں کو بھی ترغیب دی، فورٹ ولیم کالج  
 کی وجہ سے دیسی زبان پھیل رہی تھی، <sup>۱۸۵۶ء</sup> میں ہندو کالج قائم ہوا اور راجہ رام موہن رے  
 نے قدیم سنسکرت تعلیم کے خلاف آواز بلند کی، اس وقت سے سارے ہندوستان میں ایک تعلیمی اور  
 مذہبی کنکشن شروع ہو گئی، <sup>۱۸۳۵ء</sup> میں مہارے کی تجویز پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا  
 ہمارے پرانے قانون بھی اپنی اصلی حالت پر نہ رہے، بلکہ وہ ہندو، مسلمان کے بجائے اینگلو  
 لا اور اینگلو مسلم لا ہو گئے، مغرب اور اس کے فلسفیانہ خیالات نے بھی ایک ہل چل پیدا دی، اسی زمانہ  
 میں مولانا سید احمد بریلوی نے تجدید و اصلاح اور سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا، مولانا  
 کرامت علی جوہر کی تحریک مشرقی بنگال میں اردو کے ذریعہ اپنا کام کر رہی تھی، ان تحریکوں  
 نے اردو کو ترقی دی، لیکن اردو ٹائپ مقبول نہ ہو سکا، اور دلی میں <sup>۱۸۳۷ء</sup> میں لیتھو پریس قائم ہوا،  
<sup>۱۸۳۵ء</sup> میں شہناہی ہند میں دفتری زبان فارسی سے اردو ہوئی، اور پریس کو بھی آزادی ملی، <sup>۱۸۳۶ء</sup> میں  
 مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر نے دہلی سے اردو اخبار نکالا، اردو صحافت میں اہمیت

کا فخر اسی کو حاصل ہے، یہ ششہ تک خوب چلتا رہا، علمی نقطہ نگاہ سے اردو اخبار اور اس کا مطبع کو اشاعت خیالات تربیت رلے عامہ، طباعت کتب میں اولیت کا امتیاز حاصل، اس میں ادبی حیثیت کو زیادہ اہمیت تھی، چنانچہ ذوق، متون اور غالب کی غزلیں کبھی ہم طرا غزلیں کبھی زبان و محاورات کی بحث کبھی تہمدی کی شاعری پر مباحثہ وغیرہ موضوعوں پر منظر ہوتے تھے، ششہ میں مولوی باقر علی نے اردو کا ایک دوسرا اخبار منظر حق نکالا، معلوم نہیں کتنی مدت تک زندہ رہا،

دوسرا اخبار سید الاخبار ہے جس کو سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ششہ میں نکالا تھا، موصوف کا عین شباب میں انتقال ہو گیا، کچھ دنوں تک سر سید نے بھی اس کو مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں:-

”سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ رلے نام ایک اور شخص کے سپرد تھا، مگر زیادہ

ترسید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے، لیکن یہ اخبار ایک مدت تک جاری رہ کر بند ہو گیا۔“  
 ”فوائد الناظرین“، ماسٹر رام چند دلی سے نکالا کرتے تھے، پہلے یہ ماہوار رسالہ تھا، لیکن ششہ سے ہفتہ وار ہو گیا، اس اخبار میں مشہور اشخاص کی تصویریں اور مختلف مقامات کے نقشے بھی ہوتے تھے، یہ چیز پہلے کیس نظر نہ آتی تھی، نقشے سائنٹفک مضامین، علمی آلات اور تاریخی اشخاص کی دست تصویریں اسکی خصوصیات میں سے تھیں، ششہ میں ایک اور اخبار قرآن السعدین پبلیشنگ ہاؤس کی ادارت میں دلی سے نکلا، یہ بارہ برس تک زندہ رہا، ششہ میں قرآن پبلیشنگ ہاؤس کے مدیران سے ہفتہ وار اخبار ”اسعد الاخبار“ نکالا، دیوان نقشب کا پہلا حصہ اسی اخبار کے مطبع سے ششہ

۱۰۔ آجادی ممدی پبلشنگ کے اردو اخبارات کی فہرست سالہ اردو ششہ ۱۹۳۵ء،

میں شائع ہوا، اس میں قطعہ تالیف اور کتابوں کا اشتہار نظم میں درج ہوتا تھا، ۲۰ نمبر کی اشاعت میں مرزا حاتم علی مہر کا وہ قطعہ جو انہوں نے لاہور ڈوٹھوزی کے خیر مقدم میں کہا تھا

درج ہے، ۵

ڈوٹھوزی است رونق بخش ہند اے صبا درخش جہت ایں مردہ گو

مصرعہ تالیف مقدم گفت مہر افتخار مہند باد انجسم تو

۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کے نمبر میں یہ خبر درج ہے کہ بدر الدین علی خاں نے ملکہ وکٹوریہ اور

پرنس البرٹ کے لئے مہریں کھود کر دیں،

احسن الاخبار مطبوعہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں لکھتا ہے کہ ”صادق الاخبار کے ایڈیٹر صاحب نے

رفتہ رفتہ اپنے اخبار کو اردو زبان کا اخبار بنا دیا ہے ابھی میں نہیں آتا کہ فارسی زبان سے کیوں رابطہ اُلفت منقطع کر دیا، شاید اخبار کے خریداروں نے تھا ضایا ہو گا کہ فارسی زبان ترک کر دے

اور اردو زبان جاری کر دے“ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کا مطالبہ وزیر و وزیر بڑھ رہا

تھا، بادشاہ دہلی کے مقدمہ کے سلسلہ میں، اس کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے، ”ایک گواہ کن سنگھ نامی کا بیان ہے کہ

”جمال الدین ایک ہفتہ دار اخبار نکالتا تھا، جس کے مضامین قطعی انگریزی

حکومت کے خلاف ہوتے تھے، اس کا نام صادق الاخبار، سچی خبریں تھا، دلی میں بڑا اخبار

بجھا جاتا تھا“

کریم الدین مصنف تذکرہ شعراء نے مطبع رفاه عام قائم کیا، اور ایک اخبار کریم الاخبار

کے نام سے جاری کیا ۱۸۴۹ء میں شیخ محمد ضیاء اللہ نے ضیاء الاخبار نکالا،

یہ وہ وقت تھا جب ڈوٹھوزی ہندوستان کا گورنر تھا جو مغربی تہذیب کی برتری کے

خطہ میں مبتلا تھا، اس نے ویسی ریاستوں کے احاق کا ایک طوفان پیا کر رکھا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اسکے عہد میں سائنس کے فیوض و برکات بھی نظر آنے لگے، ٹیلیگراف، جہاز رانی اور ڈاک میں سہولیت ہوتی گئی، کارڈ کی قیمت ایک پیسہ اور لفافہ کی دو پیسہ تھی، انگریزی تعلیم اور سرکاری ملازمتوں کی وجہ سے اردو تحریر کے تکلفات ختم ہونے لگے اور ایک کاروباری زبان پیدا ہونے لگی، جس نے اسکو پچھلے میں بڑی مدد ملی، ۱۸۳۵ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ اخباروں کی انتہائی آزادی کا زمانہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں اردو اخبارات بڑی تیزی سے بڑھنے لگے اور ایشیاٹک جرنل کی زبان میں ”انگریزی نہیں بلکہ ویسی اخباروں نے ہندوستان میں معاشرتی، اخلاقی، مذہبی تعلیم اور مادی انقلاب پیدا کیا ہے“ ویسی اخبارات اپنے حقوق کے لئے لڑتے رہے اور یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ قوم کی بیداری میں ان اخباروں کا بہت بڑا حصہ ہے، اسی وقت سے اردو صحافت نے اپنے ہونہار ہونے کا پورا ثبوت دیدیا تھا، یہ اخبارات اس وقت کی معاشرت اور مذاق کے آئینہ دار ہیں،

کوہ نور کے اجراء سے اردو صحافت نے ترقی کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا، یہ نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کا اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا، جسے ۱۸۵۷ء میں منشی ہر سکھ رائے نے لاہور سے نکالا، منشی ہر سکھ رائے مصافات سکندرہ کے رہنے والے تھے، مولانا احسن مارہروی نے اسکا سنہ اجراء ۱۸۵۹ء بتلایا ہے، یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں بڑی کثرت سے اردو اخبارات نکلتے تھے، دہلی کے بیان کے مطابق چھبیس اخبارات اور رسائل صرف صوبہ شمالی مغربی سے نکلتے تھے، جن میں تیس ہندوستانی زبان کے تھے، دو فارسی کے اور ایک بنگالی کا،

لے بچول ہٹری آف انڈیا کے *News after North Indian Historical Journal* کے  
تاریخ نثر اردو،



دوسرے صوبوں کے اخبارات کو ملا کر پچاس تک تعداد پہنچ جائیگی۔ <sup>۱۸۵۵ء</sup> کے آخر ہی میں <sup>۱۸۵۵ء</sup> کوہ کے خریداروں کی تعداد ۲۵ تک پہنچ گئی تھی، اس کے خریداروں میں سر جان لارنس، لفٹننٹ لیس، مسٹر میکورڈ، مسٹر سلین، مسٹر میگراور دوسرے انگریزوں کے نام بھی ملتے ہیں، یہ مدراس، ممبئی اور کلکتہ تک پھیلا ہوا تھا۔ <sup>۱۸۵۳ء</sup> میں یہ اخبار ہفتہ وار سے روزانہ ہو گیا، لیکن پھر ہفتہ وار ہو گیا، یہ وہی اخبار ہے جس کے علمہ میں منشی نوکسور بھی کام کرتے تھے، اس کے دامن سے اس دور کے بہت سے ہندو اور مسلمان ادیب و راہل قلم وابستہ رہے، مثلاً نادر علی، تاج الدین، منشی نول کشور، امرزا موہد، منشی نثار علی شہرت، مولوی سیف الحق، ادیب، مولوی محمد دین فرق اور منشی عرم علی چشتی وغیرہ اس کے اڈیٹر رہے، بعض عیسائی بھی اس کے اڈیٹر تھے، اس کا نام اتنا مقبول ہوا کہ ہندوستان کے بہت سے اخباروں نے اپنے نام میں نور کا جز لگایا، مثلاً دریائے نور لاہور، نور الاخبار اور افشاں لدھیانہ، نور الانوار و مطلع نور <sup>۱۸۶۲ء</sup> میں یہ نامی گرامی اخبار بند ہو گیا،

اس زمانہ کے اکثر اخبار اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہوتے تھے، اور بعض اخبار میں انگریزی اور اردو ساتھ ساتھ ہوتی تھی، مثلاً اگرہ گورنمنٹ گزٹ یہ سرکاری اخبار تھا جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا، اندور سے آٹھ صفحات کا ہفتہ وار اخبار مالوہ نکلتا تھا اس کے ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں ہندوستانی ہوتی تھی اس کے اڈیٹر دھرم زائن بہت اچھے شاعر تھے، انھوں نے مل کی پولیٹیکل اکالومی اور انگلستان کی تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہے، راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں بھرت پور صوبہ اگرہ سے ایک اخبار منظر السرو نکلتا تھا، اس میں بھی ہندی اور دونوں ہوتی تھی،

بنارس سے <sup>۱۸۵۵ء</sup> میں ہرکارہ جاری ہوا، بریلی سے عمدۃ الاخبار، لکھنؤ پرکاش

ادارت میں نکلا، انھوں نے ایک علیٰ اخلاقی انسائیکلو پیڈیا بھی لکھی جس کا نام مشرقی طرز پر زینت زینت رکھا، مرزا پور سے امریکی پرنٹنگ مشینوں کا اخبار خیر خواہ جاری ہوا، شملہ سے شیخ عبد القدر نے شملہ اخبار نکالا، موصوف انگریزی اور ہندوستانی دونوں سے واقف تھے، ۱۸۵۳ء میں دیوان چندر رائے سیالکوٹ نے ہمارے بے بہا کے نام سے مطبع چشمہ فیض سے جاری کیا، جہاں دکتور یہ پیر کے نام سے بہت دنوں تک زندہ رہا، کلکتہ سے اردو گائیڈ نکلا، مولانا احسن مامٹر نے خورشید عالم سیالکوٹ اور طلسم لکھنؤ کا بھی ذکر کیا ہے، یہ دونوں اخبار ۱۸۵۶ء میں جاری ہوئے تھے، اس میں طلسم لکھنؤ اس لئے اہم ہے کہ اس سے ۱۸۵۷ء کی شورش کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی خبریں زیادہ تر افواہیں ہوتی تھیں، اسی کے بعد پہلا دور ختم ہو جاتا ہے،

اس دور میں سیاسی اور خارجی امور اخباروں کی توجہ کا مرکز تھے، پریس کی آزادی کی وجہ سے لب و لہجہ میں بہت کچھ بے باکی تھی، خالص اشتہار کا اب تک راج نہیں ہوا تھا، اخباروں کی زبان گو بیاض و بہار جیسی نہ تھی، پھر بھی قدیم تھی، فارسی انشاء کا نتیجہ اب بھی کیا جاتا تھا، اس قسم کی ترکیبیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں، "راقم چٹھی، صاحب چٹھی، انتخاب ایک چٹھی، اجازت اندر جانے کی لی، بیگم صاحب بیٹھی تھی، بچوں بجائے چونکہ، بحصول اجازت حکام واسطہ خرید نیلام اسباب لوٹ کے، چارج عمدہ جج کا تھا، وے وہ کی جمع، نسبت سابق صحبت رکھنے میں، کرا سپانڈٹ بجائے نامہ نگار کے، بلا حصول پاس مالک کے، فقروں اور جلوں کو کسی قسم کے وقفوں کے نشانہ سے جدا نہیں کرتے تھے، انگریزی املا کی صحبت کا اس قدر خیال تھا کہ پیٹرن اور ڈیمو بھی لکھتے تھے، بیسی بیس کی جگہ لکھتے تھے، اس زمانہ کی صحافت کی مدعا نگاری قابل تعریف ہی، وہ اپنا مطلب خوبی سے ادا کر لیتے تھے،

لے خطبات گارسان سماجی ۱۸۵۷ء Cultural History of Urdu Journalism ۱۸۵۷ء اس دور کا خصوصیت  
ہندوستانی کے مضمون اب سے آدھ صدی کے اردو اخبارات رسالہ اردو ۱۸۵۷ء اور Historical  
JOURNAL AND PYESS AFTER MUTINY سے ماخوذ ہے،

# تَلَخِیصٌ تَبَصِّرُکَ

## راجہ ٹوڈرل کے لڑکے

یوپی سٹاریکل جرنل کے ستمبر ۱۹۰۳ء میں راجہ ٹوڈرل کے لڑکوں کی نسبت ایک تحقیق مضمون شائع ہوا ہے جس کی تلخیص حسبِ ذیل ہے:-

اکبر کے نامی گرامی وزیر ٹوڈرل کے لڑکوں کے حالات بہت کم معلوم ہیں، لیکن پھر بھی ہمارے پاس مستند تاریخیں موجود ہیں جن سے اُن کی زندگی کے حالات کا علم ہو جاتا ہے، اکبر نامہ میں دھارو، گوردھن (غالباً گوردھن) اور کلیان داس کا ذکر ہے، ایک سنسکرت ڈرامہ کام سادوہ مصنفہ سیشہ کرشن میں راجہ ٹوڈرل کے ایک لڑکے کا نام گوندھاری بتایا گیا ہے، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھاری گوندھاری کا مخفف ہے، جس کو والدین نے پیاسے دھارو کر لیا ہے، اور یہی نام دونوں سے زیادہ مشہور ہے، بعض لوگوں نے غلطی سے دھارو اور گوندھاری کو ایک ہی سمجھ لیا ہے، کھتری اتھاس کا مصنف تو ایک قدم آگے بڑھ گیا ہے، وہ گوندھاری کو بڑا بھائی کہتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ گوندھاری یا دھارو راجہ ٹوڈرل کا بڑا لڑکا تھا، ہورج (Beveridge) کے اکبر نامہ میں صرف دو لڑکوں دھارو اور کلیان کا ذکر ہے،

۱۵۴۴ھ  
اکبر نامہ میں دھارو کا سب سے پہلے ذکر اس وقت آیا ہے، جب فتح دھول کا جوہر جون

میں مرزا مظفر حسین اور مرزا علی کے خلاف نصیب ہوئی تھی، وہ اس خبر اور منتخب ہا تھیں کو گجرات سے دوبار لیجانے کے لئے تعینات ہوا تھا، قیاس ہے کہ اس مہم میں اپنے باپ کے ساتھ ساتھ وہ بھی شریک جنگ تھا، جو کام اس کے سپرد تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ اس کی بہادری کا صلہ اور اس کی حوصلہ افزائی تھی، دوسری بار اس کا ذکر اس طرح آتا ہے، ششہ جلوس شاہی کا زمانہ تھا، عرب بہادر جو صوبہ بہار میں تربت اور چھپران کے درمیان خانِ عظم سے شکست کھا کر جون پور کی طرف بڑھا رہا تھا، اس کی سرکوبی کے لئے اکبر کے حکم سے اپنے باپ کی طرف سے بھیجا گیا تھا گو درجن نے باغی کو پہاڑی علاقہ میں بھگا دیا، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جونپور میں مقرر ہو گیا تھا یا دوبار اگر وہ سے بھیجا گیا تھا، اکبر نامہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ شمشیر خاں ۲۷ جلوس شاہی کو بہار سے بنارس آیا تاکہ راجہ ٹوڈل کی فوجوں کو وہاں سے لے کر بہار کے باغی کو سر کرے، راجہ اس دارالہمٹ میں تھا، اس لئے ممکن ہے کہ اس کا لڑکا عارضی طور پر بنارس میں یا مستقلاً جونپور میں مقرر ہوا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کی موت کے بعد جونپور سے دوبارہ میں حاضر ہوا تھا اور ششہ جلوس شاہی سے غالباً وہ کئی سال تک جونپور ہی میں مقیم تھا، پانچ سال بعد ایک واقعہ اور ذکر ہے، جس سے یقین ہو جاتا ہے، کہ وہ جونپور کا حاکم تھا، وزیر خاں کے انتقال کے بعد شہباز خاں بنگال سے لوٹ رہا تھا تو اس نے وزیر خاں کے بیٹے صاحب کو اس عہدہ پر مقرر کیا تھا، خود ۲۳ سالگی میں دوبار میں حاضری کے لئے روانہ ہوگا، اس کے جاتے ہی صاحب کے دماغ میں بغاوت کا مادہ پکنے لگا، اور وہ موقع ڈھونڈنے لگا، جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوا تو اس نے میر مراد کو ضروری احکامات بھیجے، وہ اس وقت بہار اور بنگال کے امراء کا سزا دل نامزد ہو کر بھیجا گیا تھا، اس نے وزیر خاں کے تمام سپاہیوں کو بھرتی کرنا شروع کیا، جوان دونوں صوبوں کے امراء کی خدمت کے لئے تیار تھے، اور اس کا انتظام کیا کہ باقی سپاہیوں کی مدد سے صاحب کو دوبار

حاضر کر دیں، صراح کے تمام عذر لنگ مراد کے لئے قابل قبول نہیں تھے، وہ اپنے فرض سے دستا تھا، راستہ میں دو غائب اور رشوت سے اس بات کی کوشش کی کہ اندروں کے اندر ایک انتہا پیدا ہو جائے، اور جب وہ جو پور پہنچا تو دھارو کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا، سزا دل کی ہدایت کے مطابق صراح کے ساتھ ایک نگران کا رہنا ضروری تھا لیکن راجہ کے لڑکے سے یہ چوک ہو گئی اور اُس نے صراح کو بغیر کسی چوکیدار کے آگے بڑھنے دیا، راستہ میں اس نے خوب سیم وزر لٹائے اور بہت سے سپاہیوں کو اکٹھا کر کے میر کے علاقہ فنجور ہنسوا کی طرف کوچ کر گیا، میر کو اس کی سازش کا پتہ چلا اور وہ قریب کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا، اس باغی نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، اور اطراف میں لوٹ مار اور غارتگری شروع کر دی، ابو الفضل کہتا ہے:

”ایک بیک قصبات اور دیہات کے جاگیرداروں کو اس ہنگامہ کی خبر ہوئی، اور وہ وہاں پہنچ گئے، سب پہلے آنے والوں میں انہیں مورال تھا، جس نے اپنے ساتھ

ایک اچھا فوجی دستہ بھی لایا۔“

اس کو گوندھاری نے جو پور سے بھیجا تھا، صراح فوراً گھر گیا اور دربار میں لایا گیا، اس واقعہ سے دھارو کی اپنی غلطی کے احساس اور اس کے ہر وقت تدارک کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، لیکن اس سے زیادہ یہ واضح ہوتا ہے کہ راجہ کا لڑکا اُس وقت جو پور کا بٹا تھا، پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اسی زمانہ میں اس نے بنارس میں ایک تہوار کے تماشہ کو روٹی بخشی تھی، جو بیشیش کے اعزاز میں ہوا تھا، ایک شکرت ڈرامہ کام سودھ مصنفہ سیشہ کرشن جو اسی کی سرپرستی میں لکھا گیا تھا، جب یہ ڈرامہ اس تہوار میں کھیلایا گیا، تو وہ بھی شریک تھا، اس ڈرامہ کے شروع میں ایک اشلوک ہے جس میں اس کو راجہ گودردھن دھاری کے ازمنشا میر سلطنت سے خطاب کیا گیا ہے،

۱۵۸۹ء میں دھارو جو پور میں تھا اس سال کے آخر میں اس کے باپ کا انتقال لاہور میں ہوا جس نے ہمیشہ کے لئے جو پور چھوڑ دیا، اور ۱۵۹۱ء کے وسط میں بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا، اور اپنے باپ کے فادموں کو پیش کیا، اور خاطر خواہ انعام پایا، اسی سال مرزا عبدالرحیم خانخاناں ملتان کا صوبہ دار مقرر ہوا اور مرزا خان بیگ ترخان کے خلاف سندھ کی مہم پر مامور کیا گیا، گو دھارو جس کہنا در اور خان کا خطاب لے چکا تھا، اپنے دستہ کے ساتھ خان خانان کی کمک کو پہنچ گیا، دھارو نے بہت ہی نمایاں خدمات انجام دیں اور دشمن کے ساتھ بہت سی جنگوں میں بڑی بہادری سے لڑا، آخر کار اس کی پیشانی پر ایک نیزہ لگا، اور وہ گھوڑے سے گر پڑا، یہ بڑا کاری زخم تھا آخر ۱۵۹۲ء میں ایک سچے سپاہی کی طرح بہادری سے لڑتے ہوئے اس نے جان دیدی،

اس ہونہار فوجوان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے گھوڑوں کو سونے کی نعل لگاتا تھا، ابو الفضل کے بیان کے مطابق اس کا نام ہفت صدی پہلے سالاروں کی فہرست میں نظر آتا ہے، اور اس کی ماہانہ تنخواہ قریب قریب آٹھ ہزار روپیہ تھی اور اسکو بائیس گھوڑے، بائیس ہاتھی اور چھیالیس بار برداری کے جانور رکھنے کی اجازت تھی،

راجہ ٹوڈل کے دوسرے رٹکے کلیان داس کو کہیں راجہ کلیان سنگھ اور کہیں راجہ کلیان سنگھ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس دریں کلیان بہت لوگوں کا نام تھا اس لئے اس میں بہت کچھ غلطی ہوئی ہے، لاہور کے پروفیسر شرمائے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ترک میں راجہ کلیان سنگھ کو غلطی سے راجہ ٹوڈل کا لڑکا بتلایا ہے، اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تین دلیلیں پیش کی ہیں،

۱، آثارِ امراء نے راجہ ٹوڈل کے کسی رٹکے کا یہ نام نہیں بتلایا ہے، اور نہ وہ کسی

لے رٹکے کا ذکر کرتا ہے، جو اتنا متاثر ہو،

(۲) بہارستان غیبی نے راجہ مان سنگھ کے لڑکے کا نام کلیان سنگھ بتلایا ہی، اس کتاب سے یہ پتہ

چلتا ہے کہ کلیان سنگھ اپنے باپ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوتا تھا،

(۳) مان سنگھ کا ایک لڑکا کلیان سنگھ تھا،

فاضل پروفیسر کو حیرت ہے کہ سرحد و ناتھ سرکار نے کس طرح تزک کو تسلیم کر لیا اور بہارستان اور تزک کے اختلاف کو نظر انداز کر دیا، لیکن افسوس ہے کہ پروفیسر مذکور کو یہ نظر نہ آیا کہ سرحد و ناتھ سرکار کی دلیلوں کی بنیاد زیادہ مضبوط ہے،

اگر تائیں راجہ ٹوڈل کے کسی لڑکے کا ذکر نہیں ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے

کوئی لڑکا نہیں تھا، اگر نامہ جو کہیں زیادہ بہتر اور قریب تر معاصرانہ تاریخ ہے نہ صرف اس کا ذکر کرتی ہے، بلکہ راجہ ٹوڈل کے لڑکوں کے کارناموں کی بھی اس میں تفصیل ہے،

پروفیسر مذکور کی دوسری دلیل بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے، وہ شاید بھول گئے کہ ناتھ صاحب

پر انکو پورا بھروسہ ہے، اس نے بھی اپنی کتاب بہارستان غیبی چوتھے باب ۱۵ اور پھر دسویں باب میں راجہ

کلیان ولد ٹوڈل لکھا ہے، ”یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جہاں پر راجہ مان سنگھ کے لڑکے کلیان سنگھ

کا ذکر ہے، وہاں راجہ کا لفظ شامل نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ راجہ مان سنگھ کا ایک لڑکا کلیان سنگھ

تھا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں کیس راجہ کلیان سنگھ کا نام آیا ہے، اس سے مان سنگھ کا

لڑکا ہی مراد ہو، جہاں گیر کے وقت میں راجہ ٹوڈل کے لڑکے کا نام راجہ کلیان یا راجہ کلیان سنگھ

اور کبھی راجہ کلیان بھی لیا گیا ہے، اس کے علاوہ مان سنگھ نے بھاؤ سنگھ اور دوسرے مہاشیخ جگت سنگھ

کا لڑکا دوہی وارث مرنے وقت چھوڑے تھے، جگت سنگھ مان سنگھ کی زندگی ہی میں دیر سے

کو بچ کر لیا، اب یہ ممکن ہے کہ کلیان سنگھ جو بہت ہی کم مشہور ہوا، راجہ مان سنگھ کے دوسرے

لڑکوں کی طرح ان کی زندگی میں چل بسا ہو اور یہ بالکل قطعی ہے، اس لئے کہ بھاؤ سنگھ کے بعد

دارثوں میں جگت سنگھ کے لڑکے کا نام نہیں آتا، جہاں تک راجہ ٹوڈرمل کے لڑکے راجہ کلیان سنگھ کا تعلق ہے، یہیں قطعی معلوم ہے کہ وہ راجہ ان سنگھ کی موت کے بہت بعد تک زندہ رہا، راجہ مان سنگھ کا انتقال ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۶۱۴ء میں ہوا،

جب ہم راجہ کلیان کے حالات ترک اور اُس کے ساتھ اکبر نامہ میں پڑھتے ہیں تو اُن کے متعلق کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا، اکبر نامہ کے بیان کے مطابق کلیان دس ولد راجہ ٹوڈرمل کو اکبر کے انچا سوس سال جلوس میں ایک ہزاری اور پانچ سو گھوڑوں کا منصب عطا ہوا، ترک سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۱۱ء میں راجہ کلیان سنگھ کے منصب میں پانچو ذات اور تین گھوڑوں کا اضافہ ہوا، جس نے اُن کے مجموعی منصب کو یکہزار پانچ سو ذات، اور آٹھ سو گھوڑوں تک پہنچا دیا،

ابو الفضل نے سب سے پہلے کیا یوں کے راجہ رودرا چند کی اطاعت کے سلسلہ میں ذکر کیا، بریلی کا کلکٹر متھرا داس اس راجہ سے ملا اور اُس نے اُس کو ترغیب دی کہ وہ اس کے ساتھ چل کر اکبر کو نذر عقیقت پیش کرے، راجہ رودرا چند کو اس کھتری کی ضمانت پر حاضر ہونے میں تامل ہوا، لیکن ساتھ ساتھ اُس نے دربار میں حاضر ہونے کا وعدہ کیا، اگر راجہ ٹوڈرمل اسکی ضمانت لے لیں، اپنے بیٹے ٹوڈرمل نے اپنے لڑکے کلیان داس کو بھیج دیا تاکہ کیا یوں کے راجہ کو اطمینان ہو جائے، راجہ کلیان پر بھر دسہ کر کے لاہور چلا گیا، اور ۱۵۸۹ء کے سرمایہ میں اکبر کے دربار میں حاضر ہو گیا، کلیان کا ذکر دوسری بار اکبر کے چھالیسویں سال جلوس (۱۶۰۱ء) میں ہوتا ہے، ابو الفضل نے لکھا ہے آٹھ بہن کو شہنشاہ کو علم ہوا کہ چند بد طینت سرکشوں نے خراج وصول کرنا نہیں چھوڑا ہے، بادشاہ نے چند مقبرہ و مسجد آدمیوں کو اپنی حکومت میں روک تھام کے لئے مقرر کیا، ان میں ایک کلیان داس بھی تھا، اور گجرات کی راہیں اس کے سپرد ہوئیں،



اگیر کے انچاسویں سال جلوس میں اس کا نام ان امرا کی فہرست میں دسواں تھا، جن کے منصب میں اضافہ ہوا تھا، اکبر نامہ کا بیان ہے کہ کلیان داس ولد راجہ ٹوڈرل کو ایک ہزار ذات اور پانچ گھوڑوں کا منصب عطا ہوا اور قلعہ کا گنج سیر دہوا،

جہانگیر کے عہد میں راجہ کلیان بنگال بھیجا گیا جہاں اُس نے بادشاہ کو تحائف بھیجے، جو ۸ محرم بروز دوشنبہ (غالباً ۳۴ راج ۱۶۱۱ء) کو بادشاہ تک پہنچے، اس کا اثر یہ ہوا کہ راجہ کلیان کے منصب میں پانچ سو ذات اور تین سو گھوڑوں کا اضافہ ہوا جس نے اُس کا منصب ایک ہزار پانچ سو اور آٹھ سو گھوڑوں تک پہنچا دیا،

۲۴ مئی ۱۶۱۱ء کو ایک حکم نامہ صادر ہوا جس سے ہاشم خاں صوبہ دار اڑیسہ کو کاشمیر تبدیل کر دیا گیا، ہاشم خاں اپنی نئی جگہ پر فوراً روانہ نہیں ہوا، غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا کہ اسلام خاں کی سفارش کیے ازلای خاں زاداں، پر کلیان کے منصب میں دو سو ذات اور گھوڑوں کا اضافہ ہوا، ایک شاہی جھنڈا ایک علم، ایک شاہی نقارہ اور صوبہ اڑیسہ کی صوبہ داری عطا ہوئی، اس صوبہ پر ۱۶۱۱ء سے لیکر ۱۶۱۸ء تک اُس نے حکومت کی راجہ کیشو داس مارو نے خود را (جو کہ اڑیسہ اور گولکنڈہ کی سرحد پر واقع تھا) کے والی پرشوتم دیوا کو سخت شکست دی اور اُس کو مجبور کر کے بہت ہی ذلت آمیز شرائط صلح اس سے منوائیں، لیکن بہت جلد اس صحف نامہ کے پرزے اڑ گئے، راجہ کلیان نے کیشو داس مارو کے ساتھ خود را پر حملہ کر دیا، اس نے پرشوتم دیوا کی ریاست کو غارت کر دیا، اور اس کو مجبور کر دیا کہ مارو کے شرائط صلح کو پھر تسلیم کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کو نہ صرف اپنا مشہور ہاتھی شیشا ناگادربار میں اور تین لاکھ روپیہ خراج شاہی خزانہ میں داخل کرنا پڑا بلکہ اپنی رٹکی کو بھی شاہی حرم میں بھیجا پڑا،

بعد میں راجہ کلیان کے خلاف کچھ نامناسب شکایتیں پہنچیں، جس کی وجہ سے وہ ۱۶۱۸ء

میں واپس بلا لیا گیا، اُس نے دربار میں حاضر ہونے میں دیر کی، اس سے اس کے دشمنوں کو موقع مل گیا اور اُنھوں نے بادشاہ کا دماغ اس کے خلات بھر دیا، آخر شش گت کے آخر میں جب اُس نے حاضری کی درخواست کی تو وہ اور اُس کا لڑکا آصف خاں کی حراست میں لے لئے گئے، اور آصف خاں کو حکم ہوا کہ مقدمہ کی تحقیقات کریں، ایک ہفتہ کے بعد اٹھارہ ہاتھی جو راجہ اڑیسہ سے لایا تھا اُن میں سے سولہ شاہی فیمل خانہ میں داخل ہو گئے اور دو اس کو پیش کئے گئے، جب ایک ہفتہ اُد گزر گیا، اور آصف خاں نے اپنی تحقیقات پیش کی کہ کھان بے گناہ ہے، تب بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی اسکو اجازت ملی، اس موقع پر راجہ نے ایک سوہر، ہزار روپیہ، موتیوں کا ہاں جس میں اتنی موتی اور دو لعل تھے، اس کے علاوہ ایک مالاجس میں ایک لعل اور دو موتی تھے، اور ایک سونے کے گھوڑے کی صورت جو جو امرا ت سے لپی ہوئی تھی پیش کی، بادشاہ نے نہ صرف ایک خلعت اور ایک گھوڑا عطا کیا، بلکہ مہابت خاں کے دو پہ سالاروں میں ایک اس کو بھی مقرر کیا، دوسرا آند خاں تھا، مہابت خاں اس وقت کابل کا صوبہ دار بنا کر بھیجا گیا تھا، او نگلش کو سر کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا، کلیان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہے۔

علی محمد خاں نے اپنی کتاب مرآۃ احمدی میں ایک تیسرے لڑکے کا ذکر کیا ہے، اُس نے لکھا ہے کہ گوبی ناتھ ولد راجہ ٹوڈر مل سورت کے قریب کڑی کے شہر میں امن قائم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ اپنے اور دوسرے امرا جیسے راجہ سور کے دستوں کے ساتھ مالوہ کے راستہ سے وہاں پہنچا اور ملک کے اس حصہ میں بد امنی کا خاتمہ کر دیا، اس سے زیادہ اُس کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں ہے،

# احسان علیہ السلام

## عسلی گدھ عربی میں پہلا پی ایچ ڈی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے عربی میں پی ایچ ڈی کی پہلی ڈگری سید محمد یوسف صاحب کو عطا کی ہے، یوسف صاحب دو سال سے علامہ عبد العزیز المبینی کے تحت ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اور اسی یونیورسٹی کے فرسٹ کلاس فرسٹ ام لے گئے ہیں، سید یوسف صاحب کے مقالہ کا موضوع ”المہلب بن ابی صفرۃ“ ہے، اور ٹائپ کے تین صفحات پر مشتمل ہے، المہلب اپنے وقت کا نامور ترین فوجی قائد تھا، جس نے تیرہ سال کی مسلسل جنگ کے بعد شام میں غوراج کے سب سے زیادہ مفرط فرقتہ ازارقہ پر فیصلہ کن فتح حاصل کی، یہ مشہور فتح اور اس کے علاوہ میدان کارزار میں مہلب کے دیگر کارنامے تاریخی روایات میں محفوظ ہیں، لیکن ابھی تک المہلب کے صحیح مقام کا تعین نہیں کیا گیا، مورخین نے ہنوز اس بات کی کوشش نہیں کی کہ المہلب کے کارناموں کی اہمیت کا اندازہ لگائیں اور اس کے مکمل نظام جنگ اور تدبیر حرب کے مخصوص طریقوں کا مطالعہ کریں، اس مقالہ میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ المہلب کے فوجی کارناموں کو ان کے مناسب تاریخی ماحول اور وقتی حالات کے پس منظر میں پیش کیا جائے، اور یہ اندازہ لگایا جائے کہ عربوں کے فن حرب کی ترقی میں المہلب کا کیا حصہ ہے،

اسلامی تاریخ کے اہل اور قدیم ماخذوں میں کافی مواد ملتا ہے، جس سے المہلب کی عسکری زندگی

کی مکمل داستان بنائی جاسکتی ہے اور اُس کی قیادت اور تدبیر جنگ کی امتیازی خصوصیات کا تنقیدی مطالعہ کیا جاسکتا ہے لیکن خالص تاریخی ماخذ المہلب کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں، المہلب کے کارنامے صرف میدانِ کارزار تک محدود نہیں، اس کے ذاتی خصائص بالخصوص جو دو سنا اتنی ہی شہرت رکھتے ہیں جتنی کہ اس کی فتوحات، اس کی نفاستِ طبع اور ادبی ذوق پر اس کے مقولے اور اس کی تحریریں گواہ ہیں، (جو بطور ضمیمہ مقالہ کے آخر میں شامل ہیں) اسی طرح اسکا شاعرانہ ذوق اور شاعرانہ نوازی کا تذکرہ ایک علیحدہ باب چاہتا ہے، ان سب امور کیلئے ادبی کتابوں اور معاصر شعرا کے دیوانوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، اس مقالہ کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں تاریخی ماخذوں کے علاوہ ادبی مصادر سے پوری پوری مدد لی گئی ہے اور جہاں کہیں بھی نثر میں خواہ نظم میں، المہلب کا حوالہ پایا جاتا ہے، اس کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے،

جہاں تک فنِ حرب کا تعلق ہے المہلب کا طرہ امتیاز اس کی مطالعات اور مراوغہ کی پالیسی ہے وہ جلد فیصل ہو جانے والی لڑائیوں کے بجائے طویل جنگ کو ترجیح دیتا تھا، صبرِ آزما معاصرین کے ذریعہ دشمن کی اقتصادی طاقت کو ناکرنا اور مکائد و حیل سے مخالفتِ جماعت میں تشدد و انتشار پیدا کرنا اس کا سب سے کارگر حربہ تھا، یہ طریقہ جنگ اس زمانہ کے لئے ندرت رکھتا تھا، یہاں تک کہ بہت سے لوگ اس کے سمجھنے سے بھی قاصر تھے، ازراۃ کے خلاف تیرہ سال کی مسلسل جنگ اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، اس جنگ میں المہلب کی کامیابی اس کے معاصرین کی ناکامی کے مقابلہ میں اور زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور اس کا مخصوص طریقہ جنگ صاف واضح ہو جاتا ہے،

المہلب کی زندگی اس لحاظ سے بھی دلچسپ ہے کہ وہ پہلا عرب جنرل تھا، جس نے ۳۳ء میں شمال

مغرب سے ہندوستان پر حملہ کیا، المہلب کا ذکر روایتِ حدیث میں بھی ہے،

سید یوسف صاحب کے مقالہ کے تین تختین تھے جن کی رپورٹ سے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

۱۔ ڈاکٹر ڈی ایم ڈانڈسن (ہنری مارٹن اسکول آف اسلامک اسٹڈیز)

”یہ مقالہ اہم ترین عربی ماخذوں سے ریسرچ کا ایک نہایت مکمل نمونہ ہے، یہ قابل تحسین صحت و صفائی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے، یہ حد درجہ دلچسپ ہے، اس لئے کہ اس کا انداز بیان راست و صریح اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔“

۲۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد، اے، پی، ایچ ڈی (ڈپٹہ)

”مسٹر یوسف نے اس مقالہ کے ہیرو المہلب کو ہر ممکن نقطہ نظر سے پیش کیا ہے، اور ساتھ ہی ایک ایسا پس منظر بھی فراہم کیا ہے جس سے ہیرد کی تصویر اور زیادہ موثر اور فطرت کے مطابق نظر آتی ہے، انھوں نے بکھرے ہوئے مواد کو جمع کرنے اور اس کو ایک مکمل دلچسپ اور پڑھنے کے قابل تصنیف کی صورت میں ڈھالنے کے لئے بڑی محنت اٹھائی ہے، اور جو مواد بھی ان کو ملا اس کو بڑی ہنرمندی اور تنقیدی نظر سے جانچا ہے، جہاں کہیں انھوں نے مانے ہوئے علماء سے اختلاف کیا ہے، وہاں اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کئے ہیں، جو اکثر صورتوں میں واجب التسلیم ہیں، اپنے بیان کو حد امکان تک جلی اور مکمل بنانے کے لئے انھوں نے ایسی کتابوں کی بھی درق گردانی کی ہے جن کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، مثلاً عربی شعور کے کلام کے مجوئے، مسٹر یوسف نے اسلامی تاریخ کے ایک قدیم تاریک اور پرفتن دور کے وقائع کو اس فن کے پیرو حضرات کی بہت بہتر ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔“

۳۔ مولانا عبدالعزیز المہینی صدر ادارہ عربی مسلم یونیورسٹی:-

”رسالہ میں مہلب کو محض ایک شرعی عرب یا ایک آزمودہ کار جہز اور قائمہ اکبر کی حیثیت

ہی میں پیش نہیں کیا گیا، بلکہ یہ اس کے جملہ مجلسی خصائص طبعی مکارم اور خداداد جواہر کا ایک ہمہ گیر کتبہ سامنے لا رکھا ہے، جس میں تہلب کے دربار میں اس ہمد کے نامی شاعر اور قبائلی و فود آتے ہیں اور اپنی منہ مانگی مرادیں پا کر مٹ جاتے ہیں یہ اور اسی قسم کی اور خوبیاں ہیں، جو اسلامی قائدین کے سوانح نگار بہت کم دکھاتے ہیں جس سے غیروں کو ان کی زندگی محض قتل و غارت کے مناظر کا مجموعہ نظر آتی ہے۔“

”سید یوسف صاحب نے مختلف دوا دین شعراء و مجامع ادبیہ سے اس ہمد کی تاریخ کے علمی ادبی اور تاریخی ریزے چن چن کر ان کو تاریخی حقائق کی صف میں لاکھڑا کیا ہے، اور اس طرح موجودہ تاریخ کے بیانات کے تسلسل میں ان کو جہاں جہاں خلا نظر آیا اس کو اپنے من گھڑت سے نہیں بلکہ اپنی عرق ریزی اور ریزہ چینی سے نہایت سلیقہ کے ساتھ پُر کیا ہے۔“

”میں یونیورسٹی کو مبارک باد دینا ہوں کہ اسکی چار دیواری میں علمی مواد کی کمی کے باوجود ایسا رسالہ تیار کیا گیا جو ہندوستانی بلکہ بیرونی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں بھی مخصوص امتیاز کا حامل ہے،

## زمین دوز شہر

لندن کا ایک محلہ جو گوہ باری سے تباہ ہو گیا تھا، اب اس میں ایک زمین دوز شہر ایک سو فٹ کی گہرائی میں آباد کیا جا رہا ہے، جس میں ۳۵ ہزار آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہوگی، اور وہ گلوں اور گلا گھونٹنے والی گیس سے محفوظ رہیں گے، یہ شہر ان لوگوں کی حفاظت کے لئے مخصوص ہوگا، جن کی حفاظت خود سلطنت کی حفاظت خیال کی جاتی ہے، کیونکہ یہ لوگ یا تو خود اہمیت رکھتے ہیں یا اون کے کارنامے اہم ہیں، اس شہر میں دوکانیں، رستوران اور شفا خانے وغیرہ سب ہونگے، اور کئی مین ٹن اینٹ اور پتھر اس نئے شہر کی تعمیر کے لئے زمین کے اندر سے نکالے گئے ہیں،

# انتہی

## مقدم ماہِ صیام

از جناب سخی اعظمی

صد شکر کہ رحمت کا مہینہ نظر آیا      مومن کے لئے وجہِ سکینہ نظر آیا  
وہ ماہ ہوا جس میں در فیضِ ازل باز      انوارِ الہی کا خزینہ نظر آیا  
بڑھتے ہوئے طوفانِ ضلالت میں جہاں      عرفان و ہدایت کا سفینہ نظر آیا  
ظلمت کدہ دہر کی تاریک فضا میں      ہر سمت تجلی کا فترینہ نظر آیا  
خود چشم کو اک کا اشارہ ہو کہ یہ ماہ      ایام کے خاتم کا نگینہ نظر آیا  
اذکار سے پُر نور عبادات سے معمور      ہر بندہ اللہ کا سینہ نظر آیا  
راتیں ہوئیں تسخیر و تراویح سے آبا      وہ ذوقِ عبادتِ شبینہ نظر آیا  
ہے چشمِ تصور میں ”قم ایلیں“ کا منظر      نظارہ سرکارِ مدینہ نظر آیا  
توحید کے میخانے ہیں یا صحنِ مساجد      عابد کے کفِ دست میں مینا نظر آیا  
وارثِ ثلثِ شوق میں سجدوں پہیں سجدے      پُر کیف عجب و دورِ شبینہ نظر آیا  
ہر سمت ہے پھیلی ہوئی مہتابِ تجلی      ہر گوشہ تماشا گاہِ سینا نظر آیا  
حق یہ ہے کہ اس ماہ کا ہر لمحہ قدس      بامِ فلکِ قدس کا زینہ نظر آیا

صدقے میں ملی جس کے ہیں دولتِ کونین

مژدہ کہ وہ پُر نور مہینہ نظر آیا

## سجدہ گہ افلاک

از جناب روش صدیقی

اتنا تو نہونا تھالے وحشتِ دلِ میناک	میرا بھی گریباں چاک نکلا بھی گریباں چاک
ہر پردہ ساز اس ہی شعلہ بہ پیرا ہن	خاموشیِ الفت ہے وہ نغمہ آتشناک
اک بربطِ بے نغمہ اک سا غربے بادہ	جو دل نہیں بشکستہ جو آنکھ نہیں مناک
معمورہ امکاں میں جو کچھ ہے محبت سے	کوئین کی قیمت کیا انبارِ خس و خاشاک
جو یارے محبت نے کھائی تھی جہاں ٹھوکر	وہ نقشِ قدم اب تک ہے سجدہ گہ افلاک
خاکِ رہِ الفت ہے اک سر نہ مینائش	اس خاک سے کرتے ہیں انجم بھی نکلیں پاک
دیکھو تو روشِ بڑھکر کیا حضرتِ زاہد ہیں	یہ کون سبویکے بیٹھا ہے بزیرِ تاک

## غزل

از جناب حسرت ترمذی بی بی 'اے ال' ال' بی'

خضر سے راہِ محبت میں مجھے کام نہ تھا	میں وہ آزاد ہوں جو بندہ ادھام نہ تھا
انقلابِ در بھی تھے عشق میں حسرت کے سوا	کیا غم عشق کا عالم کوئی انجام نہ تھا
دیدہ جلوہ نگر کو ترے جلووں کیلئے	حرم و دیرو کلیسا سے کوئی کام نہ تھا
ہے وہ دردِ وجودِ دل سے نہ گیا جھجھی	اے وہ دل جسے اک لمحے کو آرام نہ تھا
انتہا یہ ہے کہ ہکونہ رہی اپنی خسیر	ابتدا وہ تھی کہ اندیشہ انجام نہ تھا
ہمکو وہ پاس وفا تھا کہ ترے غم کے سوا	عشق میں کوئی شریکِ دلِ ناکام نہ تھا
حسن کو اہل ہوس نے کیا رسوا کیا کیا	جلوہ طور تماشا سے سرِ بام نہ تھا
تکھو رسوائیِ حسرت تھی گوارا کیسے	عشق بدنام سے کیا حُسن بھی بدنام نہ تھا



# مطبوعات جامعہ اسلامیہ

سلطان محمود غزنوی، از جناب محمد حبیب صاحب بی لے داکٹر، پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی، ناشر ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، حجم ۱۳۸ صفحے تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی ٹائپ میں، سلطان محمود غزنوی، اسلامی تاریخ میں دور شہنشاہیت کا بانی سمجھا گیا ہے، "سلطان" کا لقب پہلی مرتبہ اسی نے اختیار کیا، پروفیسر محمد حبیب اسکی سیرت، کردار اور کارناموں کے متعلق اپنے چند خاص نظریات رکھتے تھے، جن کو مدت ہوئی وہ اپنے مختلف مضامین میں پیش کر چکے تھے، او اسی زمانہ میں ان خیالات پر مختلف و موافق مضامین نکل چکے تھے، پھر عرصہ ہوا انھوں نے انہی نظریات کی روشنی میں انگریزی زبان میں محمود پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور اس پر بھی بعض اہل علم کی طرف مفصل تنقید اسی زمانہ میں شائع ہو چکی ہے، اب جناب سید جمیل حسین صاحب ایم، اے (چیدر آباد سروس) نے اس کتاب کو سلیس اردو زبان میں منتقل کیا ہے، جو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی طرف سے شائع ہوئی ہے، یہ کتاب چار بابوں میں تقسیم ہے، پہلے باب میں دسویں صدی عیسوی کی اسلامی دنیا پر نظر ڈالی ہے، جس میں حکومتوں کی سیاسی تقسیم، عالم اسلامی پر خلفاء کے ذہنی اقتدار، چھوٹی خانہ دانی حکومتیں، ان کی خانہ جنگیاں اور خلفائے اُن کے تعلقات مسلمانوں کی مذہبی جماعتیں اور اُن کے اختلافات، اور مسلمانوں کے درمیان نسلی تفوق کے رجحانات کو تفصیل سے دکھایا ہے، دوسرا باب سلطان محمود کے عہد حکومت پر ہے، جس میں غزنوی سلطنت کی بنیاد و تاسیس دکھا کر مشرقی و مغربی ملکوں پر محمود کے حملوں اور فتوحات کو یکے بعد دیگرے سلسلہ

بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان پر محمود کے حملوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے، تیسرا باب محمود کے کارناموں کی نوعیت و اہمیت پر ہے، اس میں مصنف نے محمود کے متعلق اپنے ذاتی رجحانات و نظریات کو خاص طور پر بیان کیا ہے، اور اسی ضمن میں محمود کے دور کی تمدنی و علمی ترقیوں کا ذکر آیا ہے، مصنف کا خیال ہے کہ محمود ایران کی ادبی نشاۃِ جدیدہ کا بانی ہی ہے، اس کے عہد میں مذہبی سرگرمی تقریباً ناپید اور ایک باجبروت شاہنشاہی کی ہوس پیدا ہو چکی تھی، اس نئی روح سے ایک نئی تہذیب کے ارتقا میں مدد ملی، اور رزم و بزم دونوں میں نفاست و خوشنمائی کا ماحول پیدا ہوا، محمود ایران کی ادبی نشاۃِ جدیدہ کا ایک عظیم الشان مربی بنا، علم و ادب کی سرپرستی کی، اور اس کی ترقی کے مواقع پیدا کئے، اس کے بعد اس کے حملوں اور فتوحات کے متعلق دکھایا ہے کہ اس کا مسلحہ نظر سراسر دنیا اور ایرانی تھا، اُس نے اپنی سپہ گری کے جوہر سے دنیا کو جبریت میں ڈالنے والی فتوحات حاصل کیں، ہندوستان پر اُس کے حملے حکومت قائم کرنے یا اسلام کی اشاعت کرنے کی غرض کے بجائے صرف تحقیر زر کے لئے تھے، غزنوی فوج مجاہدین پر شکستھی جو مذہب کی خاطر جہاد کے لئے آمادہ ہوئی ہو، بلکہ وہ ماہرین فن کی ایک تربیت یافتہ تنخواہ دار فوج تھی، جو ہندو اور مسلمان دونوں سے یکساں لڑنے کی عادی تھی، اس نے محمود کے ہاتھوں ہندوستان کے مندروں کی بربادی خالص دینا وہی اغراض کے تحت عمل میں آئی، چوتھے باب میں غزنوی سلطنت کے زوال اور خاتمہ کو دکھایا گیا ہے، کہ محمود اپنی فتوحات سے جو کچھ حاصل کر سکا، اس کو قائم رکھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، اس کے آنکھیں بند کرتے ہی ناخلف مسودے ہاتھوں غزنوی شاہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا، او وہ ایک چھوٹی سی سلطنت بن کر رہ گئی، جس کو ابتداً بلوچوں نے برباد کیا، پھر جہڑ صفوں میں بلوچوں کے عروج و زوال کی طرف اشارہ کرنے کے بعد دکھایا ہے کہ بارہویں صدی کے وسط میں غزنوی سلطنت وسیع و بے انتہا ہیت دونوں کا خاتمہ ہو گیا، اور ان کی جگہ غور اور خوارزم کی حکومتوں نے لے لی اور

اسی پر اس کتاب کا خاتمہ کیا گیا ہے، سلطان محمود کے متعلق پروفیسر محمد عیوب کے مختلف تاریخی نظریات و رجحانات میں سے اگر بعض محل نظر ہیں تو بعض قرین صحت بھی ہیں، لیکن مصنف نے کہیں کہیں محمود کی ذات و کردار کے متعلق جو ناملائم، درشت، تلخ اور ایک غیر جانبدار مورخ کی شان سے فروتر و لہجہ اختیار کیا ہے، ہم اس کو ان خوش عیقدہ مسلمان مورخین کے خوشگوار لب و لہجہ کا رد عمل قرار دے سکتے ہیں، جنہوں نے محمود کو سراپا راہِ خدا کے مقدس مجاہد اور صحابہ کرام کے نقش قدم کے مخلص متبع کے لباس میں پیش کیا ہے، اس لئے اب مستقبل کا کوئی مورخ ہی اس افراط و تفریط کے درمیان کوئی راہِ صواب پاسکتا ہے،

**فتح مبین**، مرتبہ جناب حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب ریس و تاؤلی، علی گڑھ، حجم ۲۹۳ صفحہ

تفصیل ۲۲x۱۸، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت درج نہیں، پتہ دارالریاست و تاؤلی ضلع علی گڑھ

مصنف نے تحریکِ خلافت کے زمانہ میں "اسلامی خلافت کا کارنامہ" کے نام سے ایک شائع کی تھی، مصنف کے نزدیک خلافت سے مراد مذہبِ عالم کی دعوتیں ہیں، جو اپنے اپنے وقتوں میں کرۂ ارض پر تہذیب و تمدن کی بانی رہیں، اور ان کے مصلحانِ تہذیب اصطلاح میں بنی یا رسول کہے گئے، اسی لحاظ سے اسلامی حکومت سے مراد اسلام کا وہ عظیم الشان ادارہ ہے جس نے دنیا میں تہذیب و تمدن کی کبھی نہ بجھنے والی شمع روشن کی، اور جس کی مکمل عملی تصویر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک میں ملتی ہے، اسی مناسبت سے مصنف نے پہلی جلدوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے مختلف پہلو پیش کیے اور زیرِ نظر حصہ میں جس کو "فتح مبین" سے موسوم کیا ہے، سوانح پاک کے بعینہ حصے درج کیے، اس جلد میں علیؑ مدنیہ سے وصالِ نبویؐ تک کے حالات درج ہیں، اور مختلف ابواب میں سیرت پاک سے ہر ایک ہونے والے مختلف تمدنی، تہذیبی و اخلاقی آثار کو اپنے بتصروں کے ساتھ روشن کر کے دکھایا ہے، اس کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے سودمند ہوگا،

عہد نبوی کا نظام تعلیم جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاد جامعہ عثمانیہ،  
جسم ۲۰ صفحہ ۲۱۲ لکھائی چھپائی اچھی قیمت ۸، ناشر ادارہ ترقی تعلیم اسلامی

حیدر آباد دکن

ستان

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الممالک کے اُستاد ہیں اور ہندو کے اُن چند ذی علم میں سے ہیں جن کی طرف وسعتِ نظر و صحتِ تخیل، فکرِ صحیح اور ذوقِ تحقیق و جستجو کے لحاظ سے نگاہ اُٹھتی ہے، موصوف کی نظر عہد نبوی کے بین الاقوامی تعلقات پر خاص طور سے ہے، اور ”ذاتی نبویہ“ پر ایک ضخیم تصنیف شائع کرا چکے ہیں، وہ وقتاً فوقتاً مختلف عنوانوں پر ہندو بیرون ہند کے متنازع مسائل میں اپنے نتائجِ فکر پیش کرتے اور معلومات میں اضافہ اور اہل علم سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہے ہیں، معارف کے ناظرین بھی موصوف کے دیق مقالات سے فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں، زیرِ نظر مقالہ ”عہد نبوی کا نظام تعلیم“ بھی پہلی مرتبہ معارف ہی میں شائع ہوا تھا، اور ناظرین معارف کو جیسا کہ معلوم ہے، اس میں عہد نبوی کے نظامِ تعلیم پر تفصیل سے نگاہ ڈالی گئی ہے، اب اس کو خاص اہتمام سے ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ پر حیدر آباد کی علمی مجلس ”ادارہ ترقی تعلیم اسلامی“ کی طرف سے رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے، اہل علم اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اس کو رسالہ کی اس شکل میں بھی منگا کر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں،

عربی حبشی تعلقات، از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاد جامعہ عثمانیہ،

جسم ۲۴ صفحہ ۲۱۲ لکھائی چھپائی اچھی قیمت ۸، ناشر ادارہ ترقی تعلیم اسلامی،

حیدر آباد دکن،

یہ رسالہ بھی جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب موصوف کا ایک مقالہ ہے، اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس میں عربی حبشی تعلقات پر نظر ڈالی گئی ہے، اور آخر میں ایک نو دریافت شدہ

نامہ نبوتی بنام نجاشی کو ضمیمہ کے طور پر منسلک کیا گیا ہے، جو ابھی جنوری ۱۹۳۷ء میں لندن کے رسالہ بجے، آرائے، ایس میں شائع ہوا تھا، اس نامہ مبارک کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے، یہ رسالہ بھی دبیر دستی کاغذ پر چھاپا گیا ہے،

**دیوان جوشش مرتبہ قاضی عبدالودود صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت معہ مقدمہ ۳۸۸ صفحہ**

کاغذ کتابت و طباعت بہترین قیمت پر پتہ انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی :-

مخدوم روشن جوشش عظیم آبادی میر اور مرزا کے دورِ صبا دیوان اساتذہ میں تھے، لیکن ان کے کلام کو وہ شہرت نہ حاصل ہوئی جس کے وہ مستحق تھے، تذکروں میں بھی ان کے حالات بہت کم آئے بہت مختصر ملتے ہیں، ان کا دیوان مدت ہوئی شائع ہوا تھا، لیکن اس میں صحت وغیرہ کا اہتمام نہ تھا اب اردو زبان کے ممتاز خدمت گذار جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ نے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے بڑی محنت اور قابلیت سے یہ دیوان اڈٹ کیا ہے، دیوان کے شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں مختلف تذکروں سے جوشش کے حالات نقل کرنے کے بعد خود مرتب نے بھی حالات لکھے ہیں، اور جوشش کے کلام پر نہایت مبسوط اور ناقداانہ تبصرہ کیا ہے، دیوان کی تصحیح اور کلام کے ہر جہتی تبصرے بلکہ تجزیہ و تحلیل میں صحت اور تبصرہ کا پورا حق ادا کیا گیا ہے، لیکن اختصار پسندی اور رمز و اشارات کی کثرت کی وجہ سے مقدمہ کا بڑا حصہ چیتاں بن گیا ہے، جس کو سمجھنے کے لئے بڑی دقت اٹھانی پڑتی ہے، اگر مرتب نے رمز و کنایات کے بجائے تحریر میں تھوڑی سی فیاضی سے کام لیا ہوتا، تو ناظرین داغی انجھن اور زحمت دونوں سے بچ جاتے ہر شخص کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہر ہر سطر بلکہ ہر ہر لفظ کے حوالے الٹ کر دیکھتا پھرے،

**بت تراش**، از جناب اشتیاق حسین قریشی، ناشر مکتبہ جامعہ دہلی، حجم ۲۲ صفحہ

تقیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت ۴ ر

یہ ایک مختصر ڈراما ہے، جس میں ایک بت تراش کے تیار کئے ہوئے مرد و عورت کے دو مجسوں کے ذریعہ سے تمثیل کے طور پر ان میں جان ڈال کر اس سوال کو حل کیا گیا ہے کہ خالق کائنات تعالیٰ نے صرف اچھے رجحانات اور خیر ہی خیر کو کیوں نہ پیدا کیا، تمثیل اپنے رنگ میں دلچسپ ہے، تاریخ کی تعلیم، مصنفہ ڈبیو، ایم رابرٹن، ایم اے پرنس کرپین ہائی اسکول کھڑا، ضلع ابدال، مترجمہ سٹرائیں ایس میسی بی اے، ہائی اسکول کھڑا ضلع ابدال، حجم ۵۶ صفحے، تقیع چھوٹی، خط باریک قیمت ۳ مصنف سے طلب کریں،

اس رسالہ میں ابتدائی مدرسوں میں چھوٹے بچوں کو فن تاریخ پڑھانے کے طریقے بتائے گئے ہیں، جس میں چند ابواب میں تاریخ پڑھانے کے مقاصد، معلم کے اوصاف، پڑھانے کے طریقے اور اچھے سبق کے خصوصیات وغیرہ سمجھائے گئے ہیں، معلمین کے لئے رسالہ کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے، **بچوں کا تحفہ**، از جناب محمد شفیع الدین صاحب تیر، حجم ۸۰ صفحے، تقیع چھوٹی، کاغذ بہتر، لکھائی چھپائی، اور سرورق بچوں کے مناسب، قیمت ۸۰ مصنف سے موڈرن ہائی اسکول نئی دہلی کے پتہ سے طلب کریں،

یہ بچوں کی دلچسپی کے لئے نظموں کا ایک گلدستہ تیار کیا گیا ہے، زبان آسان، عام فہم اور خیالات سادہ ہیں، نظمیں ایسے عنوانوں اور چیزوں پر لکھی گئی ہیں، جو بچوں کے گرد و پیش اور عموماً علم میں رہتی ہیں، بچے ان نظموں کو دلچسپی اور شوق سے پڑھیں گے،

**دس کی لیل**، از جناب میاں عبدالحی صاحب بھٹی قیمت ۴ رتبہ ہونہار بک ڈپو ریلوے روڈ لاہور

یہ بھی بچوں کے لئے گیتوں کا ایک مجموعہ ہندی آئین زبان میں تیار کیا گیا ہے، نظموں کا موضوع

جتنے بڑے بڑے ہندی زبان بھی کچھ سیکھ لیں، وہ اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ”ر“

# ”جلد ۵“ ماہ شوال المکرم سنہ ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۴۲ء ”عدد ۵“

## مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۳۲۲-۳۲۴
قرآن اور علاجِ خوف،	ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے پی ایچ ڈی،	۳۲۵-۳۳۷
	بیرٹراٹ لا، استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ،	
حضرت مرزا مظہر جانجانا،	جناب عبدالرزاق صاحب قریشی،	۳۳۸-۳۵۷
مثنوی محبت نامہ سوز و گداز	نواب صدربار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن	۳۵۸-۳۷۱
	حال شروانی،	
اردو اخبارات کا ارتقا،	جناب سید ابو نعیم صاحب ایم اے ال	۳۷۲-۳۸۴
	ال بی علیگ،	
ہالینڈ میں اشتقاق،	”م“	۳۸۵-۳۹۰
انجاء علیہ،	ایس	۳۹۱-۳۹۳
زمزمہ عرفان،	پروفیسر سلیم فاروقی ایم اڈال گورنمنٹ کالج پشاور	۳۹۴
غزل،	جناب امجد علی صاحب جج فیض آبادی،	۳۹۴-۳۹۵
تجدیدِ رازِ مجاہد جاہلان،	حکیم الشعراء سید احمد حسین صاحب، حیدرآباد	۳۹۵
مطبوعات جدیدہ،	”م“	۳۹۶-۴۰۰

# شذراتِ شیعہ

اس ماہ میں یوپی اور بہار کے دو ممتاز شاعر و ادیبوں کی وفات کی اطلاع ملی، ان صفحات میں ان مرحوموں کا ذکر اس لئے ہوتا ہے کہ ہماری آئندہ نسلوں کو اپنے پچھلوں کے نام نیک کی خبر بڑے اسلامی تاریخ کا ایک بڑا اہم کارنامہ و فیات یعنی ہزاروں لاکھوں بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں، اور متذکرین کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے، تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئیں کیا عجب ہو کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفات کے اوراق بن جائیں،

— — — — —

**وصلِ بلگرامی** مرحوم و مغفور کے جاننے والوں اور ملنے والوں کو یہ سن کر بڑا قلق ہو گا کہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۳۵ھ کو رات کے وقت وہ ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو گئے، مرحوم بڑے ملنسار متواضع، پر محبت، دوستوں کے ذکاوار، اور وقت پر ہر ایک کے کام آنے والے تھے، وہ گو ہمیشہ سے دیندار اور پابندِ وضع لوگوں میں تھے، جوانی میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ محمد گنگوہی سے ملتے تھے، اور اب ادھر دس بارہ برس سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (متعا اللہ تعالیٰ بفیوضہ و برکاتہ) سے ان کی ارادت کا تعلق تھا، اور اب وہ زیادہ تر حضرت مولانا کی خدمت میں تھا، نہ بھون ہی میں خانقاہِ امدادیہ کے ایک حجرہ میں مقیم رہتے تھے، وہیں اسی حجرہ میں چند روز کے بجا رہیں اچانک وفات پائی، شیخ نے اپنے مرید کی نماز جنازہ پڑھائی، اور وہیں کے قبرستان میں تدفین ہوئی،

— — — — —



خاک رسے مرحوم کے تعلقات بہت پرانے تھے، ۱۹۰۶ء میں میری تعلیم ختم ہوئی، اور وہ اس عمر میں تھے کہ عالمگیر کے نام ایک رسالہ نکال رہے تھے، ان سے بلگرام ہی کی مردم خیز زمین پر اسی زمانہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس وقت وہ جوان شاعر اور ادیب تھے، اردو فارسی، قدسے عربی اور انگریزی جانتے تھے، پھر ان کو جب وہ ادھیڑ ہو چکے تھے، مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم رئیس گورکھ پور کی سرپرستی میں گورکھ پور میں دیکھا، اس کے بعد انھوں نے لکھنؤ پہنچ کر مرقع نام رسالہ جاری کیا جو چند سال جیتا رہا، اب آخر میں وہ زاہد گوشہ نشین ہو کر نظر آئے، اور اسی پر ان کے کارنامہ حیات کا خاتمہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ اس خلق و محبت کے مجتہد کو اپنی محبت سے نوازے،

.....

بہار میں نئی تعلیم بنگال کے قرب بلکہ ملحقہ صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت پہلے پھیلی، وہاں کے مسلمان شرفاء کے جو نو نھال ان میں سب سے زیادہ پہلے اور پھولے ان میں سید علی امام، حسن امام اور منظر الحق وغیرہ کے نام ان کے بعض سیاسی اور قومی کارناموں کی وجہ سے بہت نمایاں ہیں، ان ہی کے معاصرین میں ایک نام مسٹر نصیر برسرک ہے، پٹنہ کے قریب شرفا کا ایک مشہور قصبہ نگر نہسہ ہر وہ وہیں کے انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے، خاندان میں عربی و فارسی علوم کا چرچا تھا، ان کے دادا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی یا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے شاگرد تھے، اور ان نفوس قدسیہ کے برکات کا خاصہ اثر اس مغربی تعلیم یافتہ کے ذہن و خیال پر تھا، افسوس کہ ستمبر ۱۹۲۲ء کے آخر میں اس دور کی یہ یادگار شخصیت بھی مٹ گئی،

.....

۱۹۰۹ء میں جب خاکسار پہلی دفعہ دیہات سے نکل کر شہر پٹنہ میں آیا تو سب سے پہلے ان ہی کی کوٹھی پر مرحوم دپور کی سڑک کے شمالی رخ پر تھی اس تعلق سے قیام ہوا تھا کہ میرے چھوٹے چاچا مرحوم اس زمانہ

میں ان ہی کے ساتھ رہتے تھے، عمر میں پہلا اتفاق تھا، اس لئے ان کی ہر چیز مجھے عجیب معلوم ہوتی تھی، بہت گویا، بہت منہس کلمہ، ہر وقت خوش و بشاش، شعر و سخن کے دلدادہ، اعلیٰ محبتوں کے شائق، بزرگوں کا ادب، دین کا پاس، اور مذہب کا جوش، کوٹ پتلون اور مہیٹ کے اس پتلے میں عجیب نگین کیفیت پیدا کر دیتا تھا،

۱۹۰۷ء میں ندوۃ العلماء کا ساتواں سالانہ جلسہ بڑے عظیم آباد میں تھا، جو قدیم تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا بھی مرکز تھا، اجلاس میں علمائے کرام اور مشائخ عظام کے پہلو بہ پہلو جس مولوی سید شرف الدین مرحوم کی سرکردگی میں ان فوجانہ بیروٹروں کا جھرمٹ بھی تھا، اور شاید یہ پہلا دن تھا جب مقدس شیلے اور مہیٹ یکجا نظر آئے تھے، اسی آشنائی میں جوش و حمیت کا یہ پتلا پورے انگریزی ڈیس میں ایسٹج پرایا، اور وہ دلدار تقریر کی کہ میری ان آنکھوں نے بڑے بڑے مقدس علماء اور مشائخ کو دھاڑیں مار مار کر روئے دیکھا، مقرر کے جوش کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنا قیمتی کوٹ گھڑی، انگوٹھی سب نذر کر دی، جن لوگوں نے اس منظر کو دیکھا تھا وہ سمان آج تک نہیں بھولے ہیں،

باتوں نے ان کو ان انگریزی کپڑوں اور انگریزی شکل و صورت میں دیکھا یا پھر ابھی دس پندرہ برس ہوئے ریش سپید، غلی ٹوپی اور جیکن اور کرتے میں دیکھا اور سنا کہ اب یہ عالم ہے کہ تسبیح و سجادہ سے سروکار ہو، مرحوم کی دوسری شادی نیورہ میں ہوئی تھی چند سال ہوئے کہ وہاں اس سے بھی بڑھکر محو استغراق پایا، مجھ سے عزیزانہ برتاؤ تھا، جوانی میں میلاد کا پُرشوق رسالہ لکھا تھا، اور پیر ہی میں شاعری پر ایک اردو مثنوی لکھی جو خاکسار کے مقدمہ کے ساتھ مطبع معارف میں چھپی تھی،

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت سزا دے، ان کے پورے حالات نفوسِ سلیمان کے آئینوں کی منو کی دیباچہ میں لکھوں

# مقالہ

## قرآن اور علاجِ خوف

از

ڈاکٹر میر ولی الدین ایم ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرا ایٹ لاء اسلام آباد  
 ”اس مختصر مقالہ میں میں نے ایک خوفناک جذبہ سے نجات کے چند نفسیاتی اصول پر روشنی ڈالی ہے جو  
 اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہیں، خوف کو میری مراد، اس واسطے اللہ کا خوف ہے، میں  
 خشیت اللہ کو کوئی قابلِ علاج چیز نہیں سمجھتا، معاذ اللہ، یہ تو میں مقصود ہے، انسانی خشیت  
 اللہ تعالیٰ عباد کا الحساء کے اصول کو میں نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے اور تفصیلاً کو ترک کیا ہے“

دور روزہ عمر پر زخوف و خطر است      از غصہ خدا سے خلق خونِ بھگواست  
 آسودہ ولی ز بعد مردن ہم نیست      زیرا کہ خطرہ و ران طرفِ بیاہست (ظہیر فایانی)

انسان کی دور روزہ زندگی خوف و خطر سے بھری نظر آتی ہے اس کے قلب پر اس خوفناک جذبہ کا پورا تسلط  
 دکھائی دیتا ہے جب کہ بستر سے اٹھتا ہے تو لرزان و ترسان اٹھتا ہے اور تمام دن کے غم و غصہ کو جب جب پھر بستر کی  
 طرف لوٹتا ہے تو بھی خائف ہر اسان ہوتا ہے! وہ ڈرتا کس چیز سے ہے؟ کسی کو تو بیماری کا خوف ہو کہیں ایسا  
 کہ وہ بیمار ہو جائے اور دنیوی کامیابی کی ساری توقعات ٹھیں ٹھیں بن جائیں جب کسی عزیز یا دوست کی بیماری کی خبر سن لیتا ہے

اس لیے یہ مقالہ موثر علوم اسلامیہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا،

تو بچپن پریشان ہو جاتا ہو، ترسنا ہو، کہیں مر نہ جائے، کسی کو خوف ہو کہ وہ ساری ولت کھو کر فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو جائے، منصف دولت کا شکا نہ ہو جائے کسی کو اپنی ملازمت کی طرف سے خطرہ ہو وہ حالات کو تشفی بخش نہیں پاتا، ڈرنا ہو کہ کہیں بہت جلد اس کو بے روزگاروں کی صفوں میں شریک ہونا نہ پڑے، ٹکڑوں کو محتاج نہ ہو جائے، رزق کا دروازہ بند نہ ہو جائے، اکوئی اپنی ذمہ داریوں سے گھبرا رہا ہے، یہ ناقابل برداشت نظر آ رہی ہیں، اور وہ محسوس کر رہا ہو کہ اس کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں، اس کا دل بیجا جا رہا ہے، اور وہ اپنے بلند مقام سے گر رہا ہے، اکوئی ہو کہ آج ہم جنسوں سے ملنے سے گھبرا رہا ہے، وہ ان سے گفتگو نہیں کر سکتا، خوف سے اس کی زبان سوکھی جا رہی ہے، اور بیوقوف میں ڈوب رہا ہے، اکوئی خوف زدہ ہے لیکن نہیں جانتا کہ کس چیز سے خوف زدہ ہو، اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، خطرہ کا وہ تعین نہیں کر سکتا، لیکن خوف کی لہر میں اس کے قلب میں اٹھ رہی ہیں، اور وہ بزدلی کی موت مر رہا ہے، ان غرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص اس کا شکار ہے، کون ہے جس کو فکر نہیں، غم نہیں، خوف نہیں، شیخ عواد الدین فضل اللہ نے جو بات غم کے متعلق کہی ہے، وہ خوف کے متعلق بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور نفسیاتی طور پر غم نتیجہ خوف کا،

غم از دین و مرا گر یزا ز غم نیست      یاراں قدیم را شکست از ہم نیست

غم خودی من کرد و من خودے بغم!      بچون من و غم دو یار دلا عالم نیست

کیا خوف سے نجات بھی ممکن ہو؟ کیا اس ظالم جذبہ کی مردانگی قوت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، اور اس پر فتح حاصل کیا جاسکتی ہے؟ کیا زندگی کے چند روز طمانیت خاطر اور برقی کے ساتھ بسر کئے جاسکتے ہیں؟ علمائے نفسیات نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے؟ کھانے کائنات کی کنہ و حقیقت پر غور کرنے کے بعد کیا اس کو خوفناک اور بے دردیہ رحم و قوتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے؟ کیا کائنات انسان کے لئے ایک صیب کے مانند ہے، جس پر پلانا خراس کو جان دینا ہے، خواہ پامردی اور ہمت کے ساتھ، یا نامردی اور بزدلی کے ساتھ لرزان و ترسنا؟ قرآن کریم خوف سے کس حد تک نجات دیتا ہے؟

(لَا تَخْافُوا هُوَ وَخَافُونَ إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ) (پ ۹۴)

کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی مخلوق و مملوک سے حقیقت میں نافع و مضر ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر خوف کیوں؟ کیا یہ دھم کا نتیجہ نہیں، باطل علم کی پیداوار نہیں؟ کیا اس سے نجاتِ علم کی تفصیح ہو سکتی ہے؟ اختصار کے ساتھ بعض انہی اعتبارات پر بیانِ بحث کرنی مقصود ہے،

قرآنِ کریم کی تعلیم کی رو سے خوف کی نجات اور ان زنجیروں سے رہائی جن سے خوف نے ہماری گردنیں باندھ رکھی ہیں، دو طریقہٴ قدس سے ہو سکتی ہے، ایک طریقہٴ ذہنی ہے، اور دوسرا خارجی، پہلا علم کی تفصیح پر مشتمل ہے، اور دوسرا علمِ صحیح کے استعمال پر۔

(۱) علم کی تفصیح :- خوف سے رشکگاری حاصل کرنے کے لئے تمہیں سب سے پہلے اپنے مابعد الطبیعیاتی مسلمات کا جائزہ لینا چاہئے، مذہب کی زبان میں یہ عقائد، کہلاتے ہیں، ان کو عقل سے ثابت کرنے کی فلسفہٴ میں کوشش کی جاتی ہے اور مذہب میں ان پر محض ایمان لایا جاتا ہے اور در اُطر عقل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ خلافِ تجربہ اور خلافِ وجدان نہیں ہوتے، یہ مذہبی زندگی کے وہی جذبہٴ باقی اور حسی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہوتے ہیں، تجربہ ان کی تائید کرتا ہے، وجدان ان کو اپنے ذوق کے مطابق پاتا ہے، عقل ان کی تردید نہیں کر سکتی،

ایسا پہلا عقیدہ جس کو مان لینے کے بعد خوف سے قطعاً رہائی مل جاتی ہے، حق تعالیٰ کا رحیم حکم ہونا ہے، فلسفیانہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ کائنات تمہاری دشمن نہیں دوست ہے، تم روحانی کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہو، روحانی قوانین کی تم پر حکمرانی ہے، یہ قوانین کو رائے نہیں، ان کی ایک غایت اور مقصد ہے، اگر تم ان کی نوعیت کو سمجھ کر ان کے ساتھ توافقی پیدا کر دو گے تو تم ان کو اپنا رفیقِ کار پاؤ گے اور نتیجہٴ طمانیت اور تسکین قلبی ہوگا، اگر تم نادانی اور جہل سے ان کی خلاف ورزی کرو گے، تو نقصان تمہارا ہی ہوگا، خوف و غم میں مبتلا ہو گے، حزن و یاس سے نجات نہیں ملے گی، اور اس کا باعث خود

تھمارا جہل ہوگا، اور جہل سے پیدا شدہ غلط عمل، یقین و ایمان کی شاہانہ قوت سے قطعی طور پر مان لو کہ دنیا اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کا مبدِ خیر ہے، یہ مبدِ حق تعالیٰ ہیں، جو حکیم بھی ہیں اور رحیم بھی! حق تعالیٰ خالق کائنات ہیں، جان کر کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، حق ہی بجا ہے، سراسر حکمت سے ملبوس ہے، اہل کا وہاں کوئی شاہد نہیں، مَا صَنَعَ اللَّهُ فَعَوْخِیْ، ع

زنیکو ہر جہاں درگشت نیکو است!

جب تمہارا یہ عقیدہ راسخ ہو جائے گا تو جنتِ غیر تم پر مہر بن ہو جائیگی، خیر کا جلوہ تمہیں ہر طرف نظر آنے لگے گا، کمالات پر تمہاری نظر جائیگی، دل میں اور نظریں، بھر میں اور بصیرت میں حق جل و افروز ہوگا، یعنی تمہاری طبیعت اور تمہاری فطرت بدل جائیگی، وہ عیب جو اور عیب بین نظر باقی نہ رہے گی، وہ ذہنیت باقی نہیں رہے گی، جو ہر جگہ نقص کی تلاش کرتی ہے، اور اس پر اعتراض کرتی ہے، مستقبل کو خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اور واقعات کے وقوع کے پہلے ہی اُن پر شمر ہونے کا حکم لگاتی ہے، اور وہی بھوتوں سے لرزتی اور کانپتی ہے!

ایمان کی آنکھ سے دیکھو اور یقین کرنے والے قلب کی باتوں پر غور کرو کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں، اَلْمُؤْمِنُونَ رَحِمًا اَللّٰہُ رَحِیْمًا کا قول ہے، وہ مومن پر رحیم ہیں، وہ اس کے دوست ہیں، مددگار ہیں، مولیٰ ہیں نصیر ہیں، وَاللّٰہُ دَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ آمَنُوا (پ ۳ ع ۲) جب حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، اس پر رحیم ہیں، تو پھر اس کو کس چیز سے خوف ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ کو اپنا ولی جان کر وہ کس چیز سے ڈر سکتا ہے؟ وہ تو حق تعالیٰ کے زیر پرورش ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ اس کے ساتھ بشارتِ رحمت پیش آتے ہیں، اس کے تمام معاملات کے کفیل ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں، اِجِبْ یَا اَدْرَاکُ مَوْمِنِیْنَ قَوْلِیْ بِمَا تَبَاہَا ہے، تو اب وہ بیک جست خوف و حزن سے آزاد ہو جاتا ہے، اَوَّلَاخَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ کا مصداق بن جاتا ہے!

خوف کے وقت حق تعالیٰ کے رحیم و حکیم ہونے پر غور کرو، مضطرب قلب کو، پریشان دماغ کو، معطل حواس کو کچھ دیر کے لئے اس نقطہ پر مرکوز کرو یہی وہ نقطہ ہے جو انوار کا منبع ہے، قوتوں کا مرکز ہے، توانائوں کا مبداء ہے، اسی پر نظر جمائو کہ خوف سے نجات حاصل کرو گے، تمہارا ضعف دور ہوگا، حزن رفع ہوگا، سکون حاصل ہوگا، سرور حاصل ہوگا، طہارت و تسکین قلبی نصیب ہوگی،

جب حق تعالیٰ حکیم و رحیم ہیں اور وہی جہاندار ہیں، تو ظاہر سے کہ ع  
جہاندار و داند جہان داشت

اب مجھے کسی تجربہ سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے، ع  
ہر چہ آن خسرو کند شیرین بود!

ہر واقعہ کی تحقیق اس ہمہ خیر قوت سے ہو رہی ہے، جو حکیم مطلق بھی ہے، اور رحم و کرم مطلق بھی؛ اب زندگی کا کوئی واقعہ میرے لئے مضرت نہیں ہو سکتا، وہ بحیثیت مجموعی میرے لئے مفید ہے، خیر برتر کے حصول کا ذریعہ ہو، یہ میرا جہل ہو کہ باوجود حق تعالیٰ کو رحیم اور ولی مان کر پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ مجھے نقصان پہونچا پاتے ہیں، درپے آزار ہیں، اب جب تھوڑے سے غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آگئی، کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں اور میرے حال کے علیم، تو جمعیتِ تامہ مجھے نصیب ہوتی ہے، اور خوف بالکل رفع ہو جاتا ہے،!

دوسرا اصول جس کے مان لینے کے بعد خوف قطعی طور پر دور ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معیت کا عقیدہ ہو، حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، جہان کہیں ہم ہوں، وَهُوَ مَعَکُمْ اِنَّا کُنَّا مَعَهُ پ، ا، ع، اب مجھے اس امر کا تحقیق ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے بہت قریب ہیں، اقرب ہیں، میری حفاظت فرما رہے ہیں ان کی معیت کی وجہ سے میں تمام شر و گزند سے محفوظ ہوں، جہاں بھی ہوں محفوظ ہوں، ان کے حفظ و امان میں ہوں، تو پھر خوف میرے قلب سے بالکل دور ہو جاتا ہے، اور سرور و اطمینان، بلکہ ایک ذوقِ مستی پیدا ہو جاتی ہے،!

درہم تو بودہ اندوہ و آزارم از وصل تو رفت ہستی و پندارم!

شادی آمد و نصیبِ جانم شد اکنون جان و تن خویش را بردارم

جب بھی خوف کے حالات پیدا ہوں، واقعات خطرناک نظر آئیں، غم کے بادل قلب پر چھائی لگیں

تو ہیں اس امر کا احساس کرنا چاہئے، کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، وہ رحیم ہیں، قادر مطلق ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے مجھے علوئے یکن حاصل ہے، اِنْفَرِ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَکُمْ کا مصداق ہوں، ان کو رکھ کر مجھے کس چیز سے نقصان پہونچ سکتا ہے، ان کی معیت کی وجہ سے میں ہر شے پر غالب ہوں، ہر شے سے بلند ہوں، ان کو رکھ کر مجھے کسی شے کی نہ خواہش ہے، اور نہ اس کے نہ ملنے کا غم؛ جب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہ ہو تو پھر تشویش خواہش کا بھی احتمال نہیں، اور اس کے نتیجہ غم و خوف سے بھی آزاد ہوں!

لیکن غم و مصیبت و خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا احساس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم راحت اور آسودگی، فراغت و اطمینان کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کی یافت و شہود سے غافل نہ رہے ہوں، ان کی یاد سے ذہول نہ رہا ہوں، اور کسی عارف کے یہ الفاظ ہمارے پیش نظر رہے ہوں:

تشہ اومیرگر تو زندہ خاک آن در باش گر تو بندہ

ذرہ در د خدا در دل ترا بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

جب ہمارے دل میں حق تعالیٰ کا درد ہو، محبت ہو، ان کی مہودیت و ربوبیت کا اقرار ہو، ذلت کا اظہار ان ہی کے سامنے ہو، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی کے ساتھ وابستہ ہو تو پھر خوف اور پریشانی کے وقت ہیں ان کی معیت کا شدید احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں، کہ وہ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں، مونس ہیں، غم خوار ہیں، نصیر ہیں، وکیل ہیں، اس طرح ہمارے قلب کی حفاظت ہو جاتی ہے، سکینت و طمانیت پیدا ہوتی ہے، اور خارجی حالات میں بھی خوشگوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے، اور ہم تمام مصائب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور محزن سے خوف سے رہائی مل جاتی ہے!



اگر تم خوف سے بالکل تہ رہائی کے خواہاں ہو، اس کی نیچ و بنیاد کو صحنِ دل سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو، جمیعتِ حقیقیہ کے حصول کے خواہشمند ہو، تو خود شناس بنو، عرفانِ نفس حاصل کرو، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ، اس عرفان کا آلہ محض عقلِ نظری نہیں، اس کے لئے اس عقل کی ضرورت ہے جو قبولِ اقبالِ ادبِ خوردہٗ دل ہے عقلِ نظری (قیاساتِ عقلِ یونانی) تمہیں خود شناسی میں زیادہ مدد نہیں دے سکتی، یہ زیادہ تر اوہامِ باطل کا نقشہ تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کرتی، اور پھر اسکو بھارتی رہتی ہے، یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے، یہ تمہیں لذتِ حضور سے محروم رکھتی ہے، کیونکہ خود اسکی تقدیر میں حضور نہیں:

انجامِ خود ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری!

(اقبال)

تمہیں اس جگہ اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہئے، جو پیرِ روم کی ہدایت کے مطابق تم سو کر رہو، عقلِ ہمِ رسان کہ ادبِ خوردہٗ دل است یہ عقلِ تمہیں اس وقت حاصل ہوگی جب شیخِ بوعلی سینا کی تحقیقات سے صرتِ نظر کر کے سخنِ محمدی سے دل بستی پیدا کرو:

دل در سخنِ محمدی بند اے پور علی ز بوعلی چند

(لکھنؤ خانی دتحفۃ العرائین)

اب تمہیں اس عقل کے ذریعہ جو نورِ وحی کی ہدایت در بہری میں قدم اٹھا رہی ہو، اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنی چاہئے، اس معرفت کے حصول کے بعد تم کو اپنی عبدیت کا علم ہو جائے گا، کہ تم ات و ماہیت کے لحاظ سے معلوم ہو، غارِ جافا مخلوق ہو، غیر ذاتِ حق ہو، حق تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن بن، اول و آخر ہیں، تم کو محیط ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، تم سے قریب و اقرب ہیں، تم حق تعالیٰ ہی کے

وجود سے موجود ہو، ان ہی کی حیات سے زندہ ہو، ان ہی کے علم سے جانتے ہو، ان ہی کی قدرت و ارادے سے قدرت و ارادہ کا استعمال کرتے ہو، وجود اور تمام صفات وجودیہ تمہارے پاس امانت ہیں، یہ تمہارے لئے اصلۃً نہیں امانتہ ہیں، تم فقیر ہو اور این امانت کا استعمال جب کائنات کے مقابلہ میں کرتے ہو، تو خلیفۃ اللہ کہلاتے ہو، اور جب امانت کا استعمال حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتے ہو، تو ولی اللہ کہلاتے ہو، یہی چار اعتبارات ہیں عبد اللہ کے فقر امانت، خلافت، ولایت، عبد اللہ کے پاس اللہ ہیں، ان کی ہویت دائیت ہے، صفات و افعال ہیں، ملک و حکومت ہیں، عبد اللہ کا قیام ذات اللہ میں ہوتا ہے، ذات اللہ میں خوف کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے، وہ تو سرور محض ہے، اس لئے عبد بھی اللہ کی جہت سے اپنے اندر ناقابلِ بیان سرور محسوس کرتا ہے، طائیت محض ذوقِ خالص کا مخزن بن جاتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی معارف تمام المعرفة نے

چون بد انستی کہ ظل کیستی      فارغی گر مُردی و گزریستی  
قطرہ نوری سراپا نور باش      بگذر از غم دانا مسرور باش (ردمی)

انسان اپنی اس حقیقی جہت کو فراموش کر کے خوف و حزن میں مبتلا ہوتا ہے، یا پھر خوفِ محض اس کے قلب پر محیط اس لئے ہیں، کہ وہ سرے سے اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں، اس کے ہر درد و غم ہر خوف و ہراس کا علاج خود اس کے ہاتھ میں ہے، اور وہ اس سے جاہل! اس سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی؟

یک سبد پر نان ترا فرقِ سر      تو بھی جوئی لبِ نان و در ہدر! (ردمی)  
تا بزا نوے میانِ تعراب      وز عطش و ز جویہ گشت تہی خراب

(۲) علم صحیح کا استعمال: جب تم کو اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا، جب تم نے یہ جان لیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ساتھ ہیں، اس سے قریب اور اقرب ہیں، اس کے ظاہر و باطن ہیں، جب تم کو یہ یقین ہو گیا

کہ حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، مولیٰ و نصیر ہیں، اس پر رحیم ہیں، تو اب خوف کے وقت اپنے ایمان کی قوت سے کام لو، جرات کے ساتھ کہو کہ کائنات کی کوئی چیز تم کو خوف زدہ نہیں کر سکتی، اپنے خوف زدہ نفس کو مخاطب کر کے کہو:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا وَيُخَوِّفُنَا  
بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ  
کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں؟  
کیا تجھ کو یہ لوگ اُن سے ڈراتے ہیں جو  
خدا کے ماسواہین،؟ (ڈرمت)

اَتَعَاذُ لَكُمْ الشَّيْطَانُ يَخَوْفُ اَوْلِيَا  
فَلَا تَخَافُوهُم وَاَخَافُونَ اِنْ كُنْتُمْ  
مُؤْمِنِينَ  
یہ جو ہے شیطاں ہے، کہ اپنے دوستوں  
سے ڈراتا ہے، سو تم اُن سے مت ڈرنا  
اور مجھ ہی سے ڈرنا، اگر تم مومن ہو،

ہم اپنے تحت الشعور نفس کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کرنا چاہئے، دیکھو بچہ اندھیری رات میں جاگ پڑتا ہے، اور ڈر کر رونے لگتا ہے، تم اس سے کہتے ہو ”ڈر مت یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے تم کو ڈر ہو“ خوف کی چیز میں صرف تمہارے خیال میں ہیں، کمرے میں نہیں، اس طرح خوف کی نفی کرنے کے بعد تمہیں ان چیزوں کا اثبات کرنا چاہئے، جو سچ ہیں، مثلاً تم کہو گے ”میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے باؤں ہی میں تو ہوں، کیا مجال کہ کوئی چیز تم کو چھو سکے“ اس طرح اطمینان دلانے کے بعد کہ تم پاس ہی ہو، او اس کو تمہاری قوت پر یہ یقین ہونے کی وجہ سے کہ تم اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو، بچہ پھر بڑے فکری کی نیند سو رہتا ہے،!

یہی طریقہ تم کو اپنے تحت شعوری نفس کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے، پہلے خوف کے اسباب کی نفی کرنی چاہئے، جرات و ہمت کے ساتھ اس کو یقین دلانا چاہئے، کہ ساری دنیا میں خدا کے سوا تمہیں کوئی چیز ڈرا نہیں سکتی، تم جانتے ہو کہ یہ شیخی نہیں، واقعہ ہے، حقیقت کے عین مطابق ہے، مومن جس پر حق تعالیٰ

رحیم ہیں جس کے ساتھ وہ ہیں جس کی نصرت کا وہ اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں، اَحَقَّ عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ جس نے وہ ستر ماؤں سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، ایسا مومن کائنات میں سوائے حق تعالیٰ کے کس چیز سے ڈر سکتا ہے، اور ڈر کر مومن رہ کیسے سکتا ہے؟ دیکھو ساری اشیا مخلوق ہیں، مرئوب ہیں، محکوم ہیں، محکوک ہیں، جب تک خالق و حاکم و مالک رب نہ چاہے، یہ ہیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہیں؟ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے، الحکم للہ متصرف فی الامور حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کے قبضہ قدرت میں تمام جاناں کی پستی کی بال ہیں، اَمَّا مِنْ آيَةِ الْاَلٰهِيَةِ اَخَذْنَا مِثْلَهَا، ڈرنا ہمیں ان ہی کے جلال سے چاہئے، مانع وہ ہیں، اور ضار وہ، مغرور وہ ہیں، اور مذل وہ، اور سارا عالم فقیر اور محتاج، نہ نفع کی قوت رکھتا ہو نہ ضرر کی، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَلَوْ جَعَلَ الْعِبَادُ اَنْ يَنْفَعُوْا بِشَيْءٍ لَّكَرِهْتُمْ لِقَضَاءِ اللّٰهِ لَوْ لَقِدْرُوا عَلَيْنَا

وَلَوْ جَعَلَ الْعِبَادُ اَنْ يَضُرُّوْا بِشَيْءٍ لَّكَرِهْتُمْ لِقَضَاءِ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَوْ لَقِدْرُوا عَلَيْنَا

”اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے نفع پہنچائیں، جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی تو ویسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے، اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی، تو وہ اس پر قدرت نہ پائیں گے۔“

اس صداقت پر پورا یقین رکھ کر اپنے نفس سے کہو کہ تجھے قطعاً کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہئے، اور زندگی کا یہ عجیب قانون ہے کہ جو نہ ہی خوف قلب سے دور ہوا، اب دنیا کی کوئی چیز ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتی، حضرت دانیالؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھیں شیروں کے غار میں ڈال دیا گیا لیکن

۱۔ یہ اس حدیث کا ایک حصہ ہے، جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے، اور جس کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبد

جیلانیؒ مفتح الینب مقالہ ۴۷ میں پیش فرماتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر مومن کو چاہئے کہ اس حدیث کی اپنی دل سے نکلے

کرے، ہر ایک کہ دنیا و آخرت میں تمام آفات سے محفوظ رہے، اور اللہ کی رحمت کے دونوں جہان میں عزت پائے۔

شیر و ن نے انھیں چھوٹا تک نہیں، اسکی نفیاتی توجیہ یہی ہو سکتی ہے، کہ حضرت وائیلؑ کا حق تعالیٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ خوف ان کے سینہ میں مطلق نہ تھا، اور اسی وجہ سے شیر انھیں چھو نہ سکے، یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ کتا جو خوف زدہ شخص پر حملہ کر دیتا ہے، اس شخص کے قریب بھی نہیں آتا، جو بالکل بے خوف ہوتا ہے، یہ جو سنیا سی جنگلوں میں جا بیٹھتے ہیں، جہاں ہر قسم کے موذی اور درندہ جانور بھی موجود ہوتے ہیں کیسے محفوظ رہتے ہیں؟ ان کی بے خوفی ان کے لئے سب سے بڑی حفاظت کا کام دیتی ہے، جو شخص حق تعالیٰ کو ہی نطفہ پھماتا ہے، وہ بے خوف ہوتا ہے، کامل بے خوفی نتیجہ ہے ایمانِ راسخ کا !

نفی کے بعد اثبات یعنی نفس کو یہ یقین دلانے کے بعد کہ خوف کی کوئی وجہ نہیں، اب ہمیں حق تعالیٰ کی معیت، احاطت، قرب و اقربیت کا ادراک کرنا چاہئے، جس طرح کہ چھوٹے بچے کو ہم نے اپنی موجودگی کا یقین دلایا تھا، اسی طرح نفس کو حق تعالیٰ کے حضور و معیت کا یقین دلانا ضروری ہے، جب یہ محسوس کرنے لگتا ہے، کہ اس کا قیام حق تعالیٰ کی ذات میں ہے، وہ حق تعالیٰ کے نور میں منکشف ہے اس کے داہنے بائیں اوپر نیچے آگے پیچھے حق تعالیٰ کا نور ہے، وہ نور کے قلعہ میں محصور ہے، محفوظ ہے تو پھر خوف کا سایہ اس کے قلب سے اُٹھ جاتا ہے، (ظلمت نور کی موجودگی میں کیسے ٹھہر سکتی ہے؟) سرور و طمانیت حقیقی کا نفوذ اس کی رگ و پے میں مس ہونے لگتا ہے، وہ قطرہ نور بن جاتا ہے، سراپا نور بن جاتا ہے اور مستر دامن سے ہلکا رہ جاتا ہے !

اس مقصود کے حصول کے لئے تمہیں بعض ازلی وابدی صداقتوں کا دہرا بار بار یاد دے گا، جب خوف و ہراس کی لہر میں تھارے قلب میں قیامت خیزی کر رہی ہوں، اور وہ بیٹھا جا رہا ہو اور تمہاری نظر میں دنیا تاریک ہو رہی ہو، تو تمہیں بیٹھ جانا چاہئے، اور آہستہ سے لیکن استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ معیت حق کا ادراک کرتے ہوئے ان صداقت بھرے الفاظ کی تکرار کرنی چاہئے:

حَسْبِيَ اللَّهُ نَعَمَ الْوَكِيلُ وَنَعَمَ الْمَوْلَى

مجھے اللہ کافی ہے، اور وہ کیا خوب کا سہارا،

وَلَقَدْ فَتَنَّا زَكَرِيَّا

کیا خوب مولیٰ ہے، اور کیا خوب مددگار ہے؟

ان کی نیکواری سے ہماری بصیرت کی آنکھیں کھلتی ہیں، ہیں حق تعالیٰ کی کفایت کا یقین ہوتا ہے، اور اسی یقین کی وجہ سے ہیں خوف سے نجات ملتی ہے، آزادی نصیب ہوتی ہے،

جامع ترمذی میں ہے کہ جب حضور انور صلم کو کوئی مشکل پیش آتی، فکر کا بار قلبِ انور پر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے،

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ

درود بھرے دل سے "الغیاث کی یہ پکار نکلی، کہ حجۃ الیقوم کی رحمت نے قلب کو سنبھال دیا، اور اسکی حفاظت سامان فرما کر دیے،!

یاد رکھو کہ خوف طاری ہوتا ہے خوف پیدا کرنے والے خیال کو قبول کر لینے کی وجہ سے اس خیال کا مقابلہ ذہن کی اس سطح پر نہ کرنا ممکن ہے جس سطح پر خوف کی موجیں اٹھ رہی ہیں، کوشش اس بات کی کرنی چاہئے کہ قلب اس سطح سے بلند ہو جائے، اور بالا تر سطح پر قدم جمائے، دیکھو سمندر کا طوفان اسی وقت فنا کا باعث ہوتا ہے، جب ہم اس کی تباہ کن موجوں میں گھر جاتے ہیں، لیکن اگر ہم کسٹنی پہاڑی پر چڑھ جائیں، تو پھر ان بلا خیز موجوں کے شر و شور سے ہیں نجات مل جاتی ہے، کیونکہ اب ہم ان کے پنجے سے باہر ہیں بالکل اسی طرح جب ہم خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی، سکھ ہی سکھ،!

یاد رکھو قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہمارے سارے درودوں کی دوا حق تعالیٰ ہیں، خوف و

حزن کا علاج حق تعالیٰ کی محبت ہے، غیر اللہ سے بیزاری ہے، درودِ عالم خوف و ہراس کے وقت اپنے رُخ کو حق تعالیٰ کی طرف اخلاص کے ساتھ پھیر دو اور عجز کے ساتھ ان کے قدموں پر پڑ جاؤ،

اور پھر تمھارا کام بن نہ جائے تو شکایت کرنا،

در حضرت مادمستی یکدہ کن

ہر چیز کہ غیر ماست آنرا یکدہ کن

یک صبح باخلاص بیا بردن،

گر کا تو بر نیاید آنگہ گلہ کن،

(ابوسعید مہندی)

## الفاروق

حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت، صحابہ رض کے فتوحات، عراق و شام، مصر و ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمر رض کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی علمی تعلیم کا شاندار منظر۔ یہ کتاب مولانا شبلی کی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، مطبع معارف نے نہایت اہتمام سے اس کا نیا ڈیزائن تیار کرایا ہے، جس کے ساتھ دنیائے اسلام کا رنگین نقشہ بھی شامل ہے، طباعت و کاغذ نہایت عمدہ، ضخامت ۲۱۲ صفحے، قیمت ۳۰/-

## المامون

خلیفہ امامون الرشید عباسی کے عہد سلطنت کے حالات، مولانا شبلی مرحوم کی یہ پہلی تصنیف ہے، جس میں مدوح نے تاریخ اسلام کے پرفخر عہد کے سیاسی، علمی، مذہبی اخلاقی، تمدنی حالات قلمبند کئے ہیں جن سے دولت عباسیہ کے عروج و کمال کے زمانہ کا مرقع اکھون کے سامنے پھر جاتا ہے، دارالمصنفین خاص اہتمام سے چھپوایا ہے، قیمت ۲۰/-، ضخامت ۲۴۴ صفحے،

منیجر دارالمصنفین

## حضرت مرزا مظہر جان جاناں

جناب عبدالرزاق صاحب قریشی

(۲)

شہادت | جب مرزا صاحب کا سن ۸۰ سے تجاوز کر گیا، تو اکثر ذکرِ رحلت اور دعائے خیرِ خاتمہ فرمایا کرتے تھے، اور وظائف و عبادات میں بھی اضافہ ہو گیا، اکثر غزیز دن اور دوستوں کو خط میں بھی لکھتے چنانچہ ملا عبدالرزاق کو لکھتے ہیں:

”وقتِ رحلت نزدیک رسیدہ، عراذشتاد تجاوز نمودہ و توقع ملاقات نمازہ کمارا

طاقتِ سیر و سفر نمازہ، (مکتوب پنجاہ و یکم)

صاحبزادہ مرید حسین کو لکھتے ہیں:

”ملاقاتا موقوف بمقدار است و عراخر، اگر در زندگی میسر نہ شد، انشاء اللہ تعالیٰ بشرط

ایمان در بہشت بر خورد ہائے خاطر خواہ خواہم کرد“ (مکتوب سی و ہفتم)

میر محمد حسین کے نام لکھتے ہیں، کہ

”از خبر جاگد از میر سلمان صاحب چہ نویسم کہ بر من گذشت، بیت،

یار رفت و ما چو نقشِ پانجاک افتادیم سایہ می گردید کاش این نارسا افتادگی



اکھڑتا ہوں ہر سیرا ہیم..... بہر حال ہم مصیبتھا میگذرد و ہا ہم خواہیم گذشت نفی کے  
در یاد خدا گذر و غنیمت است۔“  
(مکتوب پنجاہ و پنجم)

ایک اور مکتوب میں یوں رقمطراز ہیں:

”والدہ زہراؑ کو ارشاد کیا کہ جانے ہزاران مناقب بودند، از انتقال خود ازین عالم دانے بیائے  
گذشتند..... ما و ایشان بعلاقہ ہم عمری در وقتِ قدم باین خاکدان بقدم و تاخیر  
چند قدم ہمسفر بودیم، حالادقت رجوع بوطن اہلبیت نیز بغافلہ چند نفس ہم فاذلک ہم  
امروز گرا ز رفتہ غریزان خبر نیست فردا ست درین بزم ز ہا ہم اثرے نیست“  
(مکتوب پنجاہ و ششم)

صاحبِ معمولاتِ مظہریہ کا بیان ہے کہ مرزا صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ  
لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں، حالانکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ”روح را بگرد از انقطاع قالب  
شرف اتقا، از خدا و رسول میسر شود“

مرزا صاحب کو ان ارواحِ طیبات سے ملنے کا بہت شوق تھا،

حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت امام حسن، حضرت  
جنید بغدادی، حضرت خواجہ بہاء الدین محمد نقشبندی اور حضرت مجددِ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

صاحبِ معمولات لکھتے ہیں، کہ مرزا صاحب کو غایتِ درجہ اشتیاق تھا، کہ ان کو شرفِ شہادت  
حاصل ہو لیکن پھر بڑی حسرت سے فرماتے کہ ایامِ جوانی میں جب شہادت حاصل کرنے کا موقع تھا،  
تو میں حاصل ہی نہ کر سکا، اب بڑھاپے میں یہ عزت کہاں نصیب ہو سکتی ہے، مگر پھر خود ہی فرماتے  
کہ خدا سے یابوس نہ ہونا چاہئے، چنانچہ زمانہ نے دیکھ لیا کہ خدا نے ان کو یابوس نہیں کیا،

محرم کا مہینہ تھا مرزا صاحب اپنے مکان پر چند مریدوں کے ساتھ بیٹھے تھے، کہ وہاں سے ایک تیزی نکلا، مرزا صاحب نے اپنے مریدوں کو مخاطب کر کے کہا، کہ یہ کیا یہودہ حرکت ہے، بارہ سو برس جس مقدمہ کو چھپکے ہوں ہر سال اسے تازہ کرنا کیا بدعت ہو، اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا عقل کی خفت ہے، یہ گفتگو مجنبہ وہ لوگ جو کہ علم اور شہدوں کے ساتھ تھے، انھوں نے سنی اور تعصب کے ساتھ امام باڈونین اور مفلونین دو تین شب اس کی گفتگو رہی،

غرض، محرم الحرام ۱۱۹۵ھ شب چہارشنبہ کا ذکر ہے، کہ تھوڑی رات گزری تھی کہ کچھ لوگ مکان پر آئے، اور دروازہ پر دستک دی، خادم نے جا کر عرض کیا، کہ کچھ لوگ زیارت کیئے آئے ہیں، مرزا صاحب یہ سنکر مسکرائے، اور فرمایا کہ بلاؤ، ان میں سے تین آدمی اندر آئے، ان میں ایک ایرانی نژاد منغل تھا، مرزا صاحب اپنی خواب گاہ سے نکل آئے، اور ان لوگوں کے پاس کھڑے ہو گئے، منغل نے پوچھا ”آپ ہی مرزا جانجانا ہیں؟“ انھوں نے جواب دیا، ”ہاں“ اور اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی تائید کی، اس پر اس منغل نے مرزا صاحب پر طعنے کا وار کیا، اور تینوں فرار ہو گئے، گوئی بائیں جانب دل کے پاس لگی، مرزا صاحب نے باوجودیکہ ایسا زخم کاری کھایا لیکن استقلال و طبیعت سے پھر اپنے تین کوٹھے کے اوپر پہنچا یا۔

جس طرح مرزا صاحب کی تمنا تھی، کہ انھیں شرف شہادت نصیب ہو، اسی طرح اب زخم لگنے کے بعد دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ جس طرح ان کے جد بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے زخم لگنے کے تیسرے دن وفات پائی تھی، ان کی وفات بھی تین دن بعد ہوئے اور خدا نے ان کی یہ خواہش بھی پوری کر دی،

مرزا صاحب عالم اضطراب و بے قراری میں لوٹے تھے، اور اپنے ہی یہ اشعار پڑھتے تھے:

لے گلشن ہند ۱۲۳۵ مقامات منظری ص ۱۳۷ گلشن ہند ص ۱۳۷ معمولات منظریہ ص ۱۳۷

بنا کر دند خوش رستے بخون خاک غلطید خدا رحمت کند این ماستان پاک طینت  
 سیلِ خون از سینہ گرم روان کرد عشق نازم اعجازش کہ طوفان از تور آوروست  
 زخمِ دل منظر مبادا بر شود آگاہ باش کاین جراحیت یادگارِ ناکِ ترکانِ است  
 جاے رحمت لے جوڑم آہ داو سیلاب یادگار از من بین مشیتِ غبارِ مازہ است  
 شکافِ دہنا بیشک نشانِ سجوی باشد دلِ مجروح میدانم کہ راہی با خدا دارد  
 مصحفی نے اس شعر کا بھی اضافہ کیا ہے،

چرخِ خوش بروے دلِ تنگِ مادرِ اکرد خدا دراز کند عسرِ زخمِ کاری ما  
 کہتے ہیں کہ بادشاہ (شاہ عالم) نے مرزا صاحب کے پاس کھلا بھیجا کہ ہم نے مفسدوں کی تلاش  
 کروائی لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا، آپ کچھ سراغ بتائیں، تاکہ ان کو تلاش کر کے قراہ واقعی مرزا دیکھا،  
 مرزا صاحب نے جواب میں کھلا بھیجا کہ ققرا تو شہید راہِ خدا ہیں، مرے ہڈوں کو مارنے کا قصاص  
 کیسا، اور اگر اتفاق سے ملزم ہاتھ آجائیں، تو انہیں میرے پاس بھیج دیا جائے تاکہ دستورِ طرقت کے  
 مطابق ان سے بدلہ لیا جائے (یعنی ان کو معاف کر دیا جائے)

اسی طرح ذوالفقار الدولہ نواب نجف خان نے معاذ کے لئے جراحانِ فرنگ (ڈاکٹر) کو  
 خدمتِ اقدس میں بھیجا، مرزا صاحب نے کھلا بھیجا، کہ اگر زندگی باقی ہے، تو مسلمان جراحوں کے ہاتھ  
 سے شفا ہو جائیگی، اور اگر وقت پورا ہو چکا ہے، تو ان کا فرون کا احسان مرنے وقت کیون انہوں  
 غرض زخمِ گلنے کے تیسرے روز، ۱۰ محرم الحرام ۱۲۹۵ھ جمعہ کے دن، شام کے وقت، اس  
 پیکرِ اخلاق و گنجینہ صفات نے اس دنیا سے فانی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا، اور حضرت بی بی صاحبہ  
 کی حویلی میں جو متصل چلی گور ہے، دفن ہوئے، لوحِ مزار پر خود مرزا صاحب ہی کا یہ شعر کندہ ہے

بلوچ تربت من یافتہ از غیب تحریر ہے کہ این مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیر

سال وفات | بعض تذکرہ نویسوں نے مرزا صاحب کا سال وفات ۱۱۹۴ھ اور بعضوں نے

۱۱۹۲ھ لکھا ہے، مرزا صاحب نے ۱۱۹۵ھ کے بالکل شروع میں (یعنی نئے سال کے صرف دس دن

گزرنے پائے تھے کہ) وفات پائی، اس لئے ۱۱۹۴ھ تو قریب قیاس ہو سکتا ہے، لیکن ۱۱۹۲ھ

تو بالکل ہی غلط ہے، ۱۱۹۴ھ تک کے تمام تذکروں میں مرزا صاحب کا ذکر بحیثیت ہمعصر شاعر آتا ہے،

یہ تذکرے چونکہ ان کے ہمعصروں کے لکھے ہوئے ہیں، اس لئے بہ نسبت بعد کے تذکرہ نگاروں کے

زیادہ قابل اعتبار اور مستند مانے جائیں گے، اس کے علاوہ مرزا صاحب کی شہادت پر ان کے

متحدہ ہمعصروں، شاگردوں اور مریدوں نے تاریخیں لکھی ہیں، ان تمام تاریخوں سے ۱۱۹۴ھ

نکلتا ہے یا ۱۱۹۵ھ، مثال کے طور پر ہم دو ایک مشہور تاریخین نقل کرتے ہیں،

تمام تاریخوں میں قمر الدین منت کی تاریخ سب مشہور اور پسندیدہ ہے، اس تاریخ کا

مادہ خاص الفاظ حدیث ہیں،

(۱) ہست حدیثی از پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عاش حیدمات شہید سال وفات مرزا منظر

(۲) منظر کا ہوا قاتل جو اک مرتد شوم اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم

تاریخ وفات ان کی کہی بار و عدد سودا نے کہ "ہائے جانجنان مظلوم" (سودا)

(۳) قاضی شہداء اللہ پانی پتی مرزا صاحب کے ارشد مریدین کی حیثیت رکھتے ہیں، انھوں نے

بھی دو تاریخیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک ہم یہاں نقل کرتے ہیں، اس کا مادہ وہی الفاظ حدیث

ہیں جو منت نے اپنی تاریخ میں استعمال کئے ہیں،

آن قبلہ ارباب تقی عاش حیداً وان قد وہ اصحاب رضات شہیداً

مجموعہ ہر دو صفت سال وفاتش منظر رضی اللہ عنہ کان سعیداً

عاش حمیداً مات شهیداً

(۴) تارخ وفات ابھٹھی،

چو مجروح شد منظر بیکس و کو  
شب ہنم ماہ عاشور بود آن  
کہ از خون شدش سرزمین کربلائی  
در آن رنگ ہم میچکد از بون او  
باین بے دماغی باین کبریائی  
کے از سلف ہم نہ بگذشتہ باشد  
کہ جیت از قفس مرغِ روشِ ہائی  
غرض در شبِ قتل شاہِ شہیدان  
ز پیران برآمد خروشِ جدائی  
مریدانش در حلقہ غم نشستند  
شد از دیدہ قدسیان و شنائی  
برگش چنین موکشا و زحوران  
نغمے خورد با وصف دیر آشنائی  
چو بشنید این واقعه مصحفی ہم  
فرورفت در فکرِ تارخِ سالتش  
کہ تا سماں را کند غم زدائی

پس از ساعتی نہر حیب تامل

بر آوردہ گفت ”آہ منظر کجائی“

مرزا صاحب کا قتل | تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ مرزا صاحب کو ایک شیعہ نے شہید کیا، لیکن

مولانا محمد حسین آزاد کی رائے اس معاملہ میں مختلف ہے، وہ فرماتے ہیں:

”قتل کا سبب دلی کے خاص نام میں مشہور تھا کہ بوجیب رسم کے ساتوین کو علم اٹھے تھے، یہ (مرزا صاحب) سربراہ اپنے بالا خانہ پر خاص خاص مریدین کو لئے بیٹھے تھے، جیسا کہ عوام جہلا کی عادت ہے شاید طرفین سے کچھ طعن و تعریف ہوئے ہوں، وہ کسی جاہل کو ناگوار ہوئے، ان میں کوئی شخص لہذا وہاں نام نہانت جاہل تھا، اس نے یہ حرکت کی، لیکن یکم قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ

میں مانتے ہیں کہ مرزا جیسا اپنے کلام میں اکثر اشعار حضرت علی کی مدح میں کہا کرتے تھے، اس پر بگڑ کر کسی سنی نے یہ حرکت کی،

اس کے بعد مولانا آزاد حاشیہ میں لکھتے ہیں :-

عجب شکل ہے، حکیم صاحب بھی ایک خوش اعتقاد سنت جماعت تھے، وہ کہتے ہیں کہ سنی نے مارا، لوگ کہتے ہیں شیعہ نے مارا۔

مولانا آزاد کا ترجمہ علی اور ان کی فارسی دانی مسلم ہو، لیکن یہاں مولانا کو حکیم قدرت اللہ کی عبارت کے سمجھنے میں یقیناً غلط فہمی ہوئی، حکیم صاحب کی اصل عبارت یہ ہو:

اذا نجا کشر بمانی و مذہب اہل حق، حق بوسے ارزانی داشتہ بود، طالے نام حق شناس، در ایام  
مہر کہ ماحشورہ بہ تعصب مذہب پے حقیقت کارنا بردہ کہ دے غریقی قب جباب ولایت مآب  
و حریق عشق حضرت امامت انتساب مرتضوی بود سلام اللہ علیہ و کرم اللہ وجہہ، چنانچہ بعض  
اشعار ابدارش خاصۃ این بیت،

نکو و منظر ماطاعتے و رفت بنجاک نہایت خود بتولا و بوزاب گذاشت  
بر بے گناہ پیش گواہی دید اے گناہ شہید ساختہ بحضور سراپا سرور شہدائے کربلاے معلیٰ  
عہم السلام والرضوان رسانید۔

مندرجہ بالا عبارت سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی نے یہ معلوم کئے بغیر کہ وہ حضرت علی کرم اللہ  
کی محبت میں غرق ہیں، ان کو شہید کر دیا یہ تو کہیں نہیں ہے، کہ چونکہ وہ حضرت علیؑ کی مدح میں  
اشعار کہا کرتے تھے، اسلئے کسی سنی نے مارا،

در اصل مولانا کو یہاں کسی قدر غلط فہمی ہوئی، ورنہ تمام تذکرے خواہ وہ مرزا صاحب کے مرثیہ

نے لکھے ہوں یا غیروں نے، سینوں نے لکھے ہوں یا شیعوں نے، بلا استثناء اس بات پر متفق ہیں کہ مرزا صاحب کا قاتل ایک شیعہ تھا،

مولانا نعیم اللہ بہرائچی، مرزا صاحب کے ایک مرید لکھتے ہیں کہ، محرم الحرام کو چہ شیعوں نے سینہ مبارک پر گولی چلائی،

قدرت اللہ خان قاسم کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں، انکی بھی یہی شہادت ہے، قدرت اللہ خان مرزا صاحب کے معصرتھے، اسلئے ان کا بیان عینی شاہد کے بیان کی وقعت رکھتا ہے،

مصحفی بھی مرزا صاحب کے زمانہ میں موجود تھے، اس لئے ان کا بیان بھی عینی شاہد کا بیان سمجھنا چاہئے، وہ لکھتے ہیں :-

”در عہد شاہ عالم بادشاہ کہ بسبب بودن امیر لاراد و القاد اللہ بہادر دہلی علوی اہل تشیع

بیشتر بود و این بزرگ مقتداے متعصبان اہل سنت و جماعت گفتہ می شد، شیعہ از متعصبان

اہل تشیع شب ہنتم محرم الحرام یک ہزار و صد و نود و پنج اورا بگو لا پانچہ مجروح ساخت۔“

یہی من نہیں آتا کہ ”مقتداے متعصبان اہل سنت و جماعت“ کو کوئی سنی کس طرح قتل کر سکتا ہو؟

حقاً سفینہ ہندی (بگلو انداس) بھی مرزا صاحب کے عہد میں موجود تھے، اور ان کی خدمت میں

حاضر ہونے کا شرف ان کو حاصل تھا ان کا بیان ہو کہ

”ہر چند کہ (مرزا صاحب) می گفت کہ مارا با مذہب کارے نیست کہ ما محمدیم آتا در مذہب نیست

و جماعت غلو داشت۔“

کیا مذہب سنت و جماعت میں غلو کہنے والے بزرگ کا قاتل کوئی سنی ہو سکتا ہے؟

اب اس کے بعد دو شیعہ حضرات کا بیان بھی سن لینا چاہئے،

علیٰ ابراہیم تذکرہ مخدّر ابراہیم مین لکھتے ہیں:

"گویند بہ سبب تعصب مذہب منع تفریق سید الشہداء علیہ السلام می نمود، بدین حمیت زود  
یکے از ساکنان دہلی سنیک ہزار و یک صد و نو و چہار ہجری کہ عرش قریب صد و مقتول شد  
علی لطف صاحب گلشن ہند کا بیان ہے :-

کہتے ہیں کہ ہفت روزہ عاشورہ کو لب بام یہ اپنے گھر میں سر راہ بیٹھے تھے، اور کوئی سردار و سپہ سالار  
کا بھی آیا تھا واسطے ان کی ملاقات کے کہ ناگاہ گذر شد و ن کا ان کے زیر بام سے ہوا، اس  
روہیلے نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی، اور موقوف سلام سے ہوا اور میرزا سے مذکور جس طرح  
بیٹھے تھے، اسی طرح بیٹھے رہے، بلکہ ہنس مہو کر فرمانے لگے کہ بارہ سو برس جس مقدمہ کو ہو چکے  
ہوں، ہر سال اسے تازہ کرنا کیا بدعت ہو، اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل  
کی خفت ہے، یہ گفتگو مجنبہ وہ لوگ جو کہ علم اور شد و ن کے ساتھ تھے، اور محض  
نے مٹی اور تعصب کی مرزا سے مذکور کے امام باڑوں میں اور محضوں میں دو تین شب گفتگو  
رہی، آخر شب شہادت کو کہ شب دہم عاشورہ سے ہے، کوئی شخص ان کے دروازہ پر  
آیا، اور ان کو باہر بلوایا، جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ پٹنے کی نذر کی، اور کام  
ان کا پورا کر کے راہ اپنے گھر کی لی، اس بھی ان کا قریب سو برس کے تھا، ایسا زخم کاری  
کھایا لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا، ۱۱۹۲ھ تھے، کہ اس  
روشن ساز مسائل صدیقی نے اور اس مصلحہ پر واز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگ  
آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کے منازل طریقت پر کیا۔"

شہادت کی بالکل یہی وجہ کریم الدین نے بھی اپنی تذکرہ شعرا میں میر عبدالحی تابان  
کی زبانی لکھی ہے، صحیح مین نہیں آتا کہ یہ روایت میر عبدالحی تابان کی زبانی کس طرح بیان کیجا سکتی ہو؟



اس لئے کہ تابان نے تو مرزا صاحب کی زندگی ہی میں وفات پائی، ان کا سال وفات بقول مولوی عبدالحق صاحب  $۱۱۶۱$ ھ اور  $۱۱۶۵$ ھ کے درمیان ہے۔

مرزا صاحب کی شہادت	مرزا صاحب کی شہادت دراصل ایک سیاسی حیثیت رکھتی ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہمایون شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران بھاگا، اور
--------------------	---

پھر جب کچھ عرصہ بعد شاہ ایران کی مدد سے اُس نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کی تو اس ملک میں ایرانیوں کی آمد اور آمد کے ساتھ اقتدار بڑھنے لگا، یہاں تک کہ عہد جاگیرگری میں تو تقریباً تمام بڑے بڑے عہدوں پر سی فائز تھے، ایرانیوں کے ہندوستان میں پھیل جانے کی وجہ سے ہندوستان میں بھی وہ مسئلہ پیدا ہوا، جس سے ہر اسلامی ملک میں فتون کی ابتدا ہوتی، یعنی سنیت و شیعیت کا جھگڑا، عہد عالمگیر تک اس فتنے کے زہریلے اثرات سے ہندوستان محفوظ رہا، لیکن اورنگزیب کی وفات کے بعد چونکہ حکومت کی دیواریں کھوکھلی ہو گئی تھیں اس فتنے کو زہریلے اثرات ملک میں پھیلنے لگے، بہادر شاہ اول کی فتنے کے بعد شیعوں کا اقتدار یہاں تک بڑھا، کہ دو بھائی سید عبداللہ اور سید حسین سلطنت کے مالک بن گئے، اور بادشاہ گرائے کے خطاب سے مشہور ہوئے، فرخ سیر کے عہد میں جب ان کا زور اور ظلم و تعدی حد سے بڑھ گیا تو اس نے اُن پر مکتہ حبیبی شروع کر دی، اور ان کے اقتدار کا خاتمہ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی اقدام کرتا، ان بھائیوں نے اس کا کام تمام کر ڈیا، مرزا بیدل نے اس واقعہ کو لنگار کی نہایت عمدہ تاریخ لکھی تھی،

دید ی کہ چہ باشاہ گرامی کردند صد جور و جفا از دہ حامی کردند

تاریخ پنجوا ز خرد جسم فرمود سادات بونے نکو امی کردند،

بالآخر محمد شاہ کے زمانہ میں ان بھائیوں کا قلع قمع ہو گیا، لیکن انیسویں صدی کے عالم

کے زمانہ میں یہ فتنہ پھر جاگ اٹھا، شاہ عالم نے مسند وزارت پر بخت خان کو فائز کیا، بخت خان

کا دہلی آنا تھا کہ پھر شہنشاہیت نے زور پکڑا اور سینوں پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے جانے لگے چنانچہ مرزا صاحب ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

”حالِ مردمِ این شہر از روزیکہ نجف خان آمدہ است از شاہ تا گد اتباہ است و ذکر خلاص

بجد الدولہ بزبانِ خاص و عام است، خداے تعالیٰ زود بطور آرد“

یہ وہی نجف خان ہے جس نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو اپنے قلمرو سے نکال دیا

تھا، اور یہ دونوں بزرگ معززانوں کے شاہدہ تک پیدل آئے تھے،

یہی نجف خان ہے جس نے روہیلون کی طاقت کو پا مال کیا، اور ضابطہ خان کو مرہٹوں کی مدد

سے شگست دی اور اسی شگست کا انتقام ضابطہ خان کے بیٹے غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم سے

جس بُری طرح لیا، اس سے تاریخ کا کوئی طالب علم ناواقف نہ ہوگا،

نجف خان ایک کٹر شیعہ تھا اور مرزا صاحب بقول مصحفی ”مقتدائے متعصبانِ اہل سنت“

جماعت اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں، مرزا صاحب کے مریدوں میں روہیلون کی اکثریت تھی، اگرچہ

کے ساتھ جزوِ کفر و دنیا نجف خان کے نقطہ نگاہ سے یقیناً ضروری اور مفید تھا، بہر حال یہی نجف

خان ہے کہ ”دغاے او مرکبِ این امر (قتل مرزا صاحب) شدہ بودند و او در اجراءِ حد

تفاضل کر دے“

خانگی زندگی اور متعلقین | مرزا صاحب کی خانگی زندگی اور ان کے متعلقین کے حالات بہت کم

معلوم ہیں، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے، کھانا وقت کے وقت

بازار سے منگوایا کرتے تھے، لباس کی سادگی یقینی ہے، اس لئے کہ وہ ہمیشہ صرف ایک ہی جوڑا

پکڑا رکھتے تھے،

متعلقین کے بارے میں بھی بہت کم معلومات حاصل ہیں، خود مرزا صاحب نے تین مکتوبات میں اس طرف اشارہ کیا ہے، لیکن وہ محض اشارہ ہی اشارہ ہے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”فیتر مع متعلقان بغایت است و بدعاے دوستان مشغول“ (مکتوب پنجاہ و ششم)

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:-

”...بعد و ماہ بدہی میر دم کہ متعلقان در آنجا هستند“ (مکتوب پنجاہ و ہمام)

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:-

”.....آدم برائے طلب متعلقان فرستادم، آہنا عذر مسموع نوشتند، ناچار ہوا“

وہی اتفاق افتاد“ (مکتوب چہلم)

مرزا جان کے حالات کے سلسلہ میں ہم لکھ آئے ہیں، کہ جب انھوں نے فقیری لے لی تو سارا اثاثہ راہِ خدا میں تقسیم کر دیا، صرف بچیں ہزار روپے لڑکی کی شادی کے اخراجات کے لئے رکھ چھوڑے تھے، (اور بعد میں اس کو ایک دوست کی نذر کر دیا)، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ مرزا صاحب کی ایک بہن تھیں اس کے علاوہ معمولاتِ منظر یہ ہیں ہم کو مندرجہ ذیل بیان ملتا ہے:-

”بوقت طفولیت فقیر و ہمیشہ فقیرانہ افراط محبت ہم عہد و ہم قسم بودیم کہ اول ہر کہ از ما

ازین وارفا در گذرد، دیگے نیز بموافقت قدم زند، یعنی خود را ہلاک سازد، چون

ہمیشہ فقیر را وقت آخر رسید یکبار بسوی من گریست و بیاد آن وعدہ و برتنہائی سفر آخرت

بگریست، گفتیم کہ با یفاے وعدہ خود ثابت ام، از یک ضرب کٹا رکہ تمام می شود، لیکن در

صورت با ہم اتفاق مشکل است کہ شمارا بحکم النعشاء شعیب با قافلہ شہداء براہ جنت خواهند

و ما را بموت حرام براہ و دیگر ناچار فقیر چادر خود را چھو کفنی در بر کر دو گفت، حکم موت تو قبل ان

موتوا، ظاہر خود را مردہ و اگر و انیدہ رفاقت شما بجان دول بجا آورم کہ مقصد و از زندگی محفوظ

نفسانی است، آنرا فداے راہ دوستی کردم۔

غالباً مرزا صاحب کی یہی بہن ہیں جن کے صاحبزادوں کی سفارش مرزا صاحب کسی سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”فقیر ہمیشہ زادہ ہوا دم، ہر چند کما لاتے نہ اند، خالی از آدمیت نیستند، اما با بقضائے زمانہ پریشان روزگار واقع شدہ اند، خصوصاً کے از آئینہ بایست اضطراب گرفتار“

مرزا صاحب نے کوئی اولاد چھوڑی یا نہیں، اس کے متعلق کوئی پتہ نہیں چلتا، ان اتنا یقینی ہو کہ انھوں نے شادی کی تھی، لیکن ان کی متا بلانہ زندگی کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھی، اس لئے کہ ان کی بڑی کوجنوں کا عارضہ ہو گیا تھا، خود مرزا صاحب نے اپنے وصیت نامہ میں، جو انھوں نے آخر عمر میں تصنیف کیا، اللہ پانی پتی کے نام لکھا تھا، اس کا اظہار فرمایا ہے، فرماتے ہیں:-

..... پیش ازین چند منکوحہ من از من درخواست بود کہ تدبیر امور اخروی را بر اے او واگذارم..... این مستورہ بنا بر عارضہ سودا در طول عمر ناسازیمابسیار با فقیر کردہ، چنانچہ مخفی از اعزہ نیست، اما از ان ہمہ عفو کردم۔  
یہ عارضہ، جیسا کہ اوپر کی عبارت سے بھی ظاہر ہے، آخر آخر میں ہوا تھا، صاحب مقامات منظر کی اس عبارت سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے،

عفت پناہ عصمت دستگاہ زودہ شریعت حضرت ایشان طریقہ از آنحضرت گرفتہ  
بین صحبت مبارک بر تہہ حضور آگاہی رسیدند و اجازت ارشاد و نسا و صاحب یافتہ تاثیر  
گرم در دہائی نمودند و اوقات و مبشرات نیک میدیدند۔

۱۲ کلمات طبیات مکتوب ششم ۱۳ معمولات منظر ۱۴

اخلاق و عادات | مرزا صاحب کا قد کشیدہ اور بلند تھا، اور خشاشی واڑھی رکھتے تھے، لباس بہت

سادہ پہنتے تھے، عمامہ بطور سنت باندھتے تھے، اور قمیص پیش چاک پہنتے تھے؟

مرزا صاحب باوجود یکہ درویش تھے، مزاج میں مرزائیت اور نفاست و نزاکت بہت تھی، خود بھی اپنی اس افتاد طبع کی طرف کلام میں کسین کسین اشارہ فرمایا ہے،

درجنون ہم میرزائی از مزاج مانرفتم کز براسے خویش حمائے زنگن دانستم

بجائے سنگ طفلان پارہ ہاوشیشہ باید چو منظر میرزا دیوانہ نازک طبیعت را

درجائے سنگ شیشہ توان بر سرش زد طفلان دماغ منظر دیوانہ نازک

منظر زما برید و دگر یاد مانکرد دیوانہ خوش نبود ز وضع کرخت ما

افسوس ہو کہ مرحوم مولانا محمد حسین آزاد نے نازک مزاجی اور بد دماغی میں کوئی امتیاز

نہیں رکھا، انھوں نے مرزا صاحب کی نفاست و مرزائیت کو بد دماغی سے تعبیر کیا، اور ان کے

حالات خصوصاً اطوار و عادات کے بیان کرنے میں بقول مولانا عبدالحی مرحوم صاحب گل رعنا

”چنگیان لی ہین“ اور ”کسین واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہو، جس میں بجائے مرح کے ذم کا پہلو

نکلتا ہے، آزاد مرحوم نے مرزا صاحب کے عادات و اطوار سے متعلق جو چند حکایتیں لکھی ہیں ان کے

جوابات مولانا عبدالحی مرحوم نے گل رعنا میں دیدے ہیں، اس لئے ہم ان کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتے۔

حقیقت یہ ہو کہ مرزا صاحب کو سنجیدگی و منانت قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی

تھی، اور پھر نفاست و پاکیزگی اس پر مستزاد، ایسے شخص کی مجلس میں اگر آداب مجلس اپنے انتہائی

عروج پر نہیں ہوں گے، تو اور کہاں ہوں گے، خود آزاد مرحوم کو بھی یہ تسلیم ہے کہ جو شخص ان کی صحبت

میں بیٹھتا تھا۔ ہوشیار ہو کر بیٹھتا تھا، لیکن اس سے اگر ہم یہ نتیجہ اخذ کریں، کہ مرزا صاحب بات

پر بگڑ جاتے تھے، اور ہمیشہ لوگوں کی نکتہ چینی کیا کرتے تھے، تو یقیناً یہ ہماری سمجھ کا تصور ہے، شاہ غلام علی مرحوم کا شمار مرزا صاحب کے مقتدر مریدوں میں ہوتا ہی، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مرزا صاحب نے اپنے ایک مرید سے کہا کہ تم اپنے بچوں کو بیان کیوں نہیں لاتے، مرید نے گھر پر جا کر بچوں کو خوب سکھایا پڑھایا، اور سخت تاکید کی، کہ مرزا صاحب کے سامنے نہایت مودب ہو کر بیٹھیں، اور کسی قسم کی گستاخی نہ کریں، دوسرے دن وہ اپنے بچوں کو لیکر حاضر خدمت ہوئے، مرزا صاحب بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور ان کے بن کے مطابق ان سے مذاق کرنے لگے، لیکن بچوں کو تو ہائے سبق پڑھا دیا تھا، وہ نہایت متانت و سنجیدگی اور ادب و تہذیب سے بیٹھے رہے، بالآخر مرزا صاحب نے تنگ آ کر اپنے مرید سے کہا تم اپنے بچوں کو نہیں لائے،؟ مرید نے جواب دیا، حضرت یہ کیا بچے ہیں، مرزا صاحب نے فرمایا ”یہ بچے ہیں، ان کو بچہ کون کہہ سکتا ہے، یہ تو بوڑھے ہیں، ارے بچے تو وہ ہیں، کہ کوئی میرا دو مال بے بھاگتا، کوئی ٹوپی سر سے اتار لیتا، کوئی کرتا پھاڑ لیتا، بھلا یہ بوڑھے بچے کیسے ہو سکتے ہیں؟“

کیا ایک بد دماغ آدمی بچوں کی یہ ناز برداری کرنے کے لئے کبھی تیار ہو سکتا ہے؟  
مرزا صاحب، حقیقت یہ ہے کہ بہت کریم الاخلاق تھے، ہر شخص سے تواضع اور خندہ پیشانی سے ملتے، مشائخ کرام سے ان کو بہت محبت تھی، بالخصوص حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اکثر زیارت مزارات کو جاتے، اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ مجھے جو کچھ ملا ہے، وہ میرے بزرگوں کی برکت سے، ورنہ میرے اعمال ایسے کہاں جو قرب الہی نصیب ہو، مقربان و مقبولانِ خدا سے محبت رکھنا قبولِ خدا کا بہترین ذریعہ ہے،

ان کا عقیدہ اہل سنت و جماعت کا تھا، اکثر شیئے ان کے فیض صحبت سے سنی ہو گئے، چنانچہ

۱۔ میرید مرحوم کی والدہ اور بڑے بھائی ان کے مرید تھے ۲۔ قصص الاکابر ۳۔ مقامات مظہری ص ۲۵

وہ سنی تراش کے لقب سے مشہور تھے؛

مرزا صاحب کو طہارت و پاکیزگی کا بہت خیال رہتا، نماز ہمیشہ تازہ وضو سے اور مستحب اذکار میں ادا کرتے تھے، اور صلوات و جماعت کا بہت خیال رکھتے تھے، اپنے مریدوں اور دوستوں کو بھی یہ مشورہ دیتے، اور جس کو اس کے خلاف پاتے اس سے ناراضگی کا اظہار کرتے، لہٰذا لوگوں کو تاکید فرماتے کہ اسلامی طریقہ سے سلام کرو، ہاتھ اٹھانے اور سر جھکانے کو منع فرماتے،

مُحَن پندی اور نفاست مرزا صاحب میں بہت تھی، اور بچپن ہی سے تھی، چنانچہ شیر خوارگی کے زمانہ میں بھی مَن کی طرف اس قدر میلان تھا، کہ کسی بد صورت کی گود میں کبھی نہ جاتے، لیکن کوئی خوب صورت اگر ہاتھ بڑھاتا، تو ہبک کر اس کی گود میں چلے جاتے، صاحب مقامات منظری کا بیان ہے کہ مرزا صاحب خود فرماتے تھے کہ

”مرا یاد است طفل شش ماہ در آغوشِ رضعہ بودم، از نے حمیدہ مرا در کنی گرفت، جلوہ جہانش اول مرا از جا برد و خاطر با و وابستگی پیدا شد، دلم بے دیدار او قرار نمی گرفت، در فراتش گریہ می کردم بچہ بالہ بودم کہ آوازہ عاشقی من بر زبانہا افتاد و در مردم مشہور گشت کہ این پسر مزاج عاشقانہ دارد۔“

مرزا صاحب بہت خلوت پسند تھے، خلوت پسندی دنیاوی جاہ و منزلت سے نفرت کی پہلی منزل ہی، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ مرزا صاحب کو جاہ و ثروت سے کبھی کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی، خود فرماتے ہیں :-

نکر دیل بدنیائے قبحہ منظر ما اگر چہ حُسن پرستت پارسایِ شجوت  
عمر بھر کرایہ کے مکان میں رہے، اپنا ذاتی مکان کبھی نہ بنوایا، فرمایا کرتے، کہ ”برائے گذشتن

خانہ خویش یا بیگناہ برابر است <sup>۱</sup> کھانا ہمیشہ باز اسے منگوا کر کھاتے، ہمیشہ صرت ایک جڑا کپڑا رکھتے،  
 'نذر و نیاز کے لئے ایسی کڑی ششپٹین لگا رکھی تھیں، کہ ششکل سے پوری ہو سکتی تھیں، و  
 ششپٹین یہ تھیں؛

(۱) پیش کرنے والا نجیب و شریف ہو، (۲) دنیا داروں سے میل جول نہ رکھتا ہو،

(۳) صالح و پرہیزگار ہو، (۴) حرام و حلال میں تمیز کر سکتا ہو،

(۵) ایسے ملک سے تازہ وارد نہ ہو جو جان لوٹ مار ہوتی ہو (۶) اخلاص و عقیدت پیش کرتا ہو

مرزا صاحب بیارون کی عیادت کو ضرور جاتے، ہر شخص کو ہمیشہ نیکی سے یاد فرماتے، صحابہ کرام  
 و اولیائے عظام کے نام بغیر تعظیم و تکریم کے زبان پر کبھی نہ لاتے، کبھی کسی کی غیبت نہ کرتے، اور نہ  
 غیبت کرنے والوں کو اچھی نگاہ سے دیکھتے جو ان کے عیوب اُن پر ظاہر کرتا، اُس سے ناراض نہ ہوتے  
 بلکہ اس کا شکریہ ادا کرتے، ہمیشہ نرمی سے بات کرتے، کسی پر اعتراض نہ کرتے، بہت سخی و فیاض تھے،

مرزا صاحب کی کتاب اخلاق کا سب سے نمایاں اور امتیازی باب ان کی بیرونی سنت رسول

انام ہے، چنانچہ وہ خود فرمایا کرتے تھے، کہ میں نے اپنے اوقات و اعمال کو سنت نبوی کے طریقہ پر

تقسیم کیا ہے، اور اسی پر عمل کرتا ہوں، اگر تم میں سے کوئی میرا کوئی کام خلافِ شرع دیکھے، تو مجھے

تنبہ کر دے، اور یہ بات ان میں بچپن ہی سے پائی جاتی تھی، چنانچہ ایک دن اپنے والد ماجد کے ساتھ ان

مرشد (شاہ عبدالرحمن قادری) کی خدمت میں گئے، شاہ صاحب حکم و سماع کی حالت میں تھے، حضرت

منزب کی نماز قضا ہو گئی، مرزا صاحب نے اسی وقت دل میں عہد کر لیا کہ اگر والدانِ صحبت کیلئے کین

تو نہ کروں گا، اوپر جو ہم نے مرزا صاحب کے عادات و اطوار دیکھے ہیں ان پر آپ غور کریں، تو ان میں

سنت نبوی کی بیرونی سرسراپ کو نظر آئے گی، ہر شخص کو نیکی سے یاد کرنا، ہر شخص سے ہر بانی و



اور تواضع اور خندہ پیشانی سے ملنا، نرمی سے گفتگو کرنا، غیبت و بدگوئی سے پرہیز کرنا، کبھی اپنا ذاتی مکان نہ بنوانا، ہمیشہ صرف ایک جوڑا کپڑا کھنا، غایت پاکیزگی طہارت یہ تمام اعمال، سنت نبوی کی پیروی نہیں تو اور کیا ہے؟ غرض مرزا صاحب کا ہر کام سنت نبوی کے مطابق ہوتا تھا، اور یہی ایک مسلمان کا بہترین حاصل زندگی ہے،

بعض مکاتیب میں بھی سنت نبوی کے اتباع پر زور دیا ہے، ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"کار و غیر از ترویج شریعت و طریقت از زندگی مقصود نیست..... ما و شمار ابراہیم

سنت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام استقامت روزی کند" (مکتوب پنجاب، ہم)

قاضی شہر اللہ پانی پتی کو لکھتے ہیں:-

"درین ایام برخاطر نسق اتباع سنت بسیار مستولی است" (مکتوب ہفتاد و نہم)

مرزا صاحب کی کتاب اخلاق کا دوسرا درختان باب ان کا توکل و استغنا ہے، یہاں

ہم چند واقعات درج کرتے ہیں، جن سے ان کے توکل و استغنا اور دنیا سے بے تعلقی کا اندازہ ہو سکتا ہے،

ایک مرتبہ محد شاہ نے اپنے وزیر قمر الدین خان کی زبانی کہلا بھیجا، کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکومت

بخشی ہے، آپ کا جو کچھ چاہے، بطور ہدیہ قبول فرمائیے، مرزا صاحب نے جواب دیا، کہ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے قل متاع الدنیا قلیل جب کل دنیا قلیل ہے، اور تم کو اس قلیل کا ساتواں حصہ ملا ہے، تو

تمہارے پاس ہے ہی کیا جس کے لئے فقیر کا سر جھکے گا؟

ایک امیر نے حویلی، خانقاہ اور فقرا کے لئے وجہ معاش خدمت میں پیش کی، قبول نہیں فرمایا،

ایک روز سخت سردیوں کے دن میں ایک پرانی چادر کا نڈھے پر ڈالے ہوئے تھے، انوار

فیروز جنگ حاضر مجلس تھے، یہ دیکھ کر انہیں پر غم ہو گئیں، اپنا ایک صاحب کو مخاطب کر کے کہنا یہ ہاری بدبختی کی دلیل ہے، کہ وہ بزرگ جن کی خدمت میں ہم کو ارادت و بندگی حاصل ہے، ہمارا تحفہ قبول نہیں فرماتا۔ حضرت میرزا نے فرمایا، ”میں نے عہد کیا ہے، کہ مالداروں کا تحفہ قبول نہیں کروں گا، اب کہ میری زندگی کا آفتاب قریب غروب ہے، اپنے اس عہد کو کیسے توڑ سکتا ہوں؟“

ایک مرتبہ نظام الملک تیس ہزار روپے نقد بطور نیا زلائے، مرزا صاحب نے قبول نہیں فرمایا۔ نظام الملک نے کہا ”اسے لیکر راہِ خدا میں حاجت مندوں کو تقسیم کر دیجئے“ فرمایا مجھے اس کا سیدہ نہیں، یہاں سے تقسیم کرنا شروع کر دو، گھر پہنچے پہنچے ساری رقم ختم ہو جائیگی۔ ایک مرتبہ ایک افغان سردار نے تین سو اشرفیاں بھیجیں، قبول نہ کیا۔

مرزا صاحب، صرف یہی نہیں کہ امیرون کے تحائف و ہدایا لینے سے انکار فرماتے، بلکہ ہر نیک ممکن ہوتا، ان لوگوں سے ملنے میں بھی احتراز فرماتے، اس کے اشارات ان کے خطوط میں بھی ملتے ہیں چنانچہ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :

”دو نہی خان را کہ ارادہ ملاقات فقیر داشت منع کردم کہ نیاید و حافظ رحمت خان کہ پیش

فقیر حاضر شدہ بود صحبت او با فقیر نادرست افتاد۔ (مکتوب پنجاب و چہارم)

نواب خانخانان خلعت نواب قمرالدین وزیر کو اس طرح ڈانٹتے ہیں :

”امراء این جهان را باید کہ با سلاطین این جهان یعنی فقرا با لب باشند، خصوصاً در اوقات

استمداد و استعانت کہ دل فقرا، ملتفت گردد، در چنین اوقات بے پروائی کردن و تحریہ

مطالب بہمدہ بے ادبان گذشتن ضرر دارد، اگر حسن ظن در میان است، ادب واجب است

و اگر نسبت رجوع و انابت چہ ضرر است، باندیشہ بہین احتیاط و رسم مراسلات ترک نمود ایم

و دعا گفتہ ایم (مکتوب شہادت ویکم)

لیکن مرزا صاحب غریبون سے بہت محبت سے ملتے تھے، احمد علی سندیلوی (صاحب تذکرۂ مخزن الغرائب) مرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ان کا بیان ہے کہ

”باغرابیاد تواضع پیش می آمد، فقیر اقم مسوودہ و وسہ دفعہ بختش رسیدہ، ہنوز لدہ

صحبش از دل زرتہ ۱۱

مرزا صاحب اپنے مریدوں اور دوستوں کو بھی ہمیشہ توکل و استغفار کی تاکید فرماتے، اوہل دنیا سے ضرورت سے زیادہ میل جول بڑھانے پر ناراضگی کا اظہار فرماتے، ۱۲

اگر کوئی مرید یا کوئی غریب شخص ہر یہ پیش کرتا تو قبول فرمالتے،

لیکن امراء کے تحائف قبول کرنے سے سخت احتراز فرماتے، اس بنا پر کہ امراء و سرون کا مال غصب کرتے ہیں ۱۳ چنانچہ ایک مرتبہ ایک امیر نے کچھ آم ان کی خدمت میں ہدیہ بھیجے، مرزا صاحب نے حسب معمول قبول کرنے سے انکار کر دیا، بہت کالج و منت کیساتھ اس نے پھر بھیجا، انھوں نے اس میں سے صرف دو آم لے لئے اور باقی واپس کر دیئے، اسی وقت ایک باغبان دوڑا ہوا آیا، کہ غلام امیر نے جبراً میرے باغ میں سے آم توڑے، اور حضور کو ہدیہ بھیجے، مرزا صاحب بہت مکدر ہوئے ۱۴ مرزا صاحب اہل فضل و کمال کی حسب مراتب تعظیم و تکریم کرتے، لیکن کسی بے دین کی تعظیم خواہ وہ امیر ہو یا غریب کھڑے نہ ہوتے، ۱۵

۱۱ مخزن الغرائب، خود اراک المصنفین ۱۲ مقامات مظہری ص ۳۵۱ ایضاً ص ۳۵۲ ایضاً ص ۳۵۳

## فہم انسانی

ڈیوڈ ہیوم کی مشہور کتاب ”ہیومن اسنڈنگ“ کا ترجمہ اور اس کے مختصر حالات کے ساتھ

”میفجر“

اس کے خیالات فلسفہ پر بحث و تبصرہ، حجم ۲۲ صفحہ قیمت ۱۰/-

# ثنوی مجت نامہ سوز و گداز

## ملا نوحی خوشانی

از

نواب صدر یار جنگ بہادر مولینا حبیب الرحمن خان گوانی

”مولوی سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب رفیق دار المصنفین کا مسلسل مضمون نعل بادشاہوں اور شاہزادوں کا مٹی ذوق کے عنوان سے نکل رہا ہے، اس کے اکتوبر نمبر میں ملا نوحی خوشانی کی ثنوی سوز و گداز کا ذکر آگیا تھا کہ مجت نامہ حبیب گنج کے خزانہ میں حسن اتفاق کا ایک نسخہ موجود ہے، صاحب مجت نامہ نے چند ماہ ہوئے کہ اس ثنوی پر یہ تبصرہ لکھ کر عنایت فرمایا تھا، مگر بعض وجوہ سے

”س“

اسکی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی جس کا افسوس ہے،

اکتوبر ۱۹۵۷ء کے معارف میں مرزا ادانیال شاہزادہ کے تربیت یافتہ کے ذکر میں ملا نوحی خوشانی

اور ان کی ثنوی سوز و گداز کا ذکر آگیا ہے، اس ثنوی کا ایک نسخہ نا در میرے یہاں ہے، معلوم ہوتا ہے

کہ کسی نکتہ سنج شائق نے لکھوایا تھا، کاغذ خطا، نقاشی و طلاکاری سب ملکہ بیک زبان شوق اور

نکتہ سنجی کی شہادت دے رہی ہیں،

اسی جلد میں اور ہو ہوا اسی تیاری کا ایک اور نسخہ ملا وحشی کی نایاب ثنوی شیریں فرماؤ

کا بھی ہے، فرق صرف اتنا ہے، کہ ثنوی سوز و گداز کے عنوان میں زین تاج ہے، شیریں خسرو

اس سے ماری ہے قطع ۵ x ۴، پنجہ ہے، جیسی ہے، معلوم ہوتا ہے، کسی ولد ادو سخن کے دل سے

یہ نسخہ روح افزا لگا رہتا تھا، خط جلی استادانہ، کاغذ وصلی، مائل بہ سنہری، بکثرت ذرا فشان، عنوان طلا کار مینائی لاجوردی، دو پہلے صفحے طلا کار بین السطور جدول طلائی و لاجوردی تمام نسخہ بے عیب و صاف ہے، افسوس ہے کہ کاتب کا نام اور تاریخ درج نہیں، مجموعی شہادت یہ ہے کہ مولف کے زمانہ کے قریب کا لکھا ہوا ہے، تعداد اشعار پانچ سو چوراسی ہے،

کلام پر اسے | نوعی نے اس کا نام ایک عنوان میں محبت نامہ سوز و گداز لکھا ہے، اسم ہائے کلام بہت گرم، بلکہ ادل سے آخر تک آتش فشان ہے، اسی کے ساتھ بیان میں نزاکت ہے، واقعہ کی تصویر مصورانہ نکتہ سنجی سے کھینچا ہے، گرمی بیان پر شاہزادہ داراشکوہ کا یہ شعر صادق آتا ہے:

تنم بسوخت و لم سوخت استخوانم سوخت تمام سوختم و شوق سوختن باقی است

خوبی و گرمی کلام متعاضی ہے کہ معارف کے قدر شناس اوس کے لطف سے بہرہ اندوز ہوں، انتخاب حاضر ہے،

نوعی کا حال مزید | معارف میں نوعی جو شانی کا سنہ وفات ۱۰۹۵ھ درج ہوا ہے، جو صحیح نہیں، صحیح بموجب بیان ریاض الشعراء و خزائن عامرہ و غیرہ ۱۰۹۱ھ ہو، میر آزاد نے حسب عادت تاریخ عبارت میں لکھی ہے، "فی سنۃ الف و تسع عشرہ"

ریاض الشعراء میں ہے، در سنہ یک ہزار نو زدہ و در برہان پور جہت الہی پیوستہ۔

تذکرہ خزائن عامرہ میں ہے، کہ شاہزادہ دانیال کی وفات کے بعد نوعی خان خانان کی بارگاہ میں باریاب اور اسکی قدر دانیوں سے کامیاب ہوا، قصیدے اور ساقی نامہ اوس کی مدح میں لکھا، اگر انما یہ صلیہ حاصل کئے، ذخیرۃ السخانین کی یہ روایت نقل کی ہے، یک بار خان خانان ملا نوعی را بزرہ سنجید۔

دیوان | دیوان نوعی کے دو نسخے قلمی میرے یہاں ہیں، دونوں اقسام کلام قصائد و غزل

ثنوی در باغی سی منور بن خوشخط و کامل بن 'دو فن' میں ثنوی سوز و گداز ہے، ایک نسخہ میں ایک اور ثنوی بھی ہے، یہ ثنوی ساتی نامہ ہے جو خانخانان کی مدح میں لکھا گیا تھا، خزانہ عامرہ میں اس کا ذکر ہے، بہت شگفتہ و متانہ کلام ہے، ایک موقع پر لکھا ہے،

شرابے کہ خون در بدن گل کند      بن مویچو منقا بر بیل کند  
بن وہ کہ مست و محل افشان روم      رہ در حجت خان خانان روم

ایک دیوان پر تاریخ تحریر درج نہیں، دوسرے پر مسئلہ مقام برہان پور تحریر ہے اس طرح یہ دیوان نوعی کی وفات کے انچاس برس بعد لکھا گیا ہی

## انتخاب ثنوی سوز و گداز ملا نوعی جتوئی

حمد

الہی خندہ ام را نا لگی وہ،	سر شکم را جگر پر کا لگی وہ،
نفس را جلدہ آہ جگر بخش	نظر را سوے خود راہ سفر بخش
دل را عندلیب آوازہ گردان	گل باغم باتش تازہ گردان
مئے شوقم وہ از پیما نہ عشق	کہ جوشد بر لبم پروانہ عشق
باتش آب وہ تیغ ز باغم	کہ جز حمدت نروید از بیانم
ز نخل اینم وہ خامہ حمد	کہ آرایم بہ نامت نامہ حمد
پیا انداز حمدت کا رچندست	زبان تا دل پرند اند پرندست
ولے پاسے کہ برگل نما دارد	کجا پرواسے پا انداز دارد
من و حمدت زبان را خاک برہر	ادب را در عطاقت چاک در بر

## نعت

محمد صیقلِ مرآتِ نبیش	نظرِ بیاہ چشمِ آفرینش
شفاعتِ سنخِ جرمِ آباہستی	قناعتِ گنجِ ملکِ تنگدستی
فلکِ گلہستہ طرفِ کلاہش	ملکِ پروانہ و شمعِ نگاہش
ز شہرستانِ رحمتِ بے نصیبم	غریبم یا رسول اللہ غریبم
تو بکیں دوستِ من ہمایہ شمن	نیا بی تا کسے بکیں تراز من
ز رحمتِ زارِ خویشم وہ گیا بحر	بہشتی کن گیا ہم از تنگاہے

## مناجات

خداوندِ افرودنِ آموخت	نفسِ وز دیدہ اذولِ مردنِ سخت
بناخنِ گر بکاوی آہن و سنگ	بہر جا شعلہٴ بینی بر اورنگ
غرامتِ بین کہ این ناکسِ دلِ من	نہ کوہِ طور شد نے سنگ و آہن
من و این دل کہ گمنامِ زبانِ بُو	چنین دِلِ ما نصیبِ دشمنانِ بُو
ز خونِ این چنینِ دلِ خاکِ تن	چنینِ دلِ طعمہٴ زراغ و زغن بہ
بجائے این دلِ افسردہٴ پیکر	دلِ پروانہ ام وہ یا سمندر
وے ریشے ازان اجزا جو جانِ پیش	وے کز نامِ او گرد و زبانِ ریش
وے ہمایہٴ فریادِ بلبِل	وے صیدِ گل و صبا دبل
وے سرتاقِ قدمِ چون شعلہٴ روشن	کشیدہٴ کسوتِ فانوسِ برتن
ز شوتے کن سرم را سجدہٴ فرسا	کہ شوقِ از سر نہ انم سجدہٴ از پا
شہادتِ را شرابِ ہوشِ من کن	محبتِ را گلِ آغوشِ من کن

میرے وہ زاوۂ فحشاء نہ رطوبت،  
 کہ ہر گہ سایہ اش بر ساغر افتد  
 شب تاریک و درمردیدہ اعلیٰ  
 کرامت کن چراغانِ تجبلی،  
 ز نور و حد تم غاظر بر افروز  
 بطور رویتم را ہے بیا موز  
 دلم را عاقبت اندیشگی وہ  
 عروجے وہ بعراج قبولم  
 رہے بنما بدرگاہِ رسولم

سبب تالیف کتاب | شہزادہ دانیال نے بلایا،

قضا فرمان شہنشاہِ جوان بخت  
 فلک خرگاہ ماہِ آسمان تخت  
 چراغِ افروز مسند گاہِ اقبال  
 گلِ خورشید نو شہزادہ دنیال  
 بلا کر کہا :-

حدیثِ ببل و پروانہ تا چند  
 کن شد قصۂ فرہاد و شیرین  
 بحرِ نامے زیلیٰ بر زبان نیست  
 بحرِ حزنے ز مجنون در میان نیست  
 یکے بر طرفِ آتشخانہ بگذر،  
 بر آئینِ بت و بت خانہ بنگو،  
 عجب تر آنکہ بعد از مرگ مردان  
 زمانِ بر شیعہ آتش نوروان  
 ز آتشِ دامنِ ہمتِ نچسبند  
 جو انمردانہ در آتش نشیند،  
 رخ از جامِ سمندر بر فروزند،  
 ز بہرِ مردۂ خود را بسوزند،  
 قعبِ نیست کرد عواصِ صادق  
 نواسے این عجب سایہ بیوقوف  
 جو عیشِ رفعت و تقویم پارین  
 کہ سوز و بہرِ عاشق زندہ معشوق  
 بسوزد و در غمِ معشوق، عاشق،



ہیں باشد ہمیں معراجِ ہمت  
کے نئے نئی آساید از عشق  
ایا پروا نہ بے بس تر نم  
ہی خواہم باندک روزگار  
حدیثِ شمعِ کلکتہ بر فروز  
بحرِ تازہ خرم کنی گوش  
نوعی نے یہ حکم سکر ثنوی لکھی،

نثارِ جانِ تاراجِ محبت  
ازین ہا ہرچہ گوئی آید از عشق  
جگر خونِ غنچہ آتشِ تبسم  
براہِ یغزانی از آتشِ ہمارے  
کہ ہر کس بشنود جانِش بسوزد  
کہ تارِ رخِ کہن گرد و فراموش

نصابِ شعلہ بر کاغذِ تنہیدم  
بستی آن روزِ نارفتہ رنم  
چون این غم نامہ سوزانِ حکایت  
رقم زد خامہ معجز طرازِ ش  
برات روانہ ہوئی نوشہ کا عالم  
بر پیشِ گلِ گلند از منہ نقابے  
ز گلِ آغوشِ زینِ رشکِ چین  
نظرِ تاجانہ گرد و دل برہمن  
قدم بر آرزوی سود و جی رفت  
عالمِ مسرتِ عام،

گھر در رشتہ آتش کشیدم  
رویک سالہ در یک ہفتہ فتم  
نفسِ بگداخت در کامِ دوست  
محبت نامہ سوز و گدازِ ش

بہتا بے نہفتہ آفتابے  
ز نگہت بارگی با دِ خن شد  
تکیہ بایِ عنان و شوقِ توسن  
نگاہِش بر قفاے بود و نیست

عروسی خانہ و اماوی اود  
گلندہ حلقہ در گوشِ زمانہ

جہان سہر شوقِ شادی  
خروشِ نامے و بانگِ شادی

چراغان کردہ بام و درگلستان  
گلستانے زفا نوش خیابان  
بجان شہرے تماشا ست شاوی  
نک گلستہ در دست شاوی  
چھتے مین برات داخل ہوتی ہے،

رسیدند از قضا در تنگنا سے  
چو دہلیز عدم تار یک جاے  
برونے چون درونِ دختہ تار یک  
رہے چون نقبِ موران تنگ و  
بہر سوش بلند ایوان و قصرے  
کہ بوے سایہ اش بر طاقِ کسریٰ  
ز بس طوفان بردشہنم فنا نہ  
درستی در گھل و خشت نما نہ  
شکست اندر شکست آن بام دیو  
بتا رغبت بوش بستہ معمار،

ہوا مزدور پستی بانی او  
نفس معذور درویرانی او  
خروشِ صور چون از جای جنبید  
بنائش چون بنائے قبر لرزید

ز بس زلزل کو س آئین دم  
بنائش چون مقوی ریخت اذہم  
چون اذہم ریخت آن فرسودہ بیکہ  
نہان شد زیر ہر خشت صد سر

چنان با خاک خشتِ تخمِ سرکشت  
کہ خشت از سر نہانستہ سر خشت  
شکست آن دختہ چون بر فرقِ دا  
تو گفنی آسمان بر خاک افتاد

خروش از چرخِ نیلی پوش برخت  
زہر دل صد قیامت جوش برخت  
نوائے مطربان شد نوہ آہنگ  
زہر دل صد قیامت جوش برخت

شد از نیزنگ چرخِ سدر و سی  
عروسی ماتم و ماتم عروسی  
چو در شہر این صدائے ناخوش  
ہی گفنی کہ در شہر آتش افتاد

نوشہ کی ارتھی چلی،

روانش در عماری جاے دادند  
عمارِی را چو گل بر سر نهادند  
ہمان با کوس و نای و مطرب و گے  
ہمی رفت و جہانے ہمرہ وے  
عروس شعلہ شد جانانہ را و  
شد آتش گے عروسی خانہ را و  
حادثہ کی عروس کو خبر ہوئی،

چو آن خواب پریشان دید دختر  
چو گل ہر بادِ خسرت داد و مخر  
ز عشرت خانہ سرستانہ ہر جہت  
خسک بر پایے و آتش بر کف دست  
بر ہنسہ پاؤں سرچون شعلہ مفتون  
ہمی گفتے کہ لیے انگشت مجنون  
زمیتہاے شوقِ جانپاری  
شدہ پروانہ شمعِ عساری  
ز شوقِ سوختن در آتش دست  
نمی گنجید بچون شعلہ در پوست  
چو نخلِ شعلہ می مالید و می رفت  
بر آتش سینہ می مالید و می رفت  
مخلوق کی پریشانی اور سمجھانا

جہانے خانہ سوز آہ و افسوس  
کہ جوید شیوہ پروانہ طاؤس  
حکیم و فیلسوف و پیر و دانایان  
فسون آموزان دل ناشکیبا  
کہ شوقش ان تنافر و سازند  
بجانش ہر آتش سر و سازند  
برہمن ملتانِ بت پرستار  
ہدایت مرشدِ ناقوسِ مزار  
ز ہر سو نغمہ سنج صد نویدش  
تسلی دہ ز صد بیم و امیدش  
لڑکی کا جواب

وے دوست آتش آشنائے  
زبان نشناس کا فرما جوائے  
گفت اربتِ منع من گراید  
سجود او دگر از من نیاید

کسے را اختیار جان کس نیست  
نہ خود جان من اسطین ان کس نیست  
چو آتا زنده ام شرمندہ باشم  
کہ سوز و دلبر و من زنده باشم  
بجھانے والے چپ ہو گئے،

چو از ہر کمر و حلیت باز رستند  
زبان بستند و در ماتم نشستند  
اکبر بادشاہ کو خبر ہوئی،

جہن پیرائے این آتش ہوا باغ  
نہک سودا این چنین سازد گل و باغ  
کہ چون این قصہ در عالم ہر شد  
شہ کا راز مایان را خبر شد  
طلب کرد آن بیت کا فرلقب را  
بکوثر بار داد آن تشنہ لب را  
بفرمان شہ آمد آتش آلود  
چو سرکش شعلہ پیچیدہ در دود  
قدے چون شعلہ از تیغ نم خم داد  
زمین سجدہ را فیض ارم داد  
شہ از لطفش ہواست تحت نبشاند  
جواہر ہائے لب ہر فرش افشاند  
کشیدش از نوازش دست بر سر  
مرا و تحت دست شاہ افسر  
تستی دادش از مسکین نوازی  
بشیرین بزمائے لعب و بازی  
بفرزندئی خود داد اختصاص  
بعصمت گاہ خلوت کرد خاصش  
ز ہر جنبش از مہتابا ہسی،  
کرامت کرد و غیر از بادشاہی

لڑکی پر شاہی نہایش کا کچھ اثر نہ ہوا،

و لیکن آن زن مردانہ ہمت  
نہک لب طوطی پروانہ ہمت  
ز صد عالم تنی بر تنی  
نی شد جز بجان دادن تنی  
لبش جز گوہر آتش نی سفت  
بغیر از سوختن حرفے نی گفت

بادشاہ نے مجبوراً اجازت دی، انتظام کیا گیا،

چو عاجز شد شہ از دبحوئی او	عنان بر تاخت ز آتش خوی او
اجازت گوئے و ادش نہ از دل	ز شادی بر پرید آن مرغ بیل
تا آخر آن سپہ و انتش و داو	قرار چارہ بر بیچارگی و داو
اشارت کرد با پور جو ان بخت	کہ اے چشم و چراغِ افسر و تخت
بر این شعلہ راتا کانِ آتش	در افکن آتش در جانِ آتش
بد بگوئیش چون شیر و شکر شو	چو خورشیدش با آتش را ہر شو
اگر نرمی پذیرد یا ورش باش	و گر نہ چھو آتش ہر سرش باش
بخرمن عود و صندل بر فروزان	بر سیم دخت را یانش بسوزان
گل بخت و بہارستانِ اقبال	مراد انس و جان شہزاد و نیال
بحکم شاہِ نسہ مانِ تماشا	روان شد ہمرہ آن شکبیا
جہانے کردہ وقف از ہر کنارہ	متاعِ جان تبارِ ارجِ نظارہ
شہش در ہر نظر دادے پیامے	بہر گامے روا کردیش کاہے
تہامے رہ بروا فسانہ می خواندا	دلش میداد و رخ آہستی نہ
ولے اواز ہر دو جانم بے خبر بود	بجانش شوقِ آتش کا رگر بود
تیشہ گفتہ مرا بدنام کر دی	با فسون روزِ عیشم شام کر دی
ز صبرم رنج خواہد گشت یارم	بخاہد مرد آتش ز انتظارم
تا خورشید چو از گفتنِ فسر و ماند	گلابِ یاس بر سوزِ دل آتش
اجازت داد کا آتش بر فروزند	در آتش ہر دو را با ہم بسوزند

اطاعت پیشگانِ شاہزادہ      بخد مت نقدِ جان بر کفِ نہادہ  
چو از شہِ نغمہ رخصت شنیدم      بویِ خمد چون آتش دویدند  
ز بس چیدند بر ہم صندل و عود      جهان پر شد ز دودِ غیر آلود  
کم از مرگانِ ہم سودن زمانے      میا شد سمندر آشیانی  
نغمت آن کشته را در وے نہادند      بخور آسا بحر جاے دادند  
چو دودش با دماغِ دقرا میخت      شدش جان عطسه و بر خاکِ دخت  
سپند آسا بوجد افتاد و برخاست      بشکر شہ زبان چون شعله پیراست  
ز بعد شہ و دایع یک بیک کرد      دو چشمِ حاضران کانِ ہمک کرد  
ہی رفت و تحریکِ زبانی      ز غم می سوخت بے آتشِ جہانی  
لب از پانِ سُرُخ و چشم از سرمه خونین      چو یا قوتے شد اندر آتشِ تیز  
چنان متانہ بر آتشِ نظر کرد      کہ از بدستش آتشِ حذر کرد  
چنان از شوقِ دل بیتاب گدید      کہ از گرمیش آتشِ آب گدید  
چو موجِ انگن شد آن طوفانِ خونین      در آمد در میانِ آتشِ تیز  
در آتشِ چو صرصر پاپے کوبان      غبار از خویش و دود از شعله روبان  
محیطش گشت آتشِ با صد افسوس      تنِ او شمع و آتشِ گشتِ فانوس  
ز خونِ دل بر آتشِ روغن افتاد      سپندِ اشکِ دامن دامن افتاد  
ز آتشِ وعدہ گامیار پرسید      سُرُخِ جلوه دلدادہ پرسید  
خبر داد آتشِ از را ز درد و نش      بکوثر گشت آتشِ رہنوش  
چو اگر شد ہم از رہ بر سرش نخت      نقابش را بوس از رہ بر انداخت

سرشورید بر زانو نہادش، لبش بوسید و رو بر رو نہادش  
 کشیدش تنگ تر از جان در آغوش چو جانان یافت کرد از جان فراغش  
 بنوع امتزاج آن دو تن شد کہ جان این تن آن را کفن شد  
 شاہزادہ پراثر رقت اور مکر فرمایش چو نقشِ حال او شہزادہ بر خواند  
 دے چون ابر رحمت زار بگوشت دے چون ابر رحمت زار بگوشت  
 زخم مست از شراب گریہ مدہوش زخم مست از شراب گریہ مدہوش  
 بگفت اے شیر دل معشوق صادق ہمیں باشد عروج عشق عاشق  
 پتھین روے مردان بر زمین ست ہزاران آفرین بر آفرین ست  
 تسلی شو کہ کار خویش کردی برو عوی زانچہ گفتی بیش کردی  
 کنون شہرے زیہارت خرابست گداز آتش برون آئی صوابست  
 لڑکی نے سن کر جواب دیا،

ہین کا واز شاہ آمد بگوشش باستقبال آن برخواست ہوشش  
 ز حرف سوز ناک لب بخونست کہ دل بتالہ گشت داز لبش رست  
 کہ اے کامل عیار عشق سنبان مرغ خاتم مرغ خاتم مرغ خاتم  
 پس از عمرے نصیم شد وصالے وصالے بے وفا تر از خیالے  
 دم و صلم زمان واپسین است بمرخویشم آسایش مین است  
 رخسار دیدہ عمری ز اشتیاقش تنہا کردہ بودم در فراقتش  
 کون کش یا فتم بے رنج اغیار رہا کردن ز سہ تنگ وز ہوجا

دلم دارد وفا گر من ندارم	برون دستش از دامن ندارم
بخش چون جواب عشق گویم	اگر راه وفا داری بنویسم
برگ من محبت زنده بهتر	هوس از عشق من شرمنده بهتر
و لے هر ذره اش آتش درو بود	لبش با شاه در گفت و شنو بود
که حرفش در میان گوش لب خست	چنان طوفان آتش رخ برافروخت
زد آتش بر لبش مهر نموشی	دلش مشغول را از خود فروشی
چو مخمورے که در ساغر زنجنگ	کشید آتش ز شوقش در بنلنگ
چو مستی در کباب شور چسپید	ملاحت بیکش در هم نور دید
تن او شعله گشت و شعله شد دوو	تن صافیش چون شد شعله آلود
برو هر شاخ سنبل نخل امین	زخ از تاب آتش تاز هگلشن
و لے مغر دلش آغشته دوست	هزارش سوزد آتش در گپوست
زبانش چون لب پیامه خاموش	وجودش چون خم به جوش در جوش
همه ذرات او آتش شمر شد	در آتش چون سمنه ر غوطه ور شد
ازین پهلوان پهلونگر دید	ز استیلا آتش سر نه چسپید
که از دل بر زبان نگذشت دودش	سراسر سوخت ذرات وجودش
زبانش طوطی و دل بود ببل	همان در نعمت عشق و ذکر آن گل
روان شد تیر باران نظاره	بگاہ سوختن از هر کتاره
سر خود چون حباب از دود آتش	دو بار افراشت از آغوش شش
هزاران شعله زد لیده در محو	چو خود شید قیامت آتیش رو



بہر سو کر و خندان لب نگاہ ہے	نگاہ گرم تر از برقی آہ ہے،
دوبارہ از قعر آتش سس بر آوڑ	جالبش غوطہ ہم بر سر آوڑ
ز گرمی گشت آتش بر تن خشک	شداد کستر و خاکسترش مشک
کف خاکستر آن پیکر نور،	مصفا تر نمود از مغز کا نور
مجدد شد چو روح از تن پرستی	باتش پاک شد از جرم ہستی
ز جرم آب و گل شد صاف بے غش	بیالود از حیر نورش آتش،
زہر آلائیے خود را بری کرد	لباسِ عرش آتش گاہ زری کرد
میر ازین حیات را لنگان شد	پزیراے حیات جادوان شد
بیک جان دادن از صد دل رست	بری شد از خرد باد و دست پیوست
ہر آنکس را کہ سوز عشق دل خست	جو افریدی ازین زن باید آخست
بفتویٰ بنی ہمت نور دان	تمام زن بہست از نیم مردان
چو طوفان محبت آتش افراخت	زنے جان در ہواے مردہ بخت
ترانوی ز مردی شہرم بادا	وزین دون ہمتی آذر م بادا
کہ توانی قدم بر جان فشدن	ز شوق زندہ جاوید مردن
درین این لاف عشق تمام موی	حرام این دعویٰ احرام موی

### لغات جدیدہ

عربی زبان کے اخبارات، رسائل اور تصنیفات اور بول چال میں ہزاروں نئے الفاظ پیدا ہوئے ہیں جن کے بغیر آج کل کی عربی زبان کا سمجھنا دشوار ہے، مصنف نے اس کتاب میں اس قسم کے چار ہزار جدید عربی الفاظ کا لغت لکھا ہے، قیمت : ۱۰ پیسہ

”مینجھر“

## اردو اخبارات کا ارتقاء

از

جناب سید ابو عاصم صاحب ایم اے ایل ایل بی ٹیک

(۲)

دوسرا دور ۱۸۶۶ء | ۱۸۵۷ء میں ڈلہوزی ہندوستان سے رخصت ہوا، اور کیننگ گورنر جنرل ہوا، لیکن ڈلہوزی ہندوستان کے مجبور اور مایوس دونوں پر ایسا تیل چھڑک گیا تھا، جو ایک معمولی سی چنگاری سے بھڑک اٹھا، ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ایک معاشرتی رد عمل تھا، اور اس کو اسی روشنی میں سمجھنا چاہئے، اس میں نہ کسی غیر ملک کا ہاتھ تھا اور نہ یہ غریب بہادر شاہ کی سازش کا نتیجہ تھا، بلکہ ہندوستان کی معاشرت کی تباہی، افلاس اور اسکی غفلت کے خاتمہ ہندوستان کی حالت اس ستم رسیدہ بی کی سی بنادی تھی جو عاجز اگر شیر پر بھی حملہ کر بیٹھتی ہے، انگریزوں کے حقارت آمیز برتاؤ نے انہیں یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا کہ یہ بدیسی ان کے کچھ کو تباہ کرنے پہ تے ہوئے ہیں، اس پر متزاد یہ ہو گیا، کہ اودھ کے نواب کو معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا، "بہادر شاہ کا خطاب اور نیشنلک پھینکے مشورہ ہونے لگے، یہ صحیح ہے، کہ دلی اور اودھ کی بادشاہت چھین گئی تھی، لیکن دونوں پر اب بھی انہی کی حکومت تھی، بادشاہ تدریجی اور معاشرتی زندگی کا مرکز تھا، اور راجا اور پرجا میں ایک رشتہ تھا، ۱۸۵۷ء میں گورنر جنرل نے بادشاہ کے وکیل کو معمولی آدمی سمجھ کر ٹھٹھ سے انکار کر دیا۔"

سید اختر جان  
نہایت پرست

اس سے عوام کے دلوں پر کچھ کم دکھانین لگا ہو گا، پھر انگریزوں کی بدعہدی خود غرضی اور بدیتی نے ان کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا، اور لوگ اُن سے متنفر ہو گئے تھے، دسی اور بدیسی کش مکش کی یہ بڑی زبردست شکوہ تھی، جو بالکل فطری تھی، اور آخر مئی ۱۸۵۷ء کو دل کا غبار آتش فشان ہو کر پھوٹ نکلا، اس طوفان نے جہاں تمام نظام درہم برہم کر دیئے وہاں صحافت کی دنیا بھی غارت کر دی اگر ایک طرف عوام بے دست دبا ہو گئے، تو دوسری طرف زبان بھی بند کر دی گئی، جون ۱۸۵۷ء میں وہ ایکٹ پاس ہوا جس نے صحافت کا گلا گھونٹ دیا، اور تمام پریس اور کتابوں کی اشاعت پر پابندیاں عائد کر دیں، اس دارو گیر میں صحافت کا سانس لینا ناممکن تھا، اسی لئے قریب قریب سب اخبارات بند ہو گئے،

ملکہ کے پیغام امن اور سرسید اور دوسری لیڈروں کی کوشش سے جب اعلیٰ نصاب ہوا تو اخباروں نے دوبارہ جنم لیا، اور ہر جگہ سے اخبارات نکھنے لگے، ۱۸۵۷ء میں مشہور او وہ اخبار نکلا جس نے دنیا سے صحافت کو ایک نئی زندگی بخشی، منشی نو کشتور جو پنجاب کے مشہور اخبار کوہ نور میں کام کر چکے تھے، وہی اس کے روح رواں تھے، ۱۸۵۷ء میں یہ روزانہ ہو گیا، اور اب تک زندہ ہے، یہ اپنے صوبہ کا سب سے پہلا روزانہ اخبار ہے، ایک زمانہ میں ادبی حیثیت سے اسکی خاص اہمیت تھی، رتن ناتھ سرشار کی محرکہ الارا تصنیف فسانہ آزاد پہلے اسی کے چشمہ فیض کے ذریعہ شائع ہوئی اسکی ایک بڑی خصوصیت ہمیشہ یہ رہی کہ اس کے دامن سے پڑے کلمے، اور قابل اصحاب وابستہ رہے، مثلاً مولوی غلام شیش تلیز غالب، مولانا سید امجد علی اشہری، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی فوت راسے، نظر، مرزا حیرت دہلوی، حضرت جالب دہلوی، مرزا احمد عسکری، ماسٹر پیارے لال شاکر، و تاسی اپنے چودہویں خطبہ ۱۸۶۲ء میں اس اخبار کے متعلق لکھتا ہے، لکھنؤ کا او وہ اخبار

ہفتہ وار چھوٹی تقطیع پر مضمون کا ہوتا ہے، اسکی ادارت شیو پرشاد کرتے ہیں، وہ ہر موضوع پر کھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس میں خبروں کے علاوہ ادبی مضامین بھی ہوتے ہیں بعض مضامین میں ناگزی رسم خط میں ہیں، اس کے مضمون نگاروں میں ایک انگریز پامر بھی ہے، جس نے اردو میں اچھی صلیت پیدا کر لی ہے۔ سولہویں خطبہ ۱۸۶۷ء میں اردو اخبار کچھ سال سے نہایت کامیابی سے نکل رہا ہے، اسکی ہر اشاعت پچھلی اشاعت سے بہتر نظر آتی ہے، شروع شروع میں اس میں صرف چار صفحے ہوا کرتے تھے، اور وہ بھی چھوٹی تقطیع پر لیکن بعد میں چھ ہوئے، پھر سولہ اب اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے، پہلے کے مقابلہ میں اس کی تقطیع بھی بڑی ہو گئی ہے، میرے خیال میں اس سے زیادہ صحیح اخبار ہندوستان میں اور کوئی نہیں اس سے اندازہ ہو گا کہ اخبار بینی کا شوق ہندوستان میں کس قدر بڑھ رہا ہے، اخبار اب تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ضروریات زندگی میں شامل ہو گیا ہے۔

۱۸۶۷ء کے خطبہ میں مزید اظہار خیال کیا ہے، ”اردو کے سب اخباروں میں اردو اخبار بہترین خیال کیا جاتا ہے“..... مضامین اعلیٰ پایہ کے ہیں، جن کا مقابلہ ہمارے اخباروں کے مضامین سے کیا جاسکتا ہے۔“ خبروں کا حصہ اتنا بہتر نہ تھا، وہ زیادہ تر انگریزی اخباروں کا ترجمہ، احسان تھا، مصنف تاریخ ادب کا خیال ہے ”شروع میں جب منشی صاحب موصوف کے زمانہ میں یہ اخبار نکلتا تھا، تو یہ زیادہ تر ان خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخباروں کے مآدوں یا نوٹوں سے ترجمہ کر کے چھاپی جاتی تھیں، اسکی کوئی معینہ پالیسی بھی نہ تھی، سوائے اس کے کہ سیاسی شور و شر کے ہمیشہ یہ خلاف تھا، پہلے ہفتہ وار تھا، بعد میں روزانہ ہو گیا، اس کا اشاف اور ساز و سامان اعلیٰ قسم کا تھا۔

شمس الاخبار بدر اس سے نکلتا تھا، وہ اخبار کا معصر تھا، یہ کوئی مشہور اخبار نہ تھا، اسکی خصوصیت

صرف یہ تھی کہ یہ مسلمانوں کا اخبار اور ان کا نقیب اور انہی کے لئے مخصوص تھا، اس کے بعد لا ہور

سے اخبار عام پڑت کمندرام کی ادارت میں نکلا، یہ کافی مشہور اخبار تھا، اسکی خصوصیت یہ تھی، کہ مباح خاص خبریں چھاپتا تھا، اور بہت سستا تھا، اسکی زبان اخبار سی تھی جس میں کوئی ادبی لطافت نہ تھی، اس کی ارزانی نے اخبار بینی کا عام شوق پیدا کر دیا تھا، پہلے یہ ہفتہ وار تھا، بعد میں سہ روزہ، پھر دو روزہ ہو گیا تھا، اس کے معاون ایک پنشن یافتہ سرکاری عہدہ دار تھے، کچھ دنوں سرکار بھی اس کی سرپرست رہی، اور اس کی کاپی تمام اسکولوں میں جاتی تھی، لیکن بعد میں یہ سرپرستی ختم ہو گئی اس کے ایڈیٹر پڈت کمندرام تجربہ کار شخص تھے، کوہ نور میں کام کر چکے تھے، ۱۸۶۵ء میں میرٹھ کو اخبار عالم محمد وجاہت کی ادارت میں بکھنے لگا، اسکی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ تھی، کہ کوئل خبریں نظم میں شائع کرتا تھا، جیسے ۷

”سردی اب کی برس ہے اتنی شدید

کا نپتا بکھے ہر سحر خورشید“

صوبہ پنجاب ۱۸۷۱ء کی شورش سے بے تعلق رہا، اس کی زندگی بدستور چل رہی تھی اس نے وہاں کی ادبی اشاعت میں بھی خلل نہیں پڑا، کوہ نور بدستور جاری رہا، پنجاب کی طرح یہ بھی انگریزوں کا وفا دار تھا، انکی فتح کی خبریں بڑی مسرت کے ساتھ لکھتا تھا،

سورت میں جہان سے اردو کا کوئی اخبار کبھی شائع نہیں ہوا تھا، اور جہان قدیم طرز کے

فارسی اخبار کے سوا اور کوئی اخبار نہ تھا، ۱۸۷۱ء سے ایک اردو ہفتہ وار اخبار منظور الاخبار جاری

ہوا، اس کے ایڈیٹر کا نام محمد منظور تھا، اس کے سرورق پر اخبار کی تعریف میں ایک شعر تھا، اور

احمد کی آیت سے اس کا افتتاح ہوتا تھا، اس کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبوں اور مشرقی

مالک کی خبریں ہوتی تھیں، یورپ کے علوم و فنون پر تبصرہ بھی اس کا ایک خاص جزو تھا، اسکی

زبان نہایت فصیح تھی، اکثر مضامین کاغذاتہ اشعار پر ہوتا تھا، اس میں کماتین، متفرق اشعار مشتمل

غزلیں، وغیرہ بھی شائع ہوتی تھیں، اکثر نمبروں کے ساتھ ان کے فیضی بھی رہتے تھے،

ایس ڈبلیو فیملی، مدرسہ اجیر کے بنگران کا اور ضلع کے انسپکٹر مدارس تھے، انھوں نے

لیتھو کا ایک مطبع قائم، اور ایک اردو اخبار خواہ خلق جاری کیا، اس علاقہ میں یہ اردو کا پہلا اخبار تھا، سوہن لال اور اجودھیا پرشاد اس کے ایڈیٹر تھے، دونوں کو اردو زبان پر پوری قدرت تھی، ان کی اردو تحریروں میں سادگی اور لطیف بیان کے ساتھ ہندو سانی اور انگریزی کا ایک خوشگوار امتزاج ملتا ہے، غالباً یہ اخبار ۱۸۷۷ء سے پہلے جاری ہوا، داسی نے فروری ۱۸۷۷ء میں اس کا ذکر کیا ہے، اس میں ایک تو روزمرہ کی خبریں ہوتی تھیں، اور اس کے علاوہ مختلف عنوانات پر مضامین بھی ہوتے تھے، اس کی آزادی اور بے باکی حکومت کی نگاہ میں برا کھنٹی تھی، بناوٹ کے بعد سے ہندوستان میں پریس کی آزادی سلب ہو چکی تھی، ایسی حالت میں اس کا پینا مشکل تھا، چنانچہ حکومت نے اس اخبار کی اشاعت ممنوع قرار دیدی،

یکم جمابر لال نے جو متحدہ کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے، ان کا وہ اخبار محبوب رعایا نکالا،

سنہ اجرام معلوم نہ ہو سکا، لیکن داسی نے اپنے گیارہویں خطبہ دسمبر ۱۸۷۷ء میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ پر جاہت اور پیل فرنیڈس (People's Friend) کا ہندوستانی ایڈیشن تھا، اس کو صحیح معنوں میں اگر وہ گزٹ اخبار النواح کا قائم مقام سمجھنا چاہئے، وہ بھی حکیم صاحب

ہی نکالتے تھے، دونوں کا مقصد یہ تھا، کہ مضامین کے ذریعہ اخلاقی اصول پھیلانے اور عام کئے جائیں، اور مختلف ملکوں کی صحیح اور مستند خبریں درج کی جائیں، بے بنیاد افواہیں اور سنی سانی باتیں پھیلانے کا

دکھانے کا گزٹ ایک انگریز سمارن پور سے نکالتا تھا، اور اس کی زبان نہایت صاف اور

دھلی ہوئی تھی، کلکتہ سے ۱۸۷۷ء میں جام جہان نکلا، اسی نام کا ایک اخبار میرٹھ سے نکلتا تھا

کلکتہ کا ٹائپ میں چھپتا تھا، اور میرٹھ کا لیتھو میں، اسی سال بمبئی سے کشف الاحاد

نکلا، مولانا مہر وی نے اس کا سن ۱۸۵۳ء لکھا ہے، معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے، پنجاب گورنمنٹ کی ابتدائی تعلیم کی رپورٹ میں ایک اخبار کا ذکر ہے جو پنجاب کے علاقہ میں بہت مقبول تھا، ۱۸۶۲ء کی کلر ہی رپورٹ کے مطابق ۱۸۵۹ء تک صوبہ شمالی اور مغربی میں اردو کے تین اخبارات تھے جن میں ہفتہ وار کٹریتھ تھے، دتاسی نے لکھا ہے، ”کلمتہ سے لیکر پشاور تک شمالی ہند کے کسی بڑے مین چلے جائے، ہر جگہ لیتھو پریس دکھائی دیں گے“

دتاسی اپنے چودھویں خطبہ ۱۸۶۲ء میں ہندوستان کے اخبارات اور یہاں کی اخبار بینی کے متعلق لکھتا ہے، ہندوستان میں اخبار بینی کا چسکا بڑھتا جا رہا ہے، ان اخبارات میں بالعموم خروں کے علاوہ عام معلومات بڑھانے کے لئے مضامین بھی ہوتے ہیں، کبھی کبھی ایجادات اور تہذیب و تمدن کی ترقی سے متعلق مضامین ہوتے ہیں جنہیں لوگ بڑی دھچپی سے پڑھتے ہیں۔“

نجم الاخبار میرٹھ سے نکلتا تھا، اس کے متعلق دتاسی کا خیال ہے، کہ ”یہ صوبہ کے شمالی و مغربی کا بہترین اخبار ہے“، ۲۶ فروری ۱۸۶۲ء کے نامزین لکھا ہے، کہ ”ہندوستان کے گوشے گوشے سے اجاڑا نکل رہے ہیں، ان میں سے بیشتر اخبارات کی ادارت کے فرائض اچھے طریقہ سے ادا کئے جاتے ہیں بعض اخبارات کے مضامین دیکھنے سے پتہ چلتا ہے، کہ معنوں نگاروں کی نظروں میں ہے، اور وہ انگریزی ادبیات اور انگریزی فن صحافت سے واقفیت رکھتے ہیں، حکومت ان اخباروں کی کوئی مدد نہیں کرتی۔“

۱۸۶۵ء کے خطبہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ پنجاب بمبئی، افغانستان اور سندھ میں اردو اخبارات جاری تھے، اسی سال اخبار عالم نیا جاری ہوا، اس کے خریداروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اسکی ۵۳،۰۰۰ کاپیاں چھپتی تھیں، مرزا وجاہت علی اس کے مدیر تھے، اس میں سولہ صفحات اور صفر میں دو کالم ہوتے تھے ”راجو تانہ سے بھی ایک اخبار نثر احسان نکلتا تھا، مدراس سے عمدۃ الاخبار“

منظر الاخبار، صبح صادق، ریاض الاخبار نکلے تھے، بنگلور سے قاسم الاخبار اور حیدرآباد سے مجمع البحرین نکلے، اس فہرست سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اپنا گھر بنا چکی تھی، اوڈھا سے اپنی آواز بلند کر رہی تھی،

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلنے جا رہی تھی، ۱۸۶۲ء میں کنھوین کینگ کا ج قائم ہوا، اسی سال لاہور کا اورینٹل کالج وجود میں آیا، مدراس بی اور کلکتہ کی یونیورسٹی پہلے ہی قائم ہو چکی تھیں، ان یونیورسٹیوں کے طریقہ امتحان نے سارے تعلیمی نظام میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، تمام کالج ان کی نقل کرنے لگے، اور نئے کالج کھلنے لگے، یہ وہ وقت تھا، جب دیسی طرز معاشرت نے سپر ڈال دی تھی، اور مغربی تمدن اور خیالات فاتحانہ انداز سے ذہن و دماغ پر مسلط ہو رہے تھے، انگریزی تعلیم ہی اس وقت حسن و قبح کا معیار سمجھی جانے لگی تھی، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کے درمیان صاف طور سے ایک فلیج بن رہی تھی، اسی تعلیم اور سرکاری ملازمتوں نے عدیوں کے پیروں کو چھڑا دیا، اور غیر شعوری طور پر ہندو مسلمان الگ ہونے لگے، یہ انگریزی تعلیم ہی کا اثر تھا، کہ بہت سی معاشرتی اصلاحیں سوچی جانے لگیں، لڑکیوں کی تعلیم شادی کے مصارف اور کم سنی کی شادی کی نفی، لفت اعتدالیوں کی ترویج اور سائنس کی نئی ایجادات ہمارے اخبارات کے موضوع بن گئے، اس ترقی کے ساتھ ہمارے اخباروں نے وائسرائے کی کونسل اور محل سے باہر نکل کر غریبوں کی جھوپڑیوں تک بھی نظر ڈالی، اور ان کی فلاح کی تدبیریں سوچنے لگے، اس دور کے آخر میں پریس اور ملک کی پریشانی دور ہونے لگی، اور اب وہ دبی زبان سے ملکی معاملات پر رسانی بھی کرنے لگے، وائسرائے اب امیر کبر سے صرف وائسرائے رہ گئے، انگریزوں کے لئے خالی صابنا عایشان باقی رہ گئے۔“



تیسرا دور ۱۸۶۵ء تا ۱۸۷۷ء | سرسید پہلے شخص تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی پھرکتی ہوئی لگ پر ہاتھ رکھا

اور اسکی روح کو سمجھا، ان کا رسالہ اسباب بناوٹ ہمنامہ گو مسلمانوں کی محبت میں جادہ ابراہیم سے آگے بڑھ گیا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بناوٹ کی اصلی وجہ مغرب و مشرق کی بیگانگی تھی، سرسید کو یقین ہو گیا تھا کہ اس نئی قوت کا مقابلہ ناممکن ہو وہ انگریز اور مغرب اس قدر مرعوب تھے کہ ہر چیز کو اسی کی روشنی میں دیکھتے تھے، دوسری طرف ان کو اسلام اور مسلمانوں سے بھی بڑی محبت تھی، اس لئے مغرب کے مسلمات کو قانون قدرت بھگوان اپنے عقائد کو اسی کسوٹی پر پرکھتے اور جانچتے تھے، اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے، کہ اسلام یورپ کے معیار پر پورا اترتا ہے، ان خیالات نے مسلمانوں کے اندر جدید مذہبیت اور معاشرت کی بنیاد ڈالی، اس راہ میں مولوی چراغ علی ان کے دست راست تھے، یہ فریب بدقوت تک چھایا رہا، اس کے ٹوٹنے میں شبلی اور اودھ پنچ کا بہت بڑا ہاتھ ہے، سرسید یورپ کے تمدن کو دیکھتے، کہ ساری قوم کو یورپ کے قالب میں ڈھال دینا چاہتے تھے مغرب کے فیوض و برکات کو ہندوستان میں پھیلانے کے لئے انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، اس کا رخانہ سے یورپ کے علوم و فنون ڈھل ڈھل کر پھیلنے لگے جو مفید کام اس انجمن نے کیا، وہ ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہے گا، اور اردو زبان و ادب اس کے احسان کو کبھی سبکدوش نہ ہوگا،

۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء سے انسٹیٹوٹ گزٹ جاری ہوا، اس اخبار کے اجراء سے اردو صحافت

نے تیسرے دور میں قدم رکھا، یہ اخبار تھا جس کو سرسید کی مرکزیت کی وجہ سے کل ہند اخبار کہا جاسکتا ہے، اس کا اسٹاف اور دوسری ظاہری و معنوی خوبیاں اس کو کچھلے دور سے ممتاز کرتی ہیں، منشی چمن لال جیہ انگریزی اخبارات سے ترجمہ کرنے والا، اور مولوی فیض الرحمن اور بابا گنگا پرشاد جیہ مترجم کتب اسکو حاصل تھے، شروع میں یہ ہفتہ وار تھا، پھر ہفتہ میں دو بار نکلتے لگا، اس کے ابتدائی ایڈیٹر محمد اسماعیل تھے، کل اخبار نمائند ہیں، تصنیفوں کا شمار انگریزی کے مطابق

بائیں طرف سے ہوتا تھا، اس کی پالیسی بھی متعین تھی، وہ سرکار کا اور رعایا کا دونوں کا بھی خواہ تھا، رعایا کو نصیحت اور حکومت کی وفاداری کی تلقین اور حکومت سے رعایا کی دہجائی کی التجا اور درخواست اس کی پالیسی تھی، اس کے سرورق پر یہ الفاظ تھے: ”آزادی چھاپے کی ہے، ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا، اور ایک اصلی اور جہتی حق رعیت کا۔“ اس اخبار کی تمام خوبیاں سرسید ہی سے وابستہ تھیں، جیسے ہی ان کی توجہ اس سے ہٹی، اس کا انداز بھی بدل گیا، مولوی عبدالحی اس کی خوبیوں کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں: ”یہ سب سچ ہے لیکن اسی وقت تک جب تک کہ کالج اور دوسرے کاموں کا ہجوم نہیں ہوا تھا، آخر میں تو یہ تاخوذ اذیان نہ ہو کے رہ گیا، لیکن جب کوئی خاص مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا، تو سرسید خود بڑے پُر زور مضامین لکھتے تھے، عام اخباروں پر سوسائٹی کا بہت اچھا اثر پڑا، اور وہ سیاسی معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر بخیرگی سے بحث کرنے لگے، پنڈت کیفی نے اپنے مضمون میں اس دور کے بہت سے اخبارات کی لمبی فہرست دی ہے لیکن ان کے متعلق تفصیلی معلومات نہیں ہیں، جن سے اردو صحافت کے ارتقاء کا پتہ چلایا جاسکے، اس لئے وہ اہم نہیں،“

۶۹-۷۰ء سے اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا اس سے تمام اخباروں کو ایک موضوع ہاتھ آگیا، دونوں طرف سے خوب خوب مضامین لکھتے تھے، یہ وقت تھا جب اردو اخباروں کا بول بالا تھا، ہندی اخبار بہت کم تھے، سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ اردو کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا وہ اسی زبان میں لکھا جاتا، اور مخالفین کی زیادہ تعداد اردو کے بہت اچھے لکھنے والوں کی تھی، ہماری قومی زندگی میں پھوٹ اسی دن سے پڑی، یہ بھی یورپ کی تسلیم اور قومیت کے بھوت کا اثر تھا، ہندی اردو کے جھگڑے کی ابتداء یوں ہوئی، کہ بنگال میں فارسی زبان کے بجائے ویسی زبان عدالت کی زبان تسلیم کر لی گئی، ان کی دیکھا دیکھی شمالی مغربی صوبہ کے ہندوؤں نے بھی

مطلبہ کیا کہ یہاں بھی عدالتوں میں ہندی زبان مان لی جائے، اسکی حمایت میں بڑے بڑے مضامین لکھے گئے، جن کے متعلق دتاسی کی یہ رائے سننے کے قابل ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ بجائے مسلمانوں کی زبان کے ہندوؤں کی زبان کو فروغ دینا، باوجود پریشاد نے دیوناگری رسم خط کی حمایت میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں اردو رسم خط کے مقابلہ میں اسکی فضیلت ثابت کی تھی، دتاسی اس کے متعلق لکھتا ہے: واقعہ یہ ہے کہ خود اردو میں ایسے شمار الفاظ ہیں جنہیں دیوناگری رسم خط میں نہیں لیا جاسکتا۔ علی گڑھ کے اخبار نے دتاسی کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ اس تحریک کی بنیاد نسل اور مذہبی اختلاف پر منظر پر رہا۔ (کے وارث علی نے بھی علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۹ اپریل میں ایک بڑا جوش مضمون سپرد قلم کیا تھا، اور یہ ثابت کیا کہ اردو ہی دراصل اہل ہند کی عام زبان ہے۔“

۱۸۶۷ء میں صوبہ بہار میں بھی ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم ہوئی، اس کا صدر مقام مظفر پور تھا، اس کے متبرک ایک فاضل مسلمان تھے، کچھ دنوں میں اس کے ممبروں کی تعداد ۳۱۸ ہو گئی، جس میں ۱۲۸ مسلمان، ۱۹۲ ہندو اور ۲۸ یورپین تھے، انجن کی طرف سے ایک اخبار بھی جاری ہوا جس کا نام اخبار الاخبار تھا، اس انجن نے مغربی تعلیم کو پھیلانے میں بڑی مدد دی، اسکی تجویز تھی، کہ انجن کی طرف سے مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے ایک کالج قائم کیا جائے، اور ساتھ ساتھ مغربی علوم کی اشاعت کا کام بھی انجام دیا جائے، مسلمان عوام کی اخلاقی و ذہنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے اور اسباق کے ذریعہ تعلیم پھیلانی جائے، مغربی تصانیف کے ترجمہ کرنے کا خیال تھا، مستر فریڈرک ڈیوڈ (Friedrich David) جو ایک جید عالم تھے، اس کے حامیوں میں تھے، انجن کی طرف سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا تھا، اس کا ارادہ تھا کہ غربا کے لئے زراعت اور صنعت و حرفت کا ایک کالج بھی کھولا جائے، اس کے پانچ درسوں میں بلا امتیاز مذہب و ملت سب شریک ہونے اس انجن کا حال ٹی گڈہ اخبار میں ہمیشہ چھپتا تھا،

لے خطبات گھارسان دتاسی،

پہلے سے چشمہ عالم نام ایک اخبار یکم جنوری ۱۹۳۷ء میں جاری ہوا، اس سے پہلے اس شہر میں کوئی اخبار نہ تھا، یہ مینہ میں دو دنہ نکلتا تھا، تقطیع چھوٹی تھی، مغویں دو کالم ہوتے تھے، دتاسی نے اپنا بیس خطبرہ ۱۹۳۷ء میں لکھا ہے، کہ اس اخبار کا ایک مضمون مجھے پسند آیا، جس کا موضوع بنی نوع انسان کے اتحاد سے متعلق تھا۔

ہم اس پنجاب سنڈے کی اپریل سے شروع ہوا، جرون کے ساتھ ساتھ اردو ہندی کی کتابوں پر تبصرے بھی ہوتے تھے، نامہ نگاروں کے صرف وہ خطوط چھاپے جاتے تھے، جو اپنے اندر کچھ دلچسپی رکھتے تھے، میرٹھ کے اخبار کو اس کے نام اور انشا، پراعتراض تھا، کیونکہ اس کی زبان پر انگریزی اثر بہت غالب تھا،

دلی سے ایک ہفتہ وار اخبار ریفرامو اظہادی ہوا، اس میں آٹھ صفحے ہوتے تھے، یہ اخبار اسلام کی حمایت و اشاعت اور مسیحیت کی تردید میں نکلتا تھا، ایک مسیحی اخبار ٹمس الاخبار کنگو کہ نکلا، اس کے مضامین دلچسپ ہوتے تھے، اس کی غرض عیسائی مذہب کی اشاعت تھی،

ہندی کا ایک اخبار جگت سماچار جاری ہوا، یہ اصل میں اردو سے ہندی میں ترجمہ ہوتا تھا، اس کے متعلق دتاسی لکھتا ہے، "چاہے کوئی کچھ کہے، لیکن یہ مسلم ہے، کہ اردو زبان دوسری زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ مستعمل ہے، اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے، کہ اس اخبار میں یہ بات بھی وضاحت سے بیان کر دی گئی ہے، کہ اس کی زبان عام فہم ہے، اگرچہ ناگری رسم خط میں ہے۔"

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اکثر اردو اخباروں کے ہندی ایڈیشن اور ہندی اخباروں کے اردو ایڈیشن نکلتے تھے، پنجاب سے اخبار انجمن پنجاب نکلا، اس کے متعلق دتاسی کا خیال ہے کہ یہ وہی اخبار ہے جو کبھی "ہما پنجاب" کے نام سے جاری ہوا تھا، کیونکہ اس اخبار کے سرورق پر ہما کی خیالی تصویر تھی، یہ اخبار پنجاب سے مختلف تھا، یہ انجمن پنجاب کا اخبار تھا،

جس کے صدر مسٹر بیس گر فیض اور مستند باور و بن چند رائے تھے، انہی دو ذون کی نگرانی میں یہ اخبار شائع ہوتا تھا، حکومت بھی اسکی سرپرست تھی، اور اسکی دوسو کا بیان خریدتی تھی، اس اخبار میں تصویریں بھی ہوتی تھیں، جس نے اسکی قدر و قیمت بڑھا دی تھی، یہ تصویریں عموماً تاریخی اشخاص اور تاریخی مقامات کی ہوتی تھیں، مثلاً ایک مرتبہ نصیر الدین شاہ ایران اور بوشہر کے پل کے ایک منظر کی تصویر شائع ہوئی تھی، اس کے اڈیٹر نظام الدین تھے، الہ آباد سے ایک اخبار نور الابصار جاری ہوا، اس کے متعلق مسٹر کنسن کی رائے ہے کہ یہ شمالی مغربی صوبہ کا بہترین اخبار تھا، میرٹھ سے اردو لارپورٹ مہینہ میں دو بار شائع ہوتا تھا، یہی گنج حکام کے نام سے ماہانہ بھی نکلا کرتا تھا، مسٹر ہارلڈ ناظم تعلیمات پنجاب کی سرپرستی، اور منشی پیارے لال کی ادارت میں ایک اخبار اتالیق پنجاب نکلا اس میں تاریخ، جغرافیہ اور سائنس پر نہایت مفید مضامین ہوتے تھے،

تہذیب الاخلاق ایک رسالہ تھا، اس کا ذکر بہت ضروری ہے، کیونکہ اس کا اثر زبان اور خیالات پر گہرا پڑا، اور اردو ادب اور صحافت دو ذون اپنی صلاحیت کے مطابق اس سے مستفید ہوئے، اس کا سب سے بڑا کارنامہ جدید تعلیم کی اشاعت ہو،

مذکورہ بالا وہ مشہور اور اہم اخبارات ہیں جو اوچے پوچے کے قبل اردو صحافت میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، اور ملک کے دل و دماغ پر اتنا اثر رکھتے تھے، اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں اوچے پوچے نے اردو میں ظرفیہ نہ صحافت کا سنگوہہ چھوڑا، جس پر ہم بعد میں تفصیل سے نظر ڈالیں گے،

اس دور میں اردو صحافت کی حکومت ہندوستان کے چھ پچھ پڑے ہوئے تھی، اور ان کی سطح بھی پہلے سے بلند ہو گئی تھی، وہ ہندوستان کے باہر کی دنیا سے بھی واقفیت رکھتے تھے، داسی اور اس کے علم سے اکثر اخبارات واقف تھے، اسکی سالانہ تقریریں قدر کی نگاہوں سے دیکھی اور ترجمہ کی جاتی تھیں، ۱۸۷۷ء کے خطبہ کا ترجمہ اخبار الاحبار مظفر پور (بہار) اور اخبار انجمن پنجاب میں کیا گیا تھا

اور دتاسی کی تصویر بھی دونوں میں شائع ہوئی تھی وہ انجمن پنجاب کا اعزازی رکن بھی تھا، یہ تمام اخبارات ملکی معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے، اردو ہندی کا جھگڑا بدستور جاری تھا، جس میں سب شریک تھے، ملک میں مسلمانوں کی تعلیم کا خیال اہمیت حاصل کرتا جا رہا تھا، اور ایک مشرقی جامعہ کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی، سرسید اس وقت کی تعلیم کے خلاف تھے، اور سید عبداللہ ان کے ہمنوا تھے، سرسید نے موجودہ تعلیم کے خلاف ”موجودہ تعلیم پر اعتراضات“ کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا تھا جس کا جواب بابوشیو پرشاد نے ”اعتراضات پر اعتراضات“ کے نام سے دیا، بابو شیو پرشاد اردو کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے، ان کے اختلاف کی وہی نوعیت تھی، جو اردو و ہندی کے مسئلہ میں عام ہندوؤں کی تھی، جس کا ثبوت ان کے ان الفاظ سے ملتا ہے، ”کہ آٹھ صدی تک مسلمانوں کی حکومت کے مظالم برداشت کر چکے ہیں“ مظفر پور کی سائینٹفک سوسائٹی کے اخبار آلہ خبا میں سید امداد علی نے ایک مضمون میں یہ ثابت کیا تھا، کہ روزمرہ کی زبان میں تعلیم دینے سے تعلیم میں سہولت ہوگی، اور ہندوستانیوں کو دینی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا،

اس وقت اردو اخبارات ترقی کی راہ پر تیز تیز قدم بڑھا رہے تھے، ان میں روزانہ کم ہفتہ وار زیادہ تھے، انجمن کچھ آزادی بھی حاصل ہو گئی تھی، خصوصاً وہ اخبار جو سرکار کی سرپرستی میں تھے، جب ضرورت سمجھتے تھے، تو انگریزی حکومت پر تنقید بھی کرتے تھے، اور پریس کی قوت ایک حقیقت ہوتی جاتی تھی۔ دتاسی اپنے ۱۸۶۷ء کے خطبہ میں لکھتا ہے، ”ادبی کتابوں کے بعد اخباروں کو خاص اہمیت حاصل ہے جنہیں دن بدن ترقی ہو رہی ہے، وہ سیاسی، علمی، ادبی اخبار جن کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں بدستور جاری ہیں۔“

# تَلْخِصٌ مِّنْ تَبَصُّرٍ

## ہالینڈ میں اشتراق

المستشرق العربی لندن مئی اور جون ۱۹۲۲ء کے فیرون مین پروفیسر وائڈبرگ کے قلم سے "ہالینڈ میں اشتراق" کے عنوان سے ایک مفید مقالہ لکھا ہے، اسکی تلخیص درج کیجاتی ہے،

آج یورپ کے قریب قریب تمام بڑے بڑے ملکوں میں عربی اور مشرقی زبانوں سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، یونیورسٹیوں میں عربی کی چیر قائم ہیں، اور یہاں کے مستشرقین ڈکسی ڈکسی حیثیت سے عربی کی خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن اس کی ابتداء مغرب کے ایک چھوٹے خطہ یعنی ہالینڈ سے ہوئی۔ سب سے اول بین کے علماء نے عربی ترکی اور فارسی زبانوں خصوصاً عربی اور اس کے علوم کی طرف توجہ کی، اور اسکی بڑی گرانقدر خدمات انجام دیں، ۱۵۷۵ء میں لیڈن یونیورسٹی قائم ہوئی، اور بہت جلد یورپ میں الیات اور پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم کا مرکز بن گئی، ۱۵۹۰ء میں پروفیسر اسکالیگر (Scaliger) نقہ الملت کے چیرمین مقرر ہوئے،

اس زمانہ میں یورپ میں تجارت کا سب سے زیادہ مذاق اہل ہالینڈ میں تھا، اس سلسلہ میں انھیں بحر متوسط کی ساحلی اسلامی حکومتوں سے واسطہ پڑتا تھا، اس تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں انھیں عربی کے ترجمان اور اس کی تعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی، انھوں نے تجارتی مراسلت کے لئے پروفیسر اسکالیگر کی طرف رجوع کیا، یہ عربی زبان بہت واجبی جانتے تھے، اور یورپ میں اس زمانہ

مین عربی لغت اور قواعد کی کتابیں نامید تھیں، اس نے پروفیسر مذکور کو بڑی زحمت پیش آتی تھی، انھوں نے اپنے ایک ہونہار اور لائق شاگرد ادہیس (H. de Vries) کو عربی اور بعض دوسری مشرقی زبانوں کے سیکھنے پر آمادہ کیا، اس نے پیرس جا کر ایک مصری سے عربی زبان اور دانائین فنی ترکی اور حبشی زبانیں سیکھیں، اور جامعہ لیڈن میں مشرقی زبانوں کا استاد مقرر ہوا، چند دنوں کے بعد اس نے مشرقی زبانوں کی کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک چھوٹا سا مطبع قائم کیا، اور ۱۶۱۳ء میں عربی قواعد کی ایک کتاب شائع کی جو مدتوں یورپ میں عربی تعلیم کا ذریعہ رہی، ۱۶۴۴ء میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا، ادہیس کے ایک لائق شاگرد جولیس (J. de Meijer) نے بڑی محنت اور ذوق و شوق سے مشرقی زبانوں کی تعلیم حاصل کی، دو مرتبہ مراکش اور ایشیا کوچک کا سفر کیا، اور یہاں سات برس قیام کر کے عربی اور ترکی میں کمال حاصل کیا، اور واپسی میں جامعہ لیڈن کے لئے نادر مخطوطات کا تحفہ لے گیا، جولیس پر اطالب علم تھا، مشرقی زبانوں کے علاوہ ریاضیات کا بھی استاد تھا، ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر میں چینی زبان سیکھنے کی طر توجہ کی، اس کو عربی فارسی اور ترکی سے بڑا شغف تھا، سب سے پہلے اسی نے عربی لاطینی لغت لکھا جو کئی صدیوں تک یورپ میں مستشرقین کا مرجع رہا، پروفیسر فریٹاک (F. Freytag) کے مشہور عربی لاطینی لغت کی تالیف کے بعد علمائے ادھر توجہ کی، یہ لغت بالکل عربی لغات نمونے پر لکھا گیا تھا، لاطینی میں عربی لغات کی تشریح تھی، گویہ کوئی بڑا جامع لغت نہ تھا، لیکن زمانہ کے اعتبار سے غنیمت تھا،

پروفیسر جولیس کی توجہ اور دہیچی سے یورپ میں لیڈن یونیورسٹی مشرقی زبانوں کی تعلیم کا مرکز بن گئی، اس کے نامور شاگرد ادہیز (H. de Vries) نے قسطنطنیہ کا سفر کر کے عربی زبان سیکھی، اور ترکوں کی معاشرت اور ان کے اوضاع و اطوار کا مطالعہ کیا، اس کی ناکامی



نے اسے وطن واپس ہونے کی مصلحت نہ دی، لیکن اُس نے عربی فادسی اور ترکی کی بہت سی نادقی کتاہیں جامعہ لیڈن کے لئے تحفہ بھیجیں، جنہوں نے عطیہ وارز کے نام سے یورپ میں اتنی شہرت حاصل کی، کہ شائقین دور و دور سے اُسے دیکھنے کے لئے لیڈن آتے تھے،

اس دور کے نامور مستشرقین میں ایک پروفیسر ایڈرین ریلینڈ (Adriaan Rezeland) استاد جامعہ اربلٹ (Arbuthnot) ہیں، یہ ہالینڈ کے سب سے بڑے فاضل مستشرق تھے، فلسطین، جغرافیہ اور اسلامی تعلیم کا ہون پر ان کی تصانیف ان کے علمی کمال کا ثبوت ہیں، ان کا نہایت اور متنا و صفت ان کی بے تعصبی اور انصاف پسندی ہے، ان کے پیشرو مستشرقین سخت متعصب تھے، اور انکی تصانیف اسلام کے خلاف اندھے تعصب سے خالی نہ ہوتی تھیں، جن کا مقصد اسلام اور اسکی تعلیمات کو سمجھنا نہیں، بلکہ محض مسیحیت کی مدافعت اور اسلام پر اعتراض کرنا تھا، پروفیسر ریلینڈ کی روش اس سے بالکل مختلف تھی، ان کا مقصد انصاف اور بے تعصبی کے ساتھ اسلام کی تعلیم کا مطالعہ اور اس کو اصلی اور صحیح ماخذوں سے لیکر اصلی شکل میں پیش کرنا تھا، وہ علانیہ کہتے تھے، کہ میں راسخ العقیدہ مسیحی ہوں، لیکن میرا مذہب دوسرے مذاہب پر طعن و طنز کا سبب نہیں بن سکتا، ان کا مقولہ تھا کہ ہم سب انسان ہیں، جن کو غلطی کا ہو جانا بعید نہیں، خصوصاً مذہبی معاملات میں ہم حد اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں، اور اپنے جذبات کے ماتحت فیصلہ کر دیتے ہیں،

ریلینڈ کے عہد کے بعد لیڈن یونیورسٹی میں ایک ایسی گھر کے تین افراد ابٹرشلسٹنس

(Alben & Shalferd) اسکاٹلنڈ کا جان جیمز (John James) اور اس کا

پوتا ایکے با دیگرے شیعہ عربی کے صدر مقرر ہوئے، اور ستر سال تک یہ عہدہ اس گھرانے میں رہا، ان میں جیمز اپنے عہد کا سب سے بڑا مستشرق تھا، اور ابٹرشلسٹنس پہلا شخص ہے، جس نے عربی زبان کے ذریعہ عبرانی کو سمجھنے کی کوشش کی، گو اس کا یہ نظریہ غلط تھا، لیکن اسکی بنیاد صحیح تھی، اتنا مسلم ہو کہ تورانی

اصل زبان عبرانی کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے صحیح معنی مرور زمانہ نے بھلا دیئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تورات کے مختلف زبانوں کے ترجموں میں ایک ہی عبرانی لفظ کے مختلف بلکہ متضاد ترجمے ہوئے ہیں، البرٹ کا نظریہ یہ تھا کہ قدیم عبرانی الفاظ کے معنی کو ان کے مقابل عربی الفاظ کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے، اس کے ثبوت میں اس کے پاس دلائل اور مثالیں بھی تھیں، لیکن یہ بڑا متعصب تھا، اس لئے عربی زبان کے مطالعہ میں اس نے کوئی اچھا اثر نہیں چھوڑا، اس کے بعد ہالینڈ میں استشراق کی رفتار سست پڑ گئی،

گذشتہ صدی کے اواخر میں پھر اسکی تجدید ہوئی، اور ایسی ہوئی کہ اس میدان میں اسکا قدم کچھ دور سے بہت آگے بڑھ گیا، اور ایسے نامور اور صاحب کمال مشرق پیدا ہوئے جن کے کارناموں کے سامنے گذشتہ مشرقین کے کارنامے ماند پڑ گئے، ان میں ڈورزی (Dorzi) ڈی گج (De Goeje) اور اسنوکر ہرگر (Snouck Hurgronje) زیادہ ممتاز ہیں، ان کا کارنامہ یہ ہے، کہ انھوں نے مشرقی علوم کے مطالعہ کو طعن و تعصب سے پاک کر کے خالص علمی مقصد بنا دیا، ان کے علمی کارناموں نے مشرقیات میں ہالینڈ کا علمی پایہ بہت اونچا کر دیا، بلکہ یہاں تک کما جاسکتا ہے کہ اس میں یورپ کا کوئی ملک ہالینڈ کی ہمری نہیں کر سکتا، ان علمائے علم کی پیام رسانی کا پورا حق ادا کیا، اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک دائمی غنیمت میراث میں چھوڑ گئے،

ڈورزی ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۰۳ء میں وفات پائی، اس میں مختلف زبانوں کے سیکھنے کی فطری صلاحیت تھی، ادب اور عہد وسطیٰ کی تاریخ سے اُسے خاص دلچسپی تھی، فنون لطیفہ سے بھی ذوق رکھتا تھا، اسکی خوش قسمتی سے اُس کو لیڈن یونیورسٹی میں ویرس (Vreeswyk) جیسا کمال استاد مل گیا، جس نے اپنے تلامذہ کے لئے علمی تحقیق کا ایک قابل تقلید طریقہ ایجاد کیا،

اور ڈوزی کو عربی زبان کے مطالعہ میں الفاظ اور معنی کے ساتھ ان کے اشتقاق کی طرف زیادہ توجہ کرنی کہایت کی اس طریقہ تحقیق کا نتیجہ وہ عربی اور فرانسیسی لغت ہی جو عربی زبان کا خزانہ تصور کیا جاتا ہے، ڈوزی نے اپنے علمی مساعی اور محنت کا نصف حصہ اس بے مثل لغت کی تالیف و تحقیق میں صرف کیا، اسکی اہم تاریخی تصانیف میں فرانسیسی زبان میں اسکی قابل قدر کتاب "ابینین میں مسلمانوں کی تاریخ" ہے،

ڈی گج ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۰۹ء میں وفات پائی، یہ ڈوزی کے ارشد تلامذہ میں تھا، ہمارے فن، غیر معمولی ذہانت اور جدت طرازی اس کا نمایاں وصف ہے، آج عربی زبان کے طالب علموں کے لئے جو کتابیں ناگزیر سمجھی جاتی ہیں، ڈی گج کے زمانہ میں ان کا نام و نشان نہ تھا، اور نہ مشرقی کتابیں یورپ تک پہنچی تھیں جن سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھاتے، عربی کتابوں کے بیشتر قلمی اور بازار اور جو نصف مشرق و مغرب کے کتب خانوں کی ردی کے انبار میں گم تھے، ان گنہائے گرانمایہ کو گوشہ گمنامی سے بچانے میں ڈی گج کی کوششوں کو بڑا دخل ہے، اور یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ گذشتہ نصف صدی کے اندر یورپ میں جتنی نمایاں کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر ان کی اشاعت میں کسی نہ کسی حیثیت سے ڈی گج کی امداد ضرور شامل ہے، اس نے عربی تصنیفات کو بہترین تصحیح و ترتیب تحشیہ اور فرستون کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کے بعد کے ان تمام مستشرقین نے جنہوں نے عربی کتابیں شائع کیں، اس کے طریقہ کی تقلید کی اور اس میں وہ سب اس کے احسان ہیں، ڈی گج نے سب سے اول یعقوبی کے جغرافیہ کا وہ حصہ جو مغرب (شمالی افریقہ اور اندلس وغیرہ) سے تعلق ہے شائع کیا،

اس کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اس کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا، ابو جعفر طبری کی مشہور تاریخ "تاریخ الامم والملوک" کی اشاعت ہے، ان خدمات کے ساتھ مختلف اسلامی موضوعوں پر مقالات کا

سلسلہ بھی جاری رہا، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے نوین اور گیارہویں حصے میں متعدد مقالات اس کے قلم کے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ مشرقیات میں اس شغف و انہماک کے باوجود ان دونوں فاضلوں کو مشرق دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملا، بلکہ جولیس کے علاوہ اس دور کے کسی ہالینڈی مشرق کو اسلامی دنیا سے تعلق پیدا کرنے کا اتفاق نہیں ہوا،

اسنوک ہرگر وینج بھی ڈورزی کا شاگرد رشید اور اپنے عہد کا صاحبِ کمال فاضل مشہور عالمِ سیاح اور نامور سیاست دان تھا، اس نے البتہ اسلامی ملکوں کی سیاحت کی، اسکی پیداکر ڈورج سے یورپ میں اسلامیات کے مطالعہ کے ذوق کو بڑی ترقی ہوئی، وہ ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۷ء میں وفات پائی، الیات اور مشرقی زبانوں کی تحصیل کے بعد جزیرہ العرب کی سیاحت کی اور مکہ کے نام سے اس سیاحت کا سفر نامہ شائع کیا، ۱۸۸۹ء سے لیکر ۱۹۱۰ء تک جادین جہان و مسلمانوں کے امور کے متعلق حکومت ہالینڈ کا مشیر تھا، اسلامیات اور جاوین اسلام اور مسلمانوں کے تعلقات پر مطالعہ اور تلاش و تحقیق میں مشغول رہا، ۱۹۰۶ء میں لیڈن یونیورسٹی میں شعبہ عربی کا صدر مقرر ہوا، اس کو مشرق خاص طور سے مسلمانوں کے ساتھ بڑا تعلق خاطر تھا، برسوں اسلامی تعلیمات پر غور و فکر مسلمانوں کے ساتھ روابط و تعلقات اور ان سے تبادُل خیالات کے بعد اس مغربی مقلد کے برخلاف ”مشرق مشرق ہے“ اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔ اس کو یقین کامل تھا کہ اسلام اور جدید یورپ میں ربط و اتحاد ممکن ہے، اور یہ دور دونوں میں الفت و محبت کے رشتہ کو مضبوط کرنے اور ایک دوسرے کو بہتر طریقہ سے سمجھنے کیلئے سب زیادہ موثر و مناسب ”م“

### جینی مسلمان

ایک درمند صاحبِ قلم جینی مسلمان نے چین کے مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی، تمدنی، سیاسی اقتصادی اور تعلیمی

”مینجر“

حالات ہندوستانی زبان میں لکھے ہیں، صفحات ۲۴۲ صفحہ قیمت :- غیر

# اُحِبَّ اِلَیَّ

## چینی حکومت و اُن کے مسلمان

چینیوں کے دل میں مدتوں سے آرزو تھی کہ وہ دوسرے اسلامی ممالک سے خوشگوار تعلقات پیدا کر کے دوبارہ رفتہ رفتہ اخوت میں منسلک ہو جائیں، چنانچہ حال ہی میں اسلامی چینی وفاق کے نمائندے عثمان و ونے شاہی مسجد لاہور میں بعد نماز جمعہ ایک تقریر کی، اور چین کے مسلمانوں کی جانب سے ہندی مسلمانوں کو ہدیہ تہنیت پیش کیا، اور یہ بھی بتایا کہ چین کے مسلمان دوسرے غیر مذہب والوں سے بالکل شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں،

اس وفاق کے صدر جنرل عمر باجوہ *Mamam* ابن تیرہ صدی کی مدت میں چین میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ تک پہنچ چکی ہے، چین میں ۱۰۰۰۰۰ مسیحی ہیں، پندرہ سال ہوئے انھوں نے کلام پاک کا چینی ترجمہ شروع کیا تھا، اب تک اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں، حکومت چین نے چالیس مسلم طلبہ کو جامعہ اذہرین تعلیم کے لئے مقرر بھیجا تھا، جن میں سے پندرہ تعلیم ختم کر کے واپس آچکے ہیں، بہت سے چینی طلبہ ترکی اور ایران بھی بھیجے گئے ہیں، عنقریب کچھ لڑکے ہندستان بھی آئیں گے،

## طیاروں کی صلاح و ترقی

موجودہ جنگ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فضائی جنگ ہے، اس لئے امریکہ، روس اور برطانیہ

سے زیادہ جہاز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، لندن میں آئے دن ایسے ہوائی جہاز بن رہے ہیں جو بہت تیز رفتار اور جلد سامانِ جنگ سے مسلح ہوتے ہیں، ان طیاروں میں سب سے بڑی وقت یہ ہے کہ ڈبیز زمین پر رینگے، نصائین بلند نہیں ہو سکتے، اور مشین کی آواز بہت تیز ہوتی ہے لیکن حال میں ایک جرمن نے ایسا ہوائی جہاز بنایا، جس میں ایک ٹن لگا ہوا ہے جس کے دباتے ہی ہوائی جہاز پرواز کی طرح ایک جگہ اتر سکتا ہے، اور دوسرا ٹن دباتے ہی ہوائی پرواز شروع کر دیتا ہے، لیکن اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس کے ٹن اکثر خراب بھی ہو جاتے ہیں، اس لئے اب تک جنگ میں استعمال نہ ہو سکا، امریکہ کا ایک سائنس دان بھی اس گرو سے واقف ہو گیا ہے، امید ہے کہ وہ اس خرابی کی اصلاح میں کامیاب ہوگا، کیونکہ اس کے مقابلہ کا جرمنی میں کوئی سائنسدان نہیں،

## جامعہ استنبول

جمہوریہ ترکیہ سے پہلے استنبول میں صرف مذہبی مدارس تھے، جن میں حدیث، فقہ، اور دوسرے دینی علوم کی تعلیم ہوتی تھی، لیکن اب وہاں جدید طرز کی یونیورسٹی قائم ہو گئی ہے، امید ہے کہ اس فریدیہ اہل استنبول کا کافی ترقی کریں گے، اس کے نصاب میں طب، ادویہ سازی، قانون، سائنس، اقتصادیات اور ادب وغیرہ نئے فنون شامل ہیں، یہ جامعہ شہر کے وسط باطنت (سمت) *Baghdad* کے قریب واقع ہے، اس سے ملا ہوا ایک باغ ہے جس کے سامنے حسین ترین مناظر ہیں، طلبہ کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچ چکی ہے، اس لئے اب عمارت کی توسیع ہونے والی ہے،

## روس میں مسجدیں

روس میں اس وقت ۱۳۱۲ مساجد ہیں، ان کی بڑی تعداد *Baghdad* کے

شہر دینا (دہلی) میں ہے، وہاں کے سب سے بڑے موجودہ امام عبدالرحمن بن، ان کی مستقل سکونت تو  
ہی میں ہی، ان مساجد میں ۸۰۵۲ ملا، ۲۸۲۰ شیوخ اور ۵۲۸ مؤذن روسی حکومت کی طرف سے مقرر  
ہیں، یہ مسجدیں مختلف فرقوں، سنی، شیعہ اور اسماعیلیوں کی ہیں،

## قطب شمالی میں نشر گاہ

قطب شمالی و جنوبی میں سال بھر برف پڑتی رہتی ہے، جس طرف نگاہ اٹھتی ہے، برف ہی  
برف نظر آتی ہے، وہاں ایک سو کوئی آبادی نہیں، موجودہ جنگ میں پٹرول کیا بھورا ہے اسلئے  
ہر ملک کی یہ خواہش ہے کہ وہ کم سے کم تیل میں اپنا کام چلائے، اسکو سے امریکہ کا قریب ترین راستہ قطب  
شمالی ہو کر ہے، اس لئے اہلِ روس نے اس برف سے ڈھکے ہوئے ملک میں نشر گاہ اور ہوائی اڈہ قائم  
کر کے دنیا کو جو حیرت کر دیا ہے

## فیثہ پر قرآن

ایک ایرانی سیاح جو حال ہی میں گھنوا آیا تھا، اس کے پاس ایک کلام مجید تھا، جو ساڑھے سات  
گزیے اور ڈھائی انچ چوڑے کپڑے پر لکھا ہوا تھا، خیال ہے کہ یہ نسخہ ۸۰۰ سال پہلے کا لکھا ہوا ہے، یہ فن  
خطاطی کا بہترین نمونہ اور غالباً چھ سال سے کم مدت میں نہ لکھا گیا ہوگا،

## ایک نیا نباتاتی تجربہ

امریکہ کے ایک سائنسدان پروفیسر آرتھر ٹھکسن کا خیال ہے کہ اگر پانی میں تین چار بار ایک خاص کمیاد  
طریقہ سے برقی لہر دوڑائی جائے اور اس سے درخت سینچے جائیں تو وہ زیادہ پھل دینگے اور پھول کی کثافت  
بڑھ جائے گی، علی گڑھ کے ایک طالب علم جنھوں نے نباتات میں ایم اے کیا ہے، انھوں نے ذاتی تجربہ  
کے بعد پروفیسر موصوف کے خیال کو صحیح پایا،

# ایک مہینا

## زمرہ عرفان

اندر د فیصلہ سلیم فارانی ایم اے ایم اے اوال، گورنمنٹ کالج ہشیار پور  
 جذبہ دل مہار ہے تقدیر کی تعبیر کا  
 معجزہ دکھلاؤ رہ ہنگامہ تدبیر کا  
 انقلاب انگیز ہی نادان اتر ابرک  
 محورِ اعظم تو ہی ہے عالمِ تقدیر کا  
 جو تجھے کہتے ہیں فانی جانتے شاید نہیں  
 ایک پہلو اور بھی اس سی تصویر کا  
 جان نثاری کیل ہو مرد مجاہد کے لئے  
 حوصلہ ہے پست اس کے دُبر و شیر کا  
 ناشناسائی میں جب انسان کے عالمِ مطیع  
 کیجئے اندازہ پھر عرفان کی تاثیر کا  
 ذرہ ذرہ میں جہان اندر جہان پاناہن  
 پھر بھی اسکی معرفت میں خوف و تقصیر کا  
 ہیبتِ جلوہ گری نے عقل پر ڈالے ہین  
 حیرتِ نظارہ ہے حلقہ مری زنجیر کا  
 کون کہہ سکتا ہو کیا ہو گر اٹھے اس نقاب  
 اس قدر چرچا ہو جس کے نور کی تیور کا

میں نے فارانی طفولیت میں جو دیکھا تھا خواہ

وقتِ آپہنچا ہے اب اس خواب کی تعبیر کا

## غزل

از جناب امجد علی صاحب پنج فیض آبادی

زبان پہ لائیے کیا شکوہ ہر کسی کے لئے  
یہ دل بنا ہے اول سے شکستگی کے لئے



اب اس خلوص کی تو جھکو داد دو کہ نہ د  
زمانے بھرے ہوں ناخوش تری خوشی کیلئے  
کمان میں اور کمان یہ دیا ربے گا نہ  
بہا نہ چاہئے کچھ مرگ بیکسی کے لیے  
غضب ہو کھا گیا تو بھی نہ گشتِ ظلمت  
ضیائیں عرشِ سوسا شامِ زندگی کیلئے  
اب اس اداے ہنس سے تو دیرینہ نہ کر  
تمام عمر میں رو دیا ہوں اس ہنسی کیلئے  
نہیں کہ اُن میں جمالِ کرم نہیں یعنی  
وہ مرہبان بھی ہیں لیکن کسی کسی کیلئے  
عطا ہوا ذوقِ محبت کے ساتھ عرابہ  
یہ زندگی تو بہت کم ہے عاشقی کیلئے  
نفسِ نفس میں بناتا ہوں اک جانِ اسید  
یہ اہتمام ہے دودن کی زندگی کیلئے  
اسی جانِ خس و خاک کو بنالے ارم  
بہشت اُتر کے نہ آئی کبھی کسی کیلئے

وہ حسن و دلکش و رعنا سہی مگر امجد

نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کیلئے

تخذیر از مجالستِ جاہلان

از جناب حکیم الشعرا سید احمد حسین صاحبِ امجدیہ آبادی

قطعہ

جاہل انسان کے سایے میں نہ جاؤ  
تم ابو جہل کو بھائی نہ بناؤ  
وہ تو تم کو بھی تیرہ کر دے گا  
کوئلہ، جامہ سیہ کر دے گا  
لوگ سمجھیں گے کہ تم جاہل ہو  
کیونکہ جاہل کی طرف مائل ہو  
دوست جاہل کا ہو جاہل کا شیل  
قیل الجنس الی الجنس میل  
صہبتِ نیک سے جاہل فطرت  
جاہلیت کو نہیں کھ سکتی  
اگ ہی راکھ بنے تو بن جائے  
راکھ تو آگ ہو نہیں سکتی

# مستعاضہ مطبوعات جدیدہ

حزب امام ولی اللہ دہلوی { از مولانا عبید اللہ صاحب سندھی تقطیع چھوٹی ہفت  
کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ { ۲۱۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجددہ

پتہ اردو بک اسٹال لاہور،

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ،  
علوم اور ان کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے، اور اپنی ذہانت سے اس میں  
بہت سی لطافت و نکات پیدا کئے ہیں، اس موضوع پر وہ ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں  
یہ مختصر کتاب گویا اسکی تمہید ہے، اس میں مولانا نے شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ سے لیکر شیخ الاسلام مولانا محمود  
صاحب تک اس سلسلہ کے تمام بزرگوں کو موجودہ اصطلاح میں ایک انقلابی اور ان کے تجدیدی اور  
اصلاحی کارناموں کو ایک طے شدہ اور منظم سیاسی پروگرام کے تحت میں انقلابی تحریک کی شکل میں پیش  
کیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحب مجتہدانہ دماغ اور بلند فکر و نظر رکھتے تھے، اور ہندوستان  
کے علماء میں وہ پہلے بزرگ ہیں جن کی نظر ہندوستان میں اسلامی حکومت اور یہان کے مسلمانوں کے  
زوال کے سیاسی اسباب تک پہنچی، اور ان کی کتابوں میں جا بجا سیاسی اور اقتصادی مسائل بھی ملتے  
ہیں، اور ان کے بعد اس سلسلہ کے بزرگوں نے مسلمانوں کے مروجہ عقائد و اعمال کی اصلاح کے ساتھ سیاسی  
حیثیت سے بھی ان کی تجدید کی کوشش کی، لیکن اس کو ٹھیک ٹھیک مغرب کے موجودہ سیاسی انداز و  
خیالات اور بین الاقوامی انقلابی تحریکوں پر منطبق کرنا نہ صرف خلاف واقعہ بلکہ خود ان بزرگوں

کی توہین ہے، کتاب کا بڑا حصہ مصنف کے ذاتی مفروضات و قیاسات پر مشتمل ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں، اور اگر کہیں کوئی کمزور بنیاد مل بھی گئی ہے، تو مولانا کے تخیل نے اس پر پوری عمارت بنا کر کھڑی کر دی جو اس کتاب کا طرز استدلال ان یورپین مصنفین کی طرح ہے جو ایک لفظ سے پوری داستان تصنیف کر لیتے ہیں، مولانا کے تخیل میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ ان کے تن کے شارح مولانا نور الحق نے پوری کر دی۔ مولانا کو سیاست میں اتنا غلو ہے، کہ انھوں نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی کارناموں اور اکر جیسے طے کی مگر امیون کو ایک ترازو میں رکھ دیا ہے، اچانچہ فرماتے ہیں، ہماری رائے میں جو کام اکبر نے شروع کیا تھا، وہ اساساً صحیح تھا، اور عللاً غلطیان اس لئے ہوئیں، کہ اس عظیم الشان کام کو چلانے کے لئے اسے آدمی میسر نہیں آئے، ہمارا خیال ہے کہ وہ ضرورتاً خدا سے تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کے ذریعہ سے پوری کر دیں، یعنی جس گمراہی کا آغاز اکبر نے کیا تھا، گویا اسکی تکمیل شاہ ولی اللہ نے کی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ مصنف کا علم و نظر مسلم ہے، ان کے حسن نیت میں بھی شبہ نہیں، لیکن مغربی ملکوں خصوصاً سویٹ روس کے قیام کے اثر سے ان پر ایک خاص قسم کی سیاست اتنی چھا گئی ہے، کہ اس میں دینی مصالح گم ہو گئے ہیں، تاہم چونکہ ایک ممتاز دماغ کے قلم کی تحریر ہے، اس لئے اس میں غلو و فکر کے لائق بہت سے نکتے بھی مل جاتے ہیں، اور اسی حیثیت سے اسکو پڑھنا چاہئے،

غالب مؤلفہ جناب غلام رسول صاحب مہر تقی بڑی خدمات ۱۸۸۳ء صفحہ ۱۸۸ کتابت

و طباعت بہتر قیمت معلوم نہیں، پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہوری دروازہ لاہور

جناب غلام رسول صاحب مہر کی قابل قدر تالیف غالب کے پہلے ایڈیشن پر دسمبر ۱۸۸۳ء کے معارف میں مفصل ریویو ہو چکا ہے، اور وہ صاحب ذوق طبقہ میں اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکا ہے کہ اس کے لئے کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں، غالب پر اردو میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب ان سب میں ممتاز درجہ رکھتی ہے، اس میں خود غالب کی تحریروں اور کلام سے ان کی مفصل سوانحی

مرتب کی گئی ہے، یہ خصوصیت اس کے سوا اور کسی کتاب میں نہیں، اس اعتبار سے اسکی حیثیت تزک کی ہوگی۔ سات آٹھ سال کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا ہے، اس میں لائق موفت نے بہت سے نئے اور مفید اضافے کئے ہیں، اور کتاب کی ضخامت ایک سو صفحوں سے زیادہ بڑھ گئی ہے، اصحاب ذوق کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہئے،

**تمنا ع اقبال** از جناب ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن  
تقطیع ٹری ضخامت ۱۰۰ صفحہ کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۷ روپے ۶ پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ مکتبہ امداد باہمی سٹی کالج حیدرآباد دکن،

موفت نے اس کتاب میں اقبال کی شاعری کے بنیادی پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے جس سے ان کی تعلیمات کے سمجھنے میں رہنمائی ہوتی ہے، کتاب میں تین مضامین ہیں، پہلے مضمون میں جن پر آشوب حالات میں اردو شاعری نے جنم لیا اور جس ماحول میں اقبال کی شاعری کا نشوونما ہوا، اس کے جو اثرات اردو اور اقبال کی شاعری پر پڑے اس کو دکھایا گیا ہے، دوسرے میں اقبال کی شاعری کے ابتدائی رنگ اور پھر عہد ہمد کے تغیرات اور اس کے اثرات و نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے، تیسرے میں اقبال کی بنیادی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، اس سے کلام اقبال کی شاعری کے مختلف دوروں کے تغیرات اسکی طبعی اسباب نتائج اور اسکی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اور اس پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، اس کا جواب بھی ملتا ہے، کلام اقبال پر جو مختصر کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں افادہ کے لحاظ سے یہ کتاب بہت اچھی ہے،

ہمارا ہندوستان از ترجمہ جناب مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب، تقطیع چھوٹی قیمت ۲۰۰ صفحہ کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۷ روپے ۶ پتہ :- ہنری ملرڈ پبلشرز آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی، مکتبہ مدراس،

ہندوستان قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال ہے، زمین کی زرخیزی، پیداوار، معدنیات، صنعت، حرفت کیلئے مواد خام، کسی چیز کی کمی نہیں، جو اجناس ساری دنیا میں پائی جاتی ہیں، قریب قریب سب کی سب تمنا ہندوستان میں موجود ہیں، لیکن اجنبی حکومت کی بے توقبی اور ہندوستان کی عام جہالت و انداس کی وجہ سے اس بے کران دولت سے ہندوستان کو بہت کم فائدہ پہنچا، اس کے مقابلہ میں وہ ملک جو پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے، محض اپنے ذرائع کی وجہ سے اپنی کم دولت سے ہندوستان سے کہیں زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً ہندوستانی نے اس موضوع پر انگریزوں میں یہ مفید اور پراثر معلومات کتاب لکھی تھی جس میں ہندوستان کی طبعی دولت اور دوسرے ملکوں کی دولت کا موازنہ کر کے ان کے مقابلہ میں اپنی دولت سے ہندوستان کی محرومی اس کے اسباب اور اس کو مٹانے کی صورت بتائی گئی ہیں، کاشتکاروں اور مزدوروں کی اصلاح اور ان کی ترقی کے وسائل کو خاص طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان کی موجودہ صنعتی اور اقتصادی حالت اور آئندہ ترقی کے متعلق بھی بہت سی مفید باتیں آگئی ہیں، کتاب بہت مفید ہے، لائق ترجمہ کرنے ترجمہ ایسا کیا کہ کتاب ترجمہ نہیں بلکہ تصنیف معلوم ہوتی ہے،

فاسٹرم مترجمہ کامریڈ باری تقی طبع چھوٹی ہفتامست ۶۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتریت

پتہ ۱۔ مکتبہ اردو لاہور،

یہ مختصر سالہ ایک برطانوی اہل قلم پروفیسر میرلڈ لاسکی کی تصنیف ہے، اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ ہٹلر کا عقیدہ ابتدا سے یورپ بلکہ دنیا پر وحشیانہ تسلط و اقتدار تھا، لیکن شروع میں اسے فاسٹرم کے چہرہ پر ایسا پردہ ڈالے رکھا اور اس کا طرز عمل کچھ ایسا بہم تھا، کہ یورپ کی جمہوری حکومتوں سرمایہ داروں، اشتراکیوں، مختلف سیاسی طبقوں نے اپنا حامی سمجھا، اس کی بے عنوانیوں و جھوٹ چشم پوشی، بلکہ اس کی حمایت کی، اور ہٹلر نے جرمنی کے جنگ کے بعد کے پیدا شدہ حالات سے فائدہ اٹھا

اور جرمن قوم کو شاندار مستقبل کا یقین دلا کر اپنا اقتدار قائم کر لیا، اور ملک کو فوجی بنانے کے بعد کھل کر میدان میں آگیا، اس وقت سب کی آنکھیں کھلیں، لیکن اب ہٹلر کی قوت اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اس کا مقابلہ آسان نہ تھا اس نازک وقت میں صرف برطانیہ دنیا کی آزادی اور موجودہ تہذیب کو اس وحشت و بربریت سے بچا سکتی ہے، لیکن اس کو صرف زبان سے نہیں، بلکہ اپنے محکوم ملکوں کے ساتھ عمل و حریت نوازی کا ثبوت دینا چاہئے، یہ کتاب غالباً روس پر جرمنی کے حملہ سے پہلے لکھی گئی ہے، اب ان حالات میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی ہے،

وار دات از پنڈت و ماتریہ کیفی دہلوی تقطیع بڑی ضخامت ۵۱۲ صفحے کا غذائیت

طباعت بہتر قیمت مجلد ۷، میسر زرام لال سوری اینڈ سنز نارملی لاہور

مذکورہ بالا کتاب پنڈت و ماتریہ کیفی دہلوی کے کلام کا مجموعہ ہے، اردو شاعری اور اردو زبان پنڈت جی کا پایہ سلم ہے، ان کی مشق سخن پر نصف صدی سے زیادہ گزری ہے جس کی مثالیں شعرا میں کم نہیں کی، پنڈت جی ان شعرا میں ہیں جنہوں نے قدامت کے باوجود اردو شاعری کی تنگ دامانی کا احساس کیا اور اسکو تغزل کے قدیم تنگ کوچہ پر نکال کر ایک وسیع شاہراہ پر لانے کی کوشش کی جس کا ثبوت ان کا یہ کلیات ہے، چنانچہ اس ضخیم مجموعہ میں مختلف کیفیات اردات و اوقات و حالات اور سیاسی و قومی ادبی اور دوسری مختلف موضوعوں پر پڑھ سونپیں ہیں، ان میں غزل کا حصہ بہت کم ہے، مصنف کا رجحان اوقات و محتاج کی جانب زیادہ ہے، چنانچہ غزل میں بھی عموماً تغزل اور تغزل کی رنگینیوں کو بجا کر واقعت زیادہ نمایاں ہے، اسلئے اس مجموعہ میں غزل سو ذوق رکھنے والوں کی دلچسپی کا سامان بہت کم ہے، لیکن اور اصناف سخن کے نمونہ بکثرت ہیں اور ابتدائی مشق کو لیکر اب تک کا کلام شامل ہے، میں ہوا سی اور کیسا نیت کا ہونا و شواہد، اسکو کہہ سکتی کیسا تہ و شقی کو نمونے بھی موجود ہیں، بعض بعض نظمیں پنڈت جی کی اسٹی کا کمال نمونہ کلام کی ترتیب دیکھنا سیکھنے سے لگتی ہیں اس کو شاعری کے تدبیر کے اعتبار اور تغیرات کا اندازہ ہو جاتا ہے، پنڈت جی ان باتیات میں ہیں جن کو سہند مسلمانوں کی قدیم کجی اور مشترکہ تہذیب کی یاد دہانہ ہے جس کی جھلک ان کے کلام میں بھی جا بجا نظر آتی ہے، ”م“

جلد ۵۰ "ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۲ء" عدد ۶

## مضامین

۴۰۲-۴۰۴	سید سلیمان ندوی	شذرات
۴۱۶-۴۰۵	مودی محمد رفیع صاحب دہلی، گرامی فینڈ اراکین	مشرق تولد کی اور قرآن،
۴۳۲-۴۱۷	جناب زبیر احمد صاحب لکھنؤ عربی	علوم حدیث پر ہندوستان کی عربی تالیفات
	اللہ آباد یونیورسٹی،	
۴۴۱-۴۳۳	جناب محمد عبدالقادر صاحب بی ایس	ابن خلدون کے معاشی خیالات،
	سی، آنرلندن لکھنؤ معاشیات جامعہ عثمانیہ	
۴۵۰-۴۴۲	جناب خواجہ عبدالحمید صاحب لکھنؤ فلسفہ	افلاطون،
	گورنمنٹ کالج لاہور،	
۴۵۵-۴۵۱	،	مرخان مرغ، یا بھلا مانس،
۴۶۰-۴۵۵	"ن ص"	فن سیرت بخاری،
۴۶۴-۴۶۱	"ا-س"	انجیل علیہ،
۴۶۹-۴۶۵	مولانا آسیا زلیٰ نا ماعری لکھنؤ کتب خانہ ریاست چوہدری	مولانا شبلی کے دو غیر مطبوعہ خطوط،
۴۶۴-۴۶۰	"م"	آفتاب،
۴۶۶-۴۶۴	"ع س"	نیم عشرت،
۴۶۶-۴۶۰	"م"	مطبوعات جدیدہ

# شکست

پنجاب کے نامور عالم وکیل و مجاہد سیاسیات مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کی وفات کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا، قصور ضلع لاہور اُن کا وطن تھا اور وہیں وکالت کرتے تھے، اور اچھے نامور وکیل تھے، مولانا کے عالم، دنیات کے فاضل اور انگریزی سے واقف تھے، مولانا ابوالکلام کے اللہ والی تحریک سے اُن کو ایسی دلچسپی تھی کہ اس کے لئے انھوں نے بہت کچھ نثار کیا، اپنے ایک صاحبزادہ کو ایک طرف عالم بنایا اور دوسری طرف کیمبرج کا گریجویٹ، اسی طرح اپنے دوسرے بیٹے کو بھی عربی و انگریزی کی تعلیم دلائی، اور دونوں کو مع اپنی زندگی کے بہت سے سرمایہ کے دعوت و تبلیغ اسلام کے کاموں کی تندر کر دیا، جس کا سلسلہ ایک زمانہ میں ممبئی سے لے کر مدراس تک جال کی طرح پھیلا تھا، خلافت کی تحریک میں کامیاب وکالت کو خیر باد کہہ کر قومی و سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے، اور اخیر تک انجو ہمد پر قائم رہے۔



مرحوم مسلمان اہل حدیث تھے، نہایت دیندار، متواضع، ملنسار، پابند وضع، علامہ ابن تیمیہ اور حنفی ابن قیم کی تصانیف کے بڑے شائق تھے، اور ان ہی کی تحقیقات پر ان کا عمل تھا، خلافت، حجاز اور کانگریس میں پیش از پیش حصہ لیا، اور اس عمر میں بھی جو غائبانہی کے قریب ہو گئی وہ اپنے جذبات کے لحاظ سے ایسے ہی جوان تھے، اور سیاسیات کی عملی تحریکوں سے کنارہ کش تھے،

جو کم کو خاکسار سے گونا گوں تعلقات قلبی تھے، قومیات میں ہمیشہ ساتھ رہا، خالافت میں بہت کچھ ہم آہنگی تھی، سب سے اخیر بات یہ کہ حجاز کے وفد خلافت میں جو ۱۹۲۴ء میں جدہ تک جاسکا تھا، وہ ان کے ساتھ تھے، گو وفد کا صدارت برائے نام میرے نام تھی، مگر اُن کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا



جاتا تھا، جدہ کے نہایت پر خطر متحلوں پر جب جان کا خطرہ بھی تھا وہ برابر ہمت بڑھاتے رہتے تھے، ہنگامہ سدا  
جدہ اور قاہرہ میں ہر جگہ وہ ساتھ تھے، افسوس کہ اس وفد کے قین مجبوروں میں دو مولانا عبداللہ جدہ بدایونی  
اور مولانا عبدالقادر قصوری چلے، اب صرف ایک باقی ہے معلوم نہیں وہ بھی کون کے لئے،

سر محمد یعقوب کی ناگمانی وفات کا سانحہ اخباروں میں آچکا ہے، مرحوم مراد آباد کے رہنے والے تھے،  
ان کے والد ماجد مولوی محمد اسماعیل صاحب وکیل شاہجہان پور نہایت نیک و متین و دیندار بزرگ تھے،  
ندوۃ العلماء کے رکن تھے اور مشائخ اہل تبلیغی تحریک میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ تھے، سر محمد یعقوب نے  
گو انگریزی تعلیم پائی تھی مگر مذہبی ذوق و رشتہ میں پایا تھا اور بڑے خوش قسمت تھے، مراد آباد کی کامیاب  
وکالت سے لیکر کونسل کی صدارت تک اور پھر سرکار نظام کے مشیر اصلاحات کے رتبہ تک انھوں نے  
جو ترقی کی وہ سراسر ان کی خوش قسمتی کا نتیجہ تھی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس عالم میں بھی خوش قسمت  
بنائے، وہ بہت خوش خلق، متواضع، متحمل اور مہتمم اور ضرورت مندوں کی امداد میں کٹا دوست تھے، غفرلہ تعالیٰ  
اردو زبان کے مشہور پرانے رسالہ زمانہ کے ایڈیٹر دیانند رائے نے کسی مہینہ وفات پائی، کالج  
سے نکلنے کیساتھ انھوں نے بریلی میں زمانہ کو جاری رکھا ایک معمولی رسالہ تھا اپنی ادارت میں لیا اور اسکو  
کا پھول لائے، اور اس کو اس حد تک چمکا یا کہ اردو کے اچھے رسالوں میں گنا جانے لگا، بلکہ اس وقت و  
اردو کا سب سے پرانا رسالہ ہے، پریم چند انجمنی کو وہی سب سے پہلے ایجنٹ پر لائے، ان کے علاوہ ادیبیت چھو  
نے والے اور کہنے والے ہندو اور مسلمان نوجوانوں نے ان کے سایہ قلم میں تربیت پائی، اور کہنا چاہیے کہ زمانہ  
صرف ان ہی کے بدولت ہندو مسلمان اہل قلم کا سنگم اب تک رہا، اور اس کو دیکھ کر تسکین ہوتی تھی کہ  
ہندو مسلمانوں کی پرانی تہذیب کے شیدائی ہندو ابھی تک زندہ ہیں،

تہ سے جسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

امید کہ زمانہ آئندہ بھی اپنے بانی کی یادگار میں اسکی بنائی ہوئی روش پر عملدرمیکھتا کہ اس اختلاف آباد

ہند کی اس آدمی میں میانِ زن کا یہ دیا جلتا رہے،

نذر

ہماری زبان کے مصنفوں میں اس وقت سب سے بڑے مصنف غالباً مولوی عبدالرزاق صاحب کا پوری

ہیں، جو البرکۃ اور نظام الملک نام دو مشہور کتابوں کے مصنف ہیں، مولانا شبلی مرحوم نے فرما دیا ان اسلام کا سلسلہ

قائم کیا تھا، ان ہی کے ساتھ ان ہی کے زیرِ مشورہ مولوی عبدالرزاق صاحب نے ذرا سے اسلام کا سلسلہ شروع کیا تھا

جبکہ پہلی کڑی البرکۃ ہو، جو آج سے چالیس سال پہلے لکھی گئی تھی، اور اس وقت بہت دھچپی سے پڑھی گئی تھی،

لیکن اب چالیس سال میں تحقیقات میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے، اور بہت سی نئی کتابیں بھی چھپ گئی ہیں

اس لیے ضرورت تھی کہ مصنف اس پر نظر ثانی کریں، چنانچہ موصوف نے کئی سال کی محنت میں اس کو نظر ثانی کر کے

چھپوایا ہے، اور ۳۰۰ صفحے اور ۵ انے باب بڑھائے ہیں، امید ہے کہ اہل شوق ہمارے سب سے بڑے مصنف

کی اس سب سے پہلی کتاب کی پوری قدر کریں گے، غیر مجلد کی قیمت ۴ روپے اور مجلد کی ۸ روپے، پتہ: مولوی عبدالرزاق

صاحب مہتمم صیغۂ تاریخ، بھوپال،

صیغہ

اکھل عریاں نویسی کا نام ادب لطیف، اور مزدوروں اور غریبوں کے مرثیہ کا نام نیا ادب رکھا گیا ہے، اھمکا جا رہا ہے

کہ یہ نئے انقلاب کی بنیاد بنے گا، اس نئے ادب میں ہر پرانی چیز سے بے ادبی پہلا اصول ہے، اس بنا پر مذہب سے جو ان کا

پرانام سرمایہ رنج ہے، ادبی ناگزیر ہے، چنانچہ ہندو فوجوں کی دیکھا دکھی مسلمان فوجوں نے بھی تفریح طبع کی خاطر اس

بے ادبی سے دل بہلانے کی طرح طرح کی صورتیں ایجاد کی ہیں، کہیں ظرافت کہیں تمغہ کہیں شاعری کہیں سیاست اور کہیں اثر

کے مسائل میں بذلہ سخی کی جاتی ہے، اور عموماً اس شغل میں بے روزگار اہل قلم مصروف ہیں، دلی کے ایک نئے ادب کے رسالہ

ابھی اس بے ادبی کا نیا مظاہرہ کیا گیا جو یہ رسالہ اس دوا کے پوتے کی ادارت میں نکلتا ہے، جو ہندی مرحوم کے بقول مذہب

کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے تھے۔

یہ ہیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

پھر کیا مسلمان اس پر صرف افسوس کیے کر دیا جائیں،

# مقالہ

## مشرقِ نوید کی اور قرآن

از

مولوی محمد اویس صاحب مدنی گرامی رفیق دارالمصنفین

پورا مضمون حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کے افادات کا نتیجہ ہے، فارسطر کے

جغرافیہ کی طرف مخدومی جناب مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہ نے دہنائی فرمائی ہے۔

”مشرقِ نوید یورپ“ جن کے فضل و کمال کا سکہ دلوں پر بٹھا ہوا، اور جن کی تلاش تحقیق کا رعب مانع  
 پر چھایا ہوا ہے، وہ اسلام کی عداوت میں کبھی ایسی عامیانہ اور جاہلانہ روش خدیا کرتے ہیں جس پر سطحی معلومات والا  
 انسان بھی ہنسنے بغیر نہیں رہ سکتا، چنانچہ مشہور جرمن محقق و مشرقِ نوید کی جس کے علمی افلاس کا یہ عالم ہے  
 کہ وہ قرآنِ پاک کو (نمود باللہ) تصنیف محمدی بتلاتا ہے، انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں قرآن مجید پر ریویو  
 کرتے ہوئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھتا ہے کہ عرب سے تو انھیں اتنی تہمت تھی  
 لیکن بیرونِ عرب کا جہان ذکر کرتے ہیں، وہ ان کی بے خبری و لفظ کا اصلی ترجمہ جہات ہے، کی پر وہ درمی  
 ہو جاتی ہے، چنانچہ مصر کی زرخیزی کو جہان کہ بارش تقریباً نہیں دیکھی جاتی ہے، وہ دریائے نیل کے سیلاب کے  
 بجائے بارش پر منحصر رکھتے ہیں،

واقعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب قید خانہ میں تھے، تو مصر کے بادشاہ نے

خواب دیکھا کہ سات موتی گائین ہیں، اور سات دہلی گائین موتی کو گل گئیں، اور سات شاداب بالین ہیں اور سات خشک خشک بالون نے سبز کو کھالیا، شاہ مصر کے خواب کی حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی، جس کو قرآن پاک نے ان الفاظ سے بیان کیا ہے،

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَابًا قَصًا  
أَخَذَ تَعْدَنَ رَدَاكِنِي سُنْبُلًا لَّآ  
قَلِيلًا مِّمَّا أَكُلُونَ نَعْرَیَاتٍ مِّنْ  
بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعَ شَدَا دِیَاكُلْنَ مَّا  
قَدْ مَتَّوْهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مَّا مَخَصُنُوْنَ  
نَعْرَیَاتٍ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٍ ذَٰلِكَ  
یَیْنَاتِ النَّاسِ وَفِیْهِ كِبْرُؤُنِ  
آپ نے فرمایا کہ تم سات سال متواتر بونا  
پھر جو فصل کا تو، اس کو بالون میں رہنے دینا،  
ہاں مگر تھوڑا سا جو تمہارے کام میں آئے  
پھر اس کے بعد سات برس اور ایسے سخت  
آئیں گے جو کہ اس ذخیرہ کو کھا جائیں گے  
جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کیا  
ہے، مگر تھوڑا سا جو تم رکھ چھوڑو گے، پھر  
اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا، جس میں  
(یوسف ۶)

لوگوں کے ٹخنوں پر بارش ہوگی، (یا فریادیں  
ہوگی) اور اس میں شیر بھی پھوڑیں گے،  
اس تعبیر میں ایک لفظ (ینات) ہے، عموماً جس کا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ بارش ہوگی، جس میں مشرق  
کے نزدیک مصر کے سلسلہ میں بارش کا ذکر نوذ بانٹہ صاحب قرآن کی بے خبری کی دلیل ہے،

بمؤخت عقل زحیرت کہ این چہ بولہی است!

بے خبران کو خدا سے عظیم ذخیرہ کے کلام پر تنقید کی جرأت؟ ذیل کی سطروں میں اس تنقید کی اصل  
حقیقت آشکارا کی گئی ہے!

(۱) اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہو کہ (ینات) کے معنی مرث پانی بہنے کے نہیں ہیں، مفسرین کی ایک

جماعت کہتی ہے کہ یہ غیث (یعنی بارش) شے شتق نہیں ہے، بلکہ اس کا مادہ غوث ہے جس کے معنی فریادری کے ہیں یعنی اس قحط کے بعد ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریادری ہوگی، اور قحط دور ہوگا، اس قحط کے خاتمہ کا سبب بارش ہوگی، یا نیل کا سیلاب؟ اس کا یہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے!

روح المعانی میں ہے ۲۷

ای یَصِيبُهُمْ غَيْثٌ اِی مَطَرٌ كَمَا تَال  
بَنِي لَاحِبٍ كِرْپَانِی پونچے گا، جیسا کہ ابن عباس، مجاہد اور جمہور نے کہا ہے اس  
فَهُوَ مِنْ غَاثِ السَّلاَثِ الِیَاسِ، و  
قِيلَ هُوَ مِنَ الْغُوثِ اِی الْفَرَجِ  
یَقَالُ اِغَاثَنَا اللّٰهُ تَعَالٰی اِذَا امْتَدَّنا  
بِمَوْجِ الْمَكَارِ حَتّٰی اَظْلَمْنَا فَهَیْجُوْ  
رباعی وادی،

بیضاوی میں ہے ۲۸

یَمْطُرُ وَفِیْهِ مِنَ الْغَیْثِ  
اَوْ یَاثُوْنَ مِنَ الْقَحْطِ مِنْ  
الْغُوثِ،

تنبلیبی کی جواہر احسان فی تفسیر القرآن میں ہے ۲۹

جَاثِرًا یَكُوْنُ مِنَ الْغَیْثِ وَهُوَ  
قَوْلُ ابْنِ عَبَّاسٍ وَجَمْهُورِ الْمُفَسِّرِیْنَ  
جائز ہے کہ غیث سے ہو، جیسا کہ ابن عباس، اور جمہور مفسرین کا قول ہے، یعنی بارش ہوگی

اسے یسطر و ن وجا نزان یکون اور جائزہ کے کوٹ سے ہو جس کے معنی  
 من اغاثہم اللہ اذا فرج عنہم فریادری کے بن، یعنی اُن کی مشکل دور  
 و مِنہ الغوث و هو الفرج، کی جائے گی،

(۲) اور اگر عام مفسرین کے مسلک کے مطابق بارش ہی کے معنی لئے جائیں، تو بھی فاضلِ مشرق کا  
 یہ دعویٰ کہ مصر میں بارش بالکل نہیں ہوتی ہے، غلط ہے، بارش کم سہی لیکن اس کا مطلقاً انکار خلافِ قیاس  
 یعقوبی کتاب البلدان میں لکھا ہے کہ مصر میں سوا حل پر کسی قدر بارش ہوتی ہے  
 انحصارۃ المصریین جو کہ یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے، کہ وادی نیل بارش سے محروم ہے،  
 ای مارسدن وئی آسفورڈ اسٹم کے جغرافیہ عالم میں ہے  
 ”بارش یہاں بہت ہی کم یعنی قاہرہ میں ایک انچ سالانہ اور اسکندریہ میں جو سمندر سے متصل  
 واقع ہے، ۱۸-۱۹ انچ سالانہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔“

(۳) مصر کے وہ مقامات جہاں فراعنہ مصر کا قیام تھا، ان کا بارانی ہونا تو بہر حال ثابت ہو چکا ہے  
 مصر کے سوا حل اور قاہرہ جو ساحلِ دریائے نیل پر چودہ میل مربع رقبہ میں آباد ہے، وہاں بارش کا ہونا  
 معلوم ہو چکا ہے، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ فراعنہ مصر کا قیام قاہرہ سے قریب ہی منف اور عین شمس  
 میں رہا کرتا تھا، ابو الفدا کی تقویم البلدان میں ہے، کہ عین شمس کو مدینہ فرعون کہا جاتا ہے، اور یہ قاہرہ  
 سے نصف مرحلہ پر واقع ہے،

یا قوت نے بحم البلدان میں منف کو فرعون کا شہر بتلایا ہے، اور یہاں کے آثارِ قدیمہ کے سلسلہ  
 لکھا ہے کہ یہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا مکان تھا، یہیں فرعون کا قیام بھی رہا کرتا تھا، اور یہیں

۱۔ کتاب البلدان ص ۳۴۰ ۲۔ انحصارۃ المصریین ص ۸ ۳۔ جغرافیہ عالم ج ۲ ص ۱۶۲، حیدرآباد،

۴۔ تقویم البلدان ص ۱۱۸

فرعون کا عین شمس تھا، اور اس وقت فسطاط کا جو محل وقوع ہے، وہ عین شمس اور منف کے درمیان ہے، اصل یہ ہو کہ عین شمس ایک میل تھا، لوگ اسکی زیارت کو آتے تھے، پھر یہاں آبادی قائم ہو گئی، اور رفتہ رفتہ اس آبادی نے شمر کی حیثیت اختیار کر لی، ورنہ یہ منف سے الگ نہیں ہوتا۔

خطہ مرقزی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام اور پورے خاندان جس میں ۳۰ مرد اور عورتیں شامل تھیں، فرما اور عین شمس کے درمیان ٹھہرایا تھا، اور یہاں کی زمین بہت شاداب ہے۔

اب بھی عین شمس قاہرہ کے مضافات میں موجود ہے، مسلمان اس کو عون اور یوپی لوگ یلوپی کے نام سے یاد کرتے ہیں، اب یہاں بڑے بڑے مکانات اور شاندار ہوٹل ہیں، قاضی ولی محمد صاحب اپنا سفرنامہ مصر ۱۹۲۳ء میں لکھتے ہیں :-

کہتے ہیں کہ اس جگہ کو حضرت موسیٰ کی اقامت گاہ کا شرف حاصل ہوا تھا، اور فرعون کا محل بھی یہیں کہیں تھا، اور یہیں عزیز مصر کے بنگلہ میں زینا رہتی تھی، اس جگہ کوئی میکل شمس تھا، جہاں آفتاب پرستی ہوتی تھی،

ان تفصیلات سے معلوم یہ ہوا کہ فراعنہ مصر قاہرہ کے قریب ہی آباد تھے، اور وہاں بادشہ ہوتی تھی، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب میں اگر بادشہ کا ذکر تسلیم کیا جائے تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہے،

دہم) محققِ مشرق نے مصر کی ذخیرہ کو دریائے نیل پر منحصر رکھا ہے، لیکن اس پر غور نہیں کیا کہ خود دریائے نیل کا پانی بھی بادشہ کے پانی کا نتیجہ ہے،

یعقوبی کا بیان ہے کہ مصر اور اس کے دیہاتوں کا کام نیل سے چلتا ہے، اور نیل کے پانی میں

بارش کے اس پانی سے زیادتی ہوتی ہے، جو گرمی میں برتا ہے،!

الحضارة المصرية میں ہے :

آب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے، کہ نیل کا فیضان اس بارش کا نتیجہ ہے جو مارچ میں

وسطا فریقہ میں ہوتی ہے، جہاں کہ دریائے نیل کا منبع ہے، اور وہاں سے مصر کی طرف یہ پانی

سرسبزی اور شاواہی لیکڑا آتا ہے۔

عبد حاضر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا مرحوم جن کی پوری زندگی تقریباً مصر ہی میں گزری، وہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں، کہ مصر کو بارش کے پانی سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ مصر کی زندگی بارش سے نہیں بلکہ نیل کے پانی سے ہے، حالانکہ خود نیل کا پانی بارش ہی کا ممنون ہے، نیل کا فیضان اُس کی کمی و حقیقت ان مقامات کی بارش پر منحصر ہے، جہاں سے نیل میں پانی آتا ہے، اس ضمن میں علامہ مرحوم نے قرآن پاک کی یہ آیت نقل فرمائی ہے،

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسُكَّتْ يُنَابِيعُ (زمرا ۲)

فِي الْأَرْضِ، زمین کے سوتوں میں داخل کر دیتا ہے،

اس کے بعد فرمایا کہ وہ چھوٹے دریا جو نیل کے تنابیع ہیں، وہ بارش ہی کے پانی سے ہیں،

یہاں فرعون کا وہ مقولہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جس کو قرآن پاک نے نقل فرمایا ہے،

أَلَيْسَ لِي مُلْكٌ مِّصْرَ هَذِهِ الْأَنْهَارُ اے میری قوم کیا مصر کی سلطنت میری نہیں

تجویج بن تجحی (زفر ۵) جو اور یہ نہر میری پائین میں بہ رہی ہیں،

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی ایک دوسری آیت بھی قابلِ توجہ ہے،

قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی نشانوں میں سے ایک نشانی یہ بھی بتائی ہے کہ ہم



اُن مقامات پر پانی پہنچاتے ہیں، جہاں بارش نہیں ہوتی ہے، یا اگر ہوتی ہے، تو اس قدر کم کہ اس سے پورا نفع نہیں اٹھایا جاسکتا ہے، فرمایا:-

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْاَرْضِ  
الْجُزْءِ مِمَّنْ خَرَجَ بِهِمْ زُرْعَاتُ كُلِّ مُمْتَةٍ  
أَنَّا مُهْمِّمُونَ أَنْفُسَهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُونَ  
(سجدا ۳۴)

کیا انھوں نے اس بات پر نظر نہیں کیا کہ ہم  
خشک افتادہ زمین کی طرف پانی پہنچاتے ہیں  
پھر اس کے ذریعہ کو کھیتی پیدا کرتے ہیں، جس سے  
انکے مراضی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا

مفسرینِ جریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ارضِ جزء کے معنی نقل کئے ہیں،  
قال الجوز التي لا تعطى الا مطراً  
لا يغني عنها شيئاً الا ما يات بها  
من السيل  
جزوہ ہے، جہاں ناکافی بارش ہوتی ہو  
سو اس کے کہ جو پانی سیلاب سے  
پہنچ جائے،

حافظ سیوطی ص ۱۵۱ الحاضریہ میں کہتے ہیں، کہ ایک جماعت کے نزدیک ارضِ جزو سے مراد مصر  
کی سرزمین ہے، حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں، کہ مفسرین عموماً ارضِ جزء کے لئے مثال میں مصر  
کا نام پیش کر دیتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ اس سے مراد محض مصر ہے، بلکہ ارضِ جزو میں  
سے مصر بھی ہے، مصر کا ارضِ جزو میں ہونا قطعی ہے، وہاں کی زمین کی حالت یہ ہے، کہ اگر بارش حسب  
ضرورت ہو تو مکانات منہدم ہو جائیں، اس لئے اللہ تعالیٰ وہاں بارش کے بجائے اس پانی کو بجاتے  
ہیں، جو بلا وجہت میں برساتا ہے!

اسی مفہوم کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے رسالہ عرشہ اور منہاج الدین میں بیان کیا ہے

۱۵ تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۶۶ ۱۶ ج ۲ ص ۴۵ ج ۳ ص ۴۴ ۱۷ ص ۱۳

مناجِ النبیؐ من ابنِ تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں :-

فلا راض الجوز لا مقطر ما یکفیہا کاد	ارض جزین آتانی فی منین برسا ہے، جو اس
مصر لو امطرت مطول القاد لم	کے لئے کافی ہو جیسے مصر کی زمین، کہ اگر
یکفہا فانها ارض ابلیز وان امطرت	معمولی بارش ہو تو وہ اس کو کافی نہیں
مطر کثیراً مثل منطر شہر (اذا ر)	اس نے کہ مصر کی زمین کچھ دوا لی ہے، اگر
خوبت المساکن فکانت من حکمتہ	اگر زیادہ پانی برسے (مثلاً یعنی بارش کہ
الباری ورحمتہ ان امطار رضا	بارش میں ہوتی ہے) تو مسکنات برباد جائیں
بعید لا تشرساق ذالک الماء	پس خدا کی حکمت اور رحمت ہے، کہ ایک
الی ارض مصر فہذا	دور مقام پر پانی برساتا ہے، پھر اس پانی
الاحیۃ یستدل بها علی علو	کو مصر لجا تا ہے، اس آیت سے خدا کے علم
الخالق و قدرته و مشیئته	اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اس

وحکمته، کی حکمت پر استدلال کیا جاسکتا ہے !

کس قدر وحیپ بات ہے کہ جو چیز نوید کی کے نزدیک نوز بائد صاحبِ قرآن کی بے خبری پر دلالت کرتی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اسی سے خدا کے علم، اس کی قدرت، مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال کرتے ہیں،

یہ امر بھی خاص طور سے لائقِ توجہ ہے، کہ یہ قحطِ مصر ہی میں نہ تھا، بلکہ اس کے اثرات دور تک تھے، برادرانِ یوسف علیہ السلام کا غلہ کے لئے مہر آنا خود قرآن میں مذکور ہے، تو رات میں بھی انکا کنعان سے مصر تک غلہ کے لئے آنا مصر ح موجود ہے، نہ صرف کنعان بلکہ اور بہت سی ملکوں کے لوگ قحط

کے لئے معرّے تھے؛

عرب کے جنوب علاقہ میں تک اس کے اثرات تاریخ سے ثابت ہیں، چنانچہ ریزندہ فارسیوں کی گوری  
تاریخی جغرافیہ عرب میں ابن ہشام کے حوالہ سے درج ہے، کہ ملک میں مین سیلاب کے اثر سے ایک جزیرہ گئی  
جس میں ایک عورت کی لاش نظر آئی، اس کے گلے میں موتیوں کے سات گلوبند، ہاتھوں اور پیروں میں  
بازو بند کڑے اور سات سات چھڑے بھی تھے، ہر ہر انگلی میں نگینہ کی بیش قیمت انگوٹھی تھی، اور سر ہانے  
زرد مال سے لہریز ایک منہ و قہ تھا، قبر میں ایک کتبہ بھی ملا، جس میں پہلے فقرہ کے بعد پانچ اشعار درج  
ہیں، اسکی نقل حسب ذیل ہے،

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

توے نام سے اے خدا، اے خدا سے حیر

(۱) اِنَّا تَجِدُنِي ذِي شِقْرٍ بَيْتٍ مَّيْرَانَا اِلٰى يَوْسُفَ  
فَاَبْطَأْ عَلَيْنَا فَبَعَثْتَ لَنَا ذِي

میں تاجرت ذی شقربون میں نے اپنے شاہی دارو  
کو یوسف کے پاس بھیجا، پھر جب واپسی میں دیر ہوئی  
تو میں نے اپنی خواہش کو بھیجا،

(۲) بَعْدَ مَنْ وَرَقٍ لَّمَّا تَبَيَّنَ بَدَنُ مِجْمِينِ  
فَلَمَّا تَجَدَّدَ فَبَعَثْتَ بَدَنُ مِنْ ذَهَبِ

چاندی کی ایک مقدار دیکر کہ اس کے حوض میں  
آنے کی ایک مقدار لائے پھر جب وہ نہ ل سکا تو  
پھر میں نے سونا دے کر بھیجا،

(۳) فَلَمَّا تَجَدَّدَ فَبَعَثْتَ بَدَنُ مِنْ جَوْجِي  
فَلَمَّا تَجَدَّدَ فَاَحْرَمْتُ بِهِ فَطَحِي

جب اس سے بھی نہ ل سکا تو پھر میں نے جوجی  
بھیجا، اور جب اس سے بھی نہ ل سکا، تو میں نے  
ان موتیوں کو پسوا ڈالا،

(۴) فَلَمَّا اَنْتَفَعَ بِهٖ فَاَتَقَفْتُ

وہ کسی کام نہ آکے سو اب میں یہاں سے

فَصْنِ سِجِّحَ فَلْيَرْحَمْنِي ہوتی ہوں، جو کوئی میری خبر پائے، اسے

چاہئے کہ میرے اوپر ترس کھائے،

وَأَيَّةَ آعْرَآ لَا لِبَسْتَ حَلِيًّا مِنْ حَلِيَّتِي اور اگر کوئی عورت میرے ان زیوروں

پر طبع کرے اور انہیں پہننا چاہے تو اس کو (۵)

میری ہی جیسی موت نصیب ہو،

اس کتبہ سے معلوم ہوا کہ یمن تک اس خطا کے اثرات یقینی تھے، تو رات تو مراحتہ اسکی مانگی

کی قائل ہے،

(۵۳) اور سات برس ارزانی کے جو زمین مصر میں تھے، آخر ہوئے، اور گرانی کے سات برس

جیسا کہ یوسف نے کہا تھا، آنے شروع ہوئے، (۵۴) اور سب زمین میں گرانی ہوئی، پرہیز

مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی، (۵۵) پر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی، تو

خلق روٹی کے لئے فرعون کے آگے چلائی، فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسف کے جاؤ،

وہ جو تمہیں کے سوکرہ، (۵۶) اور تمام روئے زمین پر کال تھا، اور یوسف نے ذخیرے کے

کتنے کھول کے مصریوں کے ہاتھ نیچے اور مصر کی زمین کال بہت بڑھا، (۵۷) اور ساری ملک

مصر میں یوسف کے مول لینے آئے، کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔

ان حوالہ جات سے بیرونِ مصر خطا کے اثرات کا جب ثبوت موجود ہے، تو مسئلہ اور واضح ہو

ہو اسلئے کہ اگر مصر کو بارش سے محروم تسلیم بھی کر لیا جائے تو سارا عالم تو بارش سے محروم نہ تھا، اور قرآن

پاک میں (نبات) کے ساتھ (الناس لوگ) کا لفظ ہی، مرث اہل مصر کی تخصیص نہیں ہے،

(۵۸) اس موقع پر نفسِ آیت پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہئے، اور قرآن پر تنقید کے بجائے اس کے

اعجاز و بلاغت اور اسکی صداقت کا اعتراف کرنا چاہئے،

تورات کی منقولہ آیات سے معلوم ہو چکا ہے، کہ جب سامسے عالم میں لوگ بھوک سے پریشان تھے اس وقت مصر میں خوشحالی تھی، آیت یہ ہے:-

”اور سب زمین میں گرائی ہوئی، پرہیز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی۔“

یہ خوشحالی درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب کے طفیل میں تھی جس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا،

تَذَرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ ذَا بَأْسٍ فَاحْصَدُوا      تم سات سال متواتر غلہ بونا پھر جو فصل  
فَلَدُّوْهُا فِي سُنْبِلَةٍ اَوْ اَقْلِيلًا قَمَا      کاٹو اس کو بالون میں رہنے دینا، مگر تھوڑا سا  
تَاْكُلُوْنَ      (یوسفؑ)      جو تمھارے کھانے میں آئے،

حضرت یوسف علیہ السلام کی اس تفسیر کے باعث اہل مصر کو کسی قدر غلہ مل گیا تھا اور دوسرے ملکوں والے چونکہ بالکل بے خبر تھے، اس لئے وہ کوئی انتظام نہ کر سکے،

اب قابلِ غور امر یہ ہے، کہ اس پوری آیت میں (دیناث) فرمایا دسی ہوگی، یا بارش ہوگی، یعمر و شیرہ پھوڑیں گے) کے سوا جتنے مینے ہیں، وہ سب حاضر کے ہیں، (تذرعون، تم غلہ بونا، حصد تعو تم فصل کاٹو، تاکلون، تم کھاؤ، تحصنون = تم جمع کرو گے) گویا ان مخاطب مینوں کا تعلق صرف اہل مصر سے ہے، اور اسی لئے وہ نسبتِ نفع میں رہے، اور ان کے بعد جو مینے ہیں، یعنی (دیناث) اور (یعمر و شیرہ) وہ غائب کے مینے ہیں،

یہ التفات لے کر سبب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش یا فریاد دسی کا تعلق چرکہ دوسرے

۱۵ التفات علم معانی و بیان کی ایک اصطلاح ہے، جس کا مفہوم یہ ہے، کہ ایک ہی ضمن کی گفتگو میں مینوں اور طرزِ خطاب کا تغیر و تبدل، مثلاً ابھی گفتگو میں حاضر کے مینے استعمال ہو رہے تھے، یکایک غائب یا تنکم کے

ملکوں سے بھی تھا، اس لئے یہاں غائب کے معنی استعمال کئے گئے، تاکہ مفہوم میں عموم پیدا ہو، اور نوید کی جیسے تحقیق کو یہ شبہ نہ پیدا ہو، کہ مصر کی زمین تو بارانی نہیں ہے، اس لئے وہاں بارش کیسے ہو سکتی ہے؟ اور کاشت نیز غلہ کے جمع کرنے کا تعلق چونکہ مصر اہلِ مصر سے تھا، اسی لئے وہاں خطاب کے معنی استعمال کئے گئے، (واللہ اعلم بالصواب)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۵) معنی استعمال ہونے لگے، ابھی ماضی کا استعمال تھا کہ مضارع کا استعمال ہونے لگا، وشلِ داک یہ ظلم بلاغت کا ایک اہم شعبہ ہے، اور قرآنِ پاک کے التفات میں بے انتہا نکات ہیں، جو ظلم بلاغت سے دیکھیے رکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہیں،

## تاریخ اسلام کی شاندار مقبول عام کتب

عصمت انونو باتصویر | ترکی کی بیسویں صدی کی بہترین اور شاندار تاریخ موجودہ صدر جمہوریہ ترکیہ کے حالاتِ زندگی پر پیش کی لیکر موجودہ وقت تک نہایت ہی دلکش پیرایہ میں درج ہیں، قیمت مجلد چہرہ بلا محمول،

اترک مصطفیٰ کمال باتصویر | دو جلدوں میں یہ کتاب مصطفیٰ کمال مرحوم کی زندگی کا بے مثال مقبول عام اور قابلِ مطالعہ مرقع حالاتِ پیدائش سے لیکر وفات تک مکمل درج ہیں، قیمت کامل مجلد چہرہ بلا محمول،

ابن سلطان | سلطان ابنِ سعود ملکِ الحجاز کے حالاتِ زندگی پر پیش کی لیکر موجودہ وقت تک دیکھ پیرایہ میں تشریح و کيسا تہ گئے کو ہیں یہ کتاب سلطان کی دینداری اور شرافت کا مرقع ہی مقبول عام اور قابلِ مطالعہ ہی قیمت مجلد چہرہ بلا محمول،

سیرت امام حسین | دو جلدوں میں ایک شہرہ صریح علامہ اور اہلِ قلم کی بے لاگ تصنیف کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے، امام حسین کے حالاتِ زندگی پر پیش کی لیکر شہادت تک نہایت ہی وضاحت کیساتھ قلمبند کرکے ہیں یہ کتاب بھی مقبول عام و قیمت کامل بلا جلد چہرہ بلا محمول،

محمود شوکت پاشا باتصویر | ترکی کا وزیرِ اعظم عربی النسل تھا جس نے اپنی خدماتِ ترکی کے اندر نہایت دیا ننداری اور خیر خواہی کیساتھ تمام دین، حالاتِ پیدائش سے لیکر شہادت تک درج ہیں، قیمت بلا جلد مر بلا محمول،

ملنے کا پتہ ایوانِ بک ڈپوشہر سیالکوٹ

## علوم حدیث پر ہندوستان کی عربی تالیفات

از

جناب ذبیحہ احمد صاحب لکچرار عربی الہ آباد یونیورسٹی

میں نے ادارہ معارف اسلامیہ کے دوسرے اجلاس میں ہندوستان کی عربی تصانیف و تالیفات متعلقہ علوم قرآنیہ پر مضمون پڑھا تھا، جو اس اجلاس کی روداد میں شائع ہو چکا ہے، اس مضمون کی تیسری میں نے عرض کیا تھا کہ ہندوستان میں سندھ، متان اور بلوچستان کو چھوڑ کر کہیں اور مسلم عربوں نے یا کسی عربی بولنے والی قوم نے حکومت نہیں کی، البتہ فارسی بولنے والی قوموں نے یہاں آٹھ نو سو برس تک حکومت کی، اس لئے یہاں کی عربی تصانیف و تالیفات فارسی تصنیفوں کے مقابلہ میں نظر آئیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے پیدا کردہ سرمایہ میں بدیع السخیلی اور ابراہیم کمپانی جاتی ہے جس کی ذمہ داری ہندوستان پر عائد نہیں ہوتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں عربی تصنیف و تالیفات کا سلسلہ شروع ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جس کے کچھ ہی بعد بلاد اسلامیہ کی امام علی جد و جد کا عہد زریں ختم ہو گیا، اور ہندوستان میں عربی علوم عربیہ نیکی و ارتقا کی اس حد کو پہنچ گئے جس سے آگے مزید ترقی نہیں ہو سکتی تھی، اس مضمون میں جملہ علوم اسلامیہ میں سے ہمیں صرف علم حدیث سے سروکار ہے، پانچویں صدی ہجری تک تمام علم حدیث پورے طور پر مدون ہو چکا تھا اور احادیث کے سب مجموعے مرتب ہو چکے تھے، اس کے بعد جو کام باقی رہ گیا وہ یہ تھا کہ ان مجموعات کی شرحیں لکھی جائیں اور ان کی مرویہ حدیثوں کی صحت و عدم صحت پر روایت و درایت بحث کی جائے، نیز یہ کہ ان کو مختلف طریقوں سے مرتب کیا جائے اور ان کے نجوم و اشاریات ترتیب دیے جائیں۔

اس کام میں ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی اپنی بغاوت اور اپنے ماحول کے مطابق حصہ لیا، ان کی جزائی و سیاسی دشواریوں اور دقوں کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس خدمت سے کمبختی عمدہ برآ ہوئے۔ علم حدیث کی بابت سب سے بڑی وقت ہندوستان کو یہ تھی کہ چونکہ وہ عرب سے بہت دور ہے، اس لیے حدیث کے بے شمار راویوں میں تدوین کتب حدیث کے زمانہ تک چند ہندوستانی نام پائے جاتے ہیں، یہ عرب ایران اور خراسان وغیرہ ممالک کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں صحاح ستہ و مسانید عشرہ کی تدوین ہوئی، ان چند راویوں میں سے جن کا تعلق ہندوستان سے رہا ہے، ایک تو ابو حفص بن ریح بن جن کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے، آپ ہندوستان یعنی سندھ تشریف لائے، اور مسند میں انتقال فرمایا، کہا جاتا ہے جو کہ اسلام میں سب سے پہلے آپ نے تصنیف کی، یہ تصنیف فاجوچی ہے، خیال ہوتا ہے کہ وہ حدیث ہی پر ہوگی، اگر یہ روایت صحیح ہے، تو آپ کی تصنیف ہندوستان کی پہلی تصنیف ہے، دوسرا نام ابو معشرندی کا ہے جو سندھ سے عرب جا کر ام موسیٰ کے کوئی ہو گوتے، یہ بھی رواۃ ثقہ میں سے ہیں، ان کے علاوہ چند نام آئے ہیں، اور بس،

مولانا المحترم جناب سید سلیمان صاحب ندوی نے ”ہند میں علم حدیث“ پر مقالات کا ایک سلسلہ لکھا جو معارف کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا، اس سلسلے میں جناب ممدوح نے حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے ہندوستانی محدثین کا تذکرہ بسط کے ساتھ فرمایا ہے، مگر آپ نے ان کی تصانیف و تالیفات کا ذکر نہیں کیا، اس مضمون میں محدثین ہند کی قلمی خدمات کا خاکہ تالیف کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہوں،

راقم الحروف نے عمد غزنوی سے لیکر ۱۳۵۷ھ کے قریب تک کے پچھ پتیا لیس چھاپیں مصنفین مولفین کے اسمائے گرامی جمع کئے ہیں جنہوں نے عربی زبان میں علم حدیث کے متعلق کوئی ذکر کیا ہے تصنیف یا تالیف کی ہے، اس فہرست سے نواب صدیق حسن خان اور مولانا عبدالحکیم فرنگی مکی وغیرہ



اور ان کے معاصرین خارج ہیں، ان مصنفین کی ستر تصانیف ایسی ہیں، جن میں سے کچھ تو چھپ چکی ہیں، اور بقیہ ہاتھ کی لکھی ہوئی مختلف کتب قانون میں موجود ہیں، ان ستر کتابوں میں سے بائیس کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان بائیس کتابوں میں سے

- (۱) چھ کتابیں تو صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث کی شروح و حواشی ہیں (۲) تین تالیفات ایسی ہیں جن میں حدیث کے سابق مجموعوں کو نئی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے (۳) ایک کتاب لغت حدیث پر ہے (۴) ایک کتاب اربعین یعنی رسالہ چل حدیث ہے (۵) دو ایسے رسالے ہیں جن میں ایک خاص جہد و تفسیر و خیال سے حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے (۶) تین ایسی کتابیں ہیں جن میں خاص خاص مسائل و مباحث کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں (۷) ایک تصنیف ایسی ہے جس میں اسرار حدیث کا انکشاف کیا گیا ہے (۸) ایک تالیف اصول حدیث پر ہے (۹) دو رسالے اسماء الرجال کے متعلق ہیں (۱۰) دو رسالے موضوع حدیثوں پر ہیں، کل ۲۲

(۱) ان میں سے ایک لمعات النبی علی مشکوٰۃ المصابیح ہے جو شیخ عبدالحق حنفی بکری نے لکھی ہیں

چھ شرح اور حواشی

محمد دہلوی کی تالیف ایسی ہے، محدث موصوف ہندوستان کے مشہور علماء محدثین میں سے ہیں، آپ نے ۱۲۵۴ھ میں ولادت پائی اور ۱۳۵۲ھ میں رحلت فرمائی، آپ نے ہندوستان میں علم حدیث کی جو نمایاں خدمت کی وہ محتاج بیان نہیں، آپ کی تصانیف کے مالک ہیں، انھوں نے لمعات النبی علی مشکوٰۃ المصابیح کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں، کہ جب میں مشکوٰۃ شریف کی شرح فارسی میں لکھ رہا تھا، تو چند ایسے اہم علمی مسائل و نکات پیش آئے، کہ وہ فارسی زبان میں بیان نہیں کئے جاسکتے تھے، اس لئے میں نے عربی میں شرح لکھنا شروع کی، فارسی شرح نامکمل رہی، اور عربی شرح تکمیل کو پہنچ گئی، اس شرح میں لغوی و نحوی و فنی مسائل اور ایک ہی حدیث کے مختلف طرق روایات کا بجا بیان کئے گئے ہیں، راویوں کے اسماء و القاب صحت کیساتھ منقبط ہوئے ہیں۔

شیخ موصوف نے جو خاص کام کیا ہے، وہ یہ ہے کہ احادیث سے فقہ حنفی کی تطبیق نہایت کامیابی کیساتھ کرتے گئے ہیں، تاہم انہیں خود ہی فرماتے ہیں، کہ اس شرح کو دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ امام الشافعی اصحاب اہل بیت سے ہیں اور ابو حنیفہ اصحابِ ظواہر سے یہ مقدمہ بجاے خود ایک رسالہ ہے جس میں حدیث کے اقسام کا ذکر کیا گیا ہے، اس مقدمہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ یہ مقدمہ مشکوٰۃ شریف کے تمام یا اکثر ہندوستانی ایڈیشنوں کے شروع میں اسحاق کر دیا گیا ہے،

(۲) دوسری قابل ذکر کتاب اس ذیل کی ابو الحسن سدی کا حاشیہ صحیح البخاری ہے، ابو الحسن سدی ٹھٹھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پانے کے بعد مدینہ منورہ کو ہجرت کر گئے، وہاں اپنے محدث کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی، ۳۱۱ھ میں انتقال فرمایا، مصری مصنف مرادی نے اپنی سلک الدرر میں آپ کا اور آپ کی تصانیف کا ذکر کیا ہے، کشف الظنون میں بھی آپ کا نام مذکور ہے، اس حاشیہ میں مشکل الفاظ اور متعلق مسائل کو تشریح اور توضیح کے علاوہ عنوانات ابواب بخاری کی بھی مراحت و وضاحت پائی جاتی ہے،

(۳) تیسری تالیف شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مسوی ہے جو موطاے امام مالک کی شرح ہے، شاہ صاحب کی ذات بابرکات محتاج تعارف نہیں، آپ ہر حدیث کی نہایت عالمانہ تشریح و توضیح کرتے ہیں، مختلف علماء کی تشریحات بیان فرماتے ہیں، ہر باب میں شافعی حنفی و مہذب بتاتے ہیں، اہل حدیث کی تائید میں اگر کوئی آیت قرآنی ہوتی ہو تو اسے بھی نقل کرتے ہیں، شاہ صاحب نے موطا کی شرح فارسی زبان میں لکھی، مگر وہ ایسی جامع نہیں،

(۴) چوتھی کتاب شرح تراجم ابواب البخاری ہے، جس کے مصنف بھی شاہ ولی اللہ صاحب ہیں، اس کتاب میں شاہ صاحب نے ابواب بخاری کی تشریح و توضیح فرمائی ہے، شاہ صاحب نے شروع میں ابواب بخاری سمجھنے کے لئے چند اصول بیان کئے ہیں، مثلاً وہ فرماتے ہیں :

(۱) بعض اوقات امام بخاری ایسی حدیث مرفوعہ کو عنوان قرار دیتے ہیں، جو خود اُن کی شرطوں کے مطابق نہیں ہوتی، مگر اس عنوان کے تحت میں ایسی حدیث بیان کرتے ہیں، جو اُن کے شرائط کے مطابق ہوتی ہے،

(۲) بعض اوقات وہ ایسے مسئلہ کو باب قرار دیتے ہیں، جو کسی نص سے مستخرج ہوتا ہے،

(۳) کبھی وہ علمائے سابق کے مذہب کو باب قرار دیتے ہیں، اور پھر وہ ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جن سے اُن کے مذہب کی تائید ہوتی ہے،

(۴) کبھی وہ مسئلہ مختلف فیہ کو باب قرار دیتے ہیں، اور پھر تمام متضاد حدیثوں کو روایت کرتے ہیں، تاکہ فقیہ اپنی رائے کے مطابق نتیجہ نکال لے،

(۵) کبھی وہ کئی حدیثیں ایک عنوان کے تحت میں بیان کرتے ہیں، اور پھر وہ ایسی حدیث نقل کرتے ہیں جو عنوان متعلقہ کا تتمہ ہوتی ہو، ایسی حدیث کو وہ لفظ باب سے بیان کرتے ہیں، اس کے معنی نہیں ہوتے، کہ وہ ایک مختلف یا جداگانہ باب ہی بلکہ اس موقع پر باب کا استعمال ایسا ہی ہے جیسے کہ متاخرین کی تصانیف و تالیفات میں تبنیہ یا فائدہ کی اصطلاح متعمل ہوتی ہے،

(۶) بعض اوقات وہ لفظ باب قول المحدثین کے بجائے استعمال کرتے ہیں، یعنی وہ لفظ باب استعمال کرتے ہیں اور اس کو قول المحدثین مراد ہوتا ہے،

(۷) کبھی وہ مذہب بعض الناس کو یا ایسی حدیث کو جو اُن کے نزدیک معتبر نہیں، باب قرار دیتے ہیں، اور پھر وہ صحیح حدیث بیان کرتے ہیں، جس سے مذہب بعض الناس یا حدیث ضعیف کی تردید مقصود ہوتی ہے،

(۸) پانچویں کتاب از قسم شروح و حواشی محلی ہے، جو غوطا کی شرح ہے، اور سلام اللہ محمد رامپوری کی تصنیف ہے، یہ سلام اللہ دہلی کے مشہور محدث شیخ عبدالحق صحتی کی اولاد میں سے ہیں

آپؐ ۱۲۹ھ میں انتقال فرمایا۔

اس شرح کے شروع میں ایک مقدمہ ہی جس میں اصطلاحات حدیث کا بیان ہوا اور امام کا ذکر ہوا، اور موطا پر تنقید ہے، وجہ تالیف یہ بتاتے ہیں، کہ زر قانی کی شرح موطا ہندوستان میں تندرل نہیں ہوئی، اور یہاں کسی ہندوستانی نے اسکی شرح نہیں لکھی، اس لئے میں نے اس شرح کا تہیہ کیا، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی ستویں جوتیس برس پہلے لکھی جا چکی تھی، محلی کے مصنف کی نگاہ سے نہیں گذری تھی، محلی ستویں سے زیادہ جامع ہے، مگر ستویں کی ترتیب محلی کی ترتیب سے بہتر ہے،

(۲) چھٹی کتاب المواعظ اللطیفہ ہے جو محمد عابد سندھی المتوفی ۱۲۵۴ھ کی شرح ہے مسند امام ابو حنیفہؒ پر محمد عابد سندھی سندھ میں پیدا ہوئے، بیرون ہند زبیدین جا کر تعلیم مکمل کی، پھر صنعا گئے، وہاں کے وزیر نے اپنی لڑکی سے آپ کا نکاح کر دیا، پھر وہ امیر صنعا کی طرف سے سفیر مقرر ہو کر گئے، کچھ مدت کے بعد سندھ واپس آئے، لیکن دیار حبیب کی کشش پھر مدینہ منورہ لے گئی، وہاں آپ رئیس العلماء مقرر ہوئے، آپ نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں جن میں سے ایک یہ شرح ہے، مسند ابو حنیفہ کی کئی عالمانہ شرحیں لکھی ہیں، جن میں سے ملا علی قاری کی شرح مشہور ہے، ہمارے شارح نے سابقہ شروع سے فائدہ اٹھایا ہے، اور احادیث مسند کی تائید میں دیگر طرق کی حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے،

۱۔ ان میں ایک تو شارح الانوار النبویہ میں صحاح الاخبار المصطفویہ

جو حسن صفائی لاہوری کی تالیف ہے، آپ کے مورث اعلیٰ صفان پاشا خان

۲۔ دوسری ذیل کی مبنی ایسی تالیفات ہیں سابقہ جو عالمات اور کوئی ترتیب کو مشرب کی گئی ہو

(ماوراء النہر) کے رہنے والے تھے، آپ کے آخری بزرگ لاہور میں اکرمیوں ہوئے، میں ۱۱۸۱ھ میں آپ کی ولادت ہوئی

اپنی والد ماجد سے جو فقیہ کامل اور محدث کامل تھے، تعلیم حاصل کی، پھر بغداد تشریف لے گئے، دو برس کے قادم کے بعد ۱۱۸۱ھ میں سلطان آتش دہلی کے دربار میں خلیفہ عباسی کی طرف سے سفیر مقرر ہو کر

سات برس قیام کرنے کے بعد پھر بخدا واپس گئے، اور پھر دوبارہ سیفر مقرر ہو کر آئے، ۱۲۵۲ھ میں انتقال لیا، حسن صفائی محدث بھی تھے، اور ماہر لغت بھی، بلکہ ماہر لغت ہونے کی حیثیت سے آپ زیادہ مشہور ہیں، چنانچہ آپ کی عباب علم لغت پر بڑی اہم تصنیف خیال کی جاتی ہے، صفائی کی نسبت سے کئی عالم مشہور ہیں جن میں سے دو زیادہ اہم ہیں، ایک تو یہ اور دوسرے محمد بن اسحاق بن جعفر المتوفی ۲۸۲ھ، یہ بڑے بلند پایہ محدث تھے، محدثین اور اصحاب رجال ان کو ثقہ مانتے ہیں، ان سے امام مسلم امام ترمذی نے بھی روایت کی ہے، حدیث کے سلسلہ میں جہان کین بحر صفائی کا ذکر آتا ہے، وہاں یہ محمد بن اسحاق مراد ہوتے ہیں، اور لغت کے متعلق محض صفائی سے ہمارے صفائی مقصود ہوتے ہیں، مشارق الانوار میں صحیحین کی احادیث کو ابتدائی الفاظ کے اعتبار سے مرتب کیا ہے، گویا یہ کتاب صحیحین کا انڈکس ہی، یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب میں کئی کئی تفصیل ہیں، چند باب کے عنوانات مثال کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں،

باب اول، وہ احادیث جو اسم موصول و ضمیر استغنامی من سے شروع ہوتی ہیں،

باب دوم، وہ احادیث جو ان سے شروع ہوتی ہیں، اس باب میں دس تفصیل ہیں، یعنی بجا

مختلف ضمائر جن کے ساتھ ان ملتی ہیں، مثلاً اللہ، انھما، انتا وغیرہ

باب سوم، وہ احادیث جو لائے نفی سے شروع ہوتی ہیں، وغیرہ وغیرہ،

اس کتاب کی کئی شریحیں لکھی جا چکی ہیں،

۴۔ دوسری تالیف اس ذیل کی کثیر العمال فی سنن الاقوال والافعال جو علی متقی برہان

پوری کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے، آپ ۱۲۵۲ھ میں مقام برہان پور پیدا ہوئے، تعلیم سے فراغت اُ

چشتیہ خاندان میں بیعت کے بعد حجاز شریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی، آپ بڑے پایہ کے عالم

باہل اور محدث باکمال تھے، آپ کی کئی تصانیف ہیں،

سب سے پہلے ابو الحسن دین بن معاویہ نے صحاح ستہ کو ایک جگہ جمع کر کے ابواب پر مرتب کیا، ان کے

بعد ابن الاثیر جزری نے اس کتاب کی از سر نو تدوین و تہذیب اور تصحیح و تبویب کر کے جامع الاصول نام

رکھا، پھر سیوطی نے کتب ستہ اور مسانیدہ عشرہ کو ایک کتاب میں جمع کر کے مجمع ابجوامع کے نام سے موسوم کیا،

پھر اس ضخیم تالیف کی تلخیص بھی کی جو جامع صغیر کے نام سے مشہور ہے، اس میں صرف احادیث و شایعہ

ہندی محدث نے اپنی تالیف کنز العمال میں اسی مجمع ابجوامع کو فقہی ابواب پر از سر نو مرتب کیا، سب سے

پہلے آپ نے جامع الصغیر کی احادیث کو مرتب کیا، اور منہج العمال فی سنن الاقوال نام رکھا، پھر مجمع ابجوامع

کی بقیہ احادیث کو تکریم کر کے جمع کیا، اور اس کا نام اکمال منہج العمال رکھا، پھر دونوں کو ایک جگہ جمع کر کے

غایات العمال کے نام سے موسوم کیا، پھر مجمع ابجوامع کی احادیث فعلیہ کی تبویب و ترتیب کی، اور اس کا

نام مستدرک الاقوال رکھا، پھر تینوں تالیفوں کو جمع کر کے کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال کے نام

سے موسوم کیا، یہ کتاب حیدرآباد سے آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، کتاب کی فرست بھی نہایت

مفید اور باقاعدہ ہے، اس کتاب کی اہمیت محتاج بیان نہیں، فاضل مصنف کے استاد ابو الحسن بکری

فرمایا کرتے تھے، کہ جلال الدین سیوطی نے مجمع ابجوامع تصنیف کر کے عالم اسلامی پر احسان کیا، اور علی

متقی نے اسے فقہی ترتیب پر ردون کر کے سیوطی پر احسان کیا،

۳۔ تیسری کتاب از قلم مجموعہ احادیث مسند امام اعظم ہے، جسے محمد عابد سندھی مقدم الذکر

نے مرتب کیا، یہ امام اعظم سے پندرہ مسانید مروی ہیں جن میں سوا ایک بروایت صدر الدین موسیٰ

خضکی المتوفی ۱۲۵۲ھ ہے، محدث سندھی نے اسی مسند کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے،

۴۔ تیسرے ذیل کی یہی مفت حدیث (۱) یہ مجمع بھار الانوار فی غرائب السنن و لطائف الاخبار ہے جو

مشہور گجراتی محدث شیخ محمد بن طاہر بنی کی تصنیف لطیف ہے آج

گجرات کے رہنے والے اور قبیلہ نواست سے تعلق رکھتے تھے، ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم

ایک کتاب

ہندوستان میں حاصل کر کے مجاز تشریف لے گئے، اور وہاں حضرت علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ تلمذ و ارادت میں داخل ہو گئے، پھر ہندوستان واپس تشریف لا کر بورون کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اور اسی کا ذمہ کے سرانجام دینے میں شریعت شہادت نوش فرمایا، مجمع بحار الانوار کو تلمیذ شید نے اپنے مرشد کامل علی متقی کے نام گرامی سے منون کیا ہے، یہ کتاب چھپ چکی ہے، کافی بڑی قیطع کے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، یہ تصنیف قرآن و حدیث کا جامع لغت ہے، الفاظ کی ترتیب مادہ کے حروف پر ہے ایک مادہ کے جس قدر حروف قرآن و حدیث میں آئے ہیں، اُن سب کو ایک جگہ بیان کرتے ہیں، اور جن احادیث میں وہ الفاظ آئے ہیں، اُن کو بھی نقل کرتے ہیں، اس سے پہلے غرائبِ قرآن حدیث پر کی کتاب لکھی جا چکی ہیں، لیکن میری ناقص رائے میں یہ سب بہتر و جامع تر ہے،

۴۔ جو تھو ذیل (رسالہ اربعین) ایک حدیث میں ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جو شخص میرے امتیون کے لئے چالیس حدیثیں جمع کر لیا، قیامت کے دن اس کا حشر

علمائے دین میں ہوگا، اور میں اُسکی شفاعت کروں گا، اس سعادت کے حصول کے لئے بہت سے علماء نے چالیس حدیثوں کے مجموعے لکھے، جو چھل حدیث یا چھل رسالوں کے نام سے موسوم ہیں، ہندوستان کے تالیفات کردہ چھل رسالوں میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دو صحیح احادیث ہیں، جو جناب رسالت مآب صلعم روحی فداء سے شاہ صاحب کے استاد ابو طاہر ہمدانی تک اور ان سے شاہ صاحب تک پہنچی ہیں، شاہ صاحب نے لیکر آنحضرت صلعم تک جسد رسانا دین وہ سب بیان کئے گئے ہیں،

۵۔ ایسے دو رسالے جن میں (۱) ان میں تو ایک الدرائین فی بشرات البنی الامین جو اس کے مرتب صاحب ایک خاص حدیث نقطہ خیال کو حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے، بھی شاہ ولی اللہ صاحب ہیں، یہ بھی مندرجہ بالا رسالہ اربعین کی طرح چالیس حدیثوں کا مجموعہ ہے، اس میں وہ حدیثیں ہیں جو جناب میں براورد است حضرت رسالت مآب صلعم کی جانب

سے سنی گئیں، ان حدیثوں کو شاہ صاحب نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے، ایک وہ جنہیں خود شاہ صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، دوسری وہ حدیثیں جو اونھوں نے ایک واسطے سے سنیں، تیسری وہ حدیثیں جو شاہ صاحب کو ایک سے زیادہ واسطے سے پہنچیں، چہد حدیثیں نمونہ کے طور پر ذیل میں درج ہیں، ایک حدیث ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب میں کبجے واقع گجرات کی مسجد میں مراقبہ کر رہا تھا، تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو دیکھا، کہ مجھ پر ایک چادر ڈال دی جس سے تمام مذہبی اسرار و کلمات مجھ پر منکشف ہو گئے،

دوسری حدیث ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں، کہ میں نے خواب میں شیعہ فرقہ کی بابت دریافت کیا، تو فرمایا کہ وہ باطل ہے

تیسری حدیث ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں، کہ میں نے دریافت کیا کہ فقہ کے چاروں مذہبوں میں کونسا بہتر ہے، آپ نے فرمایا کہ چاروں برابر ہیں،

دوسری قسم کی احادیث جو شاہ صاحب نے ایک یا دو واسطے سے سنیں وہ ہیں، جو ان کے والد ماجد اُستاد شفیق نے اُن سے بیان کیں،

ان حدیثوں کی نوعیت مروی احادیث سے مختلف ہے، ان کو اس معنی میں تو حدیث کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی گئیں، مگر چونکہ وہ خواب میں مسطور ہوئی ہیں، اس لئے وہ دوسروں کے لئے حجت نہیں ہیں

(۳) دوسری کتاب النوادر میں احادیث جو یہ بھی شاہ صاحب ہی کی تصنیف ایتق ہے اور درالمتین

مختلف ہے یہ اس قسم کی کتاب نوادر ہے، جس طرح کہ ادب میں تاریخ میں یا دیگر علوم میں کتب نوادر ہوا کرتی ہیں، شاہ صاحب نے اس رسالہ میں حدیث کے متعلق نوادر و غریب باتیں جمع کی ہیں، مثال کے طور پر چند نمونے پیش ہیں



علوم حدیث پر ہندوستان کی عربی تالیفات

۱۔ ایک حدیث مندرجہ ذیل ہے، یعنی ایسی حدیث جسے جن نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے خداوند تعالیٰ نے سنا، اور خداوند تعالیٰ سے پھر رسول مقبول نے سنا، پوری حدیث صحاح اسنادیوں میں ہے، عن النبی عن اللہ عن الجن عن النبی قل ادھی الی اللہ استمع نغم من الجن فقالوا اننا سمعنا قرآنا عجبا یهدی الی الرشید یہاں پہلے راوی جن نے قرآن رسول سے سنا، پس قرآن حدیث کا متن ہے، اور جن پہلا راوی دوسرا راوی خدا جس نے یہ قول جن رسول پر اتارا، اور پھر اس روایت خدا کا ناقص خود رسول پر لکھا اس کا سلسلہ اسناد عن النبی عن اللہ عن الجن عن النبی ہوا،

۲۔ ایک حدیث السلسلہ بالا ولیہ ہے یعنی وہ حدیث جس کو ہر راوی نے مروی عنہ سے روایت کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے کہ یہ پہلی حدیث ہے، جو میں نے سنی، اور وہ یہ ہے، حدیث ثنی السید عمرؓ ہوا اول حدیث سمعتہ منہ قال حدیث ثنی و ہوا اول حدیث سمعتہ..... تاالراحمون و جمہو الرحمن تبارک و تعالیٰ ادھوامن فی الارض یرحمکم من فی السماء،

۳۔ الحدیث المسلسلہ بالفقہاء یعنی ایسی حدیث جس کے تمام راوی فقیہ ہیں،

۴۔ ایک وہ حدیث جس کے تمام راوی صوفی ہیں،

۵۔ ایک وہ حدیث جس کے تمام راویوں کا نام احمد ہے،

۶۔ ایک وہ حدیث جس کے تمام راویوں کے نام حرف میں سے شروع ہوتے ہیں،

۷۔ تین ایسی تالیفیں جن میں  
۱۔ ان میں سے ایک تلخیص البیان فی علامات مہدی آخر الزمان، جو  
فاضل غفر صاحب مسائل  
کے متعلق مدثرین جمع کی گئی ہیں  
شیخ علی متقی برہان پوری کی تالیف ہے، جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، جیسا کہ اس کے

نام سے ظاہر ہے، اس میں حضرت مہدی موعود کے متعلق مدثرین جمع کی گئی ہیں، حافظ بلال الدین سیوطی نے اس موضوع پر ایک کتاب العرف اللوردی لکھی تھی، ہمارے فاضل ہندی نے سیوطی کی اس تالیف

سے یہاں راوی کا نام میری یاد سے جاتا رہا ہے، منہ

کی از سر نو تہذیب و تدوین کر کے دوسرا جامہ پہنا دیا ہے، کچھ نیا مواد بھی بڑھا یا ہے، یہ کتاب اس ماحول میں لکھی گئی تھی، جب ہندوستان میں محمد جو نپوری مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کر چکے تھے اور ہندوستان و عرب میں یہ مسئلہ محرکہ الاراء بنا ہوا تھا، فاضل مولف مقدمہ کتاب میں فرماتے ہیں، کہ محمد جو نپوری یقیناً مہدی نہ تھے، وہ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور ولی ہو سکتے ہیں، مگر بعض اوقات ولی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، معصوم صرف پیغمبر ہوتے ہیں، یہ کتاب مندرجہ ذیل تیرہ فصلوں پر منقسم ہے (۱) معجزات حضرت مہدی (۲) آپ کا سلسلہ نسب، (۳) شکل و صورت (۴) کن حالات میں آپ کا ظہور ہوگا (۵) علامات (۶) کس طرح اُن کی اطاعت و بیعت کی جائیگی (۷) ان کے انصار (۸) فتوحات (۹) حضرت عیسیٰ سے ملاقات (۱۰) مدت قیام (۱۱) موت (۱۲) اُن لوگوں کا ذکر جنہوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا (۱۳) علماء مکہ و مدینہ کا فتویٰ،

(۲) اسی ذیل کی دوسری کتاب ماثبت بالسُنہ فی ایام السنہ جو شیخ عبدالحق حقی محدث دہلوی کی تصنیف ہے، اس میں سال کے بارہ مہینوں کے بار میں جو احادیث مروی ہیں، اُن کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے، ماہ محرم سے ابتدا ہوتی ہے، ماہ محرم خاھکر عاشورہ محرم کے بارے میں جو صحیح حدیثیں مروی ہیں، ان کو نقل کیا ہے، اور محرم کے سلسلہ میں جو رسوم اور توہمات عام طور سے اُس زمانہ میں مروج تھے، ان کی تردید کی ہے، مثلاً یہ خیال کہ عاشورے کے روز مرمہ لگانے سے آنکھیں نہیں دکھتیں، یا عاشورے کے دن غسل کرنے والا کبھی بیمار نہیں ہوتا، الخ اور باطل ہے، اس کے بعد اُن تمام احادیث پر جو شہادت امام حسین علیہ السلام کے متعلق ہیں، تنقید و تبصرہ ہے، آخر میں حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت دبیر بن عوامؓ کے باہمی تعلقات کا ذکر ہے، ماہ صفر کے ذیل میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے، کہ صفر نامبارک مہینہ ہے، یہ بیخ انتہائی کی بحث میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر سا حال ہے،

اس کے بعد احادیث متعلقہ رجب پر تنقید ہے، اور لیلة الرغائب پر تبصرہ ہے، اسی طرح شعبان

دفعان، شوال اور ذی الحجہ کے سلسلہ میں روزہ، تراویح، عید الفطر و عید الفصحی اور حج کے متعلق احادیث بیان کی ہیں،

۲۔ اس ذیل کی تیسری کتاب تحقیق الانشاؤں کی تعظیم البشارہ ہے یہ بھی حضرت شیخ عبدالحی کی تصنیف ہے، اس میں ان تمام حدیثوں کو جمع کیا ہے، جن میں کسی نہ کسی بزرگ کو جنت کی بشارت دی گئی ہو،

۳۔ اسرار حدیث پر ایک کتاب | (۱) یہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف لطیف حجۃ اللہ الباقیہ ہے، شاہ صاحب کا مقام نہ صرف علماء ہند کی صفِ اول میں ہی بلکہ اپنے عہد کے تمام بلادِ اسلامیہ کے عربی مصنفین و مولفین میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، نواب صدیقی حسن مرحوم نے بالکل سچ کہا جو کہ اگر شاہ صاحب قدما کے دور میں پیدا ہوتے تو امامِ وقت سمجھے جاتے، اب بھی وہ غزالی ہند مانے جاتے ہیں آپ کی تصانیف بہت ہیں، ان سب میں بہتر غالباً حجۃ اللہ الباقیہ ہے، اس کتابِ مستطاب میں شاہ صاحب رحمہ اللہ احکامِ دین کی نہایت معقول و دلپذیر توجیہ فرمائی ہے، ان کی یہ کتاب امام غزالی کی شہرہ آفاق ایثار العلوم کو بہتر سمجھی جاتی ہے،

آغازِ کتاب میں فرماتے ہیں کہ علومِ اسلامیہ کی بنیاد علمِ احادیث پر ہے، اور علمِ حدیث کی کئی شاخیں ہیں جن میں علم الاسرار یعنی وہ علم جو احادیث کے اسرار و دقائق واضح کرتا ہے، بہت اہم ہے، جس کو یہ علم حاصل ہو وہ حق و باطل میں پوری طور پر تیز کر تا ہو، اور اس کا مال اس شخص کی طرح نہیں ہے جسے طیب سب کھانے کو بتائے، اور وہ مشابہت کی بنا پر بجائے سیب کے قفل کھالے،

آپ کا دعویٰ ہے کہ ہر ہندو ہی مقلد اور اصولِ افادیت پر مبنی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب کوئی حدیث صحیح و مستند ثابت ہو جائے تو اس کی تعمیل اس پر منحصر نہ ہونی چاہئے، کہ اسکی حکمت و مصلحت سمجھ میں آجائے، کیونکہ ہر حکم کی مصلحت و حکمت ہر شخص کے ذہن میں نہیں آسکتی، لہذا بجائے اپنے دماغ پر اعتماد کرنے کے یہ زیادہ بہتر ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر اعتماد کیا جائے،

شاہ صاحب عالم مادی و عالم روحانی کے علاوہ ایک اور عالم کے قائل ہیں، جسے وہ عالم مثال کہتے ہیں، شاہ صاحب کا یہ عالم مثال افلاطون کے عالم مثل سے مختلف ہے، اس نظریہ کے مطابق ہر وہ چیز جو اس دنیا میں موجود ہے، عالم مثال میں بھی اپنا وجود رکھتی ہے، شاہ صاحب نے اس نظریہ کی تائید میں کئی حدیثوں کو پیش کیا ہے، اور ایسی حدیثوں کو جن کا مفہوم بظاہر سچے میں نہیں آتا، اس نظریہ کے ذریعہ سے سمجھا جاتا ہے مثلاً ایک حدیث شریف ہے کہ بقرہ اور عمران کی سورتیں قیامت کے روز حساب کی شکل میں ظاہر ہوں گی، ایک اور حدیث ہے کہ ہر وزجر انسان کے اعمال سامنے آئیں گے، سب پہلے نمازین سامنے آئیں گے، اور پھر زکوٰۃ اور روزے، ایکے بعد دیگرے، ایک اور حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہارے گھروں میں فتنے برپا ہوں دیکھتا ہوں، اس قسم کی کئی حدیثیں نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ان حدیثوں کی تفسیر کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کے لفظی معنی مراد لئے جائیں تب تو عالم مثال کا وجود ماننا پڑتا ہے، دوسری صورت یہ کہ یہ واقعات حقیقت میں یوں نہیں ہوتے، بلکہ اس طرح دکھلائی دیتے ہیں تیسری صورت یہ کہ ان کی تاویل کی جائے، اور ان کے مجازی معنی مراد لئے جائیں، شاہ صاحب آخری صورت خلاف حق سمجھتے ہیں، شاہ صاحب نے عالم مثال کو اس قدر وسعت دی ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے جبریل سے ملاقات کرنے یا فرشتوں کا قبرین جا کر مردوں کو سوال و جواب کرنے وغیرہ کی قسم کے واقعات کو عالم مثال کے واقعات قرار دیا ہے، مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر شاہ صاحب کی اس تشریح و توضیح حدیث کو دیگر علماء قبول کر لیں تو پھر مذہب اور فلسفہ میں بہت ہی کم فرق رہ جاتا ہے،

لیکن اس بیچ میرزا بیچ مراد ان کو نہایت ادب کے ساتھ شاہ صاحب کے نظریہ عالم مثال پر اعتراض ہے وہ یہ کہ شاہ صاحب کو بعض احادیث کے خلاف عقل مفہوم کی تشریح و توضیح کرنے کے لئے ایک ایسے عالم کا وجود ماننا پڑتا ہے جس کی ہمارے روزمرہ کے واقعات اور تجربات سے تائید نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ عالم مثال کا وجود ثابت کرنے کے لئے شاہ صاحب نے جو دلیل دی ہے، اس میں دور لازم آتا ہے، وہ عالم مثال

کے وجود کو مانتے ہیں، اس لئے کہ بعض احادیث کے مضمون ایسے ہیں، کہ عالم مثال کے نظریہ سے ان کی تشریح و توضیح ہو سکتی ہو اور ان خلاف عقل حدیثوں کے مضمون یوں صحیح ہیں کہ عالم مادی و روحانی کے علاوہ ایک عالم مثال اور ہے، علاوہ برین مثال کے طور پر یہ حدیث کہ قیامت کے روز بقرا اور عمران کی سورتیں ابر کی شکل میں نمودار ہوں گی، عالم مثال کے نظریہ سے کیونکر سمجھائی جاسکتی ہے، میری رائے ناقص ہیں ان حدیثوں کے مجازی معنی مراد لینے میں کوئی قباحت نہیں،

اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں ان اصول عامہ کا بیان ہے کہ جن سے مذہبی اُدام و نو اہی کی توجیہ کی جاسکتی ہے، اس حصہ میں سات بحث ہیں اور ہر بحث میں کئی کئی ابواب، دوسرے حصہ میں تمام مذہبی احکام کی حکمت و مصلحت بتائی گئی ہے،

۸۔ اصول حدیث پر ایک کتاب (۱) الفیض النبوی فی اصول الحدیث و فہماریس البخاری، محمد عارف بیٹنی یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار فصلوں پر مشتمل ہے، مقدمہ میں اصطلاحات حدیث کا بیان ہے، چار فصلوں میں اصول حدیث سے بحث کی گئی ہے، آخرین امام بخاری اور ان کی تصنیف پر تنقید و تبصرہ ہے،

۹۔ اسماء الرجال پر دو رسالے (۱) ان میں سے ایک دُر السحابہ فی بیان مواضع و فیات الصحابہ مؤلف حسن صفائی ہے، یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، اس میں تقریباً آٹھ سو صحابہ کے مقامات رحلت کا ذکر ہے، اسماء صحابہ حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہیں،

(۲) دوسرا رسالہ کتاب اسماء رجال مشکوٰۃ المصابیح مؤلف شیخ عبدالحق حقی محدث دہلوی کی تالیف ہے، اس میں مشکوٰۃ شریف کی تمام احادیث کے راویوں کا مختصر تذکرہ ہے، سب سے پہلے خلفائے راشدین کا تذکرہ ہے، پھر آل رسول کا اس کے بعد دیگر صحابہ کا،

۱۰۔ دو رسالے احادیث مضمومہ پر (۱) ان میں سے ایک حسن صفائی مقدم الذکر کا رسالہ فی الموضوعات من

(۲) دوسرا محمد طاہر پٹنی کا رسالہ تذکرۃ الموضوعات ہے، اس رسالہ کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں آپ تنہا فرماتے ہیں، کہ اگر کوئی مصنف کسی حدیث کو موضوع بتائے تو جب تک دوسرے ذرائع سے اُس کی تصدیق و تائید نہ ہو جائے، اس حدیث کو موضوع نہ سمجھا جائے اس کے ثبوت میں فرماتے ہیں کہ ابن جوزی کی کتاب موضوعات میں ضعف حدیثوں کا کیا ذکر، بہت سی حسن حدیثیں موجود ہیں، آگے چل کر ان احادیث پر جن کو کسی نہ کسی عالم نے موضوع قرار دیا ہے تنقید کی ہے، یہ ایک دلچسپ رسالہ ہے اور چھپ چکا ہے۔

### خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۲ء میں مدراس میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دیئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانوں نے ان کو بے حد پسند کیا، یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، قیمت :- عمر، ضخامت ۱۹۴ صفحے

### حیاتِ امام مالک

امام مالکؒ کی سوانح عمری، علم حدیث کی محفتر تاریخ، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی پہلی کتاب، مولانا امام مالکؒ پر تبصرہ، طبع سوم قیمت :- عمر، ضخامت :- ۱۰۶ صفحے،

مینجر دارالافتاء

# ابن خلدون کے معاشی خیالات

از

جناب محمد عبدالقادر صاحب بی ایس سی آئرز لندن کالج اور معاشیات جامعہ عثمانیہ

(یہ مقالہ بزم دینیات جامعہ عثمانیہ کی موتمر اسلامیہ میں ۲۹ شعبان ۱۳۶۱ھ کو پڑھا گیا)

پچھلے ڈیڑھ سو سال میں ابن خلدون پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے اور یورپی باؤنٹیں اسکے متعلق کئی کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں، لیکن محققین نے اپنی توجہ زیادہ تر مصنف کے فلسفہ تاریخ اور عمرانی نظریوں کی طرف مبذول کی ہے، چند مستشرقین نے اس کے سیاسی خیالات پر بھی بحث کی ہے جو چیز ہمارے لئے تعجب خیز ہے وہ یہ ہے، کہ انھوں نے ابن خلدون کے معاشی خیالات پر بہت ہی کم روشنی ڈالی ہے، میں نے مقدمہ ابن خلدون میں جو مواد کہ بکھرا ہوا پایا جاتا ہے اس سے استفادہ کرتے ہوئے مصنف کے معاشی خیالات کو بیان ایک منظم پیرایہ میں پیش کر نیکی کوشش کی ہے۔

ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ اس مفکر نے بشیراً یہ خیالات کا اظہار کیا ہے، جو کہ زمانہ

مابعد سے متعلق ہیں، نیز اس نے اپنی کتاب میں نظری اور عملی معاشیات کے بہت سارے اہم حصوں پر روشنی ڈالی ہے، البتہ اس کے مباحث کی وہی ترتیب نہیں ہے، جو کہ آج کل کی معاشی کتابوں میں پائی جاتی ہے، ہیں اس سے بھی انکار نہیں کہ اس نے جن مسائل پر بحث کی ہے، وہ معاشیات کے علم کے موضوعات پر حاوی نہیں ہیں، اس میں کلام نہیں کہ ہمارے مفکر نے زیادہ تر عنوانوں کی تاریخ کے مطالعہ

سے اپنے نظریوں کو اخذ کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہیں اس کے یہاں بہت سی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو کلیات کی حیثیت رکھتی ہیں، ایک اور چیز جو ہماری توجہ کی محتاج ہے، وہ یہ ہے کہ ابن خلدون اگر ایک طرف قرونِ وسطیٰ کی مدرسیت سے محفوظ رہا، تو دوسری طرف اپنے پیشروں کی مذہبی تنگ نظریوں سے آزاد رہا،

جدید تحقیق نے تاریخ کی معاشی تعبیر کے یورپین بائون پر کافی روشنی ڈالی ہے لیکن اس سلسلہ میں شاید بہت کم لوگ ابن خلدون کی اہمیت سے واقف ہیں، اس کا اصل کمال یہ ہے کہ اس نے افلاطونؑ اور ارسطو کے خیالات کو مانتے ہوئے انسانی ترقی پر مادی ماحول کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا، ابن خلدون سماجی زندگی کی نفسی بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے، اور ارسطو کی مشہور کماؤت کو دہراتا ہے، کہ ”انسان ایک سماجی حیوان ہے“ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس امر پر بھی زور دیتا ہے، کہ سماجی زندگی کا آغاز دراصل معاشی اقتیاجات کے احساس اور ان کی تکمیل کے سلسلہ میں ہوتا ہے، یعنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد زیادہ موثر ہوتی ہے،

ابن خلدون سماج کی نفسی اور معاشی بنیادوں کا محض ذکر کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا، سماجی ترقی پر مادی ماحول کے اثرات اس نے تفصیل کے ساتھ واضح کئے ہیں، چنانچہ اس نے یہ ظاہر کیا ہے، کہ انسانی زندگی کی تشغیل میں آب و ہوا، غذا اور پیشوں کا نمایاں حصہ رہا ہے، طبعی اور ذہنی خصوصیات میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کی توجیہ آب و ہوا اور غذا کے اختلافات سے ہو سکتی ہے، مرزا کمالیؑ اور افلاس کا اثر نہ صرف طبعی خصوصیات بلکہ ذہنی نشوونما اور مذہبی نقطہ نظر پر بھی پڑتا ہے، یہاں فوراً ہمارا ذہن بوٹون (Bodin)، مانتیکو (Montesquieu) اور بکسل (Buckle) کے

نظریوں کی طرف جاتا ہے، جنہوں نے اس قسم کے خیالات کو ظاہر کیا ہے، البتہ تاریخی شہادتوں کی عدم



موجودگی میں ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں بتلا سکتے، کہ مذکورہ بالا مفکرین نے ابن خلدون سے کس قدر اثرات قبول کئے ہیں، لیکن بہن آشنا تو تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ یہاں اولیت کا شرف ابن خلدون کو ہی حاصل ہے۔ قومی خصوصیات کی توجیہ بھی پیشہ ورانہ اختلافات کے ذریعہ کیجا سکتی ہے، کسی ملک کے ادارہ کی خط و خال کا دار و مدار ایک بڑی حد تک اس ملک کے مروجہ پیشوں پر ہوتا ہے، زندگی میں بدوی معیشت کے تحت جداگانہ سماجی نظام ہوا کرتے ہیں، اخلاقیات اور مذہب پر پیشہ ورانہ اختلافات کا گہرا اثر پڑتا ہے، تاجر کی ذہنیت اور اوس کے اخلاقی تفصیرات نتیجہ ہیں اس کے پیشہ کا، بدوی جس کو ہر قدم پر حیات کی کشمکش اور زندگی کی کھن منزلیوں سے گزرنا پڑتا ہے، بمقابلہ شہریوں کے جو آرام و آسائش کی زندگی بسر کیا کرتے ہیں، زیادہ مذہبی ہوتے ہیں،

انسانی تمدن میں معاشی عنصر کی اہمیت بتلانے کے بعد ابن خلدون نے ان متعدد مسائل پر روشنی ڈالی جو جن سے ہم روزی کرنے کے سلسلہ میں برابر واسطہ پڑتا رہتا ہے، انسان کی زندگی میں اعتبارات اور ان کی تکمیل کے طریقوں کا مسئلہ نہایت ہی اہم ہے، یہاں معاشی اشیا اور وقت اشیا کے درمیان فرق کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، پھر اہمیت کے لحاظ سے معاشی اشیا کے مختلف درجے ہوتے ہیں، مصنف نے ضروریات زندگی کے لئے تبیضات اور تعیشات کے لئے مرکب کی اصطلاح استعمال کی ہے، اس سلسلہ میں اس نے ہمارے توجہ ایک اہم چیز کی طرف مبذول کرائی ہے، یعنی جو ملک کہ معاشی لحاظ سے کم ترقی یافتہ ہیں وہاں لوگ زیادہ تر ضروریات زندگی کی پیدائش میں مصروف رہتے ہیں، اس کے بعد تعیشات کی پیدائش کا مرحلہ آتا ہے، مباحث کے اس خاص حصہ کی حد تک مصنف کو ہم پروفیسر پائٹن (Professor Patten)

۱۔ ملاحظہ ہو میرا مضمون بعنوان "The social and Political ideas of the -"

۲۔ "Thealdum -" مطبوعہ انڈین جرنل آف پبلیک سائنس، جلد ۴، شمارہ ۲۵، مقدمہ سوم صفحہ ۶۳

سے اپنے نظریوں کو اخذ کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہیں اوس کے یہاں بہت سی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو کلیات کی حیثیت رکھتی ہیں، ایک اور چیز جو ہماری توجہ کی محتاج ہے، وہ یہ ہے کہ ابن خلدون اگر ایک طرف قرون وسطیٰ کی مدرسیت سے محفوظ رہا، تو دوسری طرف اپنے پیشروں کی مذہبی تنگ نظریوں سے آزاد رہا،

جدید تحقیق نے تاریخ کی معاشی تبصیر کے یورپین بانیوں پر کافی روشنی ڈالی ہے، لیکن اس سلسلہ میں شاید بہت کم لوگ ابن خلدون کی اہمیت سے واقف ہیں، اس کا اصل کمال یہ ہے کہ اس نے افلاطونؑ اور ارسطوؑ کے خیالات کو مانتے ہوئے انسانی ترقی پر مادی ماحول کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا، ابن خلدون سماجی زندگی کی نفسی بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے، اور ارسطو کی مشہور کمالات کو دہراتا ہے، کہ ”انسان ایک سماجی حیوان ہے“ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس امر پر بھی زور دیتا ہے کہ سماجی زندگی کا آغاز دراصل معاشی اقتیاجات کے احساس اور ان کی تکمیل کے سلسلہ میں ہوتا ہے، یعنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد زیادہ موثر ہوتی ہے،

ابن خلدون سماج کی نفسی اور معاشی بنیادوں کا محض ذکر کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا، سماجی ترقی پر مادی ماحول کے اثرات اس نے تفصیل کے ساتھ واضح کئے ہیں، چنانچہ اوس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ کُلّیج انسانی کی تشکیل میں آب ہوا، غذا اور پیشوں کا نمایاں حصہ رہا ہے، طبعی اور ذہنی خصوصیات میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کی توجہ آب و ہوا اور غذا کے اختلافات سے ہو سکتی ہے، مرنہ الحالیؑ افلاس کا اثر نہ صرف طبعی خصوصیات بلکہ ذہنی نشوونما اور مذہبی نقطہ نظر پر بھی پڑتا ہے، یہاں فوراً ہمارا ذہن بوڈن (Bodin) مانتیکو (Montesquieu) اور بکسل (Buckle) کے

نظریوں کی طرف جاتا ہے جنہوں نے اس قسم کے خیالات کو ظاہر کیا ہے، البتہ تاریخی شہادتوں کی عدم

موجودگی میں ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں بتلا سکتے کہ مذکورہ بالا سنگدین نے ابن خلدون سے کس قدر اثرات قبول کئے ہیں لیکن ہمیں آتنا تو تسلیم کرنا پڑتا ہی کہ یہاں اولیت کا شرف ابن خلدون کو ہی حاصل ہوا۔ قومی خصوصیات کی توجیہ بھی پیشہ ورانہ اختلافات کے ذریعہ کیجا سکتی ہے، کسی ملک کے ادارے خط و خال کا دار و مدار ایک بڑی حد تک اس ملک کے مروجہ پیشوں پر ہوتا ہے، زرعی معیشت اور بدوی معیشت کے تحت جداگانہ سماجی نظام ہوا کرتے ہیں، اخلاقیات اور مذہب پر پیشہ ورانہ اخلاقیات کا گہرا اثر پڑتا ہی تھا جبر کی ذہنیت اور اوس کے اخلاقی تصورات نتیجہ ہیں اس کے پیشہ کا، بدوی جس کو ہر قدم پر حیات کی کشمکش اور زندگی کی کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہی تھا، بمقابل شہریوں کے جو آرام و آسائش کی زندگی بسر کیا کرتے ہیں، زیادہ مذہبی ہوتے ہیں،

انسانی تمدن میں معاشی عنصر کی اہمیت بتلانے کے بعد ابن خلدون نے ان متعدد مسائل پر روشنی ڈالی جو جن سے ہمیں روزی کمانے کے سلسلہ میں برابر واسطہ پڑتا رہتا ہے، انسان کی زندگی میں اعتبارات اور ان کی تکمیل کے طریقوں کا مسئلہ نہایت ہی اہم ہے، یہاں معاشی اشیاء اور وقت اشیاء کے درمیان فرق کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، پھر اہمیت کے لحاظ سے معاشی اشیاء کے مختلف درجے ہوتے ہیں، مصنف نے ضروریات زندگی کے لئے بیضا اور تیشات کے لئے مرکب کی اصطلاح استعمال کی ہے، اس سلسلہ میں اس نے ہمارے توجہ ایک اہم چیز کی طرف مبذول کائی ہے، یعنی جو ملک کہ معاشی لحاظ سے کم ترقی یافتہ ہیں وہاں لوگ زیادہ تر ضروریات زندگی کی پیدائش میں مصروف رہتے ہیں، اس کے بعد معیشت کی پیدائش کا مرحلہ آتا ہے،

مباحث کے اس خاص حصہ کی مدد تک مصنف کو ہم پروفیسر ہائین (Professor Patten)

سے ملاحظہ ہو میرا مضمون بعنوان "The social and Political ideas of the -"

"Haldun" - مطبوعہ انڈین جرنل آف پبلیکل سائنس، جلد ۲، شمارہ ۲۵، مقدمہ سوم، صفحہ ۶۳

کا پیشہ و قرار دے سکتے ہیں جس نے کہ "میشیت عسری" اور "میشیت یسری" میں فرق واضح کیا ہی نہیں بلکہ خلدون نے شکار، گلہ بانی، زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کو معاشی ارتقاء کے مختلف مرحلے قرار دیے ہیں۔

پیدا آوری کے لحاظ سے ہر پیشہ کی اہمیت ضرور ہے، لیکن شکار اور گلہ بانی سے قطع نظر جو کہ تمدن انسانی کے ابتدائی مرحلوں سے متعلق ہیں، زراعت بعد اہم ہو کچھ تو اس وجہ کہ یہ ایک قدیم پیشہ ہے اور کچھ اس وجہ کہ یہ زندگی کیلئے ناگزیر ہے، زراعت پر جو مباحث بیان کئے گئے ہیں، ان میں مصنف یونان کے معاشی تیغیل سے متاثر نظر آتا ہے، لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ زراعت کی اہمیت کو جتانے کے جوش میں اس نے اس پیشہ کی حد بندیوں کو کبھی نظر انداز ہونے نہیں دیا ہے، یہ تسلیم کرتا ہے کہ زمین میں گھٹی ہوئی زرخیزی کا عمل ہوتا رہتا ہے، اور اس کی تلافی کے لئے وقتاً فوقتاً مصنوعی طریقوں کے استعمال کی ضرورت لاحق ہوتی رہتی ہے۔

ابن خلدون نے زمین پر بہت ہی مختصر بحث کی ہے، لیکن محنت سے متعلق تفصیل سے کام لیا ہے اسے آبادی کی اہمیت کا احساس ہے، اور اس نے کثیر آبادی پر زور دیا ہے، اس حد تک اس کے خیالات افلاطون سے مختلف ہیں، اور تجار میں کے مماثل ہیں، بات یہ ہے کہ افلاطون نے حسب ضرورت مقررہ نقشوں کے تحت آبادی کا گھٹانا بڑھانا روک رکھا ہے، اور ابن خلدون خوشحالی اور اضافہ آبادی میں تعلق قائم کرتا ہے، اور سلطنتوں کی ترقی یافتہ صورت میں جو حالات پائے جاتے ہیں، ان سے اپنے بیان کی وضاحت کرتا ہے،

شہروں کی ترقی و منزل میں بھی آبادی کا خاص حصہ ہوتا ہے، شہروں کی بنیادین نہ صرف معاشرتی اور سیاسی بلکہ معاشی اسباب پر بھی قائم ہیں، اس میں کلام نہیں کہ شہروں کے آغاز و نشو و نما

اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں ایک گونہ متعلق ہے، لیکن شہروں کی بنیاد دراصل محنت کے درساؤ اس پر قابو پانے سے متعلق ہے، اسی طرح یہاں معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، قبل اس کے کہ محنت پر قابو حاصل کیا جائے سیاسی اقتدار کا ہونا ضروری ہے، لیکن اس سلسلہ میں مصنف نے بیچارے کے رواج کی مخالفت کی ہے، اور اسے ایک ایسا بدترین ظلم قرار دیا جو، جو کہ آبادی کی تباہی کا باعث بنتا ہے، ان خیالات کا اظہار کرتے وقت اس کے ذہن میں غالباً یہ چیز موجود تھی، کہ دور قدیم اور قرون وسطیٰ میں شہروں کے بسانے میں بیچارے کا خاصا استعمال ہوتا تھا،

پیدائش کی تنظیم کا مسئلہ بھی اسی قدر اہم ہے، جتنا کہ آبادی کا پیداوار کے نقطہ نظر سے پیدائش کی تنظیم سے بہتر نتائج پیدا ہوتے ہیں، افلاطون نے تقسیم عمل کی سادہ قسموں کی طرف ہماری توجہ مبذول کی تھی، لیکن ابن خلدون نے اس کے پیچیدہ اقسام پر بحث کی ہے، مختلف پیشوں کی خصوصیات اور پھر اس کے بعد محنت کی تخصیص کے فوائد و نقصانات ظاہر کئے ہیں، تخصیص یافتہ محنت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مہارت میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن ہمیشہ ایک ہی عمل سے متعلق رہنے کی وجہ سے دوسری صنعتوں میں کمال حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے، ابن خلدون نے یہ نقص جو ظاہر کیا ہے، اسے اس کے زمانہ کی روشنی میں جانچنا چاہئے، بات یہ ہو کہ مشین کی ترویج سے پہلے کے زمانہ میں آپ صنعت کو دوسری صنعت میں منتقلی اور فنی تطبیق (Technical Adaptation) کا مسئلہ بھی مشکل تھا، ابن خلدون نے تخصیص کی ایک دوسری شکل کو بھی ظاہر کیا ہے، یعنی جزائری تقسیم عمل چند صنعتیں خاص خاص شہروں سے وابستہ ہوتی ہیں، اور انہی مقامات پر ایک عرصہ دراز تک جاری رہنے کی وجہ سے وہیں انکا استحکام ہو جاتا ہے،

نظریہ قدر کے متعلق جن خیالات کا اظہار ابن خلدون نے کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ اس

بہت سارے ایسے موضوعات پر بحث کی ہے، جن کو زمانہ مابعد میں اہمیت حاصل ہوئی، اوس نے جو نظریہ قدر پیش کیا ہے، اوس میں محنت کو مرکزی جگہ دی گئی ہے، البتہ اس کے اوترون وسطیٰ کے مفکرین کے نظریہ میں یہ فرق ہے، کہ موخر الذکر مفکرین نے اپنے مباحث میں مناسب قیمت یا واجی قیمت (جس کا معنی ص ۳۷۴) کے تصور کو شامل کر لینے سے عملی تنقحات کو دھندلانا دیا ہے، اودیدیدگیں پیدا کر دی ہیں، لیکن ابن خلدون نے ان تمام امور سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہے،

جہاں تک کہ قیمتوں کو متاثر کرنے والے اسباب کا تعلق ہے، ابن خلدون نے تین امواد کی طرف ہماری توجہ مبذول کی ہے، پہلی چیز تو حکومت کی پالیسی ہے، مثلاً اشیاء پر محصول اندازی کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے بدی حاصل کو پیش نظر رکھا ہے، معاشرتی اسباب بھی قیمتوں کو متاثر کرتے ہیں، مثلاً شہری زمینوں اور مکانات کی قیمتوں کا سماجی ترقی اور سماجی اسباب کی وجہ سے بڑھ جانا، ایک اور اہم چیز جو ہے وہ یہ کہ قدرتی اسباب بھی زمین کی قیمت کو متاثر کرتے ہیں، زمین کی گنتی ہوئی زرخیزی کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے، اسکی تلافی کرنا یا زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لئے مختلف مصنوعی طریقوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے، اس سے معارف میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں قیمتیں بھی متاثر ہوتی ہیں،

اضافہ قیمت کے اسباب کے ساتھ ساتھ مصنف نے تخمین (Speculation) پر بھی بحث کی ہے، اشیاء جو ضروریات زندگی کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کا ذخیرہ اس نیت سے کرنا کہ کسی آئندہ زمانہ میں انھیں بڑھی ہوئی قیمت پر فروخت کیا جائے گا، ایک قسم کا استحصال ہے، یعنی ضرورت مندوں کی حالت سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے، اس میں کلام نہیں کہ مصنف کی مخالفت کی حیثیت اخلاقی ہے، لیکن اس کے نزدیک اس مسئلہ کا اخلاقی سے کہیں زیادہ اہم معاشی پہلو ہے، اس کا استدلال یہ ہے، کہ

تغین کی وجہ سے قیمتوں میں تغیرات پیدا ہوتے رہتے ہیں، ایک غیر یقینی کیفیت رہتا ہوتی ہے، اور اس سے کساد بازاری پیدا ہوتی ہے، تاجر کا شتکار اور صارف تباہ ہو جاتے ہیں، ان تمام نقصانات کے پیش نظر تغیر پذیر قیمتوں پر ہموار قیمتوں کو ترجیح دی ہے،

کساد بازاری کا ایک دوسرا اہم سبب قوت خرید کا ادنیٰ ہونا ہے، اعلیٰ حاصل کی وجہ سے باشندے اپنے روزمرہ مشاغل سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ ملک کی پیداوار متاثر ہوتی ہے، اور باشندوں کی قوت خرید میں کمی ہو جاتی ہے، حالات میں مزید پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہیں، اگر اس کے ساتھ ساتھ سیاسی نا استواری بھی ہو تو سرمایہ کاری کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ معاشی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں، ایک اور وجہ جس کی بنا پر قوت خرید میں کمی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کو کم تنخواہیں دی جاتی ہیں، اور ان کے پاس صرف کرنے کے لئے بہت کم رہتا ہے جہاں تک کہ نظریہ زر کا تعلق ہے، ابن خلدون کے مباحث مختصر ہیں، وہ ارسطو کے مانند یہ تسلیم کرتا

ہے کہ زرد فیہ مبادلہ بھی ہے اور ذخیرہ قدر بھی ہے، اس سلسلہ میں مصنف یہ واضح کرتا ہے کہ سونے اور چاندی کو دنیا بھر میں جو استعمال کیا جاتا ہے، اس کا صرف ایک سبب ہو سکتا ہے، یعنی ان دھاتوں کی پائیداری ان کی اہمیت سے بھی یہ کیا حقہ واقع ہو، اور مصنف کا خیال ہے، کہ ساری معاشی جدوجہد کا مقصد انہی کو حاصل کرنا ہوتا ہے، اس بنا پر ہم مصنف کو تجارین کا پیشرو کہہ سکتے ہیں، چنانچہ قیمتی دھاتوں کے متعلق دونوں کے نقطہ نظر میں مماثلت پائی جاتی ہے، سلیک کی تاریخ پر بھی تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اور کھوٹے سکون کی پالیسی کے نقائص ظاہر کئے گئے ہیں، کھوٹے سکون کی ذمت کی حد تک اس کے خیالات اس کے عصر (Ottoman) کے مثال ہیں، جس نے کہ مذکورہ معاملات میں بادشاہوں کے حق میں مداخلت سے انکار

کیا تھا، نیز عبد الملک کے اصلاحات مثلاً دار الضرب کا قیام کرنا سکون کی مقدار اور اون کے اوزان پر

قابور کھتا، اور پرنے سکون کو واپس لے لینا، ان تمام چیزوں کو بیان کیا گیا ہے،

حکومت کے معاشی فرائض پر مصنف نے جو بحث کی ہے، وہ بہت ہی اہم ہے، معاشی خوشحالی کے پیدا کرنے میں حکومت کی جو کچھ بھی اہمیت ہو سکتی ہے، اس سے ابن خلدون خوف واقف ہو، وہ اپنے ہم عصروں کی طرح حکومت کے مسئلہ فرائض مثلاً بیرونی مدافعت اور حدودِ مملکت میں جان اور مال کی حفاظت کو تسلیم کرتا ہے، لیکن وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ حکومت کے فرائض کے دائرہ کو اور بھی وسیع بنا دیتا ہو گا کہنا ہے، کہ حکومت کو وہ تمام فرائض اپنے ذمہ لینے چاہئیں جن سے ملک کی فلاح و بہبود حاصل ہو سکے، چنانچہ صنعتوں کی ترقی میں حصہ لینا حکومت کے فرائض میں شامل ہے، گو ابن خلدون نے اس مسئلہ سے متعلق کچھ زیادہ تفصیلات نہیں دی ہیں، لیکن اتنا ذوق سے کہا جاسکتا ہے، کہ حکومت کے فرائض کے بارہ میں اس کا نظریہ وہی نہیں ہے جو کہ اس کے معصرون کا تھا، وہ تمام اثرات جنہوں نے اس کے نقطہ نظر کی تشکیل میں حصہ لیا ہو گا، ان کو واضح کرنا مشکل ہے، بلاشبہ و شبہ مملکت کے متعلق ارسطو کے اخلاقی نظریہ اور اسلامی تصورات دونوں کا اس پر اثر پڑا ہو گا،

حکومت کے معاشی فرائض میں سے محصول اندازی بہت ہی اہم ہے، چنانچہ اس کا بیان ہی، کہ دراصل حکومت کی بنیادین فوج اور مالیات ہیں، جب حکومت کی مالی حالت سقیم ہو جاتی ہے، حکومت کو بھی زوال ہونے لگتا ہے، اس نے محصول اندازی کو پیدا آوری کے نقطہ نظر سے جانچنے کی کوشش کی ہو، بلکہ محصول معاشی جدوجہد میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہو، کیونکہ اسکی وجہ سے کاشتکاروں کو مزید کاشت کی ترغیب ہوتی ہے، لیکن بھاری محاصل اور نئے محاصل مثلاً محصول فروخت محصول زائرین کی مفت کرتا ہو، محاصل میں اضافہ ہو تو معاشی جدوجہد، بالخصوص زراعت پر برا اثر پڑتا ہو، کاشت کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہو جاتی ہو، فائدہ کشی، بیاریاں اور آبادی میں کمی اسکے نتائج ہوتے ہیں، باشندوں کی توت خرید میں کمی ہوتی ہو، جس مقصد کیلئے محاصل میں اضافہ کیا گیا تھا، وہ پورا نہیں ہوتا، یہاں اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اس نے اپنے





## افلاطون

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب لکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور

( آل انڈیا ریڈیو لاہور کی اجازت سے )

یونانی زبان میں حکمت کے عاشق زار کو فلسفی کہتے تھے فلسفی کے لئے اس کا فلسفہ دماغی تعیش کا ایک ذریعہ نہ تھا، بلکہ اس کی زندگی کا پورا پروگرام تھا، یونان کے ان لوگوں کے لئے عوام کے طور طریقے، ان کا مذہب، ان کے اخلاق اور ان کے رسوم اپنے اندر کسی قسم کی کشش نہ رکھتے تھے، اپنے علم کی وجہ سے فلسفی عوام کے زمرے سے باہر نکل چکا تھا، اور اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ زندگی کا ایسا پروگرام مرتب کرے جس سے اس کے دل و دماغ دونوں کو تسکین حاصل ہو، جب کسی یونانی فلسفی کے کارنامے کا جائزہ لینا منظور ہو تو اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہئے،

اب سوال یہ ہے کہ افلاطون نے اس مقصد میں کمان بک کا میا بی حاصل کی ہے، کیا اس فلسفہ اور اس کی تعلیم بالکل بے حقیقت اور گمراہ کن قیاس آرائی ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے؟ یا یہ کہ افلاطون فی تعلیم و فلسفہ انسانی دماغ کے بہترین شاہکاروں میں سے ہے جس میں بقول شیعہ زندگی کے تمام مسائل پر نہایت سنجیدہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے، اور نہایت ٹھوس اور مستقل چٹانیاں افد کی گئی ہیں؟

افلاطون کی تعلیمات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اس کے ماحول اور اس کے زمانہ کے حالات کو ذرا دیکھنا چاہئے اس کے استاد سقراط کا زمانہ یونان اور بالخصوص ایتھنز کا سنہری زمانہ تھا، علم و فضل کے چرچے

تھے، عہد کا ایک گروہ جسفلی کے نام سے مشہور تھا، خاص طور پر نئے معلومات اور نئے علوم کے پرچار میں مصروف تھا۔ یہ لوگ بلا کے ذہین تھے، تقریر و تحریر، بحث و حکم، قانون و رسمیات، غرض انسانیت کی تمام شاخوں میں ان کو دسترس تھی، لیکن ان سفسطیوں میں وہ خلوص و عشق نہ تھا، جو فلسفی کی خاص نشانی تھی۔ ان میں سے اکثر لوگ حد درجے کے دنیا دار تھے، اور سچائی سے زیادہ فیس کا ان کو لالچ تھا، ان لوگوں کی وجہ سے اتھنز میں ایک کمرام سا برپا ہو گیا، پرانی باتیں، پرانی زمین، پرانے اخلاق، پرانا طرز حکومت، پرانا مذہب، غرض ہر پرانی چیز جو کچھ پرانی تھی، اس لئے ان چرب زبانوں کے نزدیک غلط اور دھوکا سمجھی ان کی تنقید میں صرف تخریب تھی، اور ان کی تعلیم کے دو اہم اصول یونانی سوسائٹی اور سیاست کے لئے سخت خطرناک تھے،

ان کا پہلا اصول یہ تھا کہ (۱) عدل ایک بے حقیقت شے ہے جسے عدل کہا جاتا ہے، وہ یا تو اس لئے تراشا گیا تھا کہ طاقتور لوگ اپنی ہتھیائی ہوئی دولت کو کمزوروں کے بھجوم سے بچاسکیں اور یا عدل اُس کے قوانین اس لئے بنائے گئے تھے، کہ طاقتوروں کی دستبرد سے کمزوروں کو بچایا جائے، دونوں حالتوں میں عدل فطری چیز نہیں ہے، بلکہ انسانی سوسائٹی کی اپنی اختراع ہے، یعنی عدل ایک ڈھکوسلا ہے، اور فطرت انسانی کے بالکل خلاف ہے،

(۲) پھر جسفلی انفرادیت کے علم بردار تھے، اس سے پہلے یونان میں ریاست کو فطری اور خدائی دستور سمجھا جاتا تھا، لیکن جسفلی کشا تھا کہ ریاست ایک بالکل غیر فطری چیز ہے، اور اس کا آغاز ایک سماجی مٹا کی صورت میں ہوا تھا، اس سماجی معاہدہ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اپنے آپ کو ایک دوسرے کی دست برد سے بچاسکیں، فرد کے لئے سب سے بہتر حالت یہ ہے کہ وہ دوسروں پر خوب جبر کرے، اور خود ان کی دستبرد سے بچا رہے، یعنی خوب لوٹے، لیکن خود نہ لے، سب سے بری حالت یہ ہے کہ وہ دوسروں کے ظلم کا تجربہ مشق بنا دے اور خود اس میں اتنی قوت نہ ہو کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیکے، اس لئے فرد کو چاروں پار سماجی مٹا

کے مذہب سے ایک گوند عافیت حاصل کرنا پڑی، یہ جو سیاسی مدد کی بنیاد

سقراط اور افلاطون دونوں ان اصولوں کو غلط جانتے تھے، اور ان کی شکست کے بغیر حکمت و تمدن کی ترقی ناممکن سمجھتے تھے، مثلاً افلاطون نہایت آسانی سے ان اصولوں کو یوں رد کرتا ہے، اول تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے، کہ فواد سماج میں تضاد ہے، فرد ہمیشہ ایک چھوٹی سی سوسائٹی یعنی کنبہ میں پیدا ہوتا ہے اور یہ کنبہ دوسرے کنبوں سے منسلک ہوتا ہے، کنبوں کے ایسے مجموعوں سے سماج بنتا ہے، فرد محض ایک چیز ہے، پھر یہ سماجی معاہدہ جس کا منسلکی بار بار ذکر کرتا ہے، ہے کیا چیز؟ آزاد افراد نے معاہدہ کی ٹھانی کب، بات یہ ہے کہ ایسے آزاد انسانوں کا آپس میں مل بیٹھنا جو ایک دوسرے سے بالکل وحشت رکھتے ہوں، ناممکنات میں سے ہے، اس سے ثابت ہوا کہ سماجی معاہدہ کا تخیل ہی غلط ہے،

افلاطون نے ان منسلکی اصولوں کو رد کر کے یہ نتیجہ نہیں نکالا، کہ پرانے نظریے اور طور طریقے صحیح ثابت ہوئے، وہ اچھی طرح جانتا تھا، کہ یونانی سیاست و اخلاق کی عافیت اس میں ہے، اگر صحیح اصول دریافت کئے جائیں، اور یہ محض نصب العین عوام کے سامنے پیش کیا جائے، اگر ریاست کا کاروبار برے طریقے پر چلیگا، تو فرد و قوم دونوں تباہ ہوں گے، عدل کے بغیر نہ ریاست کا وجود ممکن ہے، اور نہ اخلاق کا، اسی لئے یہ مسئلہ افلاطونی فلسفہ میں خاص اہمیت رکھتا ہے،

جب کنبوں کے مجموعے سے ایک مختصر سا قبیلہ بن جاتا ہے، تو عمرانی زندگی بھی شروع ہو جاتی ہے، لیکن شروع شروع میں شخص، ہر کنبے اور ہر قبیلے کے لئے صرف ایک کام ہوتا ہے یعنی خوراک حاصل کرنا اور رہائش کا انتظام اور بیوی بچوں کی نگہداشت، وہ تقسیم کار جس کے بغیر تمدن ناممکن ہے، بعد میں آتی ہے، شروع میں کو تمدن کا درجہ نہیں دیتا، اسے وہ سور دن کی جماعت کہتا ہے، تقسیم کار اس وقت ہوتی ہے جب قبیلہ بڑھ کر ایک ملت کی شکل اختیار کرتا ہے، اس وقت دولت جمع ہونا شروع ہوتی ہے، اور خدائے

لوگوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو عوام کو طاقتور لیٹرون اور غیر اقوام کی دست برد سے بچا سکیں۔  
ملت کو افراد مختلف گرد ہوں میں بٹ جاتے ہیں، کوئی حاکم بنتا ہے کوئی رعیت، کوئی آقا، کوئی غلام، لیکن  
ہی ایسی ریاستوں میں عمرانی بیماریاں ظاہر ہو جاتی ہیں، اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان ریاستوں کے ارتقا  
میں کوئی خاص اصول کار گر نہیں ہوتے،

اب یہ عمرانی بیماریاں کیسے دور کیا ہیں؟ افلاطون ہیں ایک معیاری ریاست کا نقشہ تیار کر کے  
دیتا ہے، ریاست میں سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے، جو محض ضروریات زندگی کو پیدا کرتے  
ہیں، مثلاً پیشہ ور لوگ، کاریگر، کاشتکار، یہ لوگ نہ حکومت کے قابل ہوتے ہیں، اور نہ جنگ کے، نہ ان  
سے دماغی کام ہو سکتا ہے، اور نہ ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے، کہ وہ اپنی محنت کسی ایسے کام میں  
خوشی سے صرف کر دیں گے جس سے انہیں کوئی ذاتی نفع حاصل نہ ہو، اگر ان لوگوں میں کوئی ایسا شخص  
حسن اتفاق سے نکل بھی آئے، تو اسے فوراً اس جماعت سے علیحدہ کر لینا چاہئے، اس جماعت کے  
افراد کے لئے سب سے بڑی خوبی یہ ہے، کہ کھانے پینے میں، اٹھنے بیٹھنے میں غرض اپنے ہر کام میں  
اعتدال برتیں،

عوام کو چھوڑ کر جو لوگ ریاست میں ہوں گے، وہ دو درجوں میں بٹ سکتے ہیں، کچھ لوگ ایسے  
ہوں گے جن میں ہمت و جرات کا مادہ عوام سے بہت زیادہ ہوگا، مال و زر کی ان کو خواہش نہ ہوگی  
بلکہ وہ ناموس کے خواہشمند ہوں گے، جرات و ہمت ان کا خاصہ ہے، یہی لوگ ریاست کے جبری سپاہی  
بنیں گے، جو اسے بیرونی اور اندرونی دشمنوں سے بچائیں گے، ان لوگوں کی خاص خوبی شجاعت ہوگی  
کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن میں اعتدال مزاج اور شجاعت کے علاوہ ایک اور خوبی عقل کی  
ہوگی، نرم و بخیدگی ان کا خاصہ ہے، یہی لوگ ریاست کے صحیح پیشوا اور حاکم بن سکتے ہیں، اور فلسفہ بھی  
پیشواؤں کا حق ہے،

جس ریاست میں عوام معتدل مزاج، سپاہی شجاع اور پیشوا ماقبل ہوں گے، وہ ریاست صحیح  
 ممنون میں بہترین ہوگی، اور جب تک ایسی ریاست پچہ کی دنیا میں بن نہ جائیگی، دنیا سے بدعقلی و  
 بد اخلاقی، ظلم و ستم بے انصافی اور افسردگی بھی دور نہ ہوگی، صرف اسی معیاری ریاست میں عدل ہوگا،  
 (چنانچہ افلاطونی زبان میں سیاسی عدل سے مراد یہ ہے، کہ عوام میں اعتدال ہو، سپاہی شجاع ہوں پیشوا  
 ماقبل ہوں، اور ریاست کے یہ تینوں طبقے اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہیں،)

افلاطون کہتا ہے کہ فرد کو بھی حروف میں لکھو، تو اس کا نام ریاست ہے، ریاست کو چھوٹے  
 حروف میں لکھو تو اس کا نام فرد ہے، اس لئے جیسے ریاست کی بہترین حالت عدل ہے، اسی طرح فرد  
 کی بہترین حالت بھی عدل ہے، نفس انسانی کیا ہے؟ افلاطون کہتا ہے کہ پہلے وحشی جانوروں کا ایک  
 گرو تصور کرو، ان پر ایک سردار شیر، بٹھا دو، پھر اس شیر کے اوپر انسان کا سر جوڑ دو، یہ ہے نفس  
 انسانی، وحشی جانور کیا ہوئے؟ یہ ہیں ہمارے نفسِ امارہ کی بے لگام خواہشات، شیر سے مراد کیا ہے؟  
 جرأت و ہمت جو انسانی دل کا خاصہ ہے، انسان کا سر کس چیز کی دلیل ہے؟ عقل کی جس سے انسان  
 انسان بنتا ہے، جرأت کے شیر کی مدد سے نفسِ امارہ کی خواہشات کو رام کرو، اور شیر کی لگام عقل انسانی  
 کے ہاتھ میں دو، یہ ہے عدل، بہترین انسان وہ ہے جو اپنی خواہشات کو حد اعتدال میں رکھے، صحیح ممنون  
 میں دیر ہو، اور عقل کو اپنا رہبر بنائے جو انسان اپنے نفس کی تعمیر اس طرح کرتا ہے، وہ مردِ عادل ہے،  
 اگر فرد عقل کو اپنا رہبر بناتا ہے، تو وہ عادل ہے، اگر ریاست عقل کو اپنا پیشوا بناتی ہے، تو وہ عادل  
 ہوگا، عقل کی پیشوائی دلیل ہے عدل کی،

افلاطون کا قول ہے کہ جب تک حکمران بادشاہ نہ ہوں گے یا بادشاہ حکم نہ بن جائیں گے، انسانی  
 ریاست کی بیماریاں دور نہ ہوں گی، اس قول پر مکتہ چینیوں نے بہت کچھ لے دے کی ہے، سرسری  
 نظر سے دیکھا جائے، تو حکم و فلسفی تو ایک خیالی دنیا کا پہلوان ہوتا ہے، ایسے شخص کے ہاتھ میں ریاست

کی نگاہ میں دینا دینا پر انتہائی ظلم ہے، فلسفی تو اپنے گھر کی گتھیاں بنیں سمجھا سکتا، وہ ریاست کے عقدے کیسے حل کرے گا، یہاں بہن دیکھنا چاہئے کہ افلاطون کی مراد فلسفی یا حکم سے کیا ہے؟ اس کا اندازہ آپ اس تعلیمی پروگرام سے کر سکیں گے، جو اس نے ریاست کے پیشواؤں کے لئے مرتب کیا ہے،

افلاطونی تعلیم پیدائش سے شروع ہوتی ہے، اور موت کے ساتھ ہی ختم ہوتی ہے، لیکن اس تعلیمی پروگرام کو دہتین بڑے حصوں میں تقسیم کرتا ہے، پہلا حصہ پیدائش سے شروع ہو کر اکیس سال کی عمر تک ختم ہوتا ہے، دوسرا اکیسویں سال سے تیس سال تک اور تیسرا اس کے بعد،

پہلے بیس سالوں میں موسیقی اور جسمانی ورزش کی تعلیم ہوگی، موسیقی سے قوتِ متینہ کی تربیت مراد ہے، یعنی ایسی فنی تربیت جس سے بچے کے دل میں حُسن کا صحیح خیال پیدا ہو جائے، یہاں تک کہ وہ ہر کام میں حُسن پر خیال اور ہر بات میں حُسن کا غالب بن جائے، گویا موسیقی سے روح کی تربیت منظور ہے، اسی طرح جسمانی ورزش سے جسم کی تربیت مراد ہے، اس عرصہ میں طلبہ کو علم و حکمت سے کوئی واقفیت نہ ہوگی، ڈھکے بھرتے قیاس و گمان کے درجہ میں رہیں گے، یعنی علم و جہل کے بین میں، جہل کے درجہ سے بچہ اب نکل چکا ہو، لیکن ابھی علم کی منزل سے دور ہے، اس منزل تک پہنچنے کے لئے پروگرام کا دوسرا دور ہے، جو بیسواں سال میں شروع ہوتا ہے،

بیس سال کی عمر کے بعد ایک کڑا امتحان ہونا چاہئے، اور صرف بہترین طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے چننا چاہئے، چنے ہوئے نوجوانوں کو دس سال تک سائنس کی تعلیم دی جائیگی، سائنس سے مراد تصورات اور قوانین کا علم ہے، مثلاً جو جہل چیزیں زمین پر گرتی ہیں سمندر میں تہ و جز تہ ہواؤں کا ذریعہ کے گرد گھومتا ہے، یہ چند حقائق ہیں جو بے جوڑ سے نظر آتے ہیں، لیکن جب ہم کششِ ثقل کا خیال کرتے ہیں تو یہ قانون ان مختلف حوادث کو ایک ہی لڑائی میں پرو دیتا ہے، حوادث کے مطالعہ سے بنیادی تصورات اور قوانین تک پہنچنا یہ جو افلاطون کے نزدیک سائنس کا کام، تیس سال کی عمر تک یہ تعلیم جاری رہے گی، اس تعلیم کے ساتھ

ساتھ یہ نوجوان ریاست میں کچھ عملی کام بھی کرتے رہیں گے، اور ان کی علمی اور عملی تربیت ساتھ ساتھ جاری رہیگی اس کے بعد پھر ایک کڑا امتحان ہوگا، اس میں صرف بہترین نوجوان تعلیم کے آخری درجہ کے لئے چنے جائیں گے یہ منتخب جوان بعد میں پیشوا بنیں گے، جو لوگ اس دوسرے درجہ میں رہ جائیں گے، وہ ریاست کے سپاہی بنیں اب پانچ سال کے لئے یہ نوجوان پیشوا ریاست کی عملی خدمت سے ہٹ جائیں گے، اور اس عرصہ میں انھیں فلسفہ کی تعلیم دی جائے گی، فلسفہ سے افلاطون کی مراد خیر اعلیٰ کا علم ہے، اور خیر اعلیٰ سے مراد وہ بنیادی تصورات اور وہ اعلیٰ حقیقت ہیں، جو سائنس کی کنجی اور حوادث کی بھول بھلیاں کا راز ہے، خیر اعلیٰ کے اس علم یعنی فلسفہ کے متعلق ابھی کچھ اور عرض کیا جائے گا، اس وقت صرف یہ بیان کرنا ہے، کہ پچیس سال کی عمر میں یہ پیشوا پھر عملی دنیا میں آئیں گے، اور پندرہ سال تک ریاست کی عملی خدمت اور بالخصوص جنگ کے کاموں میں مصروف رہیں گے، پچاس سال کی عمر میں تعلیم کا یہ تیسرا دور پورا ہوگا، اب یہ لوگ ریاست کے پیشوا اور حاکم ہوں گے، اور ان کے ذمہ صرف دو کام ہوں گے، ریاست کا انتظام اور خیر اعلیٰ کی جستجو،

اس سلسلہ میں افلاطون ان پیشواؤں اور سپاہیوں کے لئے ایک مشترک طریقہ زندگی پیش کرتا ہے، پیشواؤں کے لئے دو چیزیں حرام محض ہیں، یعنی خاگی زندگی اور ذاتی جائداد، ان کی سب فرد ریاست کی زندگی مشترک ہوں گی، وہ خاص خاص موصوفین میں عارضی شادیوں کر سکیں گے، لیکن بچے پیدا ہوتے ہی ریاست کی نگرانی میں آجائیں گے تاکہ ان کے والدین انھیں بعد میں پہچان نہ سکیں، مرد اور عورت دونوں پیشوا ہو سکتے ہیں، اور تمام پیشواؤں کو ایک کنبہ بنیں گے، افلاطون کا عقیدہ تھا، کہ جہاں ریاست کے حکام کو ذاتی جائداد اور خاگی زندگی کی لوگی، فوراً ہی ریاست کے انتظام میں خلل آیا،

الغرض پیشوا کی زندگی اشتراکی ہوگی، اس کے روزمرہ کے فرائض کیا ہوں گے،؟ وہ ریاست کے کاموں کی نگرانی کرے گا، پیشواؤں اور سپاہیوں کے اعلیٰ معیار زندگی کو گرنے نہ دیکھا، نوجوانوں کی تعلیم کا اہتمام کرے گا، تعلیمی اور فنی معاملات میں بدعتوں کو روکے گا، پیشہ ورانہ کارکردگی جماعت میں افلاس



اور پیش پرستی کو روکے گا، اور خیر اعلیٰ کے متعلق اپنا علم بڑھاتا جائے گا، یہ خیر اعلیٰ کیا ہے؟ اوس کا علم کیا ہے؟ ایک مثال سے بات سمجھی جاسکتی ہے،

دنیا میں لاکھوں کتابیں ہیں، ہر ایک کو ہم کتاب کا نام کیوں دیتے ہیں، صرف اس لئے کہ ان سب میں چند خاصیتیں مشترک ہیں، یہ خاصیتیں کتاب کا تضمن کلماتی ہیں، اس تضمن کا تصور حقیقت کتاب کی جان ہے، افلاطون کہتا ہے کہ ہر وہ کتاب جو ہم دنیا میں دیکھتے ہیں نقل و مثال ہے اس ایک حقیقت کی جو تصور کتاب ہے، کتاب کا یہ تصور ہمارے خیال کی اختراع نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی دنیا میں موجود ہے، جو اس عالم رنگ و بو سے اعلیٰ ارفع ہے، ہمارے حواس صرف ظاہر کی دنیا تک محدود ہیں، عقل ظاہر کا پردہ چاک کر کے تصورات کی دنیا میں پہنچتی ہے، اور ہر چیز کی اصل کو پاتی ہے، حکمت اس تصوراتی دنیا کے تفکر کا نام ہے، تصورات کی دنیا میں بھی حقیقت کے درجے ہیں عقل ہیں بتاتی ہے، کہ سب سے اہم تصور وہ ہے، جسے خیر اعلیٰ کا نام دیا جاتا ہے، اعتدال، شجاعت، عقل، عدل، سب نیکیاں ہیں، یعنی خیر اعلیٰ کی قسین ہیں، یہ خیر اعلیٰ ہر زندگی کا نصب العین ہر نیکی کا منبع، ہر اچھائی کا محرک اور ہر تصور کی جان ہے، خیر اعلیٰ تصورات کی دنیا کا خورشید ہے اس کا ایک رُخ خُشن ہے، دوسرا حق، اور حسن و حق و خیر کا سر چشمہ خدا ہے،

افلاطونی ریاست کا حکیم پیشوا اس روحانی تصور میں متغرق ہے، لیکن وہ راہب نہیں ہے جو دنیا سے الگ ہو کر خدا کے دھیان میں مصروف ہے، وہ آزمودہ کار ہے، مرد میدان ہے، فکر و عمل کی دنیا کا دھنی ہے، خلق خدا کا پیشوا ہے، اور اسی کے ہاتھ میں ریاست کی باگ ڈور صرف اس لئے دی گئی ہے، کہ وہ بہترین خلافت ہے، اور اس کام کا اہل ہے، اسی لئے افلاطون کہتا ہے، کہ عمرانی زندگی کی بیماریاں ہرگز دور نہ ہوں گی، جب تک بادشاہ حکیم نہ ہو یا حکیم بادشاہ نہ بنیں گے،

اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ افلاطون محض ایک گمراہ کن مفکر تھا، یا انسان کے بہترین محسنوں میں اس کا شمار ہونا چاہئے، شاید آپ کے دل میں یہ خیال آئے کہ افلاطون کے یہ نظریے تو بہت دلکش ہیں لیکن ہیں وہ صرف نظریے ان کا عملی دنیا سے کیا کام؟ اس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی ایجا ڈی ٹی میں نہ صرف پچاس سال تک سیاست و اخلاق کے ان پیچیدہ مسائل پر غور و خوض ہوتا رہا، بلکہ اس نے کئی آزمودہ کار سیاست دان بھی پیدا کئے، جن کی خدمات یونان کی بعض ریاستوں نے اُس سے مستعار لیں،

## ابن رشد

مشہور مسلمان اندلسی حکیم جو مسلمانوں میں ارسطو کے فلسفہ کا بہترین شارح سمجھا جاتا ہے، اُس جس کی تصنیفات مدون تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں، اس کے سوا سچ او فلسفہ پر تبصرہ، اور اسی ضمن میں مسلمانوں کے علم کلام و فلسفہ پر بھی دیوید اور یورپ میں اسلامی علوم کی اشاعت کی تاریخ اور فلسفہ رجدیدہ و قدیمہ کا موازنہ بھی آگیا ہے، ابن رشد کے متعلق اتنا بڑا ذخیرہ معلومات کسی مشرقی زبان میں کیا، مغربی زبان میں بھی نہیں مل سکتا،

صفحات ۳۸۹ صفحہ قیمت ۵/-

## فہم انسانی

ڈیوڈ ہیوم کی مشہور کتاب ہیومن اسٹیڈنگ کا ترجمہ اور اس کے مختصر حالات کے ساتھ اس خیالات فلسفہ پر بحث و تبصرہ جلد ۲۲۸ صفحہ قیمت ۵/-

”مینجر“

# تلخیص تجربہ

## مرنجان مرغ یا بھلا مانس

مرنجان مرغ کسے کہتے ہیں؟ وہ دوسرے لوگوں سے کن باتوں میں ممتاز ہوتا ہے؟ ایسے شخص کے متعلق آپ ذرا سوچیں تو چند باتیں فوراً ذہن میں آئیں گی، مثلاً ایسا شخص خوش مزاج ہوتا ہے، ہنس کھتا ہوتا ہے، بات بات پر بگڑتا نہیں، اگر آپ اُسے کوئی چھٹی ہوئی بات کہے بھی دین تو وہ پی جاتا ہے، پھوڑا حتی المقدور کسی سے لڑائی جھگڑا مول نہیں لیتا، اگر لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لئے اُسے کوئی نقصان بھی اٹھانا پڑے تو وہ اُسے برداشت کر لیتا ہے، اُس کی خواہش ہوتی ہے، کہ زندگی کے دن خوش مزاجی اور خندہ پیشانی سے گزر جائیں، اُس کی طبیعت کی افادہ مرنجان مرغ کی سی ہوتی ہے، اس کا خاصہ وہ کچھ کچھ اقبال کے قلندر سے ملتا ہے، جو غم زندگی کو نیم زندگی تصور کرتا ہے، اور حتی المقدور اس نیم غم سے بچتا ہے، مگر ہم اسے قلندر نہیں کہہ سکتے، کیونکہ قلندر کا طریقہ زندگی اپنے اندر ایک قسم کی جسامت رکھتا ہے، اور ہمارا مرنجان مرغ دوست اس جسامت کے قابل ہی نہیں، وہ جانتا ہے کہ دنیا داری کے دھندے ضروری ہیں، اور ان کے بغیر چارہ نہیں، وہ اپنے کام کاج سے کاروبار سے، بیوی بچوں کی نگہداشت سے گریز نہیں کرتا، وہ یہ سب کچھ کرتا ہے، لیکن اُس کے دل میں یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اس دوسرے کو اور کیوں بڑھاؤں، مسافر گاڑی کے ڈبہ میں جہان ستر آدمیوں کی جگہ ہے، وہاں پورے ایک سو تین جمع ہیں، یہیں کھڑا ہی رہنا پڑے گا، تو کیا یہ حماقت نہ ہوگی؟

ایسی حالت میں ہم پڑوسیوں سے جھگڑا مول لیکر اپنی کلفت کو اور بڑھائیں ؟

پھر ہمارا مرنجان مرغ دوست بالعموم لوگوں کی نیکیوں کو دیکھتا ہی ان کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہی، وہ دوسروں کے نقائص کی تلاش میں نہیں رہتا، نہ وہ ہر بات پر شک کرتا ہے، بعض لوگوں کو دوسروں کی عیب جوئی کا مرض ہوتا ہے، اُن سے کوئی نیکی کیجئے، وہ یہی سمجھیں گے، کہ اس میں بھی کوئی فریب چھپا ہی، ہمارا بھلا مانس اس قسم کی عیب جوئی کو برا جانتا ہی

مرنجان مرغ انسان کی تین خوبیاں ابھی بیان کی گئی ہیں، وہ خوش مزاج ہے، لڑائی جھگڑوں سے بچنے کے لئے نقصان بھی برداشت کر لیتا ہی، اور عیب جو اور بد بین نہیں ہے، اب سوال یہ ہو کہ یہ تین خوبیاں اوس نے یکھی ہیں، یا اس کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے، کیا اس کی بھلائی اخلاق کا آموختہ ہے، یا فطرت کا عطیہ ؟ کیا ہم کسی طریقہ تعلیم و تربیت سے ہر کچھ کی طبیعت کو اس طرح ڈھال سکتے ہیں، کہ وہ جو ان ہو کر مرنجان مرغ ثابت ہو ؟ نفسیاتی نقطہ نظر سے اس سوال کا جواب نفی میں ہوگا، تعلیم و تربیت سے بچہ کو خوش اخلاق بنایا جاسکتا ہے، خوش مزاج نہیں، خوش مزاجی جو مرنجان مرغ شخص کی خاص نشانی ہے، فطری چیز ہے، جس کو اچھی تربیت چمکا سکتی ہے، لیکن پیدا نہیں کر سکتی،

مرنجان مرغ، منس انسان کی ایک مستقل نوع ہے، اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، حیوانیات کی ہر نوع میں افراد دو گروہوں میں بٹ سکتے ہیں، بعض فطرۃً اور نسبتہً زیادہ لڑاکے اور پیش پیش رہنے والے ہوتے ہیں، اور بعض شرمیلے ہوتے ہیں، نسبتہً حلیم الطبع اور اپنے ساتھیوں کی سرداری کے ناقابلِ بھلا مانس یا مرنجان مرغ کو گ اس دوسری قسم کے انسان ہیں، ان کی طبیعت انہیں آگے بڑھنے نہیں دیتی، اور چونکہ آگے بڑھنے کے لئے لڑائی جھگڑنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس سخت متغیر ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ ایسے موقعوں پر بھی لڑنے سے گریز کرتے ہیں، جہاں یہ عمل اخلاق کے

مین مطابق ہوتا ہے، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا تھا، خوش مزاجی اور خوش اخلاقی مین فرق ہے، خوش مزاجی فطری خاصیت اور خوش اخلاقی کسی صفت ہی،

اگر مرنجان مرغی کا یہ تجربہ صحیح ہی، تو ایک نتیجہ لازم آتا ہے کہ ایسے شخص کی خوش مزاجی اولاً خود اسکی اپنی تسکین کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ دوسروں کی تسکین کے لئے، یہ صحیح ہے کہ اس کی خوش مزاجی سے دوسروں کو فائدہ پہونچتا ہے، لیکن یہ بھلامنس اس لئے خوش مزاج نہیں ہوتا، کہ اس سے دوسروں کی زندگی کے چند لمبے اچھے گزر جائیں گے، اگر اس کے دل مین یہ خیال بھی موجود ہے، تو وہ بھلامنس بھی ہے اور خوش اخلاقی بھی، ہر بھلے مانس کے دل مین یہ خیال موجود نہیں ہوتا کہ وہ خوش مزاج ہو، کیونکہ اس کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہی،

زندگی کے کارزار مین مرنجان مرغ انسان کا کیا درجہ ہے؟ کیا اسکی ہستی دنیوی برابر ہے؟ کیا اس کی موجودگی انسانی فلاح کے لئے ضروری ہے؟ وہ نہ ہو تو اس کے دوستوں اور آشناؤں کو کیا نقصان پہونچے گا؟ ان سوالوں کا جواب آپ آسانی سے دیکھتے ہیں، صرف ایک لمحہ کیلئے دل مین سوچئے، اگر میرا مرنجان مرغ دوست زندہ نہ ہو تو میں کیا کروں گا، مین جب سخت پریشان ہوتا ہوں تو اس کے پاس جاتا ہوں، اور گھٹنہ دو گھٹنے اس کے کان کھاتا ہوں، وہ مسکراتا ہے، میری داستان سنتا ہے، دلاسا دیتا ہے، چائے پانی سے میرا رخ دور کرتا ہے، میرا غصہ ڈھنڈا کرتا ہے، اپنا کام چھوڑ کر بیٹھ جاتا ہے، مین نے کبھی سوچا کہ مین ہوں کہ مین اوس کا وقت ضائع کر رہا ہوں، وہ خندہ پیشانی سے میری سنتا ہے، دوسرے دوستوں کی سنتا ہے، حتی المقدور ہمارے جھگڑے چکاتا ہے، اپنی تکلیف کا وہ بہت کم ذکر کرتا ہی، اگر شکایت بھی کرتا ہے، تو دبی زبان سے اور عذر خواہانہ انداز سے، دشمن کو بھی اس سے کبھی تحقیر نہیں پہونچی، وہ مرنجان مرغ ہے، ہر کس و نا کس کا خیر خواہ ہے، بااثر سے گزرتا ہے تو کسی کو

سلام کتا ہے، اور کسی کو آداب عرض کسی کی مزاج پر سی کرتا ہے، اور کسی سے اس کے گھر بار کی خبر خیریت دریافت کرتا ہے کسی کو دعا دیتا ہے، کسی سے دعا لیتا ہے کہیں مہنتا ہے کہیں مسکراتا ہے، غرض اس طرح خذہ پیشانی سے یہ بھلا آدمی زندگی کے ہزار سے گزر جاتا، جو ایسے لوگ دنیا میں موجود نہ ہوں تو زندگی دو بھر ہو جائے، اور حریفوں میں مصاحت کرانے والا کوئی نہ ملے،

لیکن سچ یہ جو کہ ایسے شخص کی قدر نہیں جوتی، ہر شخص اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن اُس نقصان پہنچاتا، جو کوئی اوس کے کان کھا کر اور اس کا وقت ضائع کر کے اوسے نقصان پہنچاتا ہے، کوئی اس کی کم آزاری کو دیکھ کر اوس کی تکلیف کے درپے ہے، کوئی اُسے منافق کہتا ہے، محض اُس نے کہ وہ ہر شخص سے مسکرا کر ملتا ہے، کوئی اوس کے صبر و تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اور کوئی اُسے احمق کہتا ہے، کیونکہ وہ دوسروں کے ہاتھوں اپنا نقصان برداشت کر لیتا ہے،

شاید کار لایل نے تمام انسانوں کو دو گروہوں میں بانٹا تھا، کچھ بد معاش ہیں اور باقی احمق، بد معاشوں کی گزراہتوں پر ہوتی ہے، اب ہمارا بھلا مانس دوست بد معاشوں کی فرست میں تو شامل ہو نہیں سکتا، اس لئے لوگ اسے احمق تصور کرتے ہیں، یہ بے انصافی ہے، اگر عقل انسان کو اس لئے دی گئی ہے، کہ وہ اپنی زندگی کے دن چین و سکون سے گزار دے تو ماننا پڑے گا، کہ مرنجان مرغ انسان جسے زیادہ کامیاب حکیم ہے، کہ وہ امن و شانتی کا گر پا گیا ہے، ہاں اگر زندگی کا مقصد چین و سکون سے کوئی زیادہ اچھی حالت ہے، تو ہمارے بھلا مانس کیلئے ضروری ہے، کہ اپنی خوش طبعی کو خوش اخلاقی کے اعلیٰ درجہ تک پہنچا دے، لیکن ہر حال میں وہ بد معاش سے بہتر ہے، بھلا مانس کی سادگی بد معاش کے فریبکے جالوں کو بالآخر کاٹ کھائیگی، اس لئے بھلا مانس کو گھبرانہ چاہئے، جیت ان کی ہے،

بھلا مانس کی دو خوبیاں ایسی ہیں، کہ انہیں کسی حد تک سیکھا جاسکتا ہے، خوش طبعی مانس کی

افتیابین نہیں ہو لیکن صبر و تحمل یعنی دوسروں کی خاطر نقصان برداشت کر لینا، اور دوسروں کی عیب جٹی سے پرہیز کرنا، یہ دو صفیں سیکھی جاسکتی ہیں، اور ان کا سیکھنا ہر انسان کا فرض ہی، ان خوبیوں کے بغیر دنیا کے کام چل نہیں سکتے، یہی وجہ ہو کہ انسان کے بہترین پیشواؤں نے ان پر بہت زور دیا، ہمارا مرخان مرخ دوست اس لحاظ سے خوش قسمت ہی، کیونکہ اس کی طبیعت پہلے ہی سے اس طرف مائل ہوتی ہے، اور چون چون اس کا تجربہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اُسے اپنی ان خوبیوں کی اہمیت اور قدر کا احساس بھی ہوتا جاتا ہے، لیکن یہ احساس اُسے مغرور نہیں بنا دیتا ہے، جانتا ہے کہ یہ فطر کا عطیہ ہے، اور وہ اس عطیہ کے لئے فطرت کا شکر گزار ہے، (آل انڈیا ریڈیو لاہور کی اجازت سے)

خ س ع ج

## فن سیرت نگاری

حقیقی سیرت نگاری کا فن مصوری اور آئینہ سازی کے کلاات کا مجموعہ ہوتا ہے، سیرت نگار حسن خوبی اور خصوصیات کا ایسا تحریری مرقع تیار کرنا چاہتا ہے، جو زندگی کی صحیح، مکمل اور حقیقی جاگتی تصویر ہو، سیرت کو صاحب سیرت کا آئینہ اور مرقع ہونا چاہئے، فن سیرت نگاری عبارت ہو آئینہ کی عکس ریزی اور مصور کی قلم کاری سے فن سیرت نگاری کی یہی چسپ سیرت نگاری کو شوق بنا دیتی ہے، اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مکمل فن کیسے ہو سکتی ہے، کتاب کے چند اوراق میں زندگی کا ایک صبح، نفیس، دلپذیر و دلچسپ مخصوص اور موثر مرقع کیونکر بنایا اور سمویا جاسکتا ہے، اور کیا اکی مکمل خوبی و خلوص کے ساتھ ممکن ہے، سواغ نگار صرف کسی ایک واحد دلچسپ پہلو کو پیش نہیں کرتا، بلکہ کسی کی فطرت اور کیرکیر کا مکمل مرقع پیش کرنا چاہتا ہے، دوسری وقت یہ ہوتی ہے کہ اُس کو اس کثیر مواد سے جو اس کے سامنے موجود ہوتا ہے، بڑی خوبی اور احتیاط سے انتخاب کرنا پڑتا ہے، مثلاً کسی شخص کی مشغول زندگی کے سواغ کو پیش کرنے میں سواغ نگار کھیلے

ضروری ہو، کہ وہ اس شخص کے معاملات، اسکی ملاقاتوں اور گفتگو کے بارے میں صحیح اور متوازن معلومات حاصل کرے، یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہوگا، کہ کتنی شخصیتیں اس سے متاثر ہوئیں یا اس نے کتنوں کو متاثر کیا، کتنے خطوط کیسے اور کیوں اس نے لکھے، کتنی اور کیسے خطوط اس کے پاس آئے، ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھ کر سوانح نگار کو اپنے تاثرات پیش کرنا اور اس میں توازن قائم رکھنا نہایت ضروری ہے اس کو صاحب سیرت کے صرف کامیابی اور کامرانی کے زمانہ کا مرقع نہیں پیش کرنا پڑیگا، بلکہ توازن قائم رکھنے کے لئے یہ بھی بتانا ضروری ہوگا، کہ مصائب، رنج و غم و غصہ اور درماندگی سے وہ کس طرح متاثر ہوتا تھا،

ان تمام پہلوؤں کو کہ حد پیش کرنا ممکن نہیں، اصل یہ ہے کہ متوازن سوانح نگاری کا فن انتہائی توازن کے کمال سے عبارت ہوتا ہو، اس لئے یہ فن تمام فنون لطیفہ سے کہیں زیادہ اہم و بلند ہو، یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہو، کہ فن سوانح نگاری بقابلہ دوسرے فنون لطیفہ کے ابھی اپنے ابتدائی مدارج سے گزر رہا ہو، اور بلاتا مل اس کا اقرار کرنا پڑے گا، کہ سوانح نگار کی سب سے بڑی دشواری وہ جذبہ ہو، جس سے انسانیت موت سے متاثر ہوتی ہے، کسی ایسے شخص کی اچانک موت جس کی زندگی مشغول، ہستمد اور روشن تھی، متوسلین کے دماغ کو ایسا مغلل اور پرآگندہ کر دیتی ہو، کہ متوفی کے بارے میں ان کی رائے بالکل بدل جاتی ہے، مکان جس میں متوفی کی آواز اور اس کے قدم کی چاپ اب نہیں سُنی جاتی، اس کی پڑی ہوئی کتابیں، اگر اب واقف، خالی کرسی، ان سب جذبہ محبت کو سخت صدمہ پہنچتا ہے، اور اکثر و بیشتر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ متوفی کا کرکیر فوراً تقدیر اور وقار سے متصف نظر آنے لگتا ہے، اس کے بارے میں کسی اعتقاد یا مضحک بات کی یاد جذبہ احترام کے منافی معلوم ہوتی ہے، اس کی زندگی اور خوش طبعی کی یاد سے دل غموم ہو جاتا ہے، اس وقت سیرت نگار اپنا کام شروع کرتا ہو، اور جب اس کا قلم سیرت نگاری شروع کرتا ہے، اور متوفی



کی لغزشوں، کمزوریوں، نقائص یا اسکی پُرساست حکمت عملی یا کیفیاتِ ذہنی کی قلمی تصویریں تیار ہونے لگتی ہیں، تو صاحبِ سیرت کے پرستاروں میں سیرت نگار کے خلاف ناپسندیدگی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو بلاشبہ سچا غاص اور قابلِ عزت ہوتا ہو اور صرف اس خیال سے جوش میں آتا ہو کہ اون کے ہیر و کوہِ مناسبت یا ناپسندیدہ یا غلط یا مضحکہ انگیز رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے، ایسے وقت میں سیرت نگاری کا کام اس وقت تک کے لئے فوراً بند کر دیا جائے، جب تک متوفی کی یاد کے نقوش مدھم نہ ہو جائیں، معمولاً سیرت نگاری کا کام جلد شروع اور جلد ختم کر دیا جاتا ہے، اور صاحبِ سیرت تمام ہیلوؤں اور اس کی مخصوص اور نمایان خصوصیات کو ہلکا کر کے اوس کے باریک فرق و امتیاز کا خون اور توازن کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے، سیرت نگاری کی سب سے ابتدائی اور سب سے سخت دشواری یہی ہے سیرت نگار کو بطل پرستی کے اثر سے جذبات کی کشش کو بھی دُچار ہونا پڑتا ہے، حقیقت اُو رومان کی یہ قدیم جُک ہے اکثریت کو رومان سے شغف ہوتا ہے، اور وہ شخصیت کو بہترین شکل میں پیش کرنا قابلِ ستائش سمجھتی ہے، اس لئے فنِ سوانح نگاری صرف ایک پامال، بے رُوح جذبات سے بھرپور صداقت سے خالی فن ہو کر رہ گیا ہے جب تک لوگ یہ سبق نہ سیکھ لیں، کہ جس شخص کی عظمت اوس کی سوانح نگاری کی مستحق ہے، اس کی عظمت اسکی بھی مستحق ہے کہ اوسکی زندگی کا نہایت صاف، صمیم اور سچا مرقع پیش کیا جائے، اس وقت تک فنِ سیرت نگاری کی حقیقی عظمت قائم نہیں ہو سکتی، اس رومانی مرقع کو کون پسند کر سکتا ہے جو حقیقت سے یکسر خالی ہو، اگر زندگی کا مرقع تیار کرنا ہے تو اسکی تمکین زندگی کے تمام نشیب و فراز، خوبی و کمزوری، دانائی اور نادانی کے خطوط اور رنگوں سے ہونی چاہئے، لیکن عام قاعدہ کے مطابق جذباتی مدائن اس کا کوئی لحاظ نہیں کرتے، ان کو نہ صداقت کی پرواہ ہوتی ہے، اور نہ وہ توازن کا خیال رکھتے ہیں، وہ صرف ایک دمکتا ہوا پرشوکت مرقع تیار کرنا چاہتے ہیں، اس کا یہ نشانہیں ہو کہ زندگی

کے نامہوار پہلوؤں کا مضحکہ انگیز مرقع پیش کیا جائے، ان پہلوؤں پر زیادہ زور دینے اور ان کو ضرورت سے زیادہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن صداقت اور توازن کا قائم رکھنا ضروری ہے،

سیرت نگاری کی راہ میں ایک اور سنگِ گرانِ حائل ہے، جس کو ہٹانے کی اب تک کوئی کوشش

نہیں کی گئی ہے، وہ یہ کہ عموماً انہی لوگوں کی سیرت اور سوانح لکھے جاتے ہیں جن کے کارنامے اہم اور

روشن ہیں اور یہ فزونِ لطیفہ کے بالکل منافی ہے، بہت سے ایسے لوگ ہیں جو شخصیت کو کارنامہ پر

قربان کر دیتے ہیں جس کام کو وہ اٹھاتے ہیں، اس میں ساری قوت صرف کر دیتے ہیں، اور بڑے

کارنامے بھی وہ انجام دیتے ہیں، اور اس میں اپنی زندگی کھو دیتے ہیں انکی بے ماگی انکی زندگی کو بے

دوب سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیتی ہے ایسی شخصیتیں صرف خشک اور معمولی تاریخی تذکرہ کی مستحق سمجھی جاتی

ہیں ان کا تعلق بجائے سیرت کے تاریخ سے ہو جاتا ہے لیکن ان شخصیتوں کے علاوہ بہت سی ایسی بلند

ہستیاں بھی ہیں جن سے کسی فنی کمال کا اظہار تو کسی میدان میں نہیں ہوا، لیکن ان ہستیوں نے انسانی

جذبات کو ابھار کر متلاطم کر دیا، اور بے شمار لوگوں کی زندگیوں کو اپنی پیش سے گرما دیا، ان کی

باتوں میں نرمی، ٹھنڈک اور حلاوت تھی، ان کی نگاہ میں ہزاروں اشارے پوشیدہ تھے، انھوں نے

زندگی کو پر لطف اور پر معنی بنا دیا، ان کی روشن اور پُرسش شخصیت میں دلیری تھی، لیکن شایہ ہی

کبھی ان ہستیوں کے بارے میں کچھ بھی لکھا گیا ہو، اس کا سبب صرف یہ ہو کہ ان کی پُر تاثیر اور زو

گفتگو کا حوالہ کسی تحریر میں نہیں ہے، کیونکہ ان کی ان نگاہوں اور اشاروں کو جن کی کشش کا بھون

نہیں الفاظ کے جام میں منتقل کرنا دشوار تھا، حقیقت یہ ہو کہ یہ ہستیاں بہترین یاد کی مستحق ہیں

کیونکہ انہی نے ہم کو زندگی کی نیکیوں اسکی اہمیت اور دلکشی سے روشناس کرایا،

سچے سیرت نگار کو صاحبِ سیرت کا بڑا اگر مطالعہ کرنا چاہئے، سیرت نگار اس کو دیکھتا

اور محسوس کرتا ہے، وہ اس کے ظاہر و باطن سے واقف ہوتا ہے، سیرت نگار کو وہ پہلو قطعاً

نہیں پیش کرنا چاہئے جس کو محض وہ اپنے گمان میں جانتا اور دیکھتا ہے، بلکہ اس رُخ کو پیش کرنا چاہئے جس کو وہ حقیقتاً دیکھتا اور جانتا ہے، ایک مشہور مصوّر کا قول ہے، اگر پیشہ در مصوّر اور صاحب ذوق مصوّر میں جو اپنے ذوق کی خاطر مصوّر کی کرتا ہے، یہ فرق ہے کہ پہلا مصوّر اپنے ذہنی خاکہ کی مصوّر کی کرتا ہے، وہ ایک درخت، ٹھکل یا چہرہ کو دیکھتا ہے، پھر اوس کے بارے میں استدلال اور اس کی توجیہ و تشریح کرتا ہے، لیکن آرٹسٹ بالکل بے ساختہ، بلاتامل کسی چیز کی کسی نہج سے پوری خوبی کے ساتھ مصوّر کی کرتا ہے، وہ استدلال اور توجیہ سے بالاتر ہوتا ہے، اوس کے لئے مصوّر کی لوازمات صرف صورت، مختلف رنگوں اور فضل تک محدود ہوتے ہیں، تصویر کی تشریح و توجیہ تصویر دیکھنے والوں کا دماغ کرتا ہے، مصوّر کو تشریح اور توجیہ سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

سیرت نگار کی قوت مشاہدہ نہایت دقیق، قوی، عمیق اور دقت پسند ہونی چاہئے، اس کے لئے صبر، قوت اور تلاش و تحقیق کا ذوق ضروری ہے، اوس میں ایسی صداقت ہونی چاہئے کہ جذبات اور دماغ کے مطالبات کی طرف مطلق کوئی توجہ نہ کرے، اوس کے لئے قابلِ احترام چیز کی بے حتمی کرنا، ایسا ہی نامناسب ہے، جیسا ایک مصوّر کے لئے عیاں کی مصوّر پر امر کرنا لیکن اس قسم کی بطل پرستی کا احترام نہیں، جس کا تقاضا یہ ہو کہ کسی شخصیت کا ایسا مرتع پیش کیا جائے جو داغ دیتے سے بالکل پاک، نور ہی نور ہو،

سیرت نگار میں اصل دقت توازن کی ہوتی ہے، جس میں بلند، اعلیٰ اور پُرمہبت پہلوؤں کو دقیق، پرتون اور نظریات پہلوؤں سے متوازن کیا جاتا ہے زمین کے اندر اور آسمان کے اوپر (بعد موت روح و جسم کی طرف اشارہ ہے) جو اسرار مخفی ہیں، وہ اگر بیان نہ کئے جا سکیں تو اس طرح پیش کئے جائیں جس سے ان کا کچھ ہلکا سا تصور کیا جاسکے، عالی مرتبہ بلند پائے شخصیتیں، ہمیشہ اُن سارے باتوں کا پورا اظہار نہیں کرتیں جن کو وہ جانتی اور محسوس کرتی ہیں، ان کی خاموشی اکثر ان کی

تقریر و گفتگو سے زیادہ ہوتی ہے، سیرت نگار میں پاک اور روح پرور خاموشیوں کی طرف اشارہ کرنے کی صلاحیت بھی ضرور ہونی چاہئے، کیونکہ بڑے لوگوں کی شخصیت کا جھنوں نے عملی کام کئے ہیں ہم کو صرف خفیت پر تو نظر آتا ہے، ان کے بے شمار خفیت اشارے اور جلوے ہماری نگاہیں اوجھل رہتے ہیں، ہم بعض اشخاص سوان کی خرابیوں اور کمزوریوں یا اون کے ساتھ بے جا حسن ظن یا بدظنی یا اون کے عمدہ سلیقہ کی وجہ سے محبت و نفرت نہیں کرتے بلکہ ان کی ذات سے محبت و نفرت کرتے ہیں، اس لئے بہترین سیرت نگار کو اپنے وجدانی سلیقہ سے یہ ضرور معلوم کرنا چاہئے، کہ صاحب سیرت کی سیرت کے اصلی اور بنیادی اجزاء کیا ہیں، اور اس کی محبت کی بنیاد جذبہ شوق نہیں، بلکہ صداقت ہونی چاہئے، وہی سوانح نگار حقیقی سوانح نگار اور خادم فن کہلانے کا مستحق ہے، جو صداقت اور ہنس کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتا ہے، ایسا شخص اپنی صداقت سے دوسروں کو ایمان و یقین پر آمادہ کر سکتا ہے، اور انہیں بتا سکتا ہے، کہ ایسی زندگی جو اس حسن و خوبی کے ساتھ بسر کی گئی ہو، تاکہ اور حرمان نصیبیوں کے باوجود اس زندگی سے کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع اور دلکش ہے، جس کا سرٹ خیالی اور روحانی مرقع پیش کیا گیا ہو،

”نص“

## خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۲ء عیسوی میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دیئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانوں نے ان کو بے حد پسند کیا۔ یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے۔

فہرست ۱۔ ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۱۵ پر

”منیجر“

# احسان علیہ

## جامعہ اذہر کی ہزار سالہ جوبلی

سنہ ہجری کے حساب سے مصر کی مشہور عربی یونیورسٹی جامعہ اذہر کی تیسری ایک ہزار سال پوری ہو گئے، اس لئے اذہر والوں کو عرصہ سے اس کی ہزار سالہ جوبلی منانے کا خیال تھا، اور اس کیلئے تاریخ بھی مقرر ہو گئی تھی، جس کی صدارت شاہ فاروق کرنے والے تھے، لیکن ان کی علالت کی بنا پر اسے پھر ملتوی کر دیا گیا، اس جامعہ کی بنیاد ۳۵۹ھ مطابق ۹۶۹ء میں پڑی تھی، اس کا بانی معز لدین الحمد فاطمی کا مشہور جنرل جوہر ہے، اس جامعہ سے ہر سال ۱۱۰۰ طلبہ فارغ ہو کر نکلتے ہیں، پہلے یہاں صرف قدیم اور دینی علوم کی تعلیم ہوتی تھی، اب ضرورت کے مطابق اس کے نصاب میں جزافیہ، تاریخ اور ریاضی بھی داخل کر دیئے گئے ہیں، یہاں ترکی، افغان، عراق، فلسطین، شام، فارس، ہندوستان، جاوا، سائبرا، حجاز، سوڈان، حبشہ، چین، غرض ساری دنیا سے اسلام کے طلبہ حصولِ تعلیم کے لئے آتے ہیں، اس جامعہ کی سالانہ آمدنی ۵۰۰۰۰ پونڈ یعنی ۵۰۰۰۰ روپے ہے، ہر طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی، یہاں کے موجودہ شیخ الاذہر مصطفیٰ امراغی ہیں۔

## کویت اور مسقط کی ترقیان

کویت اور مسقط عرب کی نہایت چھوٹی ممالک ہیں، لیکن اپنی ترقی کے لحاظ سے وہ عرب

بڑی حکومتوں سے کم نہیں، کویت کی گذشتہ سال کی تعلیمی رپورٹ اور آئندہ تعلیمی بحث سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہاں کا تعلیمی شعبہ، تعلیم کی اشاعت میں بڑی کوشش کر رہا ہے، اور جدید و قدیم دونوں تعلیموں کی طرف پوری توجہ ہے، چنانچہ نئی تعلیم کے لئے جدید طرز کی دو بڑی عمارتیں احمدیہ اور مشرقیہ بن گئی ہیں، دیہاتوں میں ابتدائی تعلیم کے مدارس کھولے جا رہے ہیں، اعلیٰ تعلیم کے لئے طلبہ بیرونی ملکوں میں بھی بھیجے جاتے ہیں، غریب طلبہ کو ہر طرح کی مدد دی جاتی ہے، بچوں کی جسمانی تربیت کی ترغیب کے لئے روضۃ الاطفال کا قیام بھی پیش نظر ہے، تفسیر حدیث اور فقہ کی تعلیم اور مذہبی لکچروں کے لئے علیحدہ ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے،

مسقط کی ریاست میں بھی نمایاں ترقی ہو، شہر میں بجلی کی روشنی جاری ہو گئی ہے، نئی عمارتوں میں حسن و ترتیب کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے، شہر کی صفائی اور حفظانِ صحت کی طرف پوری توجہ ہے، تعلیم و تجارت روز افزوں ترقی پر ہے، ڈاک کا انتظام ترقی یافتہ ملکوں سے کم نہیں، گھر گھر ریڈیو بچا ہوا، چشم بد و دورانِ ترقیوں کے بعد انھیں غیر مذہب کوں کہہ سکتا ہو،

## بعض علمی نوادر

اورنگ آباد کے ایک شائقِ علم جناب محمد گیسو دراز خان نے اپنے کتب خانہ میں نادر علمی کتابوں کا بڑا قابلِ قدر مجموعہ جمع کیا ہے، ان میں سے چند قلمی نسخوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے،  
(۱) تعمیر بنی مقبرہ، اورنگ آباد میں اورنگ زیب کے لڑکے نے تاج محل کا ایک نقش نامی تعمیر کرانے کی کوشش کی تھی جس میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوا، اسکی تعمیر سے متعلق چند قلمی کائناتیں ہیں، جو نہ صرف تاریخی نقطہ نگاہ سے اہم ہیں، بلکہ مخلوق کے زمانہ عروج کے فنِ تعمیر کی ترقی

کے بارے میں بھی کافی معلومات ہم پہنچتے ہیں (۲) دیوان دلی دکنی، اس نسخہ میں بہت سی غزلیں ایسی ہیں، جو دوسرے قلمی نسخوں میں نہیں ہیں، یہ نسخہ ۱۴۵۷ھ میں نقل کیا گیا تھا (۳) مثنوی میر حسن کا ایک نامور قلمی نسخہ ہے (۴) فن خطاطی کا الم، اس الم میں فن خطاطی کے سترہ اٹھارہ نمونے موجود ہیں، (۵) مجموعہ عالمگیری، مولفہ امیر قوام الدین سہنی اس کتاب میں خواجہ معین الدین حسینی شیخ فیض اللہ چراغ دہلی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے متعلق کافی مواد موجود ہے

## دنیا کی سب سے بڑی لغت

یعنی ایک ایسی لغت تیار کر رہے ہیں، جو الفاظ کی کثرت معنی کی تشریح اور لکھائی چھپائی کے اعتبار سے دنیا کی سب سے زیادہ مکمل اور عظیم الشان لغت ہوگی، یہ لغت چھ ہزار مختلف چینی رسم الخط میں شائع ہوگی، اور اس کی چالیس جلدیں ہوں گی، اس کی مکمل میں دس برس لگیں گے پہلی جلد جس میں ۴۸۰۰۰ اوراق ہوں گے، صرف ایک چینی لفظ "زی" کے تمام مشتقات اور اس کے معنی پر محیط ہوگی، اس کے ساتھ ہی ساتھ ۱۱۰۰ مختلف قسم کے الفاظ اور محاورے بھی ہوں گے، اس سے اس لغت کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے،

## ایک نوا بجا دکھڑی

حال ہی میں ایک یورپین فرم نے ایک ایسی گھڑی بنائی ہے، جس میں کوک دینے کی قلمی ضرورت نہیں، اب تک جتنی گھڑیاں بھی ہیں، خواہ وہ کھائی کی ہوں یا چھبی، دیوار کی ہوں یا ناؤ رکھا، اس میں ۲ گھنٹے، ایک ہفتہ یا اٹھارہ دن یا مہینہ بھر میں چابی دینا ضروری تھا، لیکن اس نوا بجا گھڑی میں جس کا نام آٹومس (Atmos) ہے، کوک دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ سہ

موسم کے تغیرات گرمی سردی برسات اور بہار کے اثرات اور ہوا کی ہلکی سی لہر کے اثر سے خود بخود کوکب بھر جاتی ہے، اس میں نہ تو بڑی استعمال ہوتی ہے، اور نہ برقی لہرین، غرض یہ گھڑی جب دنیا قائم ہو بغیر انسانی مدد کے متحرک رہے گی،

## طاقت بخش حیاتین

جب موجودہ جنگ کے ہولناک شعلوں نے دنیا کی اقتصادیں، معاشرتی حالت اور مختلف کارخانوں کو اپنی آتشیں لپٹ سی خاکستر کر دیا ہے، اس وقت سے سائنس دانوں کو ایسی بہت سی نئی چیزوں کی طرف توجہ کرنا پڑی ہے، جنہیں جنگ نے ضروری بنا دیا ہے، جرمینی میں چونکہ خوراک کی کمی ہے، اس لئے وہاں کے سائنس دان ایسی حیاتین تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی ایک خوراک دن بھر کے کھانے کا کام دیگی،

## ایک بڑا پھول

شمالی مغربی امریکہ کے جھگن میں ایسے پودے پائے جاتے ہیں، جن میں گلابی رنگ کے حسین پھول کھلتے ہیں، ان پودوں کا قد عموماً چھ فٹ ہوتا ہے، اور ان کے پھول اتنے بڑے ہوتے ہیں، کہ اس کی ہر پتی ڈیڑھ دو فٹ لمبی ہوتی ہے، ان پھولوں میں نزاکت سجھ ہوتی ہے، اور پھولنے کے ساتھ ہی سمٹ جاتے ہیں، اس پھول کا نام لیکوڈلفیا (Lycodium) ہے۔

— (Fia)



# آپ علیہ السلام

## مولانا شبلی مرحوم کے دو غیر مطبوعہ خط

از

مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رامپور

مولانا شبلی مرحوم اور کتب خانہ ریاست رامپور میں بہت قدیم علمی رابطہ تھا، غالباً اس کا آغاز الفاروق کی تصنیف کے وقت ہوا ہے، کیونکہ سب سے پہلے اسی کتاب کی تالیف کے لئے سالہ جمع کرنے میں مولانا نے ہندوستان کا کونا کونا چھانا، اور جب یہاں مزید معلومات ملنے سے ناامید ہوئے تو ممالک اسلامیہ کا سفر اختیار فرمایا تھا،

کتب خانہ کی کتاب معائنہ میں مولانا کی پہلی تحریر ۹ ستمبر ۱۸۹۹ء کی لکھی ہوئی ہے، یہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کا رامپور میں ورود ستمبر ۱۸۹۹ء ذکر ہوا بالاین ہوا، تحریر کے الفاظ یہ ہیں: ”میں نے کتب خانہ کو کسی قدر تفصیل سے دیکھا، چونکہ میں کتب خانہ کی ایک مفصل رپورٹ لکھنا چاہتا ہوں، اس لئے اس موقع پر اسی قدر لکھنا کافی ہو گا، کہ یہ ایک بے مثل کتب خانہ ہے، منتظران کتب خانہ مستعد اور کارگزار ہیں، خصوصاً مدعی علی خان صاحب کو اس قدر واقفیت اور تجربہ ہے، کہ ایسے عظیم الشان دارالکتب کی ایک ایک کتاب کا نمبر و نشان اس کی حالت گویا ان کا آنکھوں کے سامنے ہے، فرست کی اگر معقول ترتیب ہو جائے

تو نہایت آسانی ہو، مولوی عبید اللہ صاحب نے بہت کچھ کام کیا ہے جو قابلِ مدح ہے،  
لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ محمد شبلی پروفیسر مدرستہ العلوم علی گڑھ۔

۹ ستمبر ۱۹۰۹ء

اس میں جس مفصل رپورٹ کا ذکر ہے، وہ معارف بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں مین نے شائع  
کرادی ہے، اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں مولانا کتب خانہ تشریف لائے تھے، اس موقع پر آپ نے کتابخانہ  
میں جو تحریر لکھی تھی، وہ بھی معارف کے سابق الذکر شمارے میں چھپ چکی ہے، مگر چونکہ چند سطروں سے  
زیادہ نہیں ہے، یہاں دوبارہ نقل کرتا ہوں، فرماتے ہیں:

”میں اس کتب خانہ سے بارہا متمتع ہوا ہوں، ہندوستان کے کتب خانوں میں اس سے  
بہتر کیا اس کے برابر بھی کوئی کتب خانہ نہیں، میں نے روم و مصر کے کتب خانے بھی دیکھے ہیں  
لیکن کسی کتب خانہ کو مجموعی حیثیت سے میں نے اس کو نقل نہیں کیا، اہل کاران کتب خانہ  
کی محنت اور وسعتِ اطلاع کی داد دینی چاہئے، خصوصاً مدعی علی خان صاحب تو خود  
ایک زندہ کتب خانہ ہیں۔“

شبلی نعمانی۔ ۶ اپریل ۱۹۱۳ء

مولانا نے اپنے پہلے سفر کے بعد حکیم اجمل خان مرحوم اور حافظ احمد علی خان مرحوم کے نام جو خط  
تحریر فرمائے تھے، ان میں سے صرف دو کتابخانے کے ایک پرانے خاں مین ملتے ہیں، چونکہ ان سے  
شاعری کے متعلق مولانا کی رائے معلوم ہوتی ہے، نیز شعرانجم کی تالیف کے آغاز پر مفید روشنی پڑتی  
ہو اسلئے معارف کے ذریعہ اہل ادب تک اس تحفہ کو پہنچا رہا ہوں،

۱۔ مولانا کا پہلا خط غالباً حافظ احمد علی خان شوق مرحوم سابق ناظم کتابخانہ کے نام ہے، حافظ  
صاحب مرحوم اوس زمانہ میں کتابخانہ کے منصرم تھے، اور نجی طور پر مطبع احمدی جاری کر کے ادب

ایک ماہانہ گلدستہ نکالتے تھے، اس خطابین انقلاب سرے سے محذوف ہے، صرف تسلیم سے شروع کر دیا گیا ہو فرماتے ہیں:

”۱۲ جنوری ۱۸۹۰ء

## تسلیم

والا نامہ میری غیبت میں آیا، میں ایک ضروری کام سے وطن گیا ہوا تھا، آج واپس آیا ہوں، آپ نے جس غایت اور لطف سے ایک نیازمند کو یاد کیا ہے، اس کا شکریہ کس زبان سے ادا ہو سکتا ہے،

گلدستوں کا میں بہت محال ہوں، نہ اس لئے کہ مجھ کو ایشیائی شاعری سے اجتناب بلکہ اس لئے یہ چیز اجیرن ہو گئی، گلدستہ میں اگر بالائزام شاعری کی حقیقت، عرب، فارس اور ہندوستان کی شاعری کی تاریخ، ان کا باہم موازنہ اور اس قسم کے امور پر تحقیق نہ آٹھیل ہوا کرین، تو اشعار کا حصہ بھی پڑھو، وہ نہ چٹنی کو مستقل غذا بنانا ایک بیفائدہ کوشش ہو، نئے مذاق کی شاعری زیادہ نہیں چل سکتی، مولوی حالی صاحب کا میدان ہو چکا اور ان کی چال پر جو لوگ چلتے ہیں، بالکل تقلید معلوم ہوتی ہو تحقیقات شاعری کا عنوان لے کر ہرچہ میں کچھ نہ کچھ لکھا جائے، تو البتہ ایک کام کی چیز ہوگی لیکن اس کے ساتھ چھپائی اور کاغذ کی عمدگی بھی جب تک اول درجہ کی نہ ہو، لوگ اس کی طرف توجہ نہ کریں گے،

میں بہت کم شعر کہتا ہوں دو تین سال میں ایک آدھ نظم ہو جاتی ہے، اور وہ اسی وقت کسی اخبار وغیرہ میں شائع ہو جاتی ہے، اس لئے غیر مطبوعہ کلام پیش نہیں کر سکتا، انفاذ و جواب چھپ رہی ہے، اس کے دیباچہ کے لئے کچھ اشعار موزون کئے تھے، اب اس کے درج کرنے کا ارادہ نہیں ہے، وہ البتہ غیر مطبوع ہے اس لئے نذر خدمت ہے، لیکن گلدستہ میں

اس کی کھیت کس تقریب سے ہو سکتی ہے، بہر حال تعمیل فرمائیں کرتا ہوں،

زردہ ابھی ڈاکخانہ میں ہو چکا ہے گا، اس وقت رسید لکھو چکا،

من کہ یک چند ز دم نہ خوشی برب کس چہ دانکہ دین پڑہ چہ سودا کردم  
مغل ابادہ دوشینہ نیا سودہ بہوز بادہ تذرازدوش بہ مینا کردم  
پیکرے تازہ کہ خواہم بہ حریفان بنود نئے از ذوق خودش نیز تماشا کردم  
می توانم کہ دم در تن اندیشہ روان منکہ دریوزہ فیض از دم عیسی کردم  
شاہد را کہ کس پرودہ ز رویش نگرفت گرہ از بند قبایش بہ فسوں دا کردم  
سخن از پایہ سقراط و فلاطون بگذشت نامہ از نوز روح القدس املا کردم  
بسکہ ہر بار گمراہش گذشتم زین راہ دشت معنی ہمہ پڑلو و لا لا کردم  
لب ز غیازہ نمی بست قدح نشان پارہ از جگر افشردہ بہ صبا کردم  
والسليم شبلی علی گڑہ

۱۲ جنوری ۱۸۹۶ء

۲۔ مولانا کا دوسرا خط حکیم اجل خان مرحوم کے نام ہے، اس لئے کہ اس کی پشت پر موصوف نے

اپنے قلم سے یہ عبارت حافظ احمد علی خان مرحوم کو لکھی ہے:

”حافظ صاحب، اس کا مناسب جواب مولوی صاحب کو لکھ دیجئے، اگر آپ بندوبست

کر سکتے ہیں، تو کر دیجئے“ اجل ۲۶ مئی ۱۹۰۳ء

۳۔ معادف معلوم ہوتا ہے کہ اناروق کے دیباچہ کے لئے مولانا نے جو نظم لکھی تھی، اس کے سب اشعار دیباچہ

میں شامل نہیں فرمائے، کیونکہ اس میں آخری شعر نہیں ہے وہ دونوں نظموں کے بعض مصرعوں میں بھی کہیں ایک دو نظموں کا

اور کہیں پورے مصرع کا تغیر ہے،

اصل خطا اس طرح شروع ہوتا ہے :-

”مکرم ما

مین نے اب ایک عربی دان کاتب مقرر کر دیا ہے، جو غالباً صحیح لکھے گا، جداگانہ صحت کا اہم  
نہیں ہو سکتا تھا، فرمائے تو اجزاء اطرار شدہ بھیجتا جاؤں،

ہاں یہ ارشاد ہو کہ کتب خانہ راہپور سے تمتع ہونے کی کیا صورت ہے ؟

مین فارسی شاعری کی نہایت مبسوط تاریخ لکھنا چاہتا ہوں، فردوسی، فرخی، عبد الوہاب،  
اتوری، سلمان سادجی، حکیم سنائی، عربی، نظیری، منوچہری، دامغانی کے حالات تذکرہ کرنے سے نقل کرنا  
ارسال فرمائیں تو نہایت کرم ہوگا،

کاتب نقل کرے اور اجرت کاتب مین ادا کر دے گا لیکن دولت شاہ سمرقندی مجمع الفصحا جزا  
عامرہ، مرآۃ الخصال، سرخوش سے نقل کرنے کی ضرورت نہیں، یہ کتابیں یہاں بھی موجود ہیں،

والتسلیم  
شبلی

حیدرآباد، ۲۱ مئی ۱۹۰۲ء

اس خطا کے پہلے پرے مین جن اجزاء کے کتاب کا ذکر ہے، وہ مفتاح السادۃ کے اجزاء تھے،  
کتاب مولانا شبلی رحوم کے توسط سے کتابخانہ امنیہ حیدرآباد سے نقل کرائی گئی تھی،

## مکاتیب شبلی حصہ اول دوم

مولانا رحوم کے دوستوں عزیزوں شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں مولانا کے قومی خیالات  
اور علمی تعلیمی اور ادبی نکات ہیں اور حقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے،  
”مینبر“

قیمت جلد اول عا، جلد دوم بر، مکمل سٹ، سے

# بَابُ التَّقْرِيرِ وَالنَّقْدِ

## آفتاب

مرتبہ جناب خورشید الاسلام صاحب مدد آفتاب مجلس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تقطیع اور سناخت

۲۸۷ صفحے کا تذکرہ کتاب و طباعت بہتر قیمت معلوم نہیں، صدر مجلس سے ملے گی،

آفتاب ہال مسلم یونیورسٹی میں آفتاب مجلس کے نام سے طلبہ کی ایک علمی مجلس ہے جس کا مقصد ان میں تحریر و تقریر کا ملکہ اور علمی ذوق پیدا کرنا، اور ان کی مذہبی اور سیاسی تربیت ہے، صدر مجلس نے آخری مقصد کے تحت میں چند تجدیدی و اصلاحی مضامین اور بعض دینی و سیاسی مجددین کے حالات کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں سات مضامین ہیں، ”تجدید و احیاء دین“ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ”اسلامی تہذیب پر دوسری تہذیبوں کے اثرات“ جناب عبداللطیف صاحب اعظمی، ”انیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے“ جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی، حضرت امام غزالیؒ جناب ملک حامد حسین صاحب، ”مختصر سیرت محمد بن عبد الوہاب نجدی“ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، علامہ سید جمال الدین افغانی، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، جمال الدین افغانی، جناب اسلوب احمد صاحب انصاری، سید غالب ایک دہ مضمون کے علاوہ باقی سب مضامین مختلف سالون میں چھپ چکے ہیں، اور مجلس کے مقصد کے لئے مفید ہیں، تصوف کے متعلق ضیاء احمد صاحب کی تحقیق سنجیدہ ہے، لیکن عبداللطیف صاحب اعظمی

اور ملک حامد بن صاحب کے معانی میں بعض بڑی فاحش غلطیاں ہیں، مثلاً اعلیٰ صاحب لکھتے ہیں:-  
 ”مسلمانوں کو غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ بعض شرعاً کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے، اس لئے انھوں  
 نے ہندو لڑکیوں کے ساتھ نہایت کثرت سے شادیاں کیں کتا بیہ عورتوں کے ساتھ تو بیٹھ شادی  
 جائز ہے لیکن ہندو عورتوں کے ساتھ قبول اسلام کی شرط کے علاوہ معلوم نہیں اور کون سی شرط پر جائز  
 یا ابن عربی کا یہ خیال کہ خدا کے اصلی نام تین ہیں، اللہ، تمیز، رب اور دوسرے تمام اس کے ماتحت ہیں،  
 عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث سے ماخوذ ہے، ممکن ہے ابن عربی نے کہیں یہ خیال ظاہر کیا ہو، لیکن اسکو  
 تثلیث سے کیا نسبت، تثلیث میں تو تین علیحدہ علیحدہ مستقل مجسم وجود پیکر اور کو خدا کی ذات میں شریک  
 جانا جائز ہی، اور ابن عربی تو اس کے قائل نہیں، پھر ابن عربی نے تو عام اہل سنت کے مطابق یہ تسلیم کیا کہ  
 کہ اصل صفات الہی سات ہیں، رفوعات، مکیہ، جداول، منہ، امر، یا بلخ، کاشن، زادہ، ابراہیم بن ادہم بدھ  
 کے حالات سے استفادہ متاثر ہوا کہ خلعت شاہی اتار چھینا، اور جنگھون کی راہ لی، اولاً حضرت ابراہیم  
 ابن ادہم کی شاہزادگی کی روایت بالکل عامیانہ ہی، آپکا وصال خود مضمون نگار کے قول کے مطابق  
 ۱۶۱۱ یا ۱۶۱۲ء میں ہوا، جو مہدی عباسی کا زمانہ تھا، اور اس زمانہ میں اندس کے علاوہ اسلامی  
 ممالک کا کوئی حصہ بنی عباس کے قبضہ سے نہ نکلا تھا، اور نہ کہیں امارت و حکومت قائم ہوئی تھی، پھر  
 ابراہیم بن ادہم کس حکومت کے شاہزادے تھے، دوسرے یہ کونسی منطق ہی، کہ جس شاہزادے نے  
 دنیا چھوڑی تو محض بدھ کے حالات سے مشابہت کی بنا پر اسے بدھ کے اثر کا نتیجہ قرار دیا جائے، اس قسم  
 کی اور بھی بعض غلطیاں ہیں، جن کی تفصیل کی اس مختصر ریویو میں گنجائش نہیں، ملک حامد بن صاحب  
 مضمون تو اور بھی لکھا اور غلط اسے برزیہ ہے، چند موٹی موٹی غلطیاں یہ ہیں، مثلاً ”ابن سینا کا خیال  
 تھا کہ شرع کے احکام و ریاست کے قوانین صرف عامۃ الناس کے لئے واجب العمل ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا  
 مقصد یہ تھا کہ بدویوں کو مذہب بنائیں، اس مقصد کے لئے انھوں نے علاوہ اور باتوں کے خیراً“

کی تعلیم دی، یا ابن رشد اپنے کو قطعاً اسلام سے آزاد خیال کرتا تھا، فیلسفی فلسفہ کو اسلام پر ترجیح دیتا تھا، اس کا خیال تھا کہ جو کچھ قرآن میں ہے، اُسی کو بغیر چون و چرا کے مان لینا چاہئے، اسی کو وہ حق بتاتا ہے لیکن ایسا حق جو طفل بطعے کے لوگوں کے لئے موزوں ہو، اور اسکی وقعت قصۃ کہانیوں سے زیادہ نہیں، فلسفہ ایک بلند چیز ہے اور حقیقی وجود کا پتہ دیتا ہے، یا امام غزالی کے نزدیک خیرِ اجداد پر عقیدہ نہ رکھنے سے اسلامی عقیدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ان میں سے ایک بات بھی صحیح نہیں ہے، ابن سینا اسلام کو دینِ حق سمجھتا تھا، اور خیرِ اجداد کا قائل تھا، النبیات شفا میں لکھتا ہے، کہ اس پکی شریعت نے جو ہمارے پیغمبر ہمارے آقا ہمارے سردار محمد ﷺ علیہ وسلم لے کر آئے جہانی مذاہب و ثواب کا حال نہایت تصریح سے بیان کیا گیا ہے، کیا شریعت کو بدویوں کا قانون سمجھنے والے اور محاد جہانی کے منکر کے یہی الفاظ ہو سکتے ہیں، البتہ عالمِ آخرت کی لذات کے متعلق اس کا خیال ہے کہ جہانی لذتیں عوام کے لئے ہیں، خواص کے لئے اس سے بلند تر روحانی لذات ہیں اس خیال کو بھی خیرِ اجداد کے انکار سے کوئی تعلق نہیں، ابن رشد کے خیالات کو نہایت مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے، فصلِ المقال اور کشف الادلہ میں قسراً فی احکام پر فلسفیانہ غور و فکر کے بارہ ہیں اوس نے تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینِ حق ہے، اور وہ خود معرفتِ حق کے لئے فلسفیانہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، فلسفیانہ طریقِ تفکر صحیح نتیجہ پر پہنچاتا ہے، اس لئے اس سے مذہب کی مخالفت نہیں بلکہ انکی تائید اور مراعات ہوتی ہے، اور کلامِ مجید میں خطابی اور اتقائی اور ہدائی اور قیاسی دونوں طرح کے دلائل ہیں جن سے عوام اور اہلِ علم معنی کھلا اور مفلاسفہ دونوں کی تشفی ہو جاتی ہے، اس لئے حکما کو برہانی اور قیاسی نقطہ نظر سے اس پر غور و فکر کرنا چاہئے، اور آیاتِ قرآنی کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کے معنی بالکل ظاہر ہیں، اور ان کے ظاہری معنی کو بغیر کسی تاویل کے ماننا عوام اور اہلِ علم دونوں کے لئے ضروری ہے، دوسری وہ جن میں ظاہری معنی کے علاوہ دیکھنا تاویل بھی ہو سکتی ہے، اس میں حکما کو فلسفیانہ غور و فکر اور تاویل کی اجازت ہے لیکن عوام کے سامنے اس کا اظہار کفر ہے، بلکہ ایسی کتابوں میں بھی اس کا اظہار



نہ ہونا چاہئے جن پر عوام کی دسترس ہو۔ ”مضمون نگار کے نقل کردہ خیالات اور اس خیال میں کیا نسبت اسی طرح امام غزالی کی جانب جو قول منسوب کیا گیا، وہ بھی غلط ہے، وہ حشراجہاد پر یقین نہ رکھنے والے کو کا فر سمجھتے تھے، جیسا کہ تہافت الفلاسفین میں ہے، اسی بنا پر انھوں نے ابن سینا کی تکفیر کی ہے، احیاء العلوم ان کی آخری کتابوں میں ہے، اس میں اس کا ذکر ہے، لطف یہ ہو کہ ان لوگوں کے مقابلہ میں مصنفین اخوان الصفا کو جن کی مکرہامیان طاہرین، مصلحین اور منصور طاح کو عارف کامل تسلیم کیا گیا ہے، بعض واقعات تاریخی حیثیت سے بالکل غلط ہیں، مثلاً امام غزالی کے تجدیدی کارناموں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ ترک رسلوتی (جاہل تھے، اس لئے ان کے زمانہ میں وہ فنون جو حقیقت قوم کی رہنمائی کرتے ہیں، سرے سے غائب تھے، اور ان کی جگہ ان فنون کا زور تھا، جو دربار میں قدر و منزلت رکھتے تھے، اور جو سر اسر خرب اخلاق تھے، اور جن سے انسانوں میں پست بستی، بزدلی اور بے غیرتی پیدا ہوتی ہے، ان حکومتوں نے اگر کوئی خدمت کی تو بس اس قدر کہ ایک طرف یونان، روم اور عجم کے جاہلی فلسفہ کو جن کا توں اسلام میں پھیلادیا، اور دوسری طرف اپنی دولت کے ذریعہ اسلامی معاشرت میں جاہلی علوم و فنون کو جاری کیا، یہ ان سلجوقی ترکوں کے متعلق کہا جاتا ہے، جن میں الپ ارسلان اور ملکشاہ جیسے جلیل القدر فرمانروا پیدا ہوئے جنھوں نے ایک طرف عباسیوں کے زوال کے بعد اسلامی سیاست کے مردہ قالب میں جان ڈالی، دوسری طرف ان کی فیاضی اور ان کے وزیر نظام الملک کی علم نوازی نے بغداد کے مشہور دارالعلوم نظامیہ کی بنا ڈالی جو ساری اسلامی دنیا کا تعلیمی مرکز بن گیا، اگر ان کے یہ کارنامے تحریب اخلاق اور بزدلی، پست بستی اور بے غیرتی پیدا کرنے کے ضمن میں آتے ہیں تو بیشک مضمون نگار کا بیان صحیح ہے، یونانی اور رومی فلسفہ تو ان سے مدتوں پہلے مامون کے زمانہ میں رائج ہو چکا تھا، اس کا الزام غریب ترکوں کے سر ڈالنا کمان ٹپک صحیح ہے، غالباً یہ مضمون کسی انگریزی مضمون یا کتاب سے اخذ و ترجمہ ہی، ورنہ اتنی غلطیاں نہ ہو سکتی تھیں، اگر مضمون نگار تنہا اردو کتابوں

سے یہ مضمون لکھتے، تو اس سے کہیں زیادہ صحیح معلومات ان کو مل جاتے، ضرورت ہے کہ ایسے مضامین کی اشاعت سے پہلے کسی صاحبِ نظر کو دکھالیا جاسکے، ورنہ اسلامی تاریخ کے متعلق طلبہ کے سامنے اسی قسم کے نادر معلومات آیا کریں گے، ”م“

## ”ششم عشرت“

کتاب و طباعت بہتر، ضخامت ۳۸۳ صفحے، پتہ :- حسین منزل، گیا،  
 جناب سید احمد علی عشرت مرحوم گیا صوبہ بہار کے رئیس اور کنہ شوق شاعر تھے، انھوں نے  
 ۵ اربوہ ۱۹۱۷ء کو انتقال کیا، اور ایک دیوان اور ایک بیاض اپنی یادگار چھوڑا، آج تقریباً بیس  
 صدی کے گزر جانے پر اس دیوان کو ان کے لائق شاگرد رشید جناب سید حسن امام صاحب رئیس گیا  
 نے مرتب شکل میں عمدہ کاغذ، عمدہ کتابت اور عمدہ طباعت کیساتھ شائع کیا ہے، لیکن دیوان کی اشاعت  
 کا مقصد تاجرانہ نہیں ہے، بلکہ خالص ادبی ذوق اور اپنے استاد کی ایک یادگار کو زندہ رکھنا ہے،  
 اس لئے یہ قیمتی فروخت نہیں ہوتا، بلکہ تماشا شہزادہ بابِ ذوق اور پبلک اداروں کو بلا قیمت ہدیہ نذر  
 کیا جاتا ہے، صاحبِ دیوان کو معلوم نہیں کہ تلذذ کس سے حاصل ہے، لیکن وہ غالب کے شاگرد نادر شاہ  
 خان صاحب شوخی رامپوری کے فیضِ صحبت سے جن کا قیام اکثر گیارہین رہتا تھا، بہت زیادہ  
 مستفید ہوئے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ با انیمہ وہ ”دلی اسکول“ کے رنگ سے بہت کم متاثر ہوئے، او  
 زیادہ تر غزلیں لکھنؤ کے طرز میں لکھیں، مثلاً شوق لکھنؤ کی طرح اکثر سیر حاصل غزلین، بلکہ جا بجا دولہ  
 لکھتے ہیں اور بعض اشعار میں لکھنؤ کا رنگ صاف نمایاں ہے، مثلاً

جب مرگ ترش رو نظر آئی دم آخر      تو ناخوار نشہ غفلت ہوا ہوا  
 دگ ترش رو کی ترک اسی لئے اختیار کیا ہے، کہ ترش، سے نشہ اتر جاتا ہے

سُرخ جوڑا خونِ سبیل کا ہوا زیبِ بدن      پھٹ پڑا جو بن عروسِ خنجرِ حلاوت پر  
کیسں کیسں ناسخ کی مضمون بند ی اور تیشی رنگ بھی موجود ہی مثلاً

لاغز ایسا ہوا ہے جسمِ نحیف      موے مژگانِ چشمِ عفا ہے،

اہلِ دولت کو کیسں پایا نہیں حاجت روا      وجہِ رخِ تشنگی آبِ گہر ہو تی نہیں

غیر ممکن ہی کہ پائے عالمون کو فیض      آبِ خنجر سے گیا و خشک تر ہو تی نہیں

لیکن بایں ہمہ ان کا کلام کھنوکے ابتدال و رد کا کت سے بالکل خالی ہی مبتذل مضامین

معشوق کے خارجی اور جسمانی اوصاف، انگیا، چوٹی، آئینہ و شانہ، پازیب اور چھانگل وغیرہ کی توصیف

و توصیف سے ان کے دیوان کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگا ہے، اگرچہ عشق و محبت کے لطیف و رقیق

جذبات ان کے کلام میں زیادہ نہیں پائے جاتے، تاہم مضامین جس قدر ہیں، پاکیزہ ہیں، اور اگر دیدہ ریزہ

سے انتخاب کیا جائے، تو بہت سے لطیف اور بلند اشعار بھی ان کے دیوان سے نکالے جاسکتے ہیں، چند مثلاً

ملاحظہ ہوں،

اے دامنِ دشتِ بخت تو ہی      پردہ ہے مری برہنگی کا

یونہی لاکھ بار جیتے یونہی لاکھ بار مرتے      تری دہگزرینِ ظالم جو مرا مزار ہوتا

ساقی نے اوس کو بہرِ صبو جی کیا پسند      چمکا نصیب اب قدحِ آفتاب کا

دونوں جہان ملے مجھے تیری تلاش میں      لیکن پتہ نہیں ترے قصرِ جلال کا

نفس کی تیرے رونق ہوگی کیا ہم دل گرفتوں کو      چھوڑا یا تو نے اوصیاءِ ناقی آشیانِ ہم سے

مجھے راحت طلب کدی نہ کوئی خوف ہو اسکا      شبِ قرقت میں ورنہ جان دینا کون مشکل ہی

اور بعض غزلیں تو اول سے آخر تک سوز و گداز کے مضامین سے لبریز ہیں مثلاً

سونے دے شوہرِ حشر کہ ناآرمیدہ ہوں      میں ساری زندگی کا صوبت کشیدہ ہوں

کیا پوچھتے ہو کس نے خاطر کشیدہ ہون  
حرمانِ چشیدہ، غمزدہ آفتِ رسیدہ ہون  
میا و صدقہ کر کے مجھے چھڑ دی کہ میں  
دگب بہارِ گلشنِ ہستی ندیدہ ہون  
اک تم کہ جز نشا و طرب کام نہیں  
اک میں کہ بہرِ رنج و المِ آفریدہ ہون  
کیا نہ ہر مرگ بھگو بھلا ناگوار ہو  
میں نامرادِ تلخی، ہجرانِ چشیدہ ہون  
کیسا زمانے میں ہو وجود و عدم مرا  
اک حرفِ آرزو و زباں نارسیدہ ہون  
مجھ بال و پڑ سکتے کیا رب ہو تو کفیل  
از دامِ جستہ تا بچن نارسیدہ ہون  
ابھائے خاکِ خارِ تعلق مجھے کہ میں  
اس خارزارِ دہر سے دامنِ کشیدہ ہون  
بحرِ جان میں خس کا سہارا نہیں ہے  
وہ تھختہ تر شلستہ بطونِ رسیدہ ہون  
سب دیکھتے ہیں، حال کا پرسان کوئی نہیں  
گویا کہ میں کسی کی شبیہ کشیدہ ہون  
صیادِ مصیرون کی حالت بتا تو کچھ  
میں مدّتوں سے حالِ چمنِ ناشیدہ ہون

اس قسم کے اور بھی بہت سو پاکیزہ اشعار اس دیوان میں موجود ہیں،

یہ دیوان صرف غزلیات کا مجموعہ ہی، قصائد بالکل نہیں ہیں، اخیر میں چند متفرق نظمیں مثلاً

”دع س“

فسدہ، رباعیان اور قطعات ہیں جو خاص مقام کے قابل نہیں،

## گلِ رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور ادب کی شاعری کا آغاز اور عبد الباقی کے اردو شعرا کے

صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو میں شعرا کا یہ مکمل تذکرہ ہے جس میں آبِ حیات کی

علیون کا ازالہ کیا گیا ہے، دلی سے لیکر عالی و اکبر تک کے حالات قیمت للغزیرہ ۵۰ صفحے،

”منی“

# مطبوعات جدیدہ

نبوت اور سلطنت مولانا محمد حامد صاحب ناظم دینیات اسلامیہ کالج پشاور قلعہ اوسط،

صفحات ۲۰۰، صفحہ کا انداز کتابت، وطاعت بہتر قیمت معلوم نہیں اپنا مصنف سے ملے گی،

لائق مولف کے الفاظ میں اس تالیف کا مقصد یہ ہے آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوان یہ خیال کرتے ہیں

کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف تبلیغ رسالت کے لئے تشریف لائے تھے، اور آپ کو حکومت و سلطنت سے کوئی

تعلق نہ تھا، میں اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں اس مقصد کے لئے انھوں نے کلام مجید سے مسلمانوں کے

معاملات کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیاز حکومت کے اجزاء اور بعض گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی حکومت کے

واقعات اور حدیث و سیرت کی کتابوں سے عہد نبوی کے مذہبی و سیاسی نظام کو پیش کیا ہے، مولف کا مقصد

نیک ہے، لیکن اسکی تعبیر کا طریقہ صحیح نہیں ہے، اس حد تک صحیح ہے کہ اسلامی قوانین کے قیام و نفاذ کے لئے

عہد رسالت میں ایک سادہ مذہبی و سیاسی نظام قائم تھا، لیکن اس کو سلطنت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا تھا،

غلط طریقہ تعبیر سے واقعہ کی صورت بدل گئی ہے، مثلاً بخدا منی قانون ساز جماعتوں (صاحب حکومت

انبیاء) کے ہمارے رسول ہی ہیں، (منش) یا تم کہ میں آپ غلظومت کی زندگی بسر کرتے تھے، اور مدینہ

میں اگر آپ کی شان حاکمانہ ہو گئی۔ یا آپ نے محسوس فرمایا کہ دینی تبلیغ بغیر نظام حکومت کے ناممکن ہے،

یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً بادشاہ تھے، لیکن دنیاوی اسلامیات سے آپ کی تاریخ متاثر تھی، مولف کی نیت نیک ہے،

لیکن ان الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود وضع قوانین تھے یا کہ میں جب آپ

کے پاس آدمی فوت نہ تھی، غلظومت کی زندگی بسر کرتے رہے، مدینہ آنے کے بعد جب فوت حاصل ہو گئی

تو حاکمانہ شان اختیار کرتی بعض مقاموں پر مفہوم کو صحیح الفاظ میں بھی تعبیر کیا گیا ہے، اور حقیقت آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کے ساتھ دنیاوی بادشاہت و سلطنت اور اس قبیل کی کسی اصطلاح  
 کی نسبت ہی صحیح نہیں، اے حضرت خاک راہ عالم پاک واقعہ یہ جو کہ ابتدائے بعثت سے اللہ تعالیٰ نے  
 دو قسم کے انبیاء مبعوث فرمائے، ایک وہ جن کے ذمہ صرف تبلیغ کا فرض تھا، اور قانون و شریعت سے انھیں  
 کوئی علائقہ نہ تھا، جیسے حضرت عیسیٰ حضرت یحییٰ اور بعض دوسرے اسمائیلی انبیاء علیہم السلام، دوسرے وہ جنہیں  
 منصب تبلیغ کے ساتھ شریعت اور اس کے نفاذ کے لئے حکومت بھی عطا ہوئی تھی، جیسے حضرت موسیٰ،  
 حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہم السلام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی دوسری قسم کے انبیاء میں تھے، اور چونکہ آپ  
 دین و دنیا دونوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے، اور اسلام دنیا میں خدا کا آخری دین تھا، اس لئے  
 اپنے ساتھ دین و دنیا کی جامع شریعت بھی لایا تھا، اس کے قیام و نفاذ کے لئے جس حد تک مادی نظام  
 کی ضرورت تھی، اسی حد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سادہ نظام قائم فرمادیا تھا، جسے اصطلاحی معنوں  
 میں سلطنت سے کسی طرح تعبیر نہیں کیا جاسکتا، مصنف کی اس تالیف سے بہت پہلے سیرۃ النبی حصہ  
 دوم میں تائیس حکومت النبی کے عنوان سے اس نظام کا پورا خاکہ موجود ہے، مصنف نے حسن نیت سے  
 یہ کتاب لکھی ہے، اور ایک حیثیت سے مفید بھی ہے، لیکن ان کے خیال کے برعکس اب تعلیم یافتہ فوج و  
 کایہ خیال ہو رہا ہے، کہ انبیاء علیہم السلام نے فوج با خدا اپنے جاہ و اقتدار اور امارت و حکومت کے لئے مذہب  
 کا ڈھونگ کھڑا کیا تھا اس لئے اب ضرورت اسکی کہ اس غلط خیال کی تردید کی جائے، اور بتایا جائے  
 کہ انبیاء علیہم السلام کا اصل کام تو تبلیغ و تعلیم و تزکیہ ہے، لیکن جب کبھی ان فرائض کی بجائے دوسری  
 دنیا کا کوئی سیاسی نظام راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے، تو لامحالہ اس پتھر کو راستہ سے ہٹانا پڑتا ہو گا  
 انسانوں میں دین و دنیا کے فوائد و حسنات کو لیکر آیا ہو اور اسکی شریعت میں جہان عقائد و عبادات کا باب ہو اور  
 تعزیرات و سزائیں کے ابواب بھی ہیں لیکن اول مقصود الذات اور ثانی مقصود بالعرض ہو۔

محمد رسول اللہ ترجمہ جناب مولوی عبید الرحمن صاحب تقطین چوٹی افغانست ۱۹۷۸ء صفحہ ۱ کاغذ

کتاب طباعت بہتر قیمت ۸ روپے کتبستان پوسٹ بکس نمبر ۱۶۷۴ بمبئی ۱

کارلائل نے اپنی مشہور کتاب ہیروانڈ بیٹورڈ شپ میں آنحضرت صلیم پر بھی ایک باب لکھا ہے، مذکورہ بالا کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے، اسلام اور آنحضرت صلیم کے متعلق کارلائل کے معلومات اور خیالات اگرچہ غلط اور ناقص سے یکسر پاک نہیں ہیں، تاہم اس تاریک دور میں جبکہ یورپ میں تعصب اور غلط بیانیوں کا طومار برپا تھا، بڑی حد تک کارلائل نے صحیح واقعات لکھنے کی ہمت کی، درحقیقت اس دور کا کوئی یورپین اسلام اور آنحضرت صلیم کے متعلق مشکل ہی سے صحیح تصور قائم کر سکتا، کچھ تو اس لئے کہ اس زمانہ میں یورپ نہایت اندھے تعصب میں مبتلا تھا، پھر اس کے پاس علم کے اتنے وسیع ذرائع نہ تھے، ان سب بڑھکر یہ کہ جدید یورپ کا کوئی فرد نہ صرف اسلام اور آنحضرت صلیم بلکہ کسی المامی مذہب اور پیغمبر برحق کے تقدس و عظمت کا صحیح ادراک کر ہی نہیں سکتا، اس لئے کارلائل نے اپنے خیال کے مطابق سچائی اور تحقیق کے باوجود بعض بڑی فاش غلطیاں کی ہیں، تاہم یہ کتاب اسلام اور آنحضرت صلیم کے متعلق اسی دور کی دوسری کتابوں کو مقابلہ میں غنیمت ہے، خیال آتا ہے، کہ اس کتاب کا ترجمہ پہلے ہی ہو چکا ہے

تصفیدی اشارے از جناب آل احمد صاحب مرور، لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی قلعہ

چوٹی افغانست ۱-۱۹۸۰ء صفحہ ۱ کاغذ، کتاب، طباعت، بہتر قیمت ۱-۱۰ روپے، نذیر

ایندہ سنزلم ایجوکیشن پریس علی گڑھ،

یہ کتاب بیٹورڈ صاحب کی ان سولہ تقریروں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اردو ادب کے

مختلف ادبی اور تنقیدی پہلوؤں پر ڈی ریڈیو پریکٹین اردو ناول کا ارتقاء، اردو نثر میں مزاحیہ نگار، اردو میں فسانہ نگاری، اردو شاعری میں خرمیات، ناولسٹ اور جرم، انگریزی شاعری، ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ اکبر کی شخصیت اور آرتھکلیکسٹ لکھنؤی، اقبال اور اس کا فلسفہ، شوکت علی

خان فانی، رتن ناتھ سرشار، ہندوستانی ادب میں آغا حشر کادر، سمندر پار سے سرسید کے خطوط، مکاتیب ہمدی، خندان، ریڈیو کے شہ لٹک کی پابندی کے ساتھ کسی علمی و ادبی موضوع پر جانتا تقریر بہت مشکل ہے، لیکن ان تقریروں میں یہ خوبی ہے، کہ اس میں اختصار کے باوجود بڑی حد تک جامعیت موجود ہے، اور زیر تقریر موضوع پر اس حُسنِ مذاق اور مکثِ سخن سے بھرہ کیا گیا ہے، کہ کوئی بنیادی بات چھوٹے ننہیں پائی ہے، اور زبان کی سادگی کے باوجود ادب کا معیار پوری طرح قائم ہے یہ تقریریں لائقِ مقرر کے اعلیٰ ادبی ذوق اور تنقیدی نگاہ کی آئینہ دار ہیں، اور ادبی حقیقت سے اصحابِ ذوق کے مطالعہ اور طلبہ کے استفادہ کے لائق ہیں،

الترجمة العربیة مولف مولانا مسعود عالم ندوی و مولانا ظفر ندوی ادیب ندوۃ العلماء قلعہ

چھوٹی ضخامت ۶۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر ۱۲ روپے :- معین المذوہ مندر دیکھنا،

محمد ناظم صاحب ندوی رکارڈنگ کھنڈ،

عربی زبان کی تعلیم کی سہولت کے لئے اسکی صرف و نحو پر اردو میں بہت سی کتابیں موجود ہیں، بعض میں ضمنی عربی انشاء و ترجمہ کی تعلیم کا بھی کسی حد تک الحاح رکھا گیا ہے، لیکن خاص اس مقصد کے لئے غالباً کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جو عربی ترجمہ و انشاء کی تعلیم میں معاون ہو، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی سابق اڈیٹر الضیاء اور مولانا محمد ناظم صاحب ندوی ادیب ندوۃ العلماء جن کے ادبی دستِ گاہ سے اہل علم واقف ہیں، اور جنہیں اس کی تعلیم کا عملی تجربہ بھی ہے، ان کے اصول و قواعد پر یہ کتاب لکھی ہے، ہر قاعدہ کے ساتھ عربی اور اردو دونوں ترجموں کی مشقیں بھی دیدی ہیں، اسباق میں تدریج کا پورا الحاح رکھا گیا ہے، یہ کتاب نہ صرف عربی زبان کے طلبہ بلکہ بہترے مدرسین کیلئے بھی مفید ہے،



# سیرۃ النبیؐ

سیرۃ النبی ﷺ کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات شعل راہ ہو سکتے ہیں، وہ حضرات صحابہ کرام ہیں، دارالمصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم انسان کام کو انجام دیا، اور اردو میں صحابہ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں اعادیت و سیر کے ہزاروں صفحات سے چن کر مرتب کیں اور بحسن و خوبی شائع کیں، ضرورت ہے کہ حق طلب اور ہدایت و رہنمائی کے جو یاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی میں چلیں، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلانی گئی تھی، ان جلدوں کی علامتہ علامتہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، جن کا مجموعہ موعودہ ہوتا ہے، لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف موعودہ میں یہ دس جلدیں کامل تدریج جاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد اول	خلفائے راشدین	ہے	جلد ششم	سیرۃ صحابہ ششم	عبار
جلد دوم	ہاجرین اولیٰ	ہے	جلد ہفتم	سیرۃ صحابہ ہفتم	عبار
جلد سوم	ہاجرین دوم	ہے	جلد ہشتم	سیرۃ صحابیات	عبار
جلد چہارم	سیر الانصار	ہے	جلد نہم	اسوۃ صحابہ اول	عبار
جلد پنجم	سیر الانصار دوم	عبار	جلد دہم	اسوۃ صحابہ دوم	عبار

یہ سیرۃ دار المصنفین اعظم گدہ

# تابعین رضی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابہ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونہ عمل ہی اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت جن بصری، حضرت اویس قرنی، حضرت امام زین العابدین، حضرت امام باقر، حضرت امام جعفر صادق، حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت سعید بن مسیب، حضرت سعید بن جبیر، حضرت محمد بن سیرین، حضرت ابن شہاب زہری، امام ربیعہ رطبی، امام کحول شامی، قاضی شریح وغیرہ چھپانے والے اکابر تابعین کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور علمی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، صفحات ۶۰، صفحہ ۱، قیمت: للعلم،

## تاریخ اسلام حصہ اول

(از آغاز اسلام تا حضرت جن رضی اللہ عنہ)

اس کتاب میں عرب قبل از اسلام کے حالات اور ظهور اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی اسلام کی مذہبی، سیاسی اور تمدنی تاریخ ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، صفحات ۲۸، صفحہ ۱، قیمت: ۷۰/-

## حصہ دوم

اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل، حجم ۴۷، قیمت ۷۰/-

مکتوبہ علی ندوی      منیر دارالمصنفین      اعظم گڑھ

مطبع معاذ بن محمد اویس و آرائی نے چھاپکوشائع کیا



۸۹۱۵۳۴۵

معرف

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار **جلد ۵**  
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے **۱۴۱۵**  
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

- 3 OCT 1965

۵۴,۱۲,۲۶

۱۸۹۵

1895

7915 AM.

- 3 OCT 1955

22 or 14, 14  
Syeda Zafar  
Ph.D (2)

[illegible]





